فیض شناسی

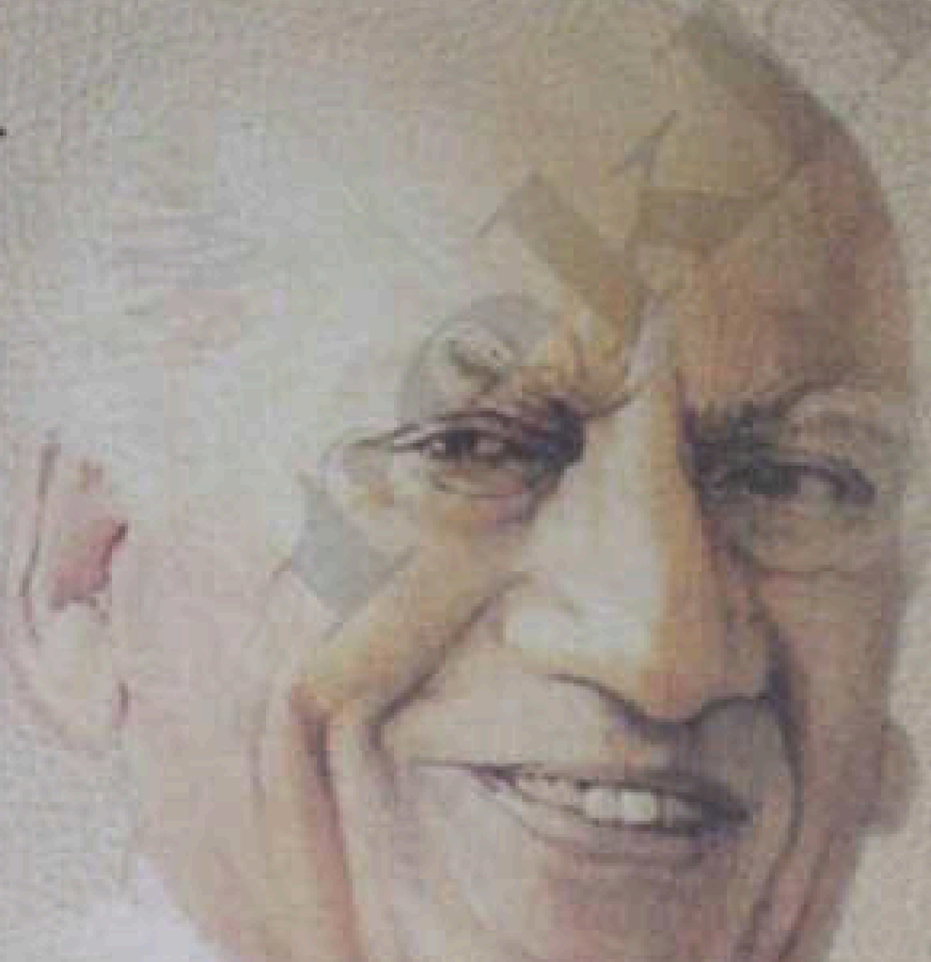

ڈاکٹر سید تقی عابدی

فیض شناسی

(تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر سید تقی عابدی

ناشرانہ اہتمام: ادارہ سیاست حیدرآباد۔ انڈیا
A Siasat Publication
Hyderabad, India.

شناسامہ

کتاب	فیض شناسی
تحقیق وتنقید	ڈاکٹر سید تقی عابدی
صورت گری	سید ولی الدین (ذکی)
عکسِ کتاب	کریسنٹ ڈیزائن اسٹوڈیو(+91 91602 46212)
سرِ ورق	کریسنٹ ڈیزائن اسٹوڈیو
طباعت	اے۔یف۔پرنٹ سسٹمس
ناشرانہ اہتمام	ادارہ سیاست،حیدرآباد۔انڈیا
اشاعتی شماریہ	نموداول
تعداداشاعت	ایک ہزار
تقویمی حوالہ	اکیسویں صدی کا تیرہواں سال، جون،موسم برشگال
استحقاق	اس مجموعہ کے تمام تصرفات ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ	600 روپیہ۔بیرونی ممالک سے 50 ڈالر

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقی
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	مجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مئی 1952ء
مقام پیدائش		دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (حیدرآباد انڈیا)، ایم۔ ایس [illegible] ایف۔ سی۔ اے۔ پی (امریکہ)، ایف۔ آر۔ سی۔ پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ادبی		شاعری
شوق	.	مطالعہ اور تحقیق
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، امریکا، کینیڈا
شریکِ حیات	:	[illegible]
اولاد	.	دو بیٹیاں ([illegible])، دو بیٹے (رضا، مرتضیٰ)
تصانیف	.	(37) تصانیف (1982ء تا حال) جوشِ مودت، گلشنِ رویا، اقبال کے عرفانی زاویے، [illegible] شاعری، اظہارِ حق، مجتہدِ نظم مرزا دبیر، طالع مہر، [illegible] تجزیہ یادگارِ انیس، ابواب المصائب، [illegible] مصحفِ فارسی دبیر، [illegible] [illegible] [illegible] انتخاب، [illegible] [illegible] کلیاتِ غالب فارسی [illegible]۔
زیرِ ترتیب	.	تجزیہ شکوہ جوابِ شکوہ، [illegible] کے [illegible] چھپ رہے ہیں۔

عمل: سعید اختر

سلیمہ ہاشمی اور فیض احمد فیض

خالد حسن، فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ، ناصرہ انور اور ان کے اہلِ خانہ

فیض احمد فیضؔ اور کرنل انور احمد کی دُختر

فیض احمد فیض، ڈاکٹر سرور اور سید سبط حسن

فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ اور کرنل انور احمد

آغا ناصر اور فیض صاحب

فیض کی 86 ویں سالگرہ پر ڈاک کا ٹکٹ تاریخ تیرہ فروری 1997ء

فیض احمد فیضؔ اور بیگم سرفراز اقبال

شماریہ	عنوان	صفحہ
1	بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ ـــــ علامہ اعجاز فرخ	11
2	فیض کا زندگی نامہ	15
3	فیض مشاہیر کی نظر میں (یعنی "82" شخصیتوں کا گلدستہ)	22
4	فیض کی شاعری (تشریح، تجزیہ، تبصرہ)	65
5	فیض کی غزل کا مقام	84
6	کلامِ فیض: عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ	97
7	فیض کی نظم کی ساخت	105
8	کلامِ فیض پر فیض کا ریویو	116
9	فیض کی دوست نوازی کا جائزہ	130
10	فیض معصوم جذبوں کے ترجمان	137
11	فیض اور احمد ندیم قاسمی کی مشترکہ قدریں	146
12	کون بڑا؟ جوش یا فیض (دنیا نامہ پر مرزا کی معلومات)	153
13	فیض: ذکرِ بادہ و ساغر	170
14	فیض کے کلام میں غلطیاں اور ابہام (متعلقہ تحریریں)	176
15	فیض کے انٹرویوز (28 منتخب 50 سے زائد صورت)	198
16	فیض کی تخلیقات... تخلیقی جدیدیت کی وسعت	304
17	فیض مخصوص ترجمہ "پیامِ مشرق" تحقیقی مطالعہ	340
18	فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان "بہ چہرہ"	348
19	فیض کا عقیدہ (متعدد حوالوں کی روشنی میں)	352
20	فیض کی صحت اور بیماریاں (خطوط کی روشنی میں)	365
21	فیض کے خطوط سے ہمیں کیا ملا؟	370
22	چہرہ ہائے مہربان	385

23	حسینؑ اور مصطفیٰ زیدی (ایک مکتوب سے ماخوذ)	386
24	حسینؑ اور نوبل پرائز	394
25	حسینؑ پہ نامۂ اعمال کا ریفرنس (شیخ محمود رضا شریعتی)	397
26	قتلِ حسینؑ پہ احتجاج کیوں ہو گیا کیوں؟	404
27	حسینؑ کا مرثیہ امام	414
28	حسینؑ نے انکار کیوں کیا	427
29	محرم اور عقیدت	431
30	اے اہلِ آرزو کہاں ملیں	458
31	حسینؑ نے زمین آسمانوں کو معاف کیا	461
32	حسینؑ کے بہتّر (72) وفا شعار	468
33	حسینؑ کے لیے	479
34	حسینؑ کی بیعت	485
35	شامِ غربت	488
36	حسینؑ اور ایرانی انقلاب	490
37	حسینؑ سب کا سانجھا ہے	498
38	جدید نظم میں حسینؑ	505
39	کلیاتِ حسینؑ پر ایک نظر	520
40	حسینؑ پر مرتب کتب اور رسائل	528
41	حسینؑ پر مرتبہ مضامین کا ذخیرہ	531
42	حسینؑ کو غیر مسلموں کا سلام	544
43	کتابیات	560

علامہ اعجاز فرخ

بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ

ڈاکٹر تقی عابدی اور فیض شناسی

کسی بھی شاعر کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی شاعری کا کتنا حصہ عالمی ادب کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہے۔اس کے پیش نظر اردو کے کئی شعراء صف اول میں شمار کئے جا سکتے ہیں،لیکن یہ نہیں طے کیا جا سکتا کہ ان میں بڑا شاعر کون ہے۔اس ضمن میں صرف تخیل کی بلندی ہی واحد معیار نہیں، بلکہ خیال کا تعمق،اس کی گیرائی، خیال کو محسوس بنا دینے کی صلاحیت،موضوع کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ جذبہ کی جس آنچ میں شاعر تپ رہا ہے،اس کی تپش کو دوسرے تک پہنچانے کی قدرت،لفظ کو معنی کے نئے پیراہن عطا کرنے کی اہلیت، مانوس خیال کی تہہ میں جدت اور انوکھے خیال کو مانوس کر دینے کی استطاعت سبھی کچھ شامل ہیں۔شاعری نہ صرف صحیفہ اخلاق ہے نہ سیاست کی آماجگاہ،لیکن اگر شاعری انسانیت کے راز ہائے سربستہ کو منکشف کرتی ہے اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے یا کائنات کے اسرار کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے قاری کو نہ صرف حرف آگہی عطا کرے، بلکہ اپنی وجدانی کیفیت کے زیر اثر جہان نو کی سیر کروائے،تب اس سے اخلاق، اقدار اور سیاست کے سرچشمے فیض حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے بھی رہے ہیں۔مرثیہ کے کسی شاعر کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی اساس مذہبی اقدار پر ہے۔اسی طرح اگر کسی کی فکر اشتراکیت اساس ہے تو اس سے وہ بڑا شاعر یا ادیب نہیں بن جاتا۔اگر چہ کہ ہر نظریہ حیات کی ادب میں گنجائش ہے،لیکن بقول غالب: ''ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے''۔

فیضؔ بلاشبہ ہمارے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔کمیت کے اعتبار سے کم کم، بلاغت،اثر آفرینی،قبولیت، رسائی و ابلاغ اور تہہ داریوں کے باوصف کون ذی شعور اور حساس دل ایسا ہوگا، جہاں فیضؔ نہ بستے ہوں۔ایک سادہ سے جملہ میں یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ فیضؔ کو جانتے سب ہیں،لیکن فیضؔ شناسی کا مدار و قرار نہ صرف اس کے فہم پر منحصر ہے، بلکہ یہ بھی کہ قاری کے اپنے ماحول،اطراف و اکناف، تجربات و کیفیات کے پس منظر میں فیضؔ کا کونسا شعر کیا معنی پیدا کرتا ہے، کتنا اثر پذیر ہے اور قاری کے خیال میں اس کی بازگشت کی کیا صورت ہے۔

فیض کی شاعری میں تناسب حسن اورحسن تناسب نے کتنا زندگی کا حوصلہ بخشا ہے، یا کتنی آزادیاں مہیا کی ہیں، کن تحریکوں کا آغاز کیا اور کن تحریکوں میں نئی روح پھونکی' ان تمام پر نقادانِ سخن نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔لیکن بلا جھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں اسالیب کی جدت اور ادبی اجتہاد کی صورت گری موجود ہے۔ان اسالیب نے فیضؔ کے مداحوں، نقادوں اور سخن فہموں کو متوجہ کیا، جس کے نتیجے میں جو مقالے اور بیش قیمت مضامین جمع ہوئے، وہ فن سے فنکار اور فنکار سے فن تک رسائی کا خوبصورت وسیلہ ثابت ہوئے۔

برصغیر میں یہ کیفیت اکثر دکھائی دے جاتی ہے کہ ذوق اور پیشے میں ہم آہنگی کم کم پائی جاتی ہے۔کچھ یہی حال ڈاکٹر تقی عابدی کا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ جسمانی امراض کے طبیب ہیں، لیکن ادب ان کی زندگی ہے، ادب ان کی صحت مندی کا راز بھی ہے اور صحت مند ادب سے انھیں بے پناہ محبت بھی ہے۔ان کے وسیع مطالعہ کا حاصل یہ ہوا کہ وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے۔کہتے ہیں کہ چاہ خود راہ پیدا کر دیتی ہے۔ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ قدیم کتب کی خریدی میں ضرور صرف ہوا، لیکن ان کی شبانہ روز محنتوں کا حاصل یہ نکلا کہ جو کام صدیوں میں نہ ہوسکا، وہ چند برسوں کی قیمتی ساعتوں نے مکمل کرلیا۔چنانچہ 30 برس کے مختصر سے عرصہ میں 35 کتابیں، 37 شہید، جوش مودت، گلشن رویا، اقبال کے عرفانی زاویئے، انشاء اللہ خاں انشاء، رموز شاعری، اظہار حق، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلکِ سلام دبیرؔ، تجزیہ یادگار انیسؔ، ابواب المصائب، ذکر دُر باران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیرؔ، مثنویات دبیر، کائنات نجمؔ، روپ کنور کماری، دربار رسالت، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُردریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشن انقلاب، مصحف تغزل، ھو النجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالبؔ دیوان، نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رباعیات دبیرؔ، سبد سخن، کلیات غالبؔ فارسی (دوجلد)، کلیات غالبؔ فارسی (ایران ایڈیشن)، فیضؔ فہمی، اس کے علاوہ چار اور کتابیں زیر تالیف ہیں، جس میں تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانیؔ لافانی، تجزیہ رباعیات فراقؔ، دوشاہکار نظمیں اور اقبال کے چار مصرعے شامل ہیں۔خود ان کے خیال میں یہ ''رومیں رخش عمرؔ ہے منزل تو ابھی بہت دور ہے''۔

فیضؔ پر بہت لکھا گیا، بہت کچھ لکھا گیا۔وہ تمام بھی جو فیضؔ کا حق تھا، وہ بھی جو کم قامتوں نے فیض پر لکھ کر خود کو بلند قامت کرنے کی کوشش ناکام کی۔کچھ یوں بھی ہوا کہ مختلف مقالوں سے کتر بیونت کر کے نئے عنوانات تراشے گئے، لیکن فیضؔ کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک ایسی مستند دستاویز کی تیاری، جو شائقین ادب، مداحان فیضؔ کے ساتھ ساتھ محققین کے لئے بھی سودمند ثابت ہو، ایک سنگ گراں بار سے کم نہ تھی۔ کم حوصلہ تو شاید ''بوجھ کس ناتواں سے اٹھتا ہے'' کے مصداق اس بھاری پتھر کو چوم کر ہٹ گئے۔اردو دنیا کے وہ نامور اہل قلم جن پر اردو کو بجا طور پر ناز ہے، انھوں نے فیضؔ کو دریافت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔چنانچہ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض پر 120 صاحبان علم وفن کے وہ مقالے جمع کئے، جو نہ صرف مستند کتابیاتی حوالوں کے ساتھ تھے، بلکہ فیضؔ فہمی کے باب میں ایک عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب سب کچھ جمع کیا جا چکا اور ترتیب کا مرحلہ درپیش ہوا تو ڈاکٹر تقی عابدی کی باریک بینی نے کائنات فیض میں ان 42 جزیروں کو دریافت کیا، جن پر ابھی کسی کی نظر ہی نہیں گئی تھی۔اس تلاش نے ڈاکٹر تقی عابدی کو ایک نئی جولانی کے ساتھ آمادۂ سفر کیا۔غیر مانوس جزیرے، اجنبی زمینیں، تلاش مسلسل، ایسے میں آبلہ پائی تو مقدر ہو ہی جاتی ہے، لیکن ہزار ہزار آبلہ پائی کے باوجود ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ مہم سر کی اور تنہا سر کی۔ان جزیروں سے جو دفینے برآمد ہوئے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

فیضؔ کا زندگی نامہ، جس میں فیض کی تاریخ پیدائش 13/فروری 1911ء سے ان کی زندگی کے اہم کوائف موجود ہیں۔فیضؔ مشاہیر کی نظر میں 82 پھولوں کے گلدستہ کی صورت میں موجود ہے۔ان 42 موضوعات پر ڈاکٹر تقی عابدی نے جس غیر جانبدارانہ انداز میں خامہ فرسائی کی ہے، اس سے ''ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں'' پوری طرح صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا لہجہ کبھی تند نہیں پایا گیا۔ وہ اکثر و بیشتر شیریں سخن اور شیریں کلام ہیں، لیکن اگر کہیں کوئی بات انھیں حقیقت کے خلاف نظر آ جائے تو اسے دلائل کے ساتھ رد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین میں وہ اہم انٹرویو بھی شامل ہے، جس میں 28 اشخاص نے فیض سے 450 سوالات کئے۔ اس انٹرویو کے نتیجے میں فیض کی پوری زندگی، شخصیت اور فن یوں شفاف اور واضح دکھائی دیتے ہیں کہ انھیں نہ صرف نقوشِ فیض کہا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے ہر نقش پر سیر حاصل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی موضوعات کے انتخاب میں بھی ایک نازک فنکار ہیں، انھیں اندازہ تو یقیناً رہتا ہے کہ کونسا موضوع ان سے کتنے حساب جاں کا طلبگار رہے۔ لیکن چوں کہ اچھوتا پن ان کی طبیعت کا خاصہ ہے، اس لئے ان کا دل طوفاں شکن نہ صرف اسے قبول کرتا ہے، بلکہ اپنی پوری سعی اور خلوص کے ساتھ اسے تکمیل کے مرحلے تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتا۔ فیض کی دولت تنہائی، فیض مصور نقوش خد و خال حسن، فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں، فیض اور بادہ و ساغر یا دِیارِ مہربان، فیض اور مصطفےٰ زیدی (رشتہ جو موتیوں سے ڈھکا رہا)، فیض بنامِ افتخار عارف (مفید، مختصر اور مستند دستاویز)، فیض کا مرثیہ امام، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ اور جو میرا تمہارا رشتہ ہے، یہ وہ نازک موضوعات ہیں، جن پر ایک ذرا سی لغزش قلم ساری محنتوں پر پانی پھیر سکتی ہے، لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے ان منزلوں کو سر کرنے میں اپنی پوری متاع قلم صرف کی ہے۔

جناب زاہد علی خاں مدیر سیاست کی نظر انتخاب نے ڈاکٹر تقی عابدی کی اس تحقیق اور جانفشانی کو ادب دوستوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر صاحبانِ نظر اور اہل ذوق یہ محسوس کریں گے:

بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ

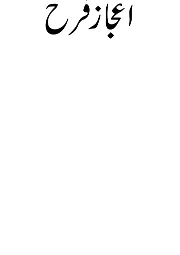

اعجاز فرخ

سن دو ہزار تیرہ، آمد برشگال، جون دسویں شام

عمل: صادقین

فیضؔ کا زِندگی نامہ

نام: فیض احمد خان

ادبی نام: فیض احمد فیضؔ

پیدائش: 13 فروری 1911ء ۔۔۔۔ فیضؔ ایک نامہ مورخہ 16 اپریل 1965ء میں اپنی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں "تاریخ پیدائش سکول کے کاغذات میں 7 جنوری 1911ء اور کہیں 7 جنوری 1912ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں، ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں 13 فروری 1911ء تاریخ پیدائش درج ہے۔

مقام پیدائش: قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ۔

والد: خان بہادر سلطان محمد خان بیرسٹر، میر منشی عبدالرحمٰن والی افغانستان۔ سابق سفیر دولت افغانستان متعین لندن۔

چودھری سلطان محمد خان، فیض احمد فیضؔ کے والد سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ علم و ادب سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبالؔ، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاءالدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھار دیا تھا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرگرم رکن تھے۔ ان کی مشہور تصنیف ہیں افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری، جو انگریزی میں ہے۔

چودھری سلطان محمد خان نے خاندانی پیشہ زراعت کو چھوڑ کر فارسی، عربی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی۔ افغانستان کے سرکاری وفد کی پیشکش پر لاہور سے کابل گئے جہاں والی افغانستان عبدالرحمٰن نے چیف سیکرٹری اور پھر سفیر بنا کر لندن روانہ کیا۔ لندن کے قیام کے دوران آپ نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ یہاں آپ کی علامہ اقبالؔ سے ملاقات ہوئی۔ خان بہادر لندن میں تین سال گزارنے کے بعد افغانستان واپس ہوئے جہاں آپ نے ایک وزیر زادی سے شادی کی لیکن محلاتی سازشوں سے جان بچا کر راتوں رات افغانستان کو ترک کر دیا۔ دوران سفر آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ سیالکوٹ پہنچ کر بیرسٹر کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا اور یہاں دو شادیاں کیں جن سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ چودھری صاحب کا 1931ء میں انتقال ہو گیا۔

والدہ کا نام: سلطان فاطمہ۔

بھائی بہن: حاجی طفیل احمد، میجر عنایت احمد، بشیر احمد، بیگم شجاع الدین، بیگم حمید، بیگم نجیب اللہ خان، بیگم اعظم علی، رشیدہ سلطانہ۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم: 1915ء میں چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ 1916ء میں ابراہیم سیالکوٹی کے مکتب گئے اور عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کی۔ 1921ء میں سیالکوٹ کے سکاچ مشن ہائی سکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور

رشیادی کو۔ پنجابی حاصل کی۔ 1927ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ 1929ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ یہیں علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن سے باقاعدہ عربی اور فارسی میں تعلیم حاصل کی۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور عربی میں بی اے آنرز کے امتحانات پاس کیے۔ 1933ء میں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم۔ اے کیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

مشاغل: 1935ء سے 1940ء تک ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر کے فرائض انجام دیے۔ 1940ء سے 1942ء تک ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ 1942ء سے 1947ء تک فوج میں مشغول کار رہے۔ 1942ء میں بحیثیت کیپٹن فوج میں بھرتی ہوئے۔ فوج کے شعبہ تعلقات عامہ میں مصروف رہے۔ 1943ء میں میجر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ 1944ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء میں فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر سبکدوش ہوئے۔ 1959ء سے 1962ء تک پاکستان آرٹس کونسل کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ 1964ء میں عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1965ء میں محکمہ اطلاعات ونشریات میں بطور اعزازی مشیر خدمات انجام دیں۔ 1972ء میں قومی ادبی اکادمی پاکستان کے صدر منتخب ہوئے۔ 1978ء میں افروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے نمائندہ اور لوٹس کے مدیر رہے۔

ازدواجی زندگی: 28 اکتوبر 1941ء کو فیض احمد فیض کی ایلس جارج سے اسلامی شریعت کے مطابق عقد نکاح ہوا۔ ایلس انگریز نژاد تھیں۔ شادی سری نگر کشمیر میں ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ نے نکاح پڑھایا۔ فیض کی والدہ نے ایلس فیض کا اسلامی نام کلثوم رکھا۔ فیض نے اپنے مجموعہ "دست صبا" کا انتساب کلثوم کے نام کیا ہے۔

شادی کی شرائط: یہ معاہدہ 28 اکتوبر 1941ء کو فیض احمد ساکن سیالکوٹ (ہونے والا شوہر) اور ایلس کیتھرین جارج (ہونے والی زوجہ) ان دونوں کے درمیان طے پایا جن کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ اس کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1) یہ معاہدے کے تحت دونوں میں یہ پایا کہ چونکہ دونوں مسلمان ہیں اس لیے ان کی شادی مسلم شریعت کے مطابق ہو۔
2) اس معاہدے کی رو سے اور مجوزہ شادی کے پیش نظر فیض احمد فیض اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس کیتھرین جارج سے شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد کسی صورت میں بھی کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔
3) اس معاہدے کے مطابق اور مجوزہ شادی کے پیش نظر فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کے تحت طلاق کا حق ایلس کیتھرین جارج کو تفویض کرتے ہیں۔
4) اس معاہدے کے تحت اور اسلامی قانون کی رو سے مہر کی رقم پانچ ہزار روپے مقرر کی ہے جو شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد ایلس کیتھرین جارج کو ادا کریں گے۔

دستخط

بی اے صدیقی	فیض احمد	ایلس کیتھرین جارج
نور حسین	لیکچرر ہیلی کالج آف کامرس، لاہور	شیخ محمد عبداللہ

مرزا ظفر الحسن فیض کی شادی کے بارے میں لکھتے ہیں: "براتیوں میں مجاز تھے، ڈاکٹر تاثیر مرحوم بھی شامل تھے۔ فیض کے مالی حالات اتنے خراب تھے کہ وہ اپنے لیے کپڑے بھی نہ بنا سکے۔ صرف ایلس کے لیے ایک انگوٹھی خرید سکے کیوں کہ ایلس نے منع بھی

خواہش کی تھی کہ انھیں شادی میں انگوٹھی ضرور پہنائی جائے۔ حقیقی اخراجات کے لیے فیض کے دوست میاں افتخار الدین مرحوم سے تین سو روپے قرض لیے گئے تھے۔ نکاح نامے پر فیض اور ایلس کے دستخطوں کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ، بی ایم صادق، ڈاکٹر تاثیر اور محمد حسین کے دستخط ہیں جو ان دنوں سری نگر میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ بیگم تاثیر کے بھی دستخط ہیں جو ایلس کی بڑی بہن ہیں۔ نکاح سے پہلے طرفین میں ایک تحریری معاہدہ ہوا جو اسی نوعیت کا تھا جو علامہ اقبال نے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کی شادی کے سلسلے میں انگریزی میں مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر کا نکاح بھی علامہ اقبال نے پڑھایا تھا۔

یہاں امرتا پریتم کے انٹرویو کا وہ حصہ درج کرتے ہیں جو ایلس فیض سے شادی کے بارے میں ہے:

امرتا: ایلس! کیا فیض صاحب سے تمھاری پہلی ملاقات تمھارے ہی دیس انگلستان میں ہوئی تھی؟

ایلس: نہیں میری بہن ہندوستان میں بیاہی تھی، ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ۔ وہ ان دنوں امرتسر میں رہتے تھے۔ البتہ 1938ء میں اپنی بہن سے ملنے ہندوستان آئی تھی۔

امرتا: تو ہندوستان ہی میں تم نے فیض کو قریب سے دیکھا۔

ایلس: ہاں امرتسر ہی میں ملی تھی۔ امرتسر ہندوستان بن گیا اور ہندوستان فیض۔

امرتا: تم اردو نہیں جانتی تھیں، پھر فیض کی شاعری سے عشق کیوں کر ہوا؟

ایلس: امرتا! سچی بات تو یہ ہے کہ میں آج تک فیض کی شاعری کی گہرائی کو نہیں جان سکی۔ زبان کا سیکھ لینا اور بات ہے۔ کسی دوسری تہذیب کو جاننا دوسری بات ہے۔

امرتا: تب فیض شاعر سے نہیں، ایک شخصیت سے پیار کیا تھا؟

ایلس: ہاں لیکن ویسے تو شاعری شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے کیوں کہ ایک شاعر کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے بھی اس کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور نہیں گھٹتا۔

امرتا: ملنے سے کتنے عرصہ بعد شادی کی منزل آئی۔

ایلس: تقریباً دو سال بعد، اور یہ انتظار اس لیے تھا کہ فیض کے والدین سے منظوری چاہیے تھی، کیوں کہ ایک غیر ملکی لڑکی سے ان کی مرضی کے بغیر ہم شادی نہیں کر سکتے تھے۔

امرتا: شادی کی رسم کہاں ادا کی گئی؟

ایلس: کشمیر میں۔ مہاراجہ کشمیر نے ہمارے ہنی مون کا محل ہمیں نکاح کی رسم کے لیے دیا تھا۔ اور شیخ صاحب نے نکاح کی رسم ادا کی تھی۔

امرتا: کیا بارات لاہور سے آئی تھی؟

ایلس: ہاں۔ تین آدمیوں کی بارات تھی۔ ایک فیض، دوسرے ان کے بڑے بھائی اور تیسرے ان کے دوست تھے...... جب یہ لوگ آ گئے تو میں نے فیض صاحب سے پہلی بات پوچھی: "شادی کی انگوٹھی لے کر آئے ہو کہ نہیں؟" فیض نے کہا "انگوٹھی بھی لے کر آیا ہوں، شادی بھی۔" میں حیران ہوئی کہ فیض نے انگوٹھی کا ساتھ کہاں سے لیا ہے، پوچھنے پر کہنے لگے: "میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا"۔

امرتا: فیض جان گئے ہوں گے کہ دل مل جائیں تو انگلیاں بھی ضرور مل جاتی ہیں۔ اچھا ایلس! یہ بتاؤ کہ نکاح کے وقت مہمان بھی کئی ہوں گے۔

ایلس: ہم نے بتایا تھا پہلے کہ شیخ عبداللہ اور ان کی بیوی کے ساتھ کلام مجید شریف، مجاز اور جوش ملیح آبادی بھی تھے۔

امرتا: فیض کے رشتہ داروں سے ملاقات کب ہوئی؟

ایلس: کشمیر میں تین دن گزار کر ہم لاہور آ گئے۔ وہاں سب سے ملاقات ہو گئی۔

امرتا: یہ جو ہندوؤں کے مکلاوے کی رسم ہوتی ہے۔

ایلس: ہاں مجھے پتہ ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے یہ دعوت دی جاتی ہے۔

امرتا: ساس کی پہلی ہدایت کیا تھی؟

ایلس: سر ڈھک کر گھونگھٹ نکالا کر۔

امرتا: ایلس جی! گھونگھٹ اٹھانے کی رسم بھی ہوئی تھی؟

ایلس: ہاں امرتا! چوتھی کے دن منہ کی سلامی بھی تھی۔

امرتا: ساس صاحب نے تمہارا نام نہیں تبدیل کیا؟

ایلس: کیا تھا اور انھوں نے میرا نام کلثوم رکھا تھا لیکن مجھے پسند نہیں آیا۔

امرتا: اردو زبان کب سیکھی؟

ایلس: گھر میں فیض کے بھتیجے سے، ان کو انگریزی سکھاتی اور ان سے اردو سیکھی۔

امرتا: اس وقت تک فیض کا پہلا مجموعہ "نقش فریادی" چھپ چکا تھا؟

ایلس: ہاں، شادی سے ایک سال پہلے چھپا تھا۔

امرتا: فیض نے اپنے پہلے عشق کی داستان اور ان کی رومانی کیفیت سے متعلق "نقش فریادی" کی نظمیں لکھی تھیں؟

ایلس: ہاں امرتا! وہ بھی اور اس کے بعد کی دوستیاں بھی۔ لیکن کبھی بھی میری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا۔ فیض جب جوان تھے تب بھی آپ میں۔ فیض کی وفا اپنے ساتھ ہے، وفادار قلم کے ساتھ ہے۔

امرتا: یہ سچ ہے، انسان کی وفا اپنے ساتھ ہو، اپنے کردار کے ساتھ ہو، اپنی تخلیق کے ساتھ ہو، اسی جیسا وفادار کون ہو سکتا ہے۔

ایلس: تینتیس برس گزر گئے ہماری شادی کو۔

امرتا: یورپ اور ایشیا کا یہ ملاپ کیسا رہا؟

ایلس: یہ ضرور ہے کہ تم سمجھتی ہو کہ مختلف تہذیبیں ہیں، مشرقی مردوں کے مزاج میں جب شادی کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ عورت کے دل میں رہیں، آسان نہیں لیکن عورت اپنے مرد کے دل میں رہ سکتی ہے، کیونکہ اپنے ماحول کو بدلنے کی اس میں قابلیت ہوتی ہے۔ مختلف تہذیب کے لوگوں کی شادی کوئی آسان بات نہیں۔

امرتا: تمہارے دو بچے ہیں۔

ایلس: دو بچیاں ہیں۔ سلیمہ اور منیزہ۔ سلیمہ مصورہ ہے اور منیزہ ٹی وی پروڈیوسر۔ دونوں نے دو پنجابی بھائیوں کے ساتھ شادیاں کی ہیں۔ اب یہ اکٹھی رہتی ہیں اپنی ساس کے ساتھ۔

اولاد: دو بچیاں۔ بڑی بیٹی سلیمہ 1942ء میں پیدا ہوئی۔ چھوٹی بیٹی منیزہ 1945ء میں پیدا ہوئی۔

بیماری اور وفات: فیض شدید سگریٹ نوشی کرتے تھے۔ موروثی یا خاندانی طور پر دل کی بیماری کا حال ان کے والد اور بڑے بھائی طفیل کی بیماری اور موت سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ 1966ء میں جب ان کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا، کورونری ... فیض کو

کمزور اور قریب المرگ کر دیا تھا۔ افتخار عارف نے 5 مارچ کو ایک خط میں جس بات کو دمے کے شدید حملے کا ذکر بتاتا ہے کہ انھیں bronchitis، emphysema ضعف قلبی کے ساتھ ساتھ قلب کی بے قاعدگی تھی۔ اس کا نتیجہ غالباً خون کی کمی اور سو تیاپہ تمام ہوا۔ 18 نومبر 1984ء کی رات کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ بیوی کی پرسش کے باوجود 20 نومبر 1984ء بروز منگل رات میں ایک بج کر چند منٹ پر میو ہسپتال لاہور کے انٹینسیو کیئر وارڈ میں فیض کا انتقال ہو گیا۔

مشاغل اور خدمات

صحافت: 1938ء سے 1939ء تک ادب لطیف کے مدیر رہے۔ 1947ء سے 1958ء تک پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شائع ہونے والے روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1978ء سے 1984ء افروایشیائی سہ ماہی مجلہ لوٹس بیروت کے مدیر اعلیٰ رہے۔

سماجی خدمات: 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ابتدائی ایام میں سجاد ظہیر، محمود الظفر، رشید جہاں، احمد علی، ملک راج آنند اور دوسری اہم ادبی شخصیات کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ 1947ء سے 1951ء تک پنجاب لیبر اینڈ انڈسٹری کمیٹی کے سرپرست رہے۔ 1951ء میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر رہے۔ 1948ء سے 1970ء تک ورلڈ ایگزیکٹو کمیٹی آف پیس کونسل رہے۔ 1958ء سے آخری عمر تک افروایشیائی ادبی انجمن کے مرکزی رکن رہے۔ 1950ء کے بعد سے ایشیائی عوام، فلسطینی عوام اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک سے منسلک رہے۔

اعزازات: 1942ء میں فوجی ملازمت کے دوران ایم بی ای (M.B.E.) کا خطاب ملا۔ 1962ء میں لینن امن انعام دیا گیا۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے جنھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ 1976ء میں ادبی افروایشیائی لوٹس انعام دیا گیا۔

قید و بند: فیض نے 9 مارچ 1951ء سے 16 اپریل 1955ء تک لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں چار سال ایک ماہ اور گیارہ دن کی قید کاٹی۔ یہ سازش راولپنڈی سازش مقدمہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پہلے تین مہینے قید تنہائی کی سزا ہوئی جس میں فیض کو نہ اپنے بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت تھی، نہ انھیں قلم اور کاغذ بھی استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ فیض کی بہت سی نظمیں جو "زنداں نامہ" میں ہیں اسی قید کے زمانے میں انھوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ فیض 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور 1959ء میں رہا کیے گئے۔ یہ دور ایوب خان کی ڈکٹیٹر شپ کا دور تھا۔

سفر و سیاحت: فیض نے اپنی زندگی میں کئی ملکوں کے دورے کیے۔ بغرض ملازمت، بطور مہمان یا مختلف سیاسی اور ادبی انجمنوں سے ارتباط رکھنے کی وجہ سے بیشتر ملکوں کی ادبی کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کی جن کی فہرست کافی طویل ہے۔ 1948ء میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے سان فرانسسکو اور 1949ء میں جنیوا میں شرکت کی۔ اسی طرح 1958ء میں تاشقند، 1962ء سے 1964ء تک انگلستان میں قیام رہا۔ فیض نے روس کے تقریباً سب بڑے اور مشہور علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ چین، کیوبا، مصر، لبنان، الجیریا، کینیڈا اور متعدد یورپی ملکوں کے مشاعروں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے۔ اُردو ادب کا یہ واحد شاعر ہے جو ملک اور بیرون ملک دونوں مقامات پر یکساں سراہا جاتا رہا۔

شاعری: 1928ء میں اخوان الصفا کے مشاعرے میں فیض نے جو پہلی غزل پڑھی اس کا پہلا شعر یہ تھا:

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہے

ابتدائی نمونہ: فیض کی پہلی نظم "میرے معصوم قاتل" 1929ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ "راوی" میں شائع ہوئی۔ یہ نظم نایاب ہے۔

شاگردی: فیض نے باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ ایک سوال کے جواب میں فیض نے کہا: انھوں نے اپنے ذوقِ وجدان کو رہبر اور خود تنقیدی و خود احتسابی کو شعار بنا کر ہمیشہ اپنے کلام پر نظرِ ثانی کی۔ اس کے علاوہ چند مخلص اور قریبی احباب سے ذہن میں اہم ہے۔ ڈاکٹر تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری اور کرنل مجید ملک بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ مشورے کرتا رہتا۔ البتہ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ فیض کے معنوی اساتذہ میں عالمی شعرا امراؤ القیس، حافظ، میر، سودا، آتش، غالب، اقبال، حسرت کے علاوہ انگریزی شعرا میں شیکسپیئر، شیلے، بائرن، کیٹس اور ییٹس قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے پیامِ مشرق کے انتخاب کے منظوم ترجمے میں فیض، صوفی تبسم اور کرنل مجید ملک کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

شعر گوئی: فیض کہتے ہیں: "جب ہم بڑی جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا: "میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو مگر یہ کام چھوڑ دو ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل و دماغ میں پختگی آ جائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیعِ اوقات ہے۔" ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مفسر بھی ہیں تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا کہ "طرح پر شعر کہو"۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں داد ملی۔ چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا: "فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ گے۔" مجھے یاد ہے ہم ستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی منزل پر تھا۔ نیچے بہت بڑی حویلی تھی۔ چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا۔ چاروں طرف مکانات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا، چاندنی، جوہڑ، دیوار اور گرے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پراسرار منظر بن گئے تھے۔ جو دن کی حقیقت سے منظر کی بدنمائی چھپ گئی تھی اور ایک عجیب قسم کا حسن پیدا ہو گیا تھا جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر کی گلیوں، محلوں اور کوچوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت وہ اسی قسم کا روپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔" نظم شب، اجالا، تنہائی، سرگوشی، بام و در، تنہائی کے بوجھ سے، "تنہائی" وغیرہ وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

اساتذہ

الف) محترم والد سلطان محمد خان کی تربیت کے علاوہ خطوط نویسی اور اخباروں کی خوانندگی نے گہرا اثر چھوڑا۔ بڑی بہنوں اور گھر کی تہذیب و ثقافت سے گہرے سماجی اور ثقافتی اثر چھوڑا جس کا ذکر فیض نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔

ب) مکتب کے استاد ابراہیم میر سیالکوٹی سے اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

ج) کالج کے اساتذہ میں شمس العلما میر حسن سے عربی اور یوسف سلیم چشتی سے اردو پڑھی۔

د) دیگر اساتذہ میں صوفی تبسم، محمد شفیع، احمد شاہ (پطرس) بخاری شامل ہیں۔

ہ) ادبی اور شعری اساتذہ میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، مولانا سالک، چراغ حسن حسرت، کرنل مجید ملک اور پنڈت ہری چند اختر قابلِ ذکر ہیں۔

مطالعہ: فیض نے اعلیٰ تعلیم اور اساتذہ سے دورانِ تعلیم مطالعہ کیا۔ فیض کے بقول جب انھیں بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا، چنانچہ وہ اکثر ناول اور کہانیوں کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اللہ کے تحت ہی انگریزی ناولوں کا مطالعہ شروع کیا۔ فیض کا یہ مطالعہ ان کے قید و بند اور جلاوطنی میں اشاعت کے دوران بھی جاری رہا۔ فیض اردو ادب کے علاوہ دنیا کے ادب کے ممتاز اور انقلابی ادیبوں اور

شاعروں کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے مطالعہ میں ادب، سائنس، فلسفہ، سیاسیات، نفسیات، تاریخ اور مذہب وغیرہ شامل تھے۔ فیض ایک من علم سے سو من تخلیق کا کام لیتے تھے۔ فیض کے ادبی مضامین جو "میزان" میں موجود ہیں اُن کے ادبی، ثقافتی اور ترقی پسند نظریہ پر اُن کی گہری واقفیت کی دلیلیں ہیں۔ فیض کا مطالعہ کتابی مطالعہ سے زیادہ مجلسی اور مشاہداتی مطالعہ تھا۔ لاہور کے تین چار گھر جن میں صوفی تبسم، تاثیر اور پطرس بخاری وغیرہ محفلیں سجاتے تھے علم و حکمت کی یونیورسٹیاں بنی جاتی تھیں جہاں علم و دانش کے خزانے لٹائے جاتے اور اُس علمی دولت کو لوٹنے والوں میں فیض بھی شامل تھے۔

تصانیف

شعری مجموعے: "نقشِ فریادی" 1941ء، "دستِ صبا" 1952ء، "زنداں نامہ" 1956ء، "دستِ تہِ سنگ" 1965ء، "سرِ وادیٔ سینا" 1971ء، "شامِ شہرِ یاراں" 1978ء، "میرے دل میرے مسافر" 1981ء، "سارے سخن ہمارے" (کلیات) 1983ء، نسخہ ہائے وفا (کلیات) 1984ء۔

نثری مجموعے: "میزان" تنقیدی مضامین 1962ء، "صلیبیں میرے دریچے میں" (خطوط) 1971ء، "متاعِ لوح و قلم" 1973ء، "مہ و سالِ آشنائی" 1980ء، "انتخاب پیامِ مشرق" 1979ء، "سفرنامہ کیوبا" 1973ء، "ہماری قومی ثقافت" 1976ء۔

ڈراما نگاری: فیض جوانی میں ناٹک دیکھتے تھے، چناں چہ کچھ ڈرامے لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے: (1) "دو احباب" 1930ء میں "راوی" میں شائع ہوا۔ (2) شکست 1931ء کی کوشش تھا۔ (3) سانپ کی چھتری۔ (4) "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے" اور (5) "پرائیویٹ سیکرٹری" لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے۔ یہ ڈرامے "متاعِ لوح و قلم" میں موجود ہیں۔ دو اور ڈرامے "توہینِ عدالت" اور "پنجابی ڈراما" بقول مرزا ظفر الحسن تلاش کے باوجود مل نہ سکے۔

فلمی وابستگی: فیض نے دو فلموں کے گانے اور مکالمے لکھے جو "جاگو ہوا سویرا" اور "دور ہے سُکھ کا دیس" ہیں۔

ترجمہ: "پوئمز بائی فیض" 1957ء میں وی جی کیرنن نے فیض کی شاعری کے انتخاب کا ترجمہ کیا، جو فیض پر انگریزی میں پہلی کتاب ہے۔

☆

فیض مشاہیرِ شعر و ادب کی نظر میں

(پیامی "82" مقولوں کا مجموعہ)

1: آغا ناصر

آج یہاں ایسے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں کہ جن کے نام سے ان کا ملک پہچانا جائے۔ پاکستان کی وجہ سے علامہ اقبال، قائداعظم [illegible] بڑی شخصیات کے برابر [illegible] فیض [illegible] فیض صاحب اپنے ملک کی پہچان تھے [illegible] بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے تعارف کے لیے ان کا نام کافی سمجھا جاتا تھا۔

2: آل احمد سرور

فیض ہمارے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھیں اللہ نے دردِ دل کے ساتھ شعورِ حسن بخشا ہے [illegible] فیض [illegible] ان کی شخصیت کو [illegible] اور ان کی شاعری کو ایک دلکش باب عطا کیا ہے۔

فیض کو [illegible] "نقشِ فریادی" [illegible] شعری مجموعوں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ فیض کی نظمیں "تنہائی"، "موضوعِ سخن"، "رقیب سے"، "مرے ہمدم مرے دوست" [illegible] "مجھ سے پہلی سی محبت" [illegible] فیض صاحب نے [illegible] اعتراض [illegible] ان کا [illegible] اس کے بعد اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا۔ [illegible] فیض کی شاعری [illegible] خصوصیت [illegible] ایک یادگار [illegible] فیض کا تصور [illegible] محبت کا [illegible] فیض کی شاعری [illegible] حسن اور حریت [illegible] ان کی اہمیت اور عظمت مسلم ہے۔ [illegible]

چنانچہ کتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک نقاد کے الفاظ میں، جدید انسان کے ذہنی و جذباتی تہذیب کے کلاسیکی عناصر کی ایک تازہ ترین جلوہ گری ہے"۔

3: ابراہیم جلیس

جو لوگ میرے نزدیک ان کے لیے نہیں اور جو پاکستان یا ہندوستان کی نئی نسل کے لیے ہی نہیں بلکہ کل کرۂ ارض پر بسنے والی ہر ایک نسل کے لیے بھی جدید ترقی پسند عوام میں تیسری دنیا کے ادب اور سیاست کے افق پر نمایاں ستاروں کے جھرمٹ میں فیض احمد فیض جیسی منفرد شخصیت ترقی پسند نسل کے لیے بھی علامہ محمد اقبال جیسی حیات بخش شاعری کا ایک گنجینہ اور رحمت ہے۔

4: ابواللیث صدیقی

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہماری پوری قوم مردہ پرست واقع ہوئی ہے، مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ ہم جو اپنے اسلاف کے مقبروں پر پھول چڑھاتے ہیں وہ کیسے مردہ پرست ہو سکتے ہیں۔ زندگی میں ہم نے غالب کی قدر نہیں کی۔ بے سرو سامانی اور بے حسی حالی کا مقدر تھا۔ ہے خدا کا شکر ہے کہ فیض صاحب کو اس کی شکایت نہ ہوگی لیکن ہمیں ادیبوں اور شاعروں کی قدر دانی اور ان کے کلام و کمال کا اعتراف ایک ایسی روایت ہے جو اگر روایت کا درجہ حاصل کر سکے تو شاید ہمارے فن اور فنکاروں کے حق میں ایک نیک فال ہوگی۔

5: احتشام حسین

فیض نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے سخت رد عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نقطۂ نظر کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔

6: احمد ندیم قاسمی

فیض کو ماضی کی ادبی روایت پر پورا اختیار حاصل ہے۔ وہ فارسی اور عربی اور انگریزی اور اردو کی کلاسیکی شاعری بھی پڑھ چکے ہیں۔ فیض کے ہاں وہ تازہ پن بھی موجود ہے جو معنویت کے ساتھ اس لیے نظر آتی ہیں کہ وہ غالب، داغ، حالی و اقبال کی تازہ کی ہوئی اور بڑھی ہوئی روایت کا احترام کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تراکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور جو لفظ کئی صدیوں سے اپنے اندر کئی جذبات سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچا ہے، فیض کو اس لفظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی استعمال کرنا ہے۔ الفاظ اور اسلوب کی تاریخ کا بھی شعور ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن و معنی کا ایک حسین امتزاج ہے۔
فیض احمد فیض نے اپنے عصری بلیغ اور کیمیا اثر زبان کی ہے اس کی ذات، زندگی ہی میں ایک تحریک، ایک مکتب کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان کے بعد آنے والے کتنے ہی شعرا ایسے ہیں جن کے ہاں فیض کے اسلوب لہجے اور ان کی مخصوص لفظیات کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ اقبال، جوش اور فراق کے بعد فیض سے زیادہ شاید ہی کسی شاعر نے اپنے معاصرین کو ذہنی طور پر اس حد تک متاثر کیا ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فیض انسانی معاشرے میں ایک مکمل انقلاب کے داعی ہیں مگر ان کے ہاں انتہا پسندی نہیں

گھٹن کو رنج کے بجائے ایک نشاطی تبدیلی کا سا انداز ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور اور خوب صورت بنانے کے لیے شاعری کو ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ مگر عجیب ہے کہ جہاں ان کے یہاں جس بھی چند موضوعات کی پیوست راہ دیتے۔ ان کی شاعری نظموں کی شیرینی پر جشن ہی کی سی مثال ہے۔ مگر یہاں سے بالعموم ان کی بات آتی ہے۔ فیض قلم و صحت کی کہانیوں سے شاہ مغموری حد پر گریز کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں انقلاب ان کے ہاں ایک آہنگ میں ڈھل گیا ہے۔ اسی طرح وہ فکری شاعری کو بھی تیز جمالیات کا ایک عنصر بنا دیتے ہیں۔ ایک ترقی پسند مصنف کی حیثیت سے مجھے تیس برس سے فیض کی رفاقت حاصل رہی ہے اور میں اسے اپنا ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر اختر انصاری

فیض احمد فیض اور ن م راشد کی نظموں کے مجموعے "نقش فریادی" اور "ماورا" حال میں شائع ہونے والی کتابوں میں بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں شاعر اردو شاعری کے جدید ترین رجحانات کے نمائندے ہیں۔

فیض اور راشد دونوں اس معنی میں نئے شاعر ہیں کہ انہوں نے اپنا منفرد رنگ اختیار کرنے سے پہلے بہت کچھ اسی پرانے رنگ میں کہہ چکے ہیں جو آج سے دس سال پہلے اردو کی تغزلیہ شاعری کا عام رنگ تھا۔ یہ بات راشد پر زیادہ صادق آتی ہے کہ ان کی نظمیں اس زمانے میں بھی اردو رسائل کے بے حد زینت ہوتی تھیں جس زمانے میں جوش، حفیظ اور اختر شیرانی اردو نظم کے جدید ترین رجحانات کے علمبردار تھے۔ فیض لکھتے تو تھے لیکن بعد میں لکھنا شروع کیا ہے اور یقیناً راشد کے بہت بعد مشہور ہوئے ہیں۔ "نقش فریادی" میں اور "ماورا" میں دونوں شاعروں کی پرانی تخلیقات کے نمونے موجود ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ "نقش فریادی" میں فیض کے پرانے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں، نئے رنگ کی چیزیں کم ہیں، اور "ماورا" میں راشد کے نئے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں پرانے رنگ کی چیزیں کم ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ن م راشد کی شاعری نے اپنے ارتقا کی منزلیں بہت آہستہ آہستہ طے کیں اور فیض کی شاعری نے ایک عرصے تک ایک خاص روش پر قائم رہنے کے بعد یکا یک ایک جست میں قدم آگے بڑھایا اور فوراً ایک نیا اور دیرپا رہنے والا انداز اختیار کر لیا۔

فیض کی شاعری میں یہ اچانک تبدیلی جو 1938ء یا اس سے کچھ پہلے واقع ہوئی، نتیجہ تھی ترقی پسند تحریک کے اثرات کا۔ تقریباً اسی زمانے میں راشد نے بھی اس تحریک کا اثر قبول کیا۔ مگر یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے راشد کو محض ترقی پسند بنایا (وہ ایک بڑا شاعر پہلے ہی تھا) مگر فیض کو اس تحریک نے ترقی پسند بنایا اور بڑا شاعر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ اگر راشد ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کے بعد بھی اپنے ابتدائی دور کے رومانی و فراری رجحانات سے پورے طور پر آزاد نہیں ہو سکا ہے تو فیض (اپنی نئی نظموں میں) ترقی پسندانہ نظریۂ شعر کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

ابھی چاک نے دامن دل بے قدروں کے نام

ماضی روح کی تحریک دی، شاعر کے جذبے کا احساس تھوڑا سا ہے کہ خارجی اور داخلی احساس ایک ہو جاتے ہیں اور فطرت اور انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "موضوعِ سخن" میں یہ شعر:

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

اس ایک شعر میں رمزی تعبیر کی وہ تہ ہے جو مشرقی شاعری کی روایات معاشقہ کی صدیوں آباد ہیں۔ کتنی باتیں ہیں، کتنے رنگ ہیں، کیا صدیوں کا تہذیبی جمالیاتی تجربہ اس شعر کے باطن سے جھلکتا ہے۔ یہ غالباً فیض کا بہترین شعر ہے۔

8: اراکین انجمن مصنفین عوامی جمہوریہ چین

دل سے آپ کی رہائی پر ہم سب نے خوشی محسوس کی۔ یہ ہمارا اطمینان کا سانس لینے پر دلی مبارک باد۔ پاکستانی ادب کے ایک ادیب کی جدوجہد اور ایشیائی مصنفین کے درمیان دوستانہ تعلقات کو مستحکم بنانے پر فخر کرنے کے لیے ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

9: اطہر رضوی

مجھے یاد ہے میں کراچی کی شاہراہ فیصل پر گاڑی میں سفر کر رہا تھا کہ ایک بڑے ٹیپ سے اقبال بانو کی دل کش آواز پیدا ہوئی۔
ریکارڈنگ تھی: دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں......
مجھے یاد ہے ٹیپ ختم ہو گیا۔ مگر میں اپنی گاڑی میں ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ کتنے برسوں سے فیض کی شاعری اور ان کی نظموں کے زوال، حسن اور حقانیت سے متعلق سوچتا رہا۔

- مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
- چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
- دیوارِ شب اور عکسِ رخِ یار سامنے
- یہ شب ہم پہ بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
- یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

فیض کے افکار، نظریات، فلسفۂ حیات اور اعتقادات سے قطع نظر، جو ایک جداگانہ مکتبِ فکر ہے، میرے نزدیک ان کی شاعری میں اردو زبان کی ہمہ گیریت، لطافت، حسن اور خوبصورت الفاظ کا برمحل استعمال نظر آتا ہے جیسے قوسِ قزح کے ہفت رنگ دائرے میں سات رنگ۔ اگر کہوں، فیض کی غزلیات میں مجھے میر اور کبھی ناصر کاظمی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور ان کی نظموں میں مجاز کی "آوارہ"، ن م راشد کے "حسن کوزہ گر"، مخدوم کی "آوارہ"، مجید امجد، سردار جعفری کی "نغمہ" اور شوکت آفریدی کی "یہ مری" مجھے جھلکتی ہے۔ جہاں جہاں نظر آتی ہے ان سب میں ایک لطیف کرب اور ایک گداز (Pessimism) ہے۔
فیض کی شاعری کی لطافت اور جاذبیت اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے گی۔

10: افتخار عارف

فیض احمد فیض قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ہماری زندگی میں ایک Legend کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت شاعر، نقاد، مدیر، ٹریڈ یونین لیڈر، سب ان کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں اور یہ ساری جہتیں ہماری تہذیبی اور قومی زندگی میں ایک مثالی شناخت رکھتی ہیں۔ ہمارے دور میں فیض احمد فیض مجبوروں، مظلوموں اور محروموں کی حمایت کرنے والے ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے، امن اور آزادی کے ترجمان کی حیثیت سے اور ساری دنیا کے انسانوں سے محبت، پیار اور انسان دوستی کے آدرش کی حیثیت سے ایک علامت بن گئے تھے۔ وہ ساری دنیا میں Progressive thought کے نمائندوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا نام ہر سطح پر ان کے

ساتھ لیا جاتا تھا۔ جنہوں نے زندگی کی کئی دہائیاں ان کے نیاز مند کی حیثیت سے گزاری ہیں۔ نتیجتاً جہاں کہیں بھی کوئی محفل ہوتی لوگوں نے ان کا ذکر نہایت احترام اور عقیدت سے کیا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے جو ان کو نظر بھر کے دیکھ لیتے ہیں ان ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ فیض صاحب کی پوری شخصیت میں سمائی تھی۔ ایک بار جو ان سے ملتا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بہت قریبی عزیز و اقارب اور عقیدت مندوں کی تعداد بہت بڑی ہے جو بھی ایک بار ان کی محفل میں گیا وہ عمر بھر کے لیے انہی کا ہو رہا۔ Legends and Myths کا ایک کمال یہ ہے کہ اگر ایک بار قائم ہو جائیں تو پھر اگر کوئی ہزار دفعہ ان کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پاتا۔ عالمی ادبی حلقوں میں انہیں ایک انقلابی، آزادی پسند اور ترقی پسند ادیب کے طور پر یاد کیا جاتا تھا اور پاکستان میں بھی روایتی نظریاتی قیادت کے ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس بات سے واقف کم ہیں کہ جب بھی ان کے نظریاتی نظریے کے خلاف صف آرائی ہوئی تو سب سے زیادہ اتنا تنہا بھی کی ذات ہوئی تھی۔

11: اکرام بریلوی

فیض کی شاعری میں اپنی جدت طرازی اور بانکپن ہے جس سے نئی سوچ نکلنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں کے آگے نئی جہتوں کی طرف آ جاتی ہے اور یہ ایک ایسا عنصر ہے جو ان کی شاعری کو حزنیہ (Morbid) یا قنوطی (Melancholic) نہیں ہونے دیتا بلکہ ان کے ہاں ایک انقلابی تحریک (Revolutionary Movement) کی صورت اختیار کر گیا ہے جس میں خیال خود شناسی کا جذبہ بن کر آگے بڑھتا اور زندہ رہنے پر اکساتا ہے۔

12: الطاف حسین قریشی

فیض صاحب کے خیالات اور ان کے مقاصد سے ہزار اختلاف سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے سوچ کی نئی راہیں نکالی ہیں۔ اظہار و بیان کے نئے سانچے تراشے ہیں اور ان کے کلام کی شوخی اور شگفتگی نے کتنے ہی دلوں اور ذہنوں کو مسخر کیا ہے۔

13: انتظار حسین

فیض 'ہجر' کے تجربے کو بستیوں کے لیے وحشت و دہشت کا سامان بنا دیتے ہیں۔ ایک اچھی بستی میں درخت ہوا ہی کرتے ہیں اور ہونے چاہئیں لیکن اگر بستی کے بیچ کوئی 'ہجر' کا درخت ہو تو ویران نظر آتا ہے۔ وہی بستی پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ فیض صاحب بھی ذکر کرتے کرتے اس مقام پر آ پہنچے ہیں کہ 'ہجر' کا درخت لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں لکھنے والوں کی تخلیقی فراخی یہاں ہوتی ہے۔ آپ ذرا اردگرد نظر ڈالیں، فیض صاحب کے ہمعصروں میں کتنے ہی ایسے ہیں کہ پتے جھڑ چکے ہیں مگر تنے کھڑے ہیں۔ انہوں نے کسی نے 'سرِ وادیٔ سینا' کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے اور پھل پھول سے لدا رہا۔ یہ بڑی بات ہے ہمارے ادب کے حق میں ایک نیک فال ہے۔

14: اندر کمار گجرال

بلاشبہ فیض برصغیر ہند و پاک کے ممتاز اور محبوب شاعر ہیں۔ بے شک یہی فیض ہیں جو اُن چند ایک شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی تخلیقات نے عہد حاضر کے ادب میں ایک جگہ بنا کر اردو زبان کا نام روشن کیا ہے۔

15: انجم اعظمی

فیض نے یہاں آہستہ روی سے زندگی کی خوابناک کیفیتوں کا عکس اس کے مصرعوں میں جھلکتا ہے۔ اس کی انقلابی شاعری بھی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کا ایک پیمانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت حساس شاعر کے کانوں میں گویا وہاں سے چپکے چپکے کچھ سرگوشی ہو رہی ہو، جب نئی زندگی کے نئے منظر آنکھوں کے سامنے آئے تو ان میں وہ اپنے خوابوں سے مختلف ہونے کا احساس ایک درد ناک رنگ سے دیکھنے لگا۔ پہلے اس کا غم احساس کی ایک منزل تک تھا... تم کہیں آئیں...... پھر اس احساس کو ایک نئی علامت مل گئی...... جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔

16: انیس اے رحمٰن

فیض احمد پاکستان کے ادبی حلقوں سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی غنائی اور الہامی کیفیتیں جو شاعری کی جان ہیں ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لیکن آج کل کی نئی تحریکِ نظم طرازی کے رہنما تسلیم ہونے کے باوجود ان کے ہاں ترقی پسند خیال کا وہ گہرا رنگ ہے جو ان کی شاعری کے بعض حصوں میں ادبی طلسم پیدا کر دیتا ہے۔

17: پیر علی محمد راشدی

فیض کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ جو کچھ اس پر بیتی اس کے باوجود اس کی انسان سے محبت کم نہ ہوئی۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس نہ ہوا۔ اس کو کوئی شکوہ نہ تھا۔ محبت اور انسان دوستی اس کا عقیدہ تھا اور وہ کسی حال میں اس سے منحرف نہیں ہوا۔ جیل ہو، دیارِ غیر ہو، اس کی زندگی کا اصول رہا۔

18: تحسین الاسلام سید

غزل کا حکایت سے اظہار کا سب سے پہلا اور دل آویز پہلو ہے۔ فیض کی غزل میں جو کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے، وہ صرف استعارات، تشبیہات اور اشارات، علامات کی نئی تراش خراش تک ہی محدود نہیں بلکہ وہاں علامتوں کی پوری فضا بھی ملتی ہے۔ اردو غزل میں فیض کی انفرادیت اس امر میں ہے کہ وہ مضمون کے اعتبار سے اور معنویت کے اعتبار سے جدت طراز ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کے کلاسیکی معیار کو بے پایاں برقرار رکھتے ہیں اور اسے فن کارانہ مہارت اور اجتہادی صلاحیتوں کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

19: تلوک چند محروم

جناب فیض احمد فیض کی ادبی خدمات کے متعلق تحریر کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اردو شاعری کے دورِ جدید میں فیض کا نام ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کے کلام کی جس قدر اور جس طریقے سے قدر افزائی کی جائے لائقِ تحسین و ستائش ہے۔ افکار کا فیض نمبر ہندوستان، پاکستان اور ادبی دنیا میں یقیناً مقبول ہوگا۔ میری ناچیز رائے میں اس شعر کا ایک قطعہ 27 اپریل 1956ء کی تاریخ کے ساتھ منظوم ہے۔ یعنی فیض کا یہ قطعہ ان کی نذر ہے، وہ قطعہ حسبِ ذیل ہے:

کلام فیض مثال نگاہ گوشِ چشماں
نوائے ساز بھی ہے وہ فریب راز بھی ہے
ملے تو کیوں نہ دلِ اہلِ فکر میں جا اس کو
کہ دل نواز بھی ہے اور دل گداز بھی ہے

20: جمیل جالبی

فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کے خیالات کی ہم آہنگی، شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔

21: جعفر علی خاں اثر لکھنوی

"فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل کی متانت سے جو جوہر دکھائے ہیں اور معصومیت کو جس طرح نبھاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول ایک طلسمی قصر میں مست ہو رہا ہے ایک ہا ہو کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اور قوسِ قزح کے رنگ [illegible] سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے۔ بالکل ایسا منظر جیسے ایک شاعر کو صبح کرتے ہوئے [illegible] دیکھا ہو۔ پانی ہر طرف [illegible] اور سامنے پہاڑی پر ایک قوسِ قزح [illegible] ایک بزم [illegible] اور ان سب کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے آسمان پر ایک بڑی آب و تاب کی قوسِ قزح۔"

22: جوش ملیح آبادی

فیض کو میں ایک زمانہ دراز سے جانتا ہوں۔ یعنی اس وقت سے جب کہ فیض ایک طالب علم تھے...... یہ غالباً 1924 یا 1926 کی بات ہے کہ فیض نے مجھے لکھنؤ سے نکلا ایک نظم سیاسی مشاعرے میں بھیجی تھی اور آج کا دن ہے میرے تعلقات اُن سے نہایت خوشگوار رہے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے اُن کے خوشگوار تعلقات بدستور قائم ہیں بلکہ روز بروز ترقی پر ہیں۔ یہ غالباً 1930ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ فیض نے ایک سیاسی اختلاف کی بنا پر ان کی ایک نظم پر ایک طرح کی تنقید کی تھی جسے فیض نے [illegible] تھا مطلع کیں [illegible] صاحب اس لے اڑے تھے اور اب معلوم ہوا ہے کہ ان صاحب سے [illegible] کے خدمات بے حساب ہیں [illegible] ایک [illegible] کا فیض کسی اچھے یا اصلی [illegible] سے نہیں بچا ہے۔

فیض کے مزاج میں اُن کے کلام کی طرح ایک نرمی اور ایک سنجیدگی پائی جاتی ہے...... اور ان کے تبسم میں ایک خصوصیت کی جھلک آج بھی موجود ہے۔ ادب دنیا کی سیاست کے متعلق نہیں [illegible] ایک دوسرے کو بھلا کہتے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں...... میں نے اپنی تمام عمر میں صرف تین چار شاعر ایسے دیکھے ہیں [illegible] اور مجھ کو ایک ناسخ کو آسمان کی طرح اس بات کے اظہار سے مسرت ہوتی ہے کہ ان چند افراد میں ایک فیض بھی شامل ہے [illegible] فیض کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ ہمارا دل اب سامنے پھیلا ہے [illegible] کے بازو اتنے لپیٹے ہوئے ہیں [illegible] قریب ہو تے [illegible] کرتے ہیں اطمینان سے ہوں گا اور فیض اس بات پر کہ اردو ادب کے ایک طالب کو پیچھے چھوڑ کے جو بادلوں اور [illegible] کا نام ہے فیض۔

اللہ ان کی عمر دراز کرے اُن اور نہال کے دروازے ان پہ کھول دے، اور رفتہ رفتہ اُن کو آسمانِ ادب کا ایک ایسا آفتاب بنا دے جو کبھی ڈوبنے کا نام بھی نہیں لیتا۔

23: حسن کمال

اپنے عہد پر نظر ڈالتا ہوں تو دو تین ہی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جن سے نہ صرف اردو کی محفل میں آب و تاب ہے بلکہ زمانے کی شاعری دنیا کی بڑی شاعری سے آنکھیں ملا رہی ہے۔ ان دو تین شعرا میں فیض کا نام بھی ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جب شاعر کی شاعری اور اس کی ذاتی زندگی اس طرح گھل مل گئی ہو کہ دونوں کو جدا کرنا ممکن نہ ہو۔

آزادی کے بعد اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے فیض جیسا اثر قبول کیا ہو۔ فیض کی شخصیت بھی دلکش ہے اور شاعری بھی۔ ان کی منکسر المزاجی، ان کا علم، ان کے تجربات زندگی اور انسان کے بہتر مستقبل کے لیے ان کی قربانیاں ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہیں۔ فراق اور اختر الایمان کے علاوہ ہندوستان کا کوئی شاعر نہیں ہے جس کی شاعری فیض کی اونچائیوں کو چھونے کی جرأت کر سکے۔

24: خدیجہ بیگم

فیض صاحب کی امن پسند طبیعت اور صلح آمیز مزاج دیکھ کر ان کی باتیں کرتے ہوئے حیران ہوتی ہوں کہ یہ ترقی پسند باغی شاعر تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص دوست سے زبانی اختلاف تک سے گریز کرتا ہے سماج اور نظام سے کیسے لڑ سکتا ہے۔

25: خلیق انجم

فیض احمد فیض علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے بعد اس صدی کے سب سے زیادہ مقبول اردو شاعر ہیں۔ بیسویں صدی کے جن اردو شاعروں کو بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں غالب اور علامہ اقبال کے بعد فیض کا نام آتا ہے۔ ان تینوں کی وجہ سے اردو جیسی کم عمر زبان دنیا کی اہم ترین زبانوں کے نقشے پر آ گئی۔ دنیا کا بڑا حصہ انھی حضرات کی وجہ سے اردو زبان اور اس کے تخلیقی ادب سے واقف ہوا۔

ہندوستان کی غلامی کے دنوں میں ترسیل و رسائل پر بے حد وسیع سامراج کا قبضہ تھا اس لیے غالب اور علامہ اقبال کی آواز ہندوستان اور پاکستان کے آزاد ہونے کے بعد ہی غیر ملکی سرحدوں کو پار کر سکی۔ فیض صاحب کی زندگی کے آخری 37 برسوں میں صورت مختلف تھی۔ ہندوستان اور پاکستان آزاد ملک تھے۔ غالب اور علامہ اقبال کو مرنے کے بعد جو شہرت نصیب ہوئی وہ فیض کو اپنی زندگی میں حاصل ہو گئی۔

فیض کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں برابر مقبولیت حاصل رہی ہے۔ وہ غیر منقسم ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ تقریباً 35 سال ہندوستان کے شہری رہے۔ اس لیے یہاں بھی ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگوں میں ان کے چاہنے والوں، مداحوں اور دوستوں کی بہت بڑی تعداد رہی۔ وہ پاکستان کے پہلے شہری ہیں جنھیں ہندوستانیوں نے جغرافیائی حدود اور سیاسی مصلحتوں سے الگ رکھا۔ دہلی میں ہندوستان کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور پاکستان کے جنرل ایوب خان کی ایک کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی، اس میں فیض اپنے روایتی احترام کے ساتھ داخل ہوئے تو تمام ہندوستانی صحافی اُن کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اس سیاسی کشیدگی کے زمانے میں ہندوستانی صحافیوں کا ایک پاکستانی شاعر کا اس طرح ادب و احترام کرنا غیر معمولی بات تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر کمرے میں بیٹھے ایک روسی

نے کہا کہ ہندوستانی اور پاکستانی شاعری اور موسیقی کے پردے میں نفرت مٹائی جا سکتی ہیں۔"

26: راحت سعید

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے ایک نابغہ روزگار اور عہد ساز شاعر تھے۔ فیض کی ساری عمر اور زندگی انسانیت کے لیے مرہم اور دوا مہیا کرنے، مظلوموں کے لیے ظالموں سے تیغ آزمائی کی جرأت والے، خوش گوار مستقبل کی نوید سنانے اور جیتی جاگتی آنکھوں اور ان کی خوشحالی میں گزری۔

انھوں نے شعر و ادب کی سمت اس کی تعریف سے وابستگی انجمن ترقی پسند مصنفین سے عہد استوار کیا۔ فیض نے ادب میں ترقی پسند فکر، سیاست میں عوامی حکمرانی اور معیشت میں سوشلزم کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی پر قائم رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے دوستی کے تمام لوگ سے مختلف ہوئے اور ان کی پاداش میں کئی مرتبہ جیل بھی گئے لیکن نہ اس سے تائب ہوئے اور نہ کبھی ان کے پائے استقامت میں لغزش آئی۔

پاکستان میں چونتیس سال کی طویل پابندی کے بعد بحال ہونے والی تحریک انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان نے 2011ء کو فیض کی پیدائش کی صدی کے طور پر عالمی سطح پر جشن منانے کا اعلان کیا اور سیکرٹری جنرل جناب حمید اختر کی رہنمائی میں اس ضمن میں متعدد پروگرام منعقد کیے۔ یہ "فیض فہمی" کے مصنف، مؤلف اور مرتب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خواہش پر تحریر کیے گئے ہیں اور ان کا نام ... اس شاندار کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد ڈاکٹر صاحب کو ملنی چاہیے۔

27 رانا محمد ساجد (امریکہ)

فیض کسی دور کا شاعر نہیں بلکہ ہر دور کا شاعر ہے۔ یا سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب ... مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا۔ یہاں آنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ فیض خود ایک ادارہ ہے۔ جسے اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ فیض کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ فیض ایک عظیم انسان ہے اور مجھے ان کی دوستی کا شرف حاصل ہے۔

28: رائے معصوم رضا

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر فیض کے یہاں سے غالب کے دو شعر نکال لیے جائیں تو فیض کے یہاں کچھ نہیں بچتا۔ وہ دو شعر یہ ہیں:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ فیض کی شاعری میں ان دونوں شعروں نے بڑا حصہ لیا ہے لیکن یہی دو شعر تو جنگ آزادی کی ترقی پسند شاعری میں چھپے ہوئے ہیں لیکن فیض کی شاعری سے ہم یہ دو شعر نکال دیں اور ان کا کام شروع کرتا ہے تو ہم صرف فیض ہی کیوں ان کو لیے کہ لیے کس کے یہاں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ غالب کے یہاں سے ہیولی تعمیری اور

میر تقی میر کو نکال دیں تو کیا بچے گا؟ اگر سردار جعفری کے یہاں سے اقبال، اختر، جوش، پھر بھی ... آدھا کان اور باقی ... کو نکال دیں تو کیا بچے گا؟ بچے گی خواب کی آواز، بچے گا سردار جعفری کا لہجہ، بچے گا فیض کا خوشگوار اسلوب... بچے گی دو مصرعوں کے بیچ کاٹی اور دبی آواز... اور یہ آواز قابل قدر ہے۔

29: رشید احمد صدیقی

میرے نزدیک ترقی پسند غزل گویوں میں جگر، فراق اور فیض ہی ایسے ہیں جنھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی خوبی اور وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ گو میں کچھ اس طرح بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ اضافہ اتنا ترقی پسندانہ نہیں جتنا شاعرانہ، عارفانہ یا عاشقانہ شاعرانہ ہے۔ فیض نے غزلیں نسبتاً کم کہی ہیں۔ فیض کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی بہترین نظموں کے اہم پہلو کہی جا سکتی ہیں۔ عجب نہیں کہ جب وہ غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی خوبیاں اور زیادہ نکھر اور سنور کر ان کی غزلوں میں آ ملتی جاتی ہیں۔ یہی بات میں نے اقبال کے بارے میں کہی تھی۔

فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک اشتراکی ہیں لیکن غزل کو جو درجہ و مقام جیسا فیض نے پہچانا ہے ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہیں پہچانا۔ فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی آلائشوں کو کم سے کم ... غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔

غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھنے سے فیض بجائے اشتراکی یا ترقی پسند کے ... ہو گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ شاعری میں موضوع کو اس طرح برتنا کہ شاعری موضوع اور موضوع شاعری معلوم ہونے لگے بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے۔ جب تک کوئی شاعر ایسا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا وہ بڑا اچھا شاعر نہیں کہلائے گا۔ ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسر ہو۔

فیض کو میں نے غالب اور اقبال کے قریب بتایا ہے لیکن ایک چیز مجھے کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ فیض کو زبان پر اتنی قدرت حاصل نہیں ہے جتنی اقبال اور غالب کو تھی۔ صحت زبان کو اردو شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے فیض نے اس کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی ان کی شاعری کا تقاضا ہے۔

30: سجاد باقر رضوی

فیض کی انفرادیت کا شدید احساس یوں ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ادبی ماحول میں ہمارے اوسط شعرا کی محفل میں چپ چاپ الگ بیٹھا رہتا ہے وہ نئی پود کے انداز میں کہتا ہے اور نئی پود کو اپنے انداز میں۔

فیض کی جمالیات جس کے ضمن میں لکھتے ہیں: "وہ نقاد کے نزدیک حسین تصویر کھینچتا ہے۔"

31: سجاد ظہیر

فیض کے نام جو خطوط ہیں "نقش فریادی"، "دست صبا" اور "زنداں نامہ" کے شائع ہونے کے بعد ہم ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیق جو ابھی نہیں ہوئی ان کے پچھلے مجموعوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اور ... قدر ہوگی۔

32: سردار جعفری

فیض بڑے شاعر ہیں۔ اگر اس کا معیار یہ ہے کہ ان کی شاعری بے حد حسین ہے تو یقیناً کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ فیض بڑے شاعر ہیں کہ انھوں نے نئے Images دیے ہیں، نیا انقلابی آہنگ دیا ہے اور ان کے اس انسانیت کی جدوجہد کے آہنگ میں پورے ایشیا، پورے عرب اور پوری دُنیا کی تحریکِ آزادی شامل ہو جاتی۔ فیض سے اُردو میں ایک نئے دبستانِ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کا حسین امتزاج ہے جس نے اُردو شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

33: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

پنجاب کیا پوری اُردو شاعری میں کلام کی اتنی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے۔ اُن کا مجموعہ کلام مختصر ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ فن کاری اور ندرتِ تخیل کا اتنا حسین امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہ و استعارے کے شعری صورت میں پیش کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے۔ اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو اُن کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے۔

34: ڈاکٹر شارب ردولوی

فیض کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کے کلام میں لفظ کا تخلیقی استعمال ہے۔ الفاظ کو نظم کر دینا، خیال، محسوسات، تجربات اور مشاہدات کو خوب صورت پیرایے یا مترنم انداز میں پیش کر دینا الگ بات ہے۔ ہر عہد میں شعرا اپنے جذبات اور محسوسات کو پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک عام شاعر لفظ کو اُس کے معنی اور لغت کے حدود میں نظم کرتا ہے۔ اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ بات زبان اور محاورے کے خلاف نہ ہو لیکن ایک عہد ساز شاعر کے یہاں لفظ لغت کے دائرے سے نکل کر ایک وسیع دُنیا بن جاتا ہے۔ اُس کے یہاں الفاظ اور استعارات کے معنی اُس کے تخلیقی استعمال سے متعین ہوتے ہیں۔ بیدل نے کہا ہے۔

زبانِ درد دل آساں نمی تواں فہمید
شکستہ اند بصد رنگ شیشۂ ما را (بیدل)

درد کی زباں کو آسان نہ سمجھ۔ میرے شیشے کے ٹوٹ جانے سے اس میں سیکڑوں رنگ پیدا ہو گئے ہیں۔ اُردو میں میر اور غالب کے اشعار اپنے خیال کی وسعت اور لامحدود معنویت کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح فیض کے یہاں لفظ کے تخلیقی استعمال نے شعر میں بیدل کے شکستہ شیشے کی طرح اُن گنت رنگ بھر دیے ہیں اور نہ جانے کتنی جہتیں پیدا کر دی ہیں کہ عام الفاظ سے ترتیب پایا ہوا شعر اپنی معنوی تہ داری کی وجہ سے لطف کا حامل بن جاتا ہے۔

35: شان الحق حقی

فیض کی شاعرانہ شخصیت کی ترکیب جن عناصر سے ہوتی ہے، مثلاً جن عناصر سے اُس میں وزن و وقار پیدا ہوتا ہے وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ وہ جذباتی طور پر روایت کی

گرفت میں رہے ہیں اور فکری صورت پر روایت سے آگے شاعرانہ تخلیق میں جذبات فکر پر حاوی رہے ہیں۔ فیض نے ان میں توازن قائم رکھا ہے۔

فیض کے ہاں سیاسی افکار اس طرح در آتے ہیں جیسے کہ دوسرے اساتذہ دعا یا نعت، حمد، نعت و منقبت لکھتے تھے۔ ان کے کلام میں ان کا فطری فلسفہ اس طرح گھلا ملا پڑا ہوا لگتا ہے جیسے کہ اقبال کے ہاں ملتا ہے کہ وہاں کوئی گرہ ہے حتیٰ کہ فیض کا ایک نظریۂ حیات۔ ایک مقصد، ایک لگن ہے کہ شاعری میں روح بن کر سما گئی ہے۔ تمام ادب میں ادب برائے حیات کی سب سے نمایاں مثال اگر کوئی ہے تو فیض ہے۔

36: شریف رزمی

فیض کا سرمایۂ کلام بڑا مختصر ہے جسے کسی طرح بھی اس کی علامت نہیں کہا جا سکتا۔ کسی شاعر کی عظمت کا انحصار صرف کلام کی کثرت پر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں غالب کا وہ مقولہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے جو انہوں نے آموں کی بابت کہا تھا کہ میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں۔ ادب کے معاملے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کی کمی فن کار کی قدر و قیمت پر اثر انداز ہوتی ہے۔

37: شورش کاشمیری

فیض ادبی رتبے کے اعتبار سے تو کاشمیری کے ہم رتبہ ہیں ہی لیکن شاید ادبی اعتبار سے بھی ہم رتبہ ہی ہیں۔ قامت کشیدہ، فریادی، چہرہ سرخ و سپید، رنگ سرخ و سپید، آنکھیں ساغر کو سب ہاتھوں سے لے کر پیتا ہیں۔ شعر نے کلام کا مدہوں اور گویا روح چین زود جائے محفل۔ انہیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" لکھ رہے تھے۔ کئے ایک بے جھجک، مجلس آرا، مجلس نواز، اندر ہی اندر سلگنے کے عادی۔ پہلے پروفیسر تھے، پھر ملٹری میں چلے گئے، اور وہاں تعلقات عامہ کے عسکری دفتر میں لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے۔ جنگ کے خاتمہ پر ملازمت سے سبکدوش ہوتا چاہا۔ ادھر پاکستان بن گیا تو پاکستان ٹائمز کے مدیر ہو گئے۔ چند سال ہوئے راولپنڈی کے مبینہ سازش میں دھر لیے گئے تھے۔ زنداں و بند کے ایام گزار آئے ہیں۔

عشق آتش و بیداد ہے صدق مری زنجیر کو

چہرے پر پریشان، آنکھوں میں سوچ، ہونٹوں پر حسرت، باتوں میں انفعال، فکر بر طرف، بیان تو عرض شگفتہ، چند شعراء کے امام، شاعری میں نئی اصناف اور نئے تجربوں کے راہی، فیض احمد فیض

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

38: شوکت صدیقی

ایک زمانہ تھا جب شیراز اور اصفہان سے آنے والے حافظ و سعدی کے اشعار لاتے تھے مگر ہمارے دور میں فیض احمد فیض ایسا جو بیروت، لندن، یا ماسکو سے واپسی پر اپنی شاعری کو سب سے عمدہ اور اعلیٰ سوغات لاتے تھے اور اپنی تازہ ترین منظومات ساتھ لاتے

تھیں اپنے سر تھوپ رہے تھے۔ انہیں وہ حزن کے ملے جلے اور الم لوگ عوام خواص تجربے کے طور پر اپنی آنکھوں سے لگتے اور انہیں سختی سنانے کے لیے ہم آزادی ہی ہوتی تو شاعری نشہ انگیز اور نشاطیہ ہو جاتی۔

39: شمیم حنفی

فیض کی شاعری اپنے قاری سے جو رشتہ قائم کرتی ہے وہ فکر سے زیادہ احساس کا رشتہ ہے۔ اسی لیے تعقلاتی (Conceptual) سطح پر اشتراکی فیض سے آگے ہیں اور راشد کے یہاں بہت نمایاں طور پر اپنی انا کا سایہ بڑا دکھائی دیتا ہے۔ سیاسی زندگی کی بے حجاب آمیزش کے باوجود کیفیت جس کا انحصار فیض کے تجربوں کی نرم آثاری پر ہے ان کے کسی بھی معاصر کے یہاں اس حد تک نمایاں نہیں ہوئی۔ اس سے فیض کے معاصر شعری منظرنامے پر نظر ڈالتے وقت ہمیں اپنے آپ کو اس خطرے سے شاید نہیں بچا سکتا کہ اس دور کے نمائندہ ممتاز ترین شعرا اختر الایمان، میراجی، مجید امجد، فیض میں تقریباً ہر ایک کا رنگ مختلف ہے اور ان کا آپس میں موازنہ کرنا اور ایک دوسرے کے حساب سے ان کے مرتبے کا تعین کرنا معقول بات نہیں ہے۔ ایک ہی عہد کی فضا میں سانس لینے والے شاعر ایک دوسرے کی روز میں تبدیل ہوتے دکھائی نہیں ہوتے، خصوصاً کسی وقت جب ان کی تخلیقی سرشت نمایاں ہو جاتی ہو۔ ان کے ادراک اور تجربے ایک دوسرے سے مماثل ہوں۔ مگر اگر فیض کے شعری منظرنامے کی مجموعی تصویر ذہن میں مرتب کی جائے تو اس کے دائرے میں مختلف جہتوں کا (پاکستانی اور ہندوستانی) ادب اور دنیا کا وہ ادب بھی آ جاتا ہے جو عالمی سطح پر باطنی وابستگی کا احساس رکھنے والے تمام ادیبوں کی مشترک میراث ہے۔ لورکا، لوئی آراگاں، نیرودا، ناظم حکمت، جیسے شاعر اپنی اپنی فنی ترجیحات کے لحاظ سے ایک ہی تحریک کی آواز میں ہر لحاظ ایک دوسرے کے ہم سفر بھی کہے جا سکتے ہیں۔ فیض کا اپنے زمانے کے اردو شاعروں میں ایک امتیاز یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ان کی شاعری بھی ہونے کی کسی نہ کسی صلاحیت سے عبارت ہے اور جس شعری ذوق میں جان ہے وہ شعر یا منظر اور کیفیت کو جھلکاتے ہیں، اس میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

40: شیر محمد حمید

فیض مختلف مزاج کے سب سے صحیح پسند آدمی ہیں.......... میں نے فیض کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا، نہ کبھی کسی کا شکوہ و شکایت کرتے سنا ہے۔

41: صدیق الرحمن قدوائی

فیض کی شاعری ترقی پسند Communism کے قائل ہیں اور تخلیقی عمل میں نظریے کی پابندی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کو پڑھتے وقت ان کے نظریے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فیض کی تخلیقی زندگی "نقش فریادی" کے دوسرے حصے سے شروع ہوتی ہے۔ "دست صبا" اور "زنداں نامہ" میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔ اس کے بعد اس میں ایک ہمواری کی کیفیت آ گئی ہے اور بعض اوقات وہ خود کو دہراتے ہوئے ملتے ہیں۔ Commitment تو قائم رہتا ہے مگر اس کے اظہار میں وہ شدت اور ندرت نہیں رہتی جو "سیاسی لیڈر"، "کتے"، "صبح آزادی" جیسی نظم سے شروع ہوا تھا اور پھر "دوستی"، "ایرانی طلبہ کے نام"، "نثار میں تیری گلیوں کے"، "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں"، "زنداں کی ایک شام" اور "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" تک ہے۔ "دست تہ سنگ"، "شام آئے آئے"، "شوق اور انقلاب"

کی دنیا بھی ختم ہو چکی ہے۔ اب مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ جیسی نظم کہیں نہیں رہتا۔ تل کر گر میرے پاس ہو اور "ملاقات" جیسی بے مثال نظمیں آتی ہیں جہاں ہر دل کو کسی پاکیزہ اور نئی سوچ اور جذبے کی نظر سے "تجھی ابھری بالکل ایک نئی فضا میں لے آتی ہے۔ وہ شگفتہ لہجہ کبھی دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگتا ہے جو "نقش فریادی" کے پہلے دور میں جاری تھا اور جس میں آغاز بلوغت کا خام سیدھا پن اور اضطراری لہجہ نمایاں تھا۔ "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور وہ مشہور شعر جو آج سب کی زبانوں پر ہے:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

دراصل اس صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں ابھرنے والے زیادہ تر ترقی پسندوں کے ابتدائی دور میں بلوغت سے عشق سے انقلاب تک کے سفر کی داستان سب کے ہاں ایک ہے۔ مختلف شاعر جس کسی شعری زاویے کے کاشانے کے طواف اور ہجر و فراق کے روایتی تجربات کا غزل کے بجائے نظم کے نئے لہجے میں اظہار سب کے ہاں مشترک ہے۔ پھر اچانک خود شناسی کی ہمہ گیری میں اپنے کے تقاضے پیچیدہ ہو کر واقعی ایک قصاب، یہ ماحول، یہ مسائل اور مسابقت ان کے لیے نئے سبب پر نظر جاتی ہے تو زندگی کا ایک رخ بدل جاتا ہے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

42: جعفر زمیر

ہمارے زمانے میں اس روایت کا سب سے مکمل اظہار فیض کی شاعری میں ملتا ہے۔ فیض ترقی پسند ادب کی ساری تحریک کی اس روایت کے سب سے بڑے نمائندے کا دعویٰ کرتی ہے۔ فیض کی نظم میں جس طرح ایک مسلسل اور صبر آزما انقلابی جدوجہد اور شدید جذباتی مجاہدہ کے ساتھ اس روایت سے منسلک رہنے کی شعوری کوشش ملتی ہے وہ کہیں اور مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔

43: صغیر نسیم

وہ کبھی اپنے نغمے زیادہ شعلہ بار نہیں بننے دیتے جو بھڑک کر گل ہو جائے بلکہ ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح ان کے جذبات آہستہ آہستہ سلگتے رہتے ہیں۔ اس طرح ادب و شعر کے تحت وہ اپنے نغمے کو ایک بھرپور اور نئی آواز مستقبل کے خواب تک پہنچا دیتے ہیں۔

44: ظ۔ انصاری

آج عاشق نسل اور شخصی کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں (تو ایسا ادب و فن کے فاصلوں کی طرف بے خبری کا سبب نہیں)۔ ایک منظر سامنے ہو چکا ہے۔ اسی طرح جس طرح قلب دریں اور ادب کے درمیان۔ یہ تو حقیقت ہے جس پر پہلی مثال مشکل ہے مگر اب بھی فیض کی آواز کا توانا پن تھی ہے اور دل میں یہ دونوں کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ شاید یہی ایک سچے شاعر کی پہچان ہے، سچے شاعر کو اگر سچے قارئین ملتے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ فنی پائیداری نہ ہو سکے۔

45: ظفر اقبال

قاری والی نے ابھی تک فیض کو منظرِ عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات نہیں پہنچی کسی کسی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس شاعر کی قاری بیگانی کر دے، اس کی شاعری بھی اتنی کمزور ہو گی۔ غزل کے حوالے سے یہ بات البتہ حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ تاہم حزن سے زیادہ قاری والی شاعری، خصوصاً نظم کے حق میں زہر بھی ہو سکتی ہے، جیسے کہ ن م راشد کے سلسلے میں ہوا ہے۔ یہ بات انقلاب کے سلسلے میں فیض بعد میں زیادہ نظر آتے ہیں اور ایک عجیب بات یہ کہ فیض کے بعد احمد فراز کا انقلاب فیض کے مقابلے میں بہرحال بہتر ہے۔ اسی طرح ضمیر نیازی کا ہاتھ بھی [illegible] کے حوالے سے خاص تک ہے، لیکن وہ اپنی نادرہ کاری سے کمی پوری کر لیتے ہیں۔ جب کہ ایک فیض [illegible] اور ایک [illegible] کی شاعری ایک خوب صورت بیانیہ ہو سکتی ہے جو جدید سیاق و سباق میں اسے شاعری کہیں کہا جا سکتا ہے۔ کم از کم فی زمانہ تو زیادہ گنجائش نہیں۔ جہاں تک شاعری میں فوقیت اور گہرائی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں فیض ہی کے ایک ہم عصر مجید امجد کی مثال بڑی آسانی سے دی جا سکتی ہے جو اس لحاظ سے فیض کی شاعری پر بہر طور فوقیت رکھتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہمارے نقادوں نے جس حد تک بھی نظر انداز کر رکھا ہو یا اس کی مسلسل عزت کرتے ہیں اور وہ بھی اسے شہرت عام دوام نصیب نہیں بھی ہو سکی ہو۔ جہاں تک نظموں کا تعلق ہے: فیض کی اکثر نظمیں زیادہ تر غزل کے ساتھ ہیں جو ہماری روایتی نظم کے کم از کم ایک کے حوالے سے زیادہ قریب ہیں جب کہ مجید امجد نے نظم آزاد اور معریٰ نظم کو بھی وہ وقار دیا ہے [illegible] فیض کی نظم پر آپ مثال پیش کر سکتے ہیں، لیکن [illegible] مجید امجد کی نظم تازگی کے ساتھ [illegible] ہے۔ فیض کی نظم اسی طرح [illegible] فیض یا اپنے دور کا شاعر ہے، لیکن [illegible] مجید امجد آج بھی ہمعصر حال کا شاعر ہے [illegible]۔ اسی طرح فیض کی شاعری آج بھی [illegible] ہو سکتی ہے [illegible] اور یہ سب سے زیادہ [illegible] بات [illegible] شاعری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

46: ظہیر صدیقی

فیض نے واضح طور پر ایک سیاسی تحریک کا ساتھ دیتے ہوئے اور انہی محرکات کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہوئے بہ حیثیت فن کار بھی ایک مقام بنا لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ بھی وہی کچھ کہنا چاہتے ہیں جو ان جیسے طبقہ خیال کے دیگر شعرا کا مقصود ہے۔ مگر وہ ان محسوسات کو [illegible] ہیں کہ اُن کی آواز [illegible] آواز نہیں بلکہ کانوں کے پردے پھاڑ دیتی ہے کہ ان کی آواز کی [illegible] ان لوگوں کو بھی ان کے قریب کھینچ لاتی ہے جو نظریے کے اعتبار سے ان سے اتفاق نہیں رکھتے۔

47: عابد علی عابد

فیض کی شعر گوئی کی خصوصیات کو پورا سمجھنا بھی ہو سکتا ہے۔ [illegible] فیض سے ملیں اور اُن کی اُن کلمات یا قول سے لطف اندوز ہوں جو [illegible] کی طرح [illegible] ہیں۔ فیض کے اشعار میں بھی یہ [illegible] ہے [illegible] جب [illegible] سے [illegible] فیض [illegible] ہیں [illegible]

جاتی ہے۔ اُن کے مزاج کا توازن لفظوں کے تعارف اور ترکیب کی شائستگی میں جھلکتا رہتا ہے۔ جو بات فیض کو موجودہ عصر کے اکثر شعرا سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت جامع صفات انشا پرداز ہے۔ انگریزی شعری روایات پر مطلع، فارسی غزل کے مزاج سے آگاہ، عربی ادب کی باریکیوں کا رازدار۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کبھی کبھی چونکا دینے والی ترکیب سامنے آجاتی ہے جس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اُن کے اشعار میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح اور ترکیب اجزائے تحسین کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ اظہارِ مطلب کے خوب صورت وسیلے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا جتنی جلدی ممکن ہو اس تخلیقی نقطے کے آس پاس پہنچے جہاں سے فیض کی غزل یا فیض کے الفاظ کی ترکیبیں منتقل ہیں۔

48: عاشور کاظمی

فیض ظلم کے خلاف تھے، استحصال کے خلاف تھے۔ ظلم کہیں ہو فیض بے چین ہو جاتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ کانفرنس منعقدہ سال 1936ء سے لے کر مرتے دم تک فیض اپنے نظریات پر قائم رہے۔ فیض کا محور باطن ایک تھا۔ غزل ہو یا نظم، فیض کے کلام میں اُن کا نقطۂ نظر نمایاں اور واضح رہا۔ اُن کی ذات اُن کے نظریے کی علامت تھی اور ان کے نظریات اُن کی ذات کی طرح محور تھے۔

49: عبادت بریلوی

فیض پر روایت کے گہرے اثرات ہیں۔ انہوں نے غزل میں پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہی روایت کے اثرات کو سمیٹے ہیں۔ غزل کی روایت کو انھوں نے ایک نئی زندگی دی ہے لیکن نئی زندگی دے کر راستے نئے راستوں پر گامزن بھی کیا ہے۔ فیض کی غزلوں میں حقیقت کے اس احتجاج نے آہستہ روی و تیزی و تندی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی لیے اُن کے ہاں ایک عجیب سی شائستگی ہے۔

50: عبدالوحید

وہ اپنے نظریات کو موزوں پر زور دینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ نرم و نازک لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ یہی خصوصیت انھیں اپنے ہمعصر ترقی پسند شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔

51: عبدالرحمن چغتائی

وہ جدید شعری ترقی پسند رجحانات کے رسیا دیکھتے ہیں۔ میں فیض کو اسی انداز سے اپنے تجربے میں لے آیا تھا کہ آئے دن کسی نہ کسی تحریک سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ شاعری اور مصوری کی جدت پسندی نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہر جانے والا ہر لکھنے والا جو کچھ کرنے کی ہمت رکھتا تھا اس تحریک کی بیعت کر لیتا۔ یہ کہ اس کے بغیر اندرونی خیالات کا پتا چلانا دشوار ہو گیا۔ سیاسی، سماجی اور ادبی ترقی پسند تحریک سے جس خلوص کا اظہار پنجاب کے فن کاروں نے کیا وہ قابلِ تحسین تھا۔ میں تو ابھی جدید ہندوستانی مصوری کے مکتب سے وابستہ رہا ہوں۔ اور اب بھی ہم اپنی روایات کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھ پاتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا اور احساس ہوتا کہ

کہا ہے جو کل تک نہیں تھی۔ ہر جماعت نے کسی نہ کسی رنگ میں اس کمی کا اعتراف کیا جو جدید تحریک شروع ہونے سے محسوس ہوتی تھی۔ شاعری کے جمود اور ترقی پسند رجحانات اور اس تحریک کو فروغ دینے والا سب سے روشن پہلو یہی ہے کہ اس دور کا ترجمان حفیظ جالندھری نے اردو کے فروغ کے لیے ادبی دنیا میں بھی کچھ کم نہیں کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے نام ساتھ مولانا عبدالمجید سالک اور دوسرے ترقی پسند ادیب داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار رہے۔ ان کی فنی تحریک ضرورت کا اعتراف ہر مکتبِ خیال کے افراد نے تا حال وار کیا۔

حفیظ جالندھری، محمد دین تاثیر، مجید ملک، فیض اور ڈاکٹر خالد کی محفلوں سے مستفید ہونے کا مجھے ہمیشہ موقع ملتا رہا۔ اگر ان کا کلام نظر سے گزرا تو ان کے کہنے کا بھی کچھ نہیں بھولا تا ثیر کے ساتھ کیسے وقت گزرا۔ دو کیا موضوع رہا اور کیا ہر جگہ ہوا یہ ایک نئی داستان ہے۔ لیکن ان کی ترقی پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو پڑھتا تھا، جو سوچتے تھے وہی لکھتے تھے اور ان کا لکھنا بھی ان کی پسند تھی۔ آزادی جو ہمیں دے کر چلی آئی ہیں اس کے ذہن نے سامنے مختلف طبقے کے لیے مواقع بھی اور خیال ہوتا تھا کہ مرحلے کچھ نئے کا بھی عالم ہو تو ہم نے یہ تجزیہ کرنے کے لیے ایک شکل اختیار کر لی۔ فیض کی شاعری کے رجحانات اپنے دور کی ضرورتوں اور آزادی کے مطلوب پہلو جیسے رہے۔ مزاحمت اور انتقال کے ساتھ ان میں موڑ بھی آتے رہے۔ ہر شاعر کا یہ عالم رہا کہ وہ ان کو چلتے ہوئے وقت سے گزرتے رہے۔ نظریاتی مضبوطی بھی اسی لیے قائم رہی۔ سے ترقی پسند تحریک میں جو سب سے بڑی کمی اور شکایت نظر آتے تھے۔ فیض نے جو اس انداز سے شاعری میں حاصل کیا کہ اس پر تحریک کے اندر کوئی بحث نہیں رہی تھی۔ عام انسانی نفسیات، درد، عوامی آواز کی جا ئز اور اس شعور کو قریب سے دیکھا جائے تو انہیں اپنی تہذیبی زندگی میں معاشرتی حیثیت پر ایک آواز ہونے کی حیثیت سے اس بات کو تجربہ کرتا رہا اور اس کو ظاہر کرتا رہا۔ خود پسندی اور خود بینی کو تو کبھی عزت و محبت اور خلوص کے باوجود نمایاں ہونے نہیں دیا جو ان کی شخصیت تھی۔

جناب اقبال کی محفلوں، دوستوں اور احباب کی بے تکلفی، خوش گپیوں اور ان کی بے مثل ہر دلعزیزی کے ہر دور کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ جب بھی موقع ملا، انہیں سے کلام سننے کی کسی نے درخواست کی، ان کے تیور بدل گئے۔ وہ بھی اکثر دوستوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا موقع پیش بھی آ جاتا کہ وہ کلام سنانے پر مجبور ہو جاتے تو وہ فارسی شعرا کے اشعار پڑھنے لگتے اور موضوع گزر جاتا۔ اس کے برعکس فیض بھی میرے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ بھی محفلیں رہیں۔ مشاعروں کی محفلوں کے درمیان جب بھی کسی نے درخواست کی فیض نے اپنا کلام جاری کر دیا۔ شاعری ایک ذہنی ہوتی ہے، وہ ذہن میں خلوص کے ساتھ تخلیق اور بہادری کی نظمیں سناتے اور جو بھی سوچ ہوتا مسودہ ہوتا۔ خاص آزادی کے بعد جو نظم "صبحِ آزادی" فیض نے لکھی اور جس جذبے سے اس نے اسے فروغ دیا اور جس نقطۂ نگاہ سے اس نے روشناس کرایا وہ بڑا مقبول تھا۔ اپنے رنگ کی منفرد کوشش بھی جس نے تخلیق کی صورت میں بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ آزادی کے مفہوم کے تحت ایک شاعری، ادبی، انقلابی اور سیاسی مزاج کی سلامتی سے قریب تر بھی اور منفرد مقام انہی کو حاصل رہے گا۔

مجھے فیض کا تعارف ہوئے بہت عرصہ ہوا۔ وہ جب الفاظ پڑھتے ہیں اور ان کے جو انداز سے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کو بہت ہی کم ایک دو موقعوں پر جو ان کے چہرے پر نقصان نظر آتا ہے۔ اپنی ناراضی کو ظاہر کرنے یا اپنے غصے کو ظاہر کرنے میں فیض نے کبھی جلدی نہیں کی۔ کبھی بھی رنجش میں مختلف طبقوں کے شعرا اور ان کے فن سے دوچار ہوتے ہیں تو مشتعل ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فیض کی انفرادیت صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ان کی امانت ہیں۔

52: عرش ملسیانی

فیض کا رجحان اردو شاعری میں نہایت خوشگوار ہے۔ وہ ان لوگوں کی صف میں پیش پیش ہیں جنھوں نے اردو نظم اور غزل کو نیا لہجہ اور نیا انداز فکر عطا کیا۔

53: عزیز احمد

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا نقاشی کی قلم سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے۔ "تنہائی" اور "موضوع سخن" میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت اور نمایاں ہے۔ تنہائی میں استعارات گرد و پیش کا سارا ماحول شعر کا ساتھ دیتا ہے۔

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار

54: عطاءالحق قاسمی

شاعری کے گلستان میں یوں تو ہزاروں پھول کھلتے ہیں اور گلشنِ ادب کی رونق بڑھا کر بکھر جاتے ہیں مگر کچھ ایسے پھول بھی کھلتے ہیں جن کی خوشبو صدیوں کے در و دیوار سے باہر کی فضاؤں کو بھی معطر کرتی ہے۔ ان پھولوں کے رنگ جس مٹی سے ملتے ہیں اسے بھی معتبر بنا دیتے ہیں۔ میر و غالب کے بعد کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اب سرائے سخن میں ایک اور شاعر بھی پیدا ہوگا۔ بلاشبہ اقبال کے ظہور سے یہ معجزہ رونما ہوا۔ اقبال کی شاعری کو اردو شاعری کی معراج قرار دیا گیا۔ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر کو اپنی شاعری کے موضوعات، اسلوب، فنی اپج اور شخصیت کے حوالے سے انفرادیت حاصل ہے تو وہ فیض احمد فیض ہیں۔ فیض صاحب ایک طرف تو میر و غالب کی روایت کے امین ہیں کہ انھوں نے کلاسیکی غزل اسی رچاؤ اور نفاست سے کہی کہ ان کے دامن پہ ایک بھی کانٹا نہیں آنے دیا۔ دوسری طرف ان کی شاعری میں اقبال کی شاعری کی طرح ایک تحریک، ایک پیغام اور ایک روح ہے جو قوم کے لیے انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہے۔ اقبال کی طرح فیض صاحب کی اپنی زندگی بھی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ فیض صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ اردو شاعری میں یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کو غزل عطا کیا اور اردو شاعری کے قالب میں خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ فیض صاحب کے ہاں "لب و رخسار" کے استعارات بدل یا "دار و رسن" کے پہلو اس طرح بدلے گئے ہیں کہ قاری دنگ ہو جاتا ہے۔ "کوئے یار" سے "سوئے دار" تک کی شاعری ایک انہی مسلسل کا نام ہے۔ فیض صاحب نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں ان کی ... چند دہائیاں تو فکر کی تلاش میں بھی جرأت ... وطن عزیز میں محفوظ نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شاعری تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کا نوحہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں فیض صاحب کی شاعری شعور عطا کرنے والی شاعری ہے اس لیے فیض کا فیض جاری رہے گا۔

55: علی جواد زیدی

فیض احمد فیض اردو کی تاریخ میں اپنے لیے مخصوص جگہ بنا چکے ہیں اور ان کے کچلے ہوئے اور سچے جذبات اور اعلیٰ سماجیات نے

ایک پوری نسل کی رہنمائی کی ہے۔ عمل کی انتہا میں بھی انھوں نے اپنی فن اور خلوص کی ادبی جو تخلیق کی وہ جذبوں کو دوام بخشتی ہے۔ ان کی تخلیقی داستان اور ان کے سچائی اور قولی کارنامے بھی تاریخی نوعیت کے ہیں۔

56: فراق گورکھپوری

مجھے یہ مضمون دراصل بڑی عجلت میں لکھنا پڑا ہے۔ اس لیے ان نئے دور کے شاعروں کا جائزہ لینا کچھ مجبوریوں سے کچھ وقت اور جگہ کی قلت سے ناممکن ہے جو بہت سے اور شاعروں سے اہم ہو چلے ہیں۔ جن میں کچھ بہت لطیف نظمیں عورتوں کی لکھی ہوئی ہیں لیکن ان سب کا نام نہ لیتے ہوئے بھی پروفیسر فیض احمد کی نظم جس کا عنوان ہے "رقیب سے" اور جو ادبی دنیا کے فروری 1938ء کے نمبر میں نکلی تھی ہے۔ اس کا تذکرہ ضرور کروں گا۔

میں بہت کم اشعار یا غزلوں و نظموں کے متعلق یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بے نظیر ہیں۔ لیکن یہ نظم ایسی ہی نظم تھی۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں اب تک ایسی پاکیزہ اور اتنی گہری نظم نہیں لکھی گئی۔ رقیب کا موضوع اردو شاعری میں بہت پرانا موضوع ہے لیکن فیض نے اسے ایک بالکل نیا رنگ دے کر عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم رشتوں کا نغمہ بنا دیا ہے۔ اس نظم کی حیات بخش ترنگ جب تک اردو زندہ ہے قائم رہے گی۔ عشقیہ نظموں کا کوئی مجموعہ اس نظم کے بغیر بے جان و بے رنگ رہے گا۔

پروفیسر فیض کا مجموعہ جس کی ایک نظم "رقیب سے" کا ذکر آ چکا ہے "نقش فریادی" کے نام سے نکلا اور اگرچہ بہت مختصر مجموعہ ہے لیکن اس کا بہت زبردست اثر ہماری شاعری پر پڑا۔ فیض نے تجربہ و احساس کی ایک نئی تکنیک دی جس میں ہماری جوانی اور زندگی کی ترجمانی کے لیے نہایت دلکش پیرایہ ہے۔ ان کے مصرعوں کی لے میں جو کھنک کا عنصر (Till) ہے اور ان کی تعمیر سازی (Teasing) میں جو تازگی و موزونیت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک طاقتور انفرادی خصوصیت پیدا کرتی ہے۔ فیض نے ایک تیا رنگ شاعری کا نیا انداز جس نصیحت افروز اور حسن کی خلوص و فن کا ادا چاہا کہ دی ہے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا ہے اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی نئی اور قابل قدر بھی۔ اس مجموعہ میں وہ یادگار نظم بھی ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" کے عنوان سے جو عشقیہ شاعری کا ایک لافانی کارنامہ ہے۔ اور یہ نظم ایک زندہ جاوید کلاسیک ہے۔ فیض نے ان احساسات کو اور بھی جگہ بیان کیا ہے جو فرسودگی کے قطعات میں تحریر ہو رہے تھے۔ فیض کی شاعری آج کل کے مہذب نوجوانوں کے احساس اور طرز احساس کا پورا آئینہ ہے۔ فیض کی تقلید کثرت سے ہوئی۔ آخر ان کا مجموعہ "دست صبا" اور "زنداں نامہ" سے ظاہر ہے۔ ان کا نیا لہجہ اور آواز میں: عشق اور فکر کے دونوں سرچشمے آ ملتے ہیں جو فیض کے یہاں ملتے ہیں اور فیض نے اپنی شاعری کے "زہر جنوں" اور "تنہائی" میں فیض کا اسلوب استعمال ملتا ہے۔ لیکن آخر ایمان اور تجدید کے لیے جس انداز سے ہمارے نوجوانوں کی تڑپ اور تضادی زندگی کے کرب کو پیش کیا ہے وہ موجودہ تحریک اور جدید دور کی بہت حد تک ترجمانی ہے۔

57: فتح محمد ملک

جب چند دن بعد جب فیض صاحب کے انتقال کی خبر ملی تب ز صاحب نے کہا کہ فیض صاحب تو موت کی تیاریوں میں مصروف تھے

اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ جن جن اقوامی اجتماعات میں اُن کی ذات پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا کرتی تھی اُن کے بعد بھی وہاں پاکستانی پرچم سر بلند رہے گا۔ یہ ہے وہ سچی اور کھری ہوئی پاکستانیت جو فیض صاحب کی تمام حیات نامعلوم وقت پر بو کہ بھی مختلف ہے اور جس کا سامراج اور آپ کے سچے تین طبقوں نے ہمیشہ مطلب معنی بنائے رکھا۔ وہ پاکستان میں ایک ایسا انقلاب دیکھنے کے آرزومند تھے جس کے نتیجے میں پاکستان کی مفلس، نادار اور بے زبان رعایا کہ جن کی محنت کا ثمر آج دوسرے جہاں عوام کسی بالا بالا بھی بن سکے، پاکستان صحیح معنوں میں ایک آزاد اور خودمختار مملکت کہلا سکے اور پاکستانی ایک روشن خیال اور غیرت مند قوم کا نام پاسکیں۔ اس اعتبار سے فیض صاحب ایک آفاقی شاعر ہی نہیں ہمارے قومی شاعر بھی ہیں۔

58: قدرت اللہ شہاب

1972ء میں جب نیشنل کونسل آف دی آرٹس کی تشکیل عمل میں آئی تو فیض صاحب نے چیئرمین کے طور پر اس کی سربراہی قبول کر لی۔ بیرونی سفر سے لوٹنے کے بعد میں نے ورلڈ آف ... کے سلسلے میں بعض معاملات میں اس ادارے کی باہمی معلومات حاصل کرنے کے لیے وزارت تعلیم میں آمد و رفت رکھی تھی۔ ایک روز فیض صاحب نے مجھے فون کیا کہ ”بہت سی کتابیں جمع ہو گئی ہیں، کہیں انھیں لے کر تمھارے پاس کس وقت آ جاؤں؟“

فیض صاحب کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میرے جیسے دو دو ٹکے کے چھوٹے لوگ سرکاری ملازمت کے زور پر زمانے میں فیض کے برابر بیٹھے ہیں، جب کہ فیض تو جانے کتنی صدیوں کے لیے فقط ایک ہی فیض ہے۔ چنانچہ میں نے کبھی انھیں تو کتابیں لے کر اپنے پاس آنے کا موقع نہ دیا، بلکہ وقتاً فوقتاً خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور جس قسم کی رو وہ چاہتے تھے اُن پر بے تکلفی سے دستخط کر آتا تھا۔

فیض صاحب جیسے حسن کی شرافت النفس، حلیم الطبع، منکسر المزاج اور انسان دوست افراد ہماری تہذیب و تمدن کا جوہر ہوتے ہیں۔ اُن کی ایک خاص پہچان یہ ہے کہ موت کی تاریکی اُن کی یاد کو دن بدن روشن سے روشن تر کرتی رہتی ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم میں سے اکثر نے فیض صاحب کو اُن کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اُن کے ساتھ چلے پھرے، بات چیت کی۔

59: قرۃ العین حیدر

فیض صاحب کی شاعری بھی کتنی اعلیٰ تھی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے شرق کے فلسطین اور ایران والے یا کوئی شاعر پہچان سکتا ہے۔ میر، غالب اور اقبال بھی ان کو پسند کرتے اور حجاب کے تھے وہ اور وارث شاہ اور بابا فرید بھی۔

60: قمر رئیس

فیض ہمارے اُن خوش نصیبوں میں ہیں جو اپنی زندگی ہی میں ایک Myth بن گئے ہیں۔ یوں تو اُن کی کئی حیثیتیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے اولین معماروں میں اُن کا نام سر فہرست رہا ہے۔ پاکستان میں وہ ٹریڈ یونین اور ادارے کی ٹریڈ یونین تنظیموں کے بھی سربراہ رہے ہیں۔ صحافت اور تعلیم سے بھی اُن کا گہرا تعلق رہا ہے۔ پھر عالمی امن تحریک اور ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک میں بھی انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اور اس طرح وہ صرف برصغیر ہی نہیں ساری دنیا کے امن دوست، محنت کش انسانوں کی زندگی اور ایک بہتر مستقبل کے

لیے اُن کی جدوجہد سے اُن کا رشتہ استوار ہوا۔ ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ کے ستم رسیدہ انسان، فلسطینی مجاہدین اور خود برصغیر کے عوام ظلم و تشدد اور استحصال کے شکنجوں سے آزادی کے لیے جو مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اس کو زبان دے رہے ہیں۔ اُن کی ذہنی ہم آہنگی فیض کی شاعری کے رومانی دور تک کی سب سے اچھی نظموں میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ لوگوں میں خوب سے مخاطب ہیں۔ دیکھیے کچھ انقلاب سے انھوں نے کتنی دفعہ سے پیار کیا ہے جس کی البتہ تحریک نے انھیں نئے انداز بخشا ہے۔ ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی جس المناک دنیا نے جنم دیا ہے اس کا دعویٰ کرنا ایک بات ہے، یہ تحریر معنی خیز ہے... انسانوں کے وجود کو نئی روح کی گہرائیوں میں اپنے احساس اقتدار میں ... دنیا کے دکھی انسانوں سے یہ جذباتی وابستگی (Sense of Identification) فیض کی شخصیت اور شاعری کے مشترک بنیادی اوصاف میں سے ہے جو انھیں دور تغیر کی انسانی اقدار ... سے فیض کی شاعری کو اعلیٰ ترین بناتی ہے ... اس کی ... حال میں ... تجربات ... جدت سے ...

61: قمر علی عباسی

جنوبی ایشیا کے ملکوں میں فیض احمد فیض ایک مشعل ہے جو اندھیروں کے خلاف ... روشنی کا پیغام دے رہی ہے، اجالے کے ... دکھا رہی ہے۔

فیض احمد فیض اردو ادب میں ... وقت کے ساتھ ... زمانوں سے ... باقی رہے ہیں۔ فیض احمد فیض ایک وقت ... انسان ... ہمیشہ ... دلوں میں ... زندہ رہیں گے۔

فیض احمد فیض ... تھے۔ اُن کے شعر میں ... انقلاب ... کے خلاف ... ان کی زندگی بے مثال ... والی ہے۔ فیض احمد فیض کے جذبات، احساسات، خیالات نے ... کو ... ہے۔

ڈاکٹر ... عابدی ... کا ... ہے ... ان کے نزدیک ... ہے۔ فیض احمد فیض پر ... مقالہ ... ہیں۔ یقین ہے کہ ... نے ... کیا ہے اُس کا حق ادا کریں گے۔ ... بے شک ... کی ... کامیابی کا ... ہے۔

62: کاردگ لیوف (روسی ادیب)

فیض ... شاعری کے ... روایات ... میر تقی میر ... غالب اور اقبال کے ... اور اُن کی ... ہوئی ... نظر آتے ہیں۔ فیض سے محبت کی جاتی ہے اس لیے کہ ان کی غزلوں میں ... شاعری کے ... استعاروں اور ... ہوئی ... کے ... اور ... کا ... ہے۔ ... حاضر ... ہے۔

63: ممتاز حسین

اب فیض صاحب ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہو گئے ہیں۔ وہ ... زندگی ... ہیں۔ ... (Living Past) ... (Living Image) ... ایک زندہ قوت ... ہے۔

64: کلیم الدین احمد

فیض کی شاعری میں قفس، صبا اور چمن، روایتی قفس، صبا اور چمن نہیں ہیں۔ اور وعدہ و پیماں بھی نئے ہیں، یعنی پرانے نقوش کا نئے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ گویا ایک پردہ ہیں اور پسِ پردہ نئی سیاسی باتیں ہیں۔ غلامی اور آزادی کی باتیں ہیں اس لیے پرانے نقوش کی وہ ہیئت بدل گئی ہے۔ اب شعروں میں رنگِ بہاراں، بزمِ حریفاں، خزاں، محفلِ یاراں، شمع، صحنِ چمن، نکہت، دامنِ گل، بادِ صبا، اشک، ساون، باغباں، شاخِ گل، نشیمن، صبح، سحر، شام کی باتیں ہیں، لیکن یہ پرانی باتیں نہیں۔ یہاں باتیں نئی ہیں، ہونے والے واقعات کی طرف اشارے ہیں، پسِ پردہ سیاسی گفتگو ہے۔ یہ سب سہی لیکن ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ پہلے ان نقوش کے معنی واضح اور متعین تھے، لیکن اب وہ کچھ مبہم سے ہو گئے ہیں ان میں پہلی سی وضاحت نہیں۔ ان کے مفہوم غیر متعین سے ہیں فیض کے شعر میں اسی قسم کی کمی ہے۔ قفس ہندوستان ہے اہلِ قفس ہندوستانی ہیں۔ چمن بھی ہندوستان ہے، صبحِ چمن آزادی ہے، یا آزاد ہندوستان، بلکہ اس کی آزادی میں آنکھ کھلنے کی۔ بادِ صبا (Zeitgeist) روحِ زمانہ ہے، آزادی کی تمنا ہے..... وعدہ و پیماں اہلِ قفس اور بادِ صبا سے ہو رہے ہیں یا کسی اور سے (آنکھ کھلے گی آزاد ہوں گے) اس لیے ابھی بند ہے۔ اور بند ہے تو پھر بادِ صبا سے وعدہ و پیماں کیسے ہو رہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باتوں کا عام مفہوم تو سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن پہلی سی وضاحت اور تعین نہ ہونے کی وجہ سے باتیں مبہم ہو جاتی ہیں۔

65: کنھیا لال کپور

ایک انگریزی نقاد کے نزدیک اعلیٰ اور ارفع شاعری میں تین "ایس" پائے جاتے ہیں۔ وہ ہیں سینس (Sense)، ساؤنڈ (Sound) اور سجیشن (Suggestion) ہم انھیں اردو میں "مغز" "موسیقیت" اور "رمزیت" کہہ سکتے ہیں۔ میری رائے میں فیض کی شاعری میں یہ تینوں "ایس" بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ فیض ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ مگر وہ اوّل اور آخر شاعر ہیں۔ خطیب یا مبلغ نہیں۔

66: گوپی چند نارنگ

فیض کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انقلابی آہنگ پر جمالیاتی احساس کو اور جمالیاتی احساس پر انقلابی آہنگ کو قربان نہیں کیا بلکہ ان دونوں کی آمیزش سے ایک نیا شعری رچاؤ پیدا کیا۔ اُن کی شاعری میں جو دل آویزی، دل آسائی، نرمی اور قوتِ شفا ہے، وہ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

67: گیان چند

اگلے وقتوں کے مقدس بزرگ ترقی پسند ادب پر اس لیے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں کہ اس میں بسا اوقات ادبی اور جمالیاتی پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے، لیکن فیض ایسے معدودے چند شعرا میں سے ہیں جن کے یہاں زندگی کو آگے بڑھانے کا شعور بھی کسی سے کم نہیں اور جو ادبی مذاق کو بھی بھرپور آسودگی بخشتے ہیں۔ اُن کی آزاد نظم پر پابند نظم کے رسیا بھی سرِ دھنتے دیکھے گئے ہیں۔
کسی سے پوچھا جائے کہ فیض نظم کے بڑے شاعر ہیں کہ غزل کے؟ تو قائل ایک عجیب اُدھیڑ بُن میں پڑ کر سائل کی جان کو

کرے گا۔ یقین کریں کہ فیض اردو ادب کی تاریخ میں ان چار پانچ شعرا میں سے ہیں جن کی نظم غزل سے بہتر ہے اور قول عمل سے بہتر۔ بلکہ آج تو ان کے صرف گنتی کے چند شعر ہی کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ ہی مقامات ان کو اقبال کے نقش قدم پر چلنے میں پیش پیش کرنے کی روشنی لکھی گئی ہوئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان میں کوئی ایک بیسویں صدی میں بھی فیض کا نام اردو ادب کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ یہی بڑے ادیب کی نشانی ہے۔

68: لطیف الزماں

ایک بڑی کمشنر نے ایک ضیافت میں بڑے خلوص کے ساتھ ایک شاعر کا تعارف کروایا: "He is the greatest living Urdu Poet." اس پر شاعر نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "So You Are Mr. Ghalib"

محمد نعمان کیمبرج نے اس شعر لطیف مرزا غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ حیرت ہے کہ ایک اردو شاعری میں ایسا اتفاق ہو جائے اور پھر جیتے جی ہم نے ان الفاظ کے جادو اور مرزا غالب کی زندگی تمام کر دی۔

دراصل یہ بھی ایک عجیب بات ہے۔ یہ ہم بخت عجیب چیز نہیں رکھتا ہے اس سے جو چیزیں ذہن کو اپنا ہی ایک مرتبہ رکھتی ہیں۔ وہ شعر تو عشق کے فن سے واقف کہاں اس کے پاس شاعری کے سر زندگی بھر ان کی رفعت سے باہر نہیں نکل سکے۔ نہیں سے ایک عشق نے اس سے دو عشق کیے اور لطف پر کیا دماغ دکھی ہے۔ ایک عشق سے آنا ہے۔ پھر شعر کہلواتے ہیں دوسرے عشق نے اسے گلہ کر دیا۔ یہ شخص تو تنہائی میں چھپکلی سے ڈر جاتا ہے جس کے مطلع و طویل دیوان غالب صاحب کا مالک ہے سامنے بچوں کو دیکھنے کے لیے بڑھ جاتے ہیں مگر اب کبھی کرتے۔ آخر انسان اپنے عشق ہی سے دیکھا جاتا ہے اور عشق میں جان کا زیاں ہی کافی نہیں ہوتا۔ سب کچھ سادگی بھی اور پیار کی ہوتی ہے۔ ان شخص سے تو کبھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا ایک دوسرے نے اختیار کرلی ہے اس پر چلا جاتا ہے۔ یہ وقوف کہتے ہیں اور کے وطن سے جدا جانے کو کبھی ہم نے کہا وہ کوئی شاعری سامنے آتی خوشی کا جاتا ہے۔ ہر کا شعر کسی کے لیے سرمایہ کاش ہوتا ہے اور کسی کو بصیرت دیتا ہے اور ان لوگوں کو زمانے کا سب سے زیادہ قابل رہے وہ خوش نصیب ہوگیا ہے۔ اللہ نے ان سے یہاں پر فضل کیا ہے۔ اور وہ لفظوں کی پہچان سے واقف ہیں۔ اپنا اپنا نصیب ہے کوئی جیتے کا سامان کرتا ہے کوئی مرنے کا۔ ہم تو کسی کی قدر نہیں کرتے وہ ایسے ولی ہوں یا اپنی طلعت ان مرزا غالب ہوں یا مرزا غالب۔

69: مجروح سلطان پوری

فیض صاحب مجاز، ن۔ م۔ راشد، اختر، بیان حیدر، محی الدین اور علی سردار جعفری کی طرح میرے پیش رو ہیں۔ 1940ء میں جب میں نے شاعری شروع کی تو ان سب سے بیشتر حضرات صاحب دیوان ہو چکے تھے۔ لہٰذا میں بیش ان سب کا عقیدت مند تھا۔ لیکن یہ بات کہنے میں مجھے باک نہیں کہ ان میں ن۔ م۔ راشد اور فیض صاحب کی شاعری اردو کے لیے ایک خاطر خواہ چیز ہے کیونکہ جس سے بنیادی درجے نظام اقبال سے ہو کے ہوتے ہوئے غالب تک ہیں جو ملتے ہیں لیکن بڑی ہی بات ان ہی حضرات کی دین کہی جائے گی۔ دونوں کے معاصرین میں پنجاب کے بیشتر شعرا نئی اور بڑی ہی زبان میں شعر کہہ رہے تھے لیکن ان دو حضرات جیسے دلکش اسلوب شاعری نہیں کر سکے۔ چنانچہ ان دونوں میں بھی ن۔ م۔ راشد کی زبان کچھ زیادہ فارسی رہی لیکن فیض نے ان کی جدید اسلوب کو

کی نمائندگی بھی عطا کی اور جس سے وہ اپنے ہم جنسوں میں سربلند ہوئے۔ مجاز کی مرگ نے تھوڑی دور تک البتہ ساتھ دیا لیکن اس کے بعد تو وہ خود بھی سب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چنانچہ آج فیض کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان سے شاعر، غیر شاعر سبھی بہ صرف عقیدت ہی کے محبت بھی کرتے ہیں۔ یہ ان کی جادو بیانی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

ایسے فیض کے بارے میں ان کی شاعری کے اعتراضات کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں یہ بات بھی عام ہے کہ فیض صاحب بہت سے سیاسی اور سماجی مسائل کو تمثیل کر کے نہیں بیان کرتے جتنے کہ وہ مستحق ہیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا اس طرح 'گفتار' کہ فیض جیسا شاعر آج اپنے ملک کے جدید شاعر کو ابھارا ہو ادب کی تاریکی سے نکالنے میں کامیاب کیوں نہیں ہے؟ کبھی ایسے تو نہیں کہ جب ان کی آواز کو "حرفِ حق" کی طرف رواں ہونا چاہیے تو ان کی صدا "جامِ زیرِ لب" کی نذر ہو جاتی ہے۔ ان کا شعر کے قصیدہ جیسی ہو گئے فیض کے سب تو سچے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ بات کچھ اچھے ڈھب اچھے لہجے میں ہوتی ہے کہ آواز نمایاں نہیں رہتی، جب کہ ان کی رہنما آج بھی آواز ہو سکتی تھی۔

یہ بہر حال یہ تو ہر شخص کی اپنی اپنی رائے ہے۔ مجموعی حیثیت سے ہو لیکن مجموعی حیثیت سے فیض کی شاعری شاخِ گل کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اب یہ عرض مند اس پر منحصر ہے کہ پھول کی پتی سے "ہیرے" کو جگر کاٹ دیں۔

70: مسعود حسین خان

اپنی تر ساسانی ذوقی فنکاری کے باوجود انھوں نے جدید اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ اور نیا لہجہ عطا کیا ہے۔ جس میں ان کا انداز اپنا ہے، نہیں کہ انھیں ابھی سے غالب و اقبال کی صف میں لا کھڑا کیا جائے لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ انھوں نے اردو شاعری کی نئی جہات تک رسائی کی ہے۔ ان کا مخصوص عاشقانہ انداز، ترنم ریز موسیقی، خوبصورت تشبیہات و استعارات اور سب سے بڑھ کر ایک نیا وجدان اور شعور جس میں فرد اور سماج دونوں ایک ہی دو رنگ کی طرح سجے ہوتے ہیں۔ یہ سب مل کر ایک عجیب انداز کی شاعری کو جنم دیتے ہیں جس سے کم از کم ہمارا ادب آشنا نہیں تھا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اردو شعر کے سلسلے میں فیض کا سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اسے خطابت کے طلاق اور انقلابی نعرہ بازی سے نجات دلائی۔ ایک انقلابی شعور کے باوجود انھوں نے فن اور محبوب کے ساتھ اپنا عہد استوار رکھا۔ کاش اردو فن کی خاطر یہ شاعری میں محبوب کے تصور کو اور کم کر لیتے۔ اور "سیاسی لیڈر کے نام"، "صبح آزادی"، "لوح و قلم"، "زنداں کی ایک صبح" اور "ملاقات" (گو اس نظم کا عنوان بہت بھٹکا ہوا ہے) جیسی نظمیں لکھتے رہتے۔

71: ملک راج آنند

1947ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھیل گئی جس سے فیض کی روح بھی لرز کر رہ گئی اور اس نے ہمیں ایسے نوحے دیئے جن میں زخم خوردہ انسانیت کا ماتم تھا۔ لیکن انسانی اقدار پر ان کا پختہ اعتماد ہونے کی وجہ سے فیض کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ انسانیت کی تعمیرِ نو کے لئے یہ ذہنی تشکیل ضروری تھی۔ آپ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری اب زیرِ مطالعہ کے ماحول میں جبر و الم کی شدید دکھ سے ابھرتا ہے اور شعور صحافیوں کو دینے لگتے ہیں۔ ان کے دل میں اس نے جو بات کا خیال کیے ابھرتا ہے۔ مخصوص درد و الم کا احساس وہ بعد میں کوئی تخلیق کرتا ہے جن کا اس پر دیوانے اگر چہ کم کے وہ حصوں کو تقسیم کر دیتے تو لیکن ذرا کوئی اپنا مقصد خود پیدا کرنے کی جرأت کرکے اور غم و الم کو جو ان مرونت سہارا بھی سکے تو لیکن دین کا تعمیر منظم

تجربہ فرد کا نصیب رہے گا اور اس طرح ایک دل دوسرے کا آئینہ بن جائے گا۔

72: محمد علی صدیقی

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اردو شاعری کے جس دور میں زندہ ہیں وہ فیض کا دور ہے۔ اس کے احساسِ جمال اور حسنِ تناسب کا دور ہے۔ یہ مستقبل سے باہم پیوست ہونے کا دور ہے اور وہ فن کار اور فنکار ہے جو مستقبل کے ساتھ مذاق نہیں کرتے ہوئے انسانوں کے بے نور زندگی کا حوصلہ اور وسائل ودیعت کر جاتے ہیں۔

فیض احمد فیض کی شاعری مستقبل آفرینی کے عمل کی شاعری ہے..... یہ سراسر حسن کی شاعری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جس شعری دور میں زندہ ہیں وہ فیض احمد فیض ہی سے عبارت ہے۔ وہ شاعر کیا ہے جادوگر ہے۔

73: مجتبیٰ حسین

ہماری جدید شاعری میں فیض کی آواز بالکل نئی تھی اور اس آواز سے اردو شاعری پہلی بار مغربی شاعری کی غنائیت (Lyricism) سے آشنا ہوئی۔ یوں تو مغربی اثرات اردو شاعری فیض سے بہت پہلے قبول کر چکی تھی۔ مگر اردو شاعری پر تمام مغربی اثرات اور ہیئتی تجربات کے باوجود اس کا کلاسیکی مزاج غالب تھا۔ فیض کی شاعری ان تمام روایات، تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے وفا برتی تھی جو ہماری شاعری میں نئی معنویت یا کم از کم معانی کے ساتھ مستعمل تھیں۔ فیض کے لہجے کی نغمگی اور خوابناکی اردو شاعری کی نغمگی سے مختلف تھی۔

74: مجنوں گورکھپوری

فیض تو ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کیے ہیں اور ان کے لیے نئی سمتیں آزادی سے بنا دی ہیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا کسی شدید قوت کے مالک نہیں۔ فیض کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات سے پڑتا ہے۔

75: محمود الٰہی

میرا مزاج فارسی اور عربی ادبیات کے سانچے میں ڈھلا ہے اور اسے فیض کی شاعری سے تسکین ملتی ہے۔ مجھے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا کہ ان کے اسلوب میں وہ قدریں نمایاں ہیں جو حافظ، امیر خسرو، سعدی، عرفی اور غالب کے اسالیب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ فیض اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہیں لیکن ماضی کی حسین روایت سے انھوں نے اعراض نہیں کیا۔

76: محمود سرحدی

1938ء کے لگ بھگ ابھرنے والے شعرا میں جوش کے مقلد باقی تھے لیکن فیض نے اپنی شاعری میں جوش کی خطابت اور اقبال کی گہرائی۔ انھوں نے ایک عام انسان کے جذبات کی ترجمانی کی۔ عام انسان جو عزت و سلامتی کے ساتھ جینا چاہتا ہے جو اپنے دور کی

جو ترقیوں کو تہہ تیغ ہوتے دیکھ چکا ہے جو کرب سہتا ہے جو دن محنت و مشقت میں گزارتا ہے اور رات کو اپنی محبوبہ کی زلفوں سے کھیل کر گزارتا ہے۔ فیض محنت کش بھی ہے عاشق بھی ہے، ایک باغی بھی ہے ایک چاہنے والا بھی، ایک انقلابی بھی ہے اور عبادت ساز بھی۔ فیض ایک نغمہ گر ہے اور وہ نغمہ ور ہے کہ یہی ترقی پسند فن اور محبت کا حاصل ہے۔

77: مرزا ادیب

ایک ہوشمند زندگی تجربات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ شاید کچھ کہے جو تجربے کی نغمگی سے لکھتا ہے اور اس کی آواز ہزاروں، لاکھوں دلوں کی دھڑکنوں میں ڈھل جاتی ہے۔ فیض ایک ایسا ہی خوش نصیب شاعر ہے اس نے ذاتی تجربوں کے نغمے اور اردو شاعری کی نئی علامتوں کو نئے مفاہیم دیے ہیں۔

78: میر رسول بخش تالپور

فیض نے بین الاقوامی اعزاز حاصل کر کے اردو ادب اور پاکستان کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری عظمت کے خیالات اور زندگی کے حقائق کی آئینہ دار ہے۔ اردو ادب میں فیض جیسے کم شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ مجھے فخر و مسرت ہے کہ میں ان کے نیاز مندوں اور عقیدت مندوں میں شامل ہوں۔

وہ بڑے منکسر المزاج انسان ہیں۔ ان کی ہر تصنیف بہترین انگریزی کی بھی تفسیر ہے۔ وہ حلقوں میں بھی مقبول ہیں، عوام و خواص میں بھی مقبول۔ فیض کو اپنے دیس و ملک سے جنون کی حد تک محبت ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہے کہ وہ مسلمان قوم میں پیدا ہوئے جس کی ناقدری اپنے محسنوں کے ساتھ ایک روایت بن چکی ہے۔

فیض بطور شاعر ہی نہیں ایک حوصلہ مند اور دلیر انسان بھی ہیں۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانی کے عالم میں بھی میں نے انہیں ہمیشہ مسکراتے دیکھا ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے غم میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں اور ان کی خوشیوں اور مسرتوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اصل میں ان کی شخصیت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

79: ن۔م۔ راشد

عہد حاضر کے شاعروں میں فیض تنہا شاعر ہے جو اپنے تجربات سے نالۂ حسن کا ایک پُرجوش بہشت پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن جس نے حسن اور وصال کے تمنا پرستوں کے ساتھ بار حقیقت کی ایک تلخی بھی دیکھی ہے۔

80: نسیم قریشی

لیکن جو چیز فیض کی بلند شاعری میں روز بروز ایک خاص نوعیت اور برتری حاصل ہوتی جا رہی ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فیض کا لب و لہجہ ان کی زندگی کے مدارج طے کرتا رہا اور بہت جلد آنے والے بہتر زمانے کے میر کارواں بن کے نظر آئیں گے۔ فیض کے یہاں فکر و لفظ کا ایک بلند اور مخصوص انداز ہے جو جذب کر دینے والی معنویت سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور ان کی ہر تحسین کاری کے ساتھ ایک تخیل کی ہمت بھی پیش کرتے ہیں۔ ہر خیال کی گہرائیوں میں ایک تخلیقی حسن ہوتی ہے اور ایسے کلام کو جمالیاتی لطف کے لیے

عربوں کی دعوت دیتا ہو یا سے اونچے ادب کا کلام ہو جو آج ہے اور فیض کے یہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جو کلام کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فیض بات کو بہت بھرپور انداز میں پیش کرنے کا ہنر ماہرانہ طریقہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں آفاقیت کی ایک جھلک ملتی ہے۔

1874ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے اردو شاعری کے نئے رجحان میں نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ یہ جدید شاعری کی تاریخ میں ایک طویل انقلابی عمل کی تمہید تھی۔ حالی نے اسے واضح اصلاحی مقصدیت سے آشنا کیا۔ چکبست، سرور، اقبال اور جوش کے یہاں یہ مقصدیت بہت زیادہ وسیع اور زیادہ ولولہ انگیز اور زندگی کے حالات و مسائل سے زیادہ مربوط ہو گئی۔ تخیل آزادی سے پیچھے ان کا نقطہ نظر تھا سامراج سے جنگ، غریبی، بدحالی، سیاسی حریت، اشتراکیت اور جمہوریت کے تصورات کی پذیرائی تھی۔ آزادی کے بعد حالات سے پیدا ہونے والی مایوسی، جھنجھلاہٹ، انتشار سے گھبرا کر ہوئی تنقید سے قطع نظر ان کے سامنے ایک مستقبل کی تعمیر کا ولولہ تھا۔ اس منزل کی تلاش جو جنگ آزادی کے دوران میں جنت محسوس ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں ان شاعروں کے علاوہ جن کا ذکر ہو چکا ہے فراق، مجاز، جذبی، سردار جعفری، ساحر، مخدوم محی الدین اور اختر الایمان کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

81: یاسر عرفات (صدر مجلس عاملہ تنظیم آزادی فلسطین و عمومی رہنمائے قوت انقلاب)

ہم فلسطینی عرب آپ کی عظیم شخصیت سے ایک بے باک اور انقلابی مجاہد وطن جس نے اپنے عوام کی اور ان آزادیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والا شاعر سمجھتے ہیں جو قومیں اپنی آزادی، ترقی اور آسودگی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ہم آپ کی دوستی، آپ کے شعور کی پختگی، فلسطینیوں کے مسئلہ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے اور فلسطینی عربوں کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے آپ کی کوششوں پر فخر کرتے ہیں۔

آپ کے وہ اشعار اور کلمات جن میں سچائی اور خلوص ہے، جو آپ نے فلسطینی قوم اور انقلاب فلسطین کے بارے میں کہے ہیں، ہمیشہ باقی رہیں گے اور زندہ رہیں گے۔ ہمدردی، محبت اور خلوص کے نمونے کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔

82: یوسف حسین خاں

فیض ہماری زبان کے چوٹی کے شاعروں میں ہیں جنھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ فیض کی غزل میں ایک نئے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے جدید تقاضوں کو غزل کے پرانے رموز میں بڑی خوبی سے سمویا ہے اور اپنے حسن ادا سے شعر کا جادو جگایا ہے۔

۔۔۔

ڈاکٹر آفتاب احمد، فیض احمد فیضؔ، شان الحق حقّی، افتخار عارف اور احمد مقصود حمیدی

فیضؔ صاحب اور سجاد ظہیر

فیضؔ اور یاسر عرفات

فیضؔ ہندوستانی نائب صدر (بعد میں صدر) ڈاکٹر رادھا کرشنن اور پاکستان کے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان
کے ساتھ ایک مشاعرے میں، دہلی 1955ء

افتخار عارف، نیومی لیزارڈ، فیض احمد فیضؔ اور فراز

لاہور ریلوے اسٹیشن پر فیضؔ کا استقبال، لندن سے واپسی پر 26 فروری 1964ء

پروفیسر فتح محمد ملک، زاہد ملک، فیض احمد فیضؔ اور شورش ملک

افتخار عارف اور محمد علی صدیقی، فیض احمد فیضؔ کے ہمراہ

فیضؔ صاحب بیچ میں ایک طرف گوپی چند نارنگ ہے، دائیں اور بائیں جانب اُپیندر اشک اور جینندر کمار ہیں۔
پرلی طرف نیاز حیدر دیکھے جا سکتے ہیں

پاکستان ٹائمز کے دفتر کے باہر، بائیں سے: احمد ندیم قاسمی، فیضؔ، اقبال سنگھ، ایلس فیضؔ۔1957ء

بائیں سے: کرنل فقیر وحید الدین، صادقین اور فیضؔ 1965ء

فیضؔ چلّی (جنوبی امریکا) کے شاعر پابلو نرودا کے ساتھ، سوچیؔ، بحیرۂ اسود، جارجیا، 1962ء

فیض اور فلمی اداکار دلیپ کمار

زہرہ نگاہ، افتخار عارف، فیض احمد فیضؔ، اوپندر ناتھ اشک، شہرت بخاری، ڈیوڈ میتھیور، عبداللہ حسین، محمد علی صدیقی اور عاشور کاظمی

فیض احمد فیضؔ، سنجے دت، نرگس، فیض بیدی، خواجہ احمد عباس، وحید اختر، عزیز قیسی، حسن کمال اور شہریار

افتخار عارف، افتخار قیصر، فیض احمد فیضؔ، اعجاز احمد اعجاز اور احمد فراز

فیضؔ شاعر مصطفیٰ زیدی کے ساتھ،لندن1960ء

فیضؔ اور سجاد ظہیر

نیومی لیزرڈ، فیض احمد فیضؔ اور شوکت علی

عارف، فیض احمد فیضؔ کے ساتھ برلن میں
عارف کے گھر پر (آخری ملاقات)

اردو مرکز لندن۔فیض صاحب تقریر کررہے ہیں۔اسٹیج پرضیاءمحی الدین، زہرہ نگاہ اور افتخار عارف

اردو مرکز لندن کے زیر اہتمام اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز(SOAS) لندن یونیورسٹی میں احمد فراز کی کتاب کی تقریب رونمائی

اردو مرکز لندن میں افتخار عارف کی کتاب مہر دو نیم کی تقریب رونمائی میں اعجاز احمد اعجاز، جوہر زاہری، عبداللہ حسین، افتخار
عارف، فیض احمد فیضؔ، فاروق حیدر، سردار املوک سنگھ، اطہر راز اور شاہدہ احمد

فیض، ایلس فیض کے ہمراہ
راولپنڈی سازش کیس سے رہائی کے فوراً بعد 1955ء

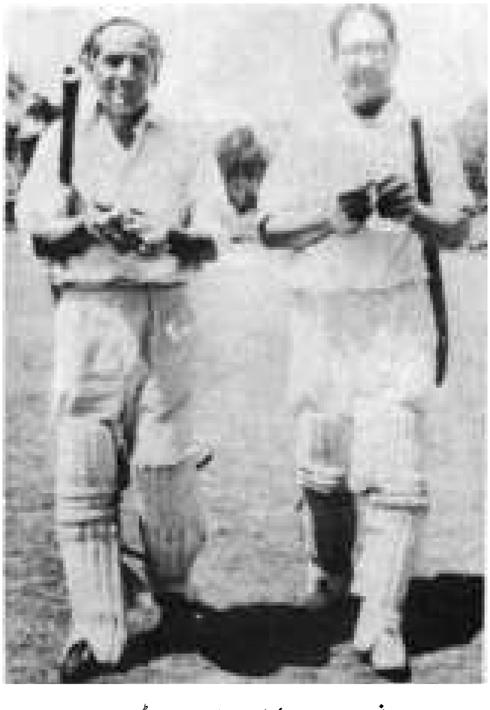

فیض، پاکستان ٹائمز کرکٹ کلب کے بیٹسمین
کی حیثیت سے فیلڈ میں ۔1956ء

فیض کی زیرِ قیادت پاکستانی صحافیوں کا وفد پیکنگ میں چین کے وزیرِ آعظم چواین لائی کے ساتھ (1956)
پہلی صف داہیں سے میر خلیل الرحمٰن، چواین لائی، فیض، محسن علی، مختار زمن۔ پیچھے احمد ندیم قاسمی، عمر قریشی، مولوی اختر علی، ظفر نیازی اور دوسرے

بائیں سے فلمسٹار راج کپور، سلطانہ جعفری، فیض، سردار جعفری، عصمت چغتائی اور محمد زبیر

کل پاکستان پوسٹ مین یونین کے صدر کی حیثیت سے
لاہور میں کل پاکستان پوسٹمین یونین کے ایک اجلاس میں فیض کی صدارتی تقریر 1949ء

ریلوے مزدور یونین کے نائب صدر کی حیثیت سے
ریلوے مزدور یونین کے جلسہ منعقدہ لاہور میں فیض تقریر کر رہے ہیں 1948ء

فیض احمد فیض، حیدر آباد جیل سے کراچی منتقل ہونے پر، جناح ہسپتال کراچی میں

فیض، اوپن ایئر تھیٹر لاہور میں فن کار زوبی اور ان کی تخلیق مجسمہ فیض کے ساتھ 1949ء

فیض احمد فیضؔ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ

بائیں سے: فیضؔ، سلیمہ، مُنیزہ اور ایلس۔ لاہور 1951

فیضؔ اور ایلس، بیٹی سلیمہ، نواسہ علی، یاسر، عدیل اور نواسی میرا۔ لاہور۔1978

فیض احمد فیضؔ اور ایلس فیض

فیض کی شاعری

(تشریح، تجزیہ، تبصرہ)

شاعری کی نفسیات اور شعر کے وجود پذیر ہونے سے ادب میں نئے مفروضے اور نئی تصوریاں نظر آتی ہیں۔ اگرچہ ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو صدیوں کے مقامی اور ذہنی تصادم سے وجود میں آتا ہے، لیکن پھر بھی شاعری کا تخلیقی عمل تقریباً ایک طرح کا ہی ہوتا ہے اسی لیے مختلف دنیا کے ادبوں میں شاعری کے بارے میں جو نظریات ملتے ہیں وہ یکساں ہیں کہ شاعر دوسرے افراد کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے، وہ کائنات کا مطالعہ باریک بینی اور دقتِ نظر سے کرتا ہے۔ وہ اپنے اندرونی جذبوں کو جو معمولی سے خارجی واقعات یا تجرباتی مشاہدات سے پیدا ہوتے ہیں نہ صرف درک کر سکتا ہے بلکہ ان کو پروان چڑھا کر لفظوں کے ذریعے عدم سے وجود میں لاتا ہے اور اس طرح دوسروں کے جذبوں کو مشتعل یا متحرک کر دیتا ہے اور اس طرح چراغ سے کئی چراغ جل اُٹھتے ہیں اور انفرادی روداد اجتماعی للکار بن جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیضؔ کی شاعری میں اردو ادب کے کئی بڑے شاعروں کے کلام کی چھاپ موجود ہے جن میں میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، نظیرؔ، انیسؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، اخترؔ شیرانی کے علاوہ فارسی کے حافظؔ، خسروؔ، عرفیؔ، بیدلؔ، عربی کے ابوالقیسؔ، ابوتمامؔ، ابونواسؔ اور مغربی شعرا میں براؤننگ، کیٹس، شیلے، ہارڈی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں میں وہ شعرا جن کا مقامی لسانی اور ذہنی مزاج فیضؔ کے مزاج سے قریب تھا، اُن کا اثر گہرا ہے، چنانچہ پہلے شعر سے آخری شعر تک غالبؔ کے اثر کو فیضؔ کے کلام میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

(1928ء)

سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
"بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے"

فیضؔ کی ابتدائی شاعری میں مغربی شعرا کی شاعری کی ہلکی رنگت دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ رنگت اور مضمون نگاری زیادہ تر رومانی شاعروں کے جمالیاتی رخ سے مشابہت رکھتی ہے جن میں حسینۂ خیال سے، تنہائی اور دوسری کئی علامتی نظموں پر خاص مغربی شعرا کے نقوش موجود ہیں۔ اردو ادب کے مختلف ادیبوں، ناقدوں، شاعروں اور دانش وروں نے فیضؔ پر مغربی شاعروں میں براؤننگ، تھامس ہارڈی، کیٹس، آرتھر سائمنس، رابرٹ فراسٹ، شیلے، بائرن اور ورڈزورتھ کا اثر محسوس کیا ہے۔ فراقؔ گورکھپوری اپنے شاہکار مقالہ "اردو کی

"عشقیہ شاعری" میں لکھتے ہیں:

"فیض اس لحاظ سے انگریزی رومانی شاعری سے بہت قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی شاعری کی بنیادیں اپنے وقت اور اپنے زمانے کی انقلابی اقدار پر قائم ہیں۔ فیض نے ایک نیا دبستان شاعری قائم کیا۔ انھوں نے جس بصیرت افروز حسن کی وسعتوں اور فن کا مادہ چابک دستی سے عشقیہ واردات کو زمانے کے سماجی مسائل سے منسلک کر کے پیش کیا، یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز ہے اور قابل قدر بھی۔"

مجتبیٰ حسین "سرخ سیاہ" مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہماری جدید شاعری میں فیض کی آواز بالکل نئی تھی اور اس آواز سے اردو شاعری پہلی بار مغربی شاعری کی غنائیت (Lyricism) سے آشنا ہوئی۔ یوں تو مغربی ادب کے اثرات فیض سے بہت پہلے ہی قبول کر لیے گئے تھے مگر اردو شاعری پر تمام مغربی اثرات اور نئے تجربات کے باوجود اس کا کلاسیکی مزاج غالب تھا۔ فیض کی شاعری ان تمام روایات، تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے خالی ہونے کی بجائے ہماری شاعری میں نئی معنویت یا قدیم موضوعات کے ساتھ مستعمل تھیں۔ فیض کے لہجے کی نغمگی اور غنائیت اردو فارسی شاعری سے مختلف تھی۔ فیض کے لہجے میں جو نرم سا مزاحمت "بربریت" اور غنائیت کی جگہ "نرم ملائمت" اور "ہلکی ہلکی آنچ" کی کیفیت نے لے لی ہے، یہ ابہام کی کیفیت اس میں وہی غنائی اور نغمگی کی کیفیت ہے جو Eliot. Yeats اور دوسرے مغربی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ یہ چیز فارسی اور اردو شاعری کو نہیں ملا ہے۔ ہندوستان میں ٹیگور کے یہاں البتہ مل جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں موضوع سے زیادہ وہ فضا اہم ہے جو موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ فیض کے یہاں ایک رچاؤ اور حسن تصور Lyric of Imagination پایا جاتا ہے۔ ان کے لہجے کی جذباتی کشش ان کے ہر مصرعے کو ایک ذہنی تصویر عطا کرتی ہے:

جو رکی ہاتھوں کا بے کار دیکھا ہی ہو
نیلی کرنا ہو کہ جو بستے میں ڈھلتی ہی نہیں
پلی کے ہر ایک ڈھانوں سے نکلتی ہی نہیں"

کلیم الدین احمد اپنے مضمون "فیض" میں نظم "تنہائی" پر لکھتے ہیں:

"یہ نظم مادام ہی کی ایک نظم ہے "دی بروکن ٹرسٹ" میں نہیں کہہ سکتا کہ فیض نے اس نظم سے شعوری طور پر استفادہ کیا ہے یا نہیں۔ کا ایک حصہ ہے: انھوں نے اپنے دل کو تسلی دی اور کہا بے قرار مت ہو وہ آ رہی ہے وہ شخص ابھی ابھی وہ آتی ہے وہ اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی دل بار بار۔ دیکھو وہ آ پہنچی، مگر کوئی صورت نظر نہ آئی۔ گھنٹوں کے بجنے کی بھاری آواز وقت گزرنے کی اطلاع دیتی رہی اور امید باقی نہ رہی۔ میں نے سوچ بھی نہ سکتا تھا، سوچنے سے یاس میں زیادتی ہوتی۔ مشابہت ظاہر ہے، مرکزی خیال ایک ہی ہے اور یہی مرکزی خیال ہارڈی کی نظم "دی بروکن اپائنٹمنٹ" میں بھی ملتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ فیض نے ان نظموں سے استفادہ کیا ہے یا نہیں، اگر استفادہ کیا بھی ہو تو انھوں نے اس مرکزی خیال کو اپنا لیا ہے اور اس کے بیان میں انفرادی شان پیدا کی ہے۔"

ڈاکٹر ہما منظور لکھتی ہیں:

"فیض نے بعض انگریزی شاعروں کے طرز فکر سے متاثر ہیں۔ ان کے ذہن کے بعض گوشوں کی چاشنی میں بھی انھوں نے ان شاعروں کے طرز ادا سے اثر قبول کیا ہے۔ نظم "تنہائی" آرتھر سائمن کے بروکن ٹرسٹ (Broken Trust) اور ہارڈی کی بروکن اپائنٹمنٹ (The Broken Appointment) کی یاد دلاتی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور فیض کی انفرادیت کے معترف اور سلامت اللہ خان فیض کی اقبال کے تتبع سے مماثل کرتے ہیں۔ ممتاز حسین، عبدالمغنی اور محمود ہاشمی نے فیض کو اقبال سے بہت قریب قرار دیا ہے۔ فیض بھی ان تمام شعرا کی طرح ایک فطری شاعر ہے۔ "نقش فریادی" میں فیض کی ایک نظم رومان کے جذبات سے لبریز ہے۔ اگرچہ یہ نظم رومانی جذبے سے سرشار ہے اور حسن آفاقی کا محدود تصور ہے لیکن آخر شیرازی و ارمان کے دیوتا سے مشابہ ہے جس کو فیض نے بعد میں جلد ترک کر دیا۔ فیض نے اس جمالیاتی کیفیت کو اپنے لہجے میں واضح کر کے چہرہ نما یہ کیف کا اثر پیدا کیا:

مجھے دے دے:

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حسن سے ظلماتِ دنیا میں نہ پھر آؤں
گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دے دے

فطری شاعر کچھ عام لوگوں سے دوسرے افراد کی نسبت حساس اور باریک بیں ہوتا ہے۔ وہ کائناتی مطالعہ میں ان دقیق چیزوں کو دیکھ سکتا ہے جنہیں عام آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور یہ مشاہدات اور تجربات کچھ عرصے تک اس کے لاشعور کے نہاں خانے میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر شاعر کو ماحول میسر ہو تو اس تصادم سے جذبات کا اظہار شدت سے شعر کی صورت میں بیک وقت لفظوں کا جامہ پہن کر کاغذ پر رقص کرنے لگتا ہے۔ یعنی جو منتشر اور بکھرے ہوئے تجربات، مشاہدات اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیات تھیں وہ سب کثرت سے وحدت میں ڈھلنے لگتے ہیں اور یہ تمام تخلیقی عمل شاعر کے لاشعوری نظام میں ایک منظم طریقے سے انجام پاتا ہے۔

فیض کی مشہور نظم "مجھ سے پہلی سی محبت" ان کی شاعری کے بنیادی فکر کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔ فیض نے یہاں رومان کا سفر کیا ہے۔ یہ مجاز سے انقلاب کا سفر ہے یہاں غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش ہے۔ اب تک جو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی تھا، سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ طلسم زندگی بھی ہے۔ یعنی یہ حسن کی رعنائی ہے تو کہیں پر کھردرا پن ہے ان دونوں میں تضاد ہے پھر شاعر کا مشاہدہ اور تجربہ یوں رقم ہے:

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

....

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

شاعر کے تخیل میں حسن کی بات رنگِ رخسار کے غازے کے غباروں پہ [illegible] کے ساتھ ہوتی ہے تب دیکھنے والے پسند بھی کرتے ہیں۔ روایتی شاعری کی دنیا، اس کا مضمون، اس مضمون سے الگ معنی سب کچھ یہی ہے محبوب کا آنچل، وہ بدن جس کے رنگ سے گلشن مہکتا ہے، وہ جس کے رخسار پہ ہلکا غازے کا غبار ہے، جس کی زلفوں میں چمکتا ہوا تارا ہو، وہ جس کے صندلی ہاتھوں پہ مہندی کی نقاشی اور جس کی آنکھوں میں وہ کاجل کی لکیر سب کچھ ہے۔ لیکن شاعر یہ سوال کرتا ہے کیا؟

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

یہاں اگر اس شعر کو ایسے انداز میں پوچھا جائے کہ اس کا جواب "ہے" ہوگا اور اگر یہی انداز میں پوچھا جائے تو جواب نفی میں ہے کہ۔ اس لیے شاعر فوراً بتا دیتا ہے کہ حسن کی دنیا سے صورت اور زیست کی حقیقت زیادہ [illegible] ہوتا ہے جہاں عوام بھوک سے مرنے کی دعا کرتے ہیں، جن کے کھیتوں میں صرف بھوک کی فصل اگتی ہے، جہاں [illegible] کی گردن [illegible] کے اندر تک جاتا ہے جوانی کے چراغ [illegible] احساس کے شعلے بجھا دیے گئے ہیں۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

شاعر [illegible] وہاں بھی [illegible] ہونا چاہیے [illegible] ہے [illegible] اور مقصد سمجھتا ہے لیکن اس کے تحت وہ جب شاعری میں [illegible] پیدا کرتا ہے [illegible] کی طرح طے کرتا ہے [illegible] فیض کی آواز رہی ہے۔

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

فیض کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان کا بحیثیت ایک فطری شاعر مطالعہ کیا جائے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں کس حد تک کامیاب رہے۔ شعر کی تخلیق اور شاعری کی مسرت کو کشش کا سبب بتایا گیا ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قدیم زمانے سے شاعری کو ایک الہامی یا تخلیقی فن (کسی کا دیا ہوا یا غیب سے عطا شدہ) سمجھا جاتا رہا ہے۔ افلاطون نے شعر کی تخلیق کو الہامی طاقت یا غیبی قوت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ارسطو نے اسے تخیل کا کرشمہ اور تطہیر نفس کا عمل بتایا ہے۔ مغرب کے اکثر بڑے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں نے شعر کو الہامی، غیبی اور غیر مرئی Muses طاقتوں کا عطیہ مانا ہے۔ اردو شعر و شاعری میں بھی غالب کی زبان سے اس غیبی قوت کا اقرار ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تو کہیں یہ اقبال اس تخلیقی طاقت کی ارزانی کی دعا کرتے ہیں:

اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
گم نام کو اعجاز بیانوں میں بقا کر

اور اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

یہاں فطرت سے مراد شاعر کی جبلی اور ذاتی طاقت ہے جو شعوں کے بالائی حصے سے خیال کی تزئین کرتی ہے۔ اور یہ قوت جتنی زیادہ ہوگی شعر کی تخلیق اتنی ہی نادر اور عمدہ ہوگی۔

فیض کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خارجی واقعات اور ماحول نے ظلم و تشدد کے اثرات جب ان کے ذہن کو پوری طرح سے مشتعل کر چکے ہوں اور ان کی بیرونی دنیا کو منتخب کیے۔ جب انھوں نے اپنی قلبی واردات کو شعر میں ابھارا۔ انھی نے بھرپور خارجی اثرات کو منظم کیا۔ یعنی کہ ان تجربوں اور مشاہدوں سے پیدا ہونے والے داخلی اور قلبی جذبات کو نظم کیا جس کا اثر شعر وجود ہونے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے اور یہی فیض کا تخلیقی عمل انھیں ایک تاثر اور ایک خاص لہجہ عطا کرتا ہے۔ فیض کے کلام میں الہامی نہیں، آورد زیادہ ہے۔ فیض کی شاعری کے مطالعے سے ہمیں احساس کی شدت، سچے جذبوں کا خلوص اور عمومی زندگی کی خواہشوں کی ترجمانی و ترغیب ملتی ہے۔ ان کی نظم ہو کہ غزل و قطعہ سب میں جمال اور جلال کی آمیزش سے زندگی کے مسائل کی آرائش موجود ہے۔ فیض کے یہاں مستقل ارادہ، پختہ عزم، اور جذبہ ان کے اشعار کے لبوں سے مترنم گونج رہا ہے۔

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

....

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

....

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

فیض کے پاس داخلیت تو ہے مگر وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے احتجاج میں قومی، ملکی اور غیر طبقاتی رنگ شامل ہے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ فیض اپنی جوانی کے دور میں صرف رومانی شاعری کیا کرتے تھے، کیوں کہ وہ عشق میں مبتلا تھے جس کا ذکر انھوں نے زندگی بھر کیا ہے کہ رشید جہاں نے کہا:

''چھوڑو یہ عاشقی کا چکر وغیرہ۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ دنیا کے دکھ جو ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمھارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے''۔ اور انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ اپنا غم جو ہے وہ تو بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے عوام کی بہتری کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اپنے لیے ہی سوچتے رہو گے، یہ تو خود غرضی ہے نا۔ ہمارا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا''

فیض نے اگرچہ ''نقش فریادی'' [illegible] کے ذریعے یہ اعلان بھی کیا کہ غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف مڑ رہے ہیں مگر یہ نہ ہو سکا۔

عزیز احمد اپنی معروف کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں:

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فیض ایک طرف تو خود سے سوال بھی کیا کرتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں:

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

مخدوم محی الدین کی موت پر فیض نے غزل کہی:

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب

ہم جانتے ہیں کہ شاعری میں اصناف فنی سہولت سمجھنے اور سمجھانے کی آسانی کے لیے ہیں، یہاں ہر شاعر کی شاعری کے تجربے سب یہ تمام اصناف فنی اپنی سرحدیں توڑ کر ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک صنف کا جائزہ شاعر کے کلام کے ساتھ انصاف نہیں، اسی لیے ضروری ہے کہ فیض کی نظموں، غزلوں اور قطعوں پر یکساں روشنی ڈالی جائے۔ شاعری کی روح تغزل ہے اور فیض کی نظم بھی قصیدہ غزل سے عبارت ہے۔ آج تک پوری طرح یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی غزلیں نظمیں ہیں یا ان کی نظمیں ہیں۔ اسی طرح مختلف موضوعات میں بھی ہر موضوع اپنے آپ منفرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت ہو یا مرثیہ یا سوختہ ہو کر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کی ... اور حکایت ہر موضوع کا مرکز جانتا ہے۔ ان وجوہ سے فیض کا کلام زبان زدِ عام بھی ہے اور کئی تحقیقی کتابیں ... کے شعرا میں سب سے زیادہ ان کا کلام گایا بھی گیا ہے۔ ہم یہاں طوالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صرف قطعات پیش کریں گے جو خوبصورت آپ تذکرہ ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

....

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

....

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

....

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

نعت کی ہیئت کا انداز دیکھیے جس میں بندگی کو عبادت کہا گیا ہے:

ملا ضمیر بندگی بھی : شکر جس ملا ہے ادا مجھے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں : تنگ دستی کا کیا گلہ مجھے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے ، ان کو تشویشِ روزگار کہاں
کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی : نقدِ شمس و قمر کی بات کرے

دعا کا پیرہن دیکھیے:

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیِ فردا بھر دے
جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے

جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے ، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

نعت کا موضوع دیکھیے: فیض کی نعت فارسی میں پانچ اشعار پر مشتمل ان کے مجموعہ "نسخہ ہائے وفا" کے آخری صفحہ پر موجود ہے۔ راقم نے فیض تحقیق میں اس پر علیحدہ مضمون لکھا ہے جہاں حرف حرف وار ترجمے کے ساتھ پیش کر دیے ہیں جس میں حضرت اور حرم کا مضمون باندھا گیا ہے:

خواجہ بہ تخت بندۂ تشویش ملک و مال
بر خاک رشکِ خسروِ دوراں گدائے تو
آنجا قصیدہ خوانیِ لذاتِ سیم و زر
اینجا فقط حدیثِ نشاطِ لقائے تو

"جو حکمراں تخت پر بیٹھا ہے وہ دولت اور ملک گیری کا غلام ہے جب کہ آپ کا فقیر جو خاک پر بیٹھا ہوا ہے شہنشاہِ وقت کا رشک بن چکا ہے۔ حکمرانوں کی قصیدہ نگاری سونے چاندی کے لالچ کا باعث ہے جب کہ آپ کی مدح دل سے نکلے ہوئے عقیدت کے پھول ہیں"۔

فیض نے ایک بہتر (72) بند کا مرثیہ بھی تصنیف کیا ہے جو "شامِ شہرِ یاراں" میں موجود ہے۔ اس مرثیہ میں بھی موضوعی طور پر فیض نے انسانی حقوق، حق و باطل کی جنگ میں حق کا ساتھ دینے کی ضرورت اور اہمیت پر اشعار لکھے:

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

فیض کی غزلوں اور نظموں کے اشعار عوام اور خواص پسند ہیں۔ فیض کے اشعار سے اُن کے طرفدار اور اُن کے مخالف دونوں محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ فیض شعر کے کوزے میں مضمون کے سمندر کو نہ صرف سمو دیتے ہیں بلکہ اُس میں تلاطم بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

راولپنڈی سازش کیس کا جواب صرف ایک ہی شعر میں دیا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

حالی غالب کے اس معروف شعر:

جب مے کدہ چھٹا تو رہی کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کی تشریح میں کہتے ہیں، عمدہ شعر وہ بھی ہے جس میں اصل لفظ "چھٹے" کے استعمال کے بغیر تمام مطلب ظاہر ہو جائے۔
چناں چہ فیض کے شعر میں اصل لفظ "سازش" تھا، جسے انھوں نے استعمال کیے بغیر مطلب ادا کر دیا۔
فیض نے جو مجاز سے حقیقت، غمِ جاناں سے غمِ دوراں کا سفر کیا وہ بھی پوری کتاب کا موضوع ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض جانتے تھے ہر نوع کی شاعری جس میں نعرہ بازی یا احتجاج کی خشکی سے دوری اختیار کر کے جمالیاتی سرور کی شراب کا اثر رکھا گیا ہے، وہ مشکل سے دستیاب ہوتی ہے۔

بجا کہ مفت لٹا رہی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مے لالہ فام کہتے ہیں

فیضؔ رجائیت اور حوصلے کا شاعر ہے۔ فیضؔ ناامیدی کے بجائے ہمت و حوصلے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فیضؔ استعاروں، اشاروں اور علامتوں میں بات کرتا ہے۔ فیضؔ مقصد کی تکمیل کو اپنا ہدف بناتا ہے کہ اگر وہ بہت کچھ آنے والے عشروں میں دیکھیں گے تو فیضؔ کو یقین ہے کہ ان کی طرزِ فغاں گلشن کی طرزِ بیان ہو گی۔

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

....

فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

....

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کہاں

. ...

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

....

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیضؔ کی ایک نظم "زنداں کی ایک شام" میں زندگی کی تیرگی، اس کی ظلمات اور اس کی تلخیوں کی کیفیت کا اظہار اور شمعِ زندگی کو بجھانے والی جبر و ستم کی بھیانک طاقتوں سے مقابلے کا حوصلہ ملتا ہے جو انسان کی حیات کے لیے تحفہ کا کام ہے:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا ؟
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

فیضؔ کے کلام میں جہاں زندگی کے حسن اور جمال کی کیفیتیں ہیں جنھیں ہم اچھی طرح سے محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ فیضؔ نے زندگی کے فلسفے پر عمل کر کے زندگی کے مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی تلخی کی ترجمانی اور شکست سے کہیں زیادہ عزم اور ارادہ سے بلند ہے جس میں جمالیاتی اور رومانی قدروں کو اہمیت اس لیے بھی دی گئی ہے کہ وہ حقیقت نگاری کی ترجمانی کرتی ہیں۔

فیض کی غزل ہو کہ نظم یا قطعہ، ان کی تشبیہات اور استعارات کا تعلق قوتِ باصرہ اور شامہ اور چھونے کی حس سے ہے۔ بعض تشبیہیں اور تلمیحیں تو کئی محسوسات کا مرقع معلوم ہوتی ہیں۔ نادر، آسان فہم اور دل آویز علامتوں کا حسن تو فیض کی شاعری کی اہم خصوصیت بن چکا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ فیض کی ذہنی نشوونما اور انقلابی رویئے کی تعمیر میں کم از کم تین عالمی اور مقامی واقعات کا بڑا دخل تھا۔ پہلی جنگِ عظیم 1914ء میں، 1939ء میں دوسری عالمی جنگ اور 1947ء میں ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات نے ان کی شاعری میں نئی جہتیں پیدا کیں اور فیض کے نئے لہجے کی تراش خراش میں مددگار ثابت ہوئے۔ اس بات کا اقرار اور انکشاف پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے تناظر میں ان کے ہم عصر جدید شاعر ن۔ م۔ راشد نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ''نقشِ فریادی'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''فیض کا شعور ہمارے تمام جدید شاعروں سے بڑھ کر تاریخ کی بے پناہ قوتوں کا شعور رکھتا ہے۔'' یہ بھی سچ ہے کہ فیض نے اپنے دور کے تاریخی عمل، فکر اور شعور کے ساتھ شعری روایات کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔

فیض کے بعض تنقید نگاروں نے انہیں داخلیت پسند شاعر بتایا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے لیکن یہ صرف فیض کی حد تک محدود نہیں۔ ہر بڑا شاعر داخلی واردات اور اندرونی جذبات کی عکاسی کی وجہ سے بڑی شاعری کی صف میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ جب خارجی مشاہدات اور بیرونی تجربات شاعر کی اندرونی دنیا سے تحلیل کرتے ہیں اور شاعر کے باطن میں جذبات اور محسوسات کا آتش فشاں تخیل کی صورت میں پھوٹ پڑتا ہے تو شعری آمد کو کوئی قوت روک نہیں سکتی کیونکہ ان تمام عناصر پر شعور بے بس ہو جاتا ہے۔ بقول فیض جب تک کوئی تجربہ شاعر کی شخصیت کا جزو نہیں ہوتا اسے شاعری میں نہیں ڈھالا جا سکتا اور اگر اسے منظوم بھی کیا جائے تو وہ شاعری تاثیر سے خالی ہوگی۔

فیض کی نظم ہو کہ غزل یا قطعہ ان کا لہجہ جو مشاہدے اور تجربے کی آنچ سے رنگین ہے آسانی کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔ جب کہ نظم اور غزل میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ نظم شاعر کا انفرادی تجربہ ہوتی ہے، اگرچہ اس کے مطالب اور مسائل اجتماعی کیوں نہ ہوں اس کے مقابلے میں غزل میں اجتماعی تجربہ ہوتا ہے جب کہ اس کے مطالب اور مسائل انفرادی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی وجہ سے مختلف غزل گو شاعروں کے درمیان ہم زمینی آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے، یعنی ایک شاعر کے غزل کے اشعار پڑھ کر اسی رنگ کے دوسرے شعرا کے اشعار کی یاد آنے لگتی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ غزل کا ہر شعر خود علیحدہ اکائی ہوتا ہے، جب کہ نظم میں یہ سہولت میسر نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی شاعر کے انداز بیان کو اس کا لہجہ بھی کہتے ہیں اور دنیا کے عظیم شاعروں نے اپنے مخصوص لہجے پر ناز بھی کیا ہے۔ حافظ شیرازی نے کہا تھا:

بدیں زمانہ نشد کس حریف فریادم
بہ بلبلاں چمن ہم گرفتہ دم

''شاید کوئی میرے لہجے کا ہم آواز ملتا، اگرچہ میں نے بلبلوں کے لیے اشعار روانہ کیے تھے''۔

میر نے کئی طرح سے اپنی شاعری اور انداز پر خود ستائی کی۔

مستند ہے مرا فرمایا ہوا

....

اوّل تو میں سند ہوں اور یہ زبان میری

میر کے انداز کی دوسرے شعرا نے بھی تائید کی:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل پہ مارا

....

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منہ پر

....

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ایک طرف تو سب نے میر کا تتبع کیا:

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

تو دوسری جانب سے ایک نئے جوش کا اظہار کیا:

نہیں چمن میں کوئی گل کوئی ویران کھل گیا
کلیاں جن کی مرے نے غزل خوش ہو گئیں

علامہ اقبال نے بھی کہا تھا:

اڑائی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

اسی طرح جب ترقی پسند تحریک کی زد میں برصغیر کے شعر و شاعری کے جھنڈے گاڑے جانے لگے تو فیض احمد فیض نے بھی کہا:

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

پروفیسر فتح محمد ملک "فیض کی شاعری ایک مطالعہ" کے "حرف اوّل" میں لکھتے ہیں:

"جب حسرت موہانی نے فیض سے اعتراض کرتے ہوئے یہ پوچھا کہ سردار جعفری کی شاعری پر آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ وہ آپ کے رنگ میں شعر کہتے ہیں؟"

معلوم نہیں حسرت کا ذہنی رجحان یہ تھا کہ سردار جعفری فیض کے رنگ میں شعر کہتے ہیں یا انھیں فیض کو Dominate کرنے کے لیے انھوں نے ایسا کہا لیکن ان کے اس سوال کے جواب میں فیض صاحب نے جو کچھ کہا وہ خاصا معنی خیز ہے۔ انھوں نے کہا: ہمارا رنگ تو اب ایک عمومی رنگ بن گیا ہے، کسی کا ذاتی نہیں رہا۔

گویا فیض نے دبی زبان سے اس بات کی تائید کی کہ سردار جعفری واقعی انھی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ فیض صاحب نے یہ بات کہہ کے بطور شاعر اپنی حیثیت کو محسوس کیا۔ فیض بطور شاعر کے جب یہ کہتے ہیں کہ

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

قاری کے نقطۂ نظر سے یہ بات بھی محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ خود نقاد بن کر کہتے ہیں کہ وہ رنگ تو اب ایک عام رنگ بن گیا ہے اور دوسرے لفظوں میں نصرت کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ سردار جعفری ان کے رنگ میں شعر کہہ رہے ہیں اڑایا جاتا ہے"۔

بہتر یہ ہے کہ ہم اس پورے سوال اور جواب کو پڑھ کر نتیجہ اخذ کریں کہ فیض سے کیا پوچھا گیا اور کیسے کہا۔

"نصرت: سردار جعفری کے بارے میں یہ عام خیال یہ ہے کہ وہ صرف ایک انقلابی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ماحول کے خلاف ردِ عمل ہے۔ کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں یا وہ صرف انقلابی شاعر ہیں؟ ان کی شاعری میں اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟

فیض: لیکن ایسا نہیں ہے۔ شروع شروع میں تو انھوں نے صرف انقلابی شاعری کی۔ بعد میں ان کی شاعری میں بہت تبدیلی آئی ہے۔

نصرت: ان کی آج کی شاعری پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کے رنگ میں شعر کہہ رہے ہیں؟

فیض: ہمارا رنگ تو اب ایک عام رنگ بن گیا ہے۔ یعنی ہمارا نہیں رہا۔ دوسرے کوئی بھی رنگ کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتا بلکہ یوں ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ایک محاورہ، ایک خاص قسم کی تشبیہ، ایک خاص قسم کا استعارہ مقبول ہو جاتا ہے جس سے اس عہد کا مزاج بنتا ہے۔ کسی نے اس کو پہلے اختیار کر لیا اور بعد میں وہی رنگ عام ہو گیا"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض نے شعر کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی محنت کی۔

فیض اپنی بیگم ایلس کو 19 اگست 1953ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"بعض وقت یہ لگتا ہے کہ دل کو کوئی خوب چیز لکھنا مشکل ہے۔ اب جب بھی ذرا فارغ ہوتا ہوں تو شاعری میں لگا رہتا ہوں جو بڑا مشکل کام ہے اور اب لکھنے میں کچھ سہولت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ اب بھی برداشت سے متعلق تو کوئی ہوئی لیکن پہلے جیسا طویل اور اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ خرابی یہ ہے کہ Bloody Perfectionism کے طعنوں سے تنگ آ کر اب میں نے پہلے کی طرح الفاظ کو بنانے سجانے اور تراش خراش کا کام چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک بھی ہے کہ نہیں۔ یہاں کوئی ایسا شخص بھی نہیں جس کا مذاق اچھا ہو، اس لیے ہمارے سامنے ہر چیز کو زیادہ احتیاط سے دیکھنا پڑتا ہے"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"بہت محنت اور عرق ریزی کی ہے۔ پڑھنے والے کو کبھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ہر لفظ پر کتنی محنت صرف کی گئی ہے اور کسی لفظ کے آخری انتخاب سے پہلے کتنے سب متبادلات آزما کے رد کیے ہیں"۔

حیات اور فن پر فیض کہتے ہیں کہ

"حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ لیکن اس زندگی کا ایک جز اور اس جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا ایک دائمی کوشش ہے۔ یعنی مستقل کاوش۔ اس کاوش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا ہر حال میں ممکن بھی ہے اور لازم بھی"۔

فیض رجائیت پسند تھے انھیں قنوطیت سے سروکار نہ تھا۔ وہ انسان کی زندگی میں جدوجہد اور کامیابی کے خواہاں تھے جو ایک مثبت اور بہت متوازن نظریہ ہے۔ وہ مشکل ترین اور مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن تھامے رہتے تھے۔ "زنداں نامہ" کی

شریعت میں نرمی اور گتی نہ ہوتی بلکہ ان کی شخصیت کا اہم رخ بھی تھا۔ معاشرے کے ناہموار مسائل جب بہت زیادہ ہوں تو فیض پامال ہونے کے باوجود اپنے پاؤں پر پہاڑ کی طرح استوار کھڑے رہتے اور حالات کے آگے شکست تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر رنج، محنت، کڑواہٹ اور تلخی اور روشنی کی امید رکھتے تھے۔ وہ کام کبھی نہیں چھوڑتے اور شکست خوردہ نہ تھے:

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

....

سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض کی شاعری میں زبان و بیان کی خوبصورتی اور نغمگی موجود ہیں۔ فیض اہل لسانی اور فنی مسائل سے واقف تھے۔ یہی کے باوجود انھوں نے اپنے کلام سے ان الفاظ یا اصطلاح کو دور کرنے کی پابندی کی۔ یہ ایک بہت بڑا ایک طویل مضمون ہے۔ اس لیے ہم نے اسی کتاب میں علیحدہ تحریر میں ان کی نشاندہی اور تشریح کا ذکر بھی کیا ہے۔

فیض کی عمر کے ساتھ ان کی شاعری کا جوش و خروش اور نئے مضامین اور مطالب بہت کم ہوتے نظر آئے گئے۔ "نقش فریادی"، "دست صبا" اور "زنداں نامہ" کے بعد "دست تہ سنگ" اور "سر وادی سینا" میں تازگی کی وہ فضا نہیں رہی اور ہر جگہ کمی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری تین مجموعوں "شام شہر یاراں"، "مرے دل مرے مسافر" اور "غبار ایام" میں علامت، استعارات کی تراش خراش میں جدت کم اور لفظوں میں تکرار زیادہ ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وزیر آغا نے تحریر کیا "وہ نظم میں اجمال کی ایک مثال ہیں"۔ فیض "ٹوٹی ہوئی" اس کا مضمون بڑھتے عمر کا المیہ ہے۔ ہر ہوا فیض کے ساتھ دوستوں نے بہت حسن و تعلقات کا پاس ملحوظ قرار دیا۔ کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ وہ باتیں فیض کے وہ نغمے گونج رہے تھے جو خود موسیقاروں نے نبھایا کر رہے تھے کہ زیادہ تر فیض کی شاعری کے شیدائی تھے اور ان کا تعلق بھی زیادہ تر فیض کی شاعری کی جگہ کم جاننے والوں سے تھا۔ لیکن فیض کو اس کا احساس تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ غالب کا اسی (80) فی صد کلام ان کے مرنے سے تیس (30) سال قبل مکمل ہو چکا تھا۔ اردو کلام غالب کی شناخت بھی قرار پایا۔ حالی نے کہا، جب ان کے جذبات میں جوش و خروش اور احساس کی توانائی کم ہو گئی تو اپنی شاعری کے آہنگ کو بدل دیا۔ حسرت موہانی جن کی غزلوں کے مصرعوں سے حسن و عشق کی بو دینی جھلکتی ہیں۔ جب آخری عمر کو پہنچے تو ان کی غزل بھی خزاں رسیدہ گلشن کا سا ایک کیف بخشنے والا ماحول پیش کرنے لگی:

گلشن کی تمنا میں ہم نے جوانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

اس کا مطلب یہ نہیں کہ فیض کے پاس اجمال یا مضمون کی جستجو تھی بلکہ یہ تحریر ایک بڑے شاعر کی داستان ہے۔ کیونکہ یہ قابل ہونے کا دور ہے۔

حاصل عمر سے تحقیق پیش ہے
خاص طور پر، تحقیق شعر و سخن

یعنی میری زندگی بھی نظموں میں بیان کی جا سکتی ہے جس خام مواد کو میں نے ادھر ادھر کر دیا۔

کسی بھی شاعر کی شاعری کی اہمیت اور عظمت کا اصل تعین وقت کرتا ہے۔ تین صدیاں گزر جانے کے باوجود میر تقی میر آج بھی اردو کے خدائے سخن ہیں۔ ڈیڑھ دو صدیوں کے بعد غالب اور غالب کی غزل اور مرثیے کے شعر زبان زد عام مانے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے عظیم شاعر محمد اقبال پر اب ساٹھ ستر سال میں پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں تصنیف اور تالیف ہو چکی ہیں۔ آج فیض کی سو سالہ سالگرہ ساری دنیا میں منائی جا رہی ہے اور ایک اندازے کے مطابق اس سال دو سو سے زیادہ جلسات، سیمینار کو نفرنس فیض کی شخصیت اور فن اور ان کے آدرش پر کام کر رہی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض اس دور کا زندہ شاعر ہے اور یہ دور فیض کا ہے۔ اگرچہ فیض کی زندگی میں ہی ان کا احساس ہو چکا تھا۔ اس سے ان کی آواز کو ان کے گلے ہی میں گھونٹ دینے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ ان کے شعری موضوعات، شعری پیغام اور روشن پیغام کو جرم قرار دیا گیا اور ان پر کھل کر اعتراضات کیے گئے لیکن ان مجنوں کا حرفِ جنوں آزادی کے دیوانوں کا حرف بنا۔ جن کی دھمک کے بیچ مرکزی خوشبو اور نغموں کی قفس کی تیلیوں سے اجالا ہر طرف پھیل جاتی گئی۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے، کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

فیض اپنی اظہاریت سے زیادہ فکری اظہار کی اہمیت پر یقین رکھتے ہیں۔

بہت سہل ہے یہ بات کہنی
کہ ساحل تک دریا ہے
تو میں ڈوبوں جو مری حد ہے
اسی کے سامنے ملی خودنگر ہے
تو ساحل در جزیرہ نظر ہے

جہاں تک فیض کے فکشن کا تعلق ہے وہ غالب اور اقبال کے اسلوب کی توسیع ہے۔ فیض کی لفظیات روایتی ہیں لیکن ان لفظیات سے انھوں نے اپنے اظہار کے لیے نئے الفاظ کا شعور پیدا کیا اور نئے اظہاری پیرائے وضع کیے۔ سیکڑوں برسوں کی تہذیب اور تاریخ کے راستے روشن کیے۔ ہم نے ایک علیحدہ مضمون میں جدید فارسی روایت پر گفتگو کی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بہت ہی خوبصورت اور بالاصالت انداز میں فیض کے کلام میں جمالیاتی احساس اور ان کے اشعار میں جہاں معنیاتی نظام پر ایک جامع مضمون "فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام" کے عنوان سے لکھا ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ یہ مضمون فیض کے فن پر پہلا اور آخری مضمون ہے جس میں ساختیاتی بنیاد پر ان کی شاعری کے معنیاتی نظام کی توجیہ کی گئی ہے۔ پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں:

"بعض حضرات یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ فیض کی شاعری کا کوئی علامتی نظام یا معنی کی کوئی پرت ان اشعار ساختیات سے وابستہ ہے۔ پورے معنیاتی نظام کے ساختیاتی تجزیے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کے شاعرانہ اظہار کی ان گنت شکلیں اور پیرایے ہیں۔ ساختیات کی بنیادی پہچان یہ ہے کہ کوئی ساختیہ بالذات کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معنی کا تصور تقابلات سے پیدا ہوتا

ہے۔ خصوصاً جو مختلف معنی کا کرتی ہیں۔ دیکھئے لیکن یہ تصور بھی مجرد حالات نہیں، کیوں کہ یہ زبان کے کسی نظام (یہاں پر شاعری کے کسی نظام) کے تحت رونما ہوتا ہے۔ اس نظام میں ہر مختصر عنصر دوسرے عنصر سے متضاد ہے اس لیے مختلف ہے۔ ہم غزل کے ایک نظام کے تحت ہے اس لیے دو باہمی رشتہ بھی رکھتا ہے۔ گویا معنیاتی امکانات ایک کسی نظام کے تحت ربط و تضاد کے باہمی رشتوں کی عمل آوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ عشقیہ تلازمات علامتی طور پر باہمی نہیں ہے۔ مثال چونکہ کسی لفظ کی مجرد تعریف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم عشقیہ اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں جو نئے سے نئے معنیاتی امکانات پیدا ہوتے ہیں، وہ شاعر کے ذہن کی خلاقی کا کارنامہ ہیں۔

(1)	عاشق (مجاہد/انقلابی)	معشوق (وطن/عوام)	رقیب (سامراج/سرمایہ داری)
(2)	عشق (انقلابی ولولہ/جذبۂ حریت)	وصل (انقلاب/آزادی/حریت/سماجی تبدیلی)	ہجر/فراق (جبر/ظلم/استحصال کی حالت/یا انقلاب سے دوری)
(3)	رند (مجاہد/انقلابی/باغی)	شراب/مے خانہ/پیالہ/ساقی (سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع)	محتسب/شیخ (سامراجی نظام/سرمایہ دار اور ریاست/حکمران طبقہ/حکومت/رجعت پسند اور تمام مخالف پسند یا زوال آمادہ قوتیں)
(4)	جنون (سماجی انصاف/انقلاب کی خواہش/تڑپ)	حسن/حق (سماجی انصاف/انقلاب/سماجی سچائی)	عقل (مصلحت کوشی/مفادات اور اندیشے/جو نظام نوکر شاہی یا عسکری نظام سے سمجھوتا بازی)
(5)	مجاہد (مجاہد آزادی/انقلابی)	زنداں/دار و رسن (سیاسی قید/پھانسی/جان کی قربانی)	حاکم (سامراج/سرمایہ داری/بادشاہی/عسکری نظام)
(6)	گلشن/عندلیب جذبۂ قومیت/حریت سے سرشار شاعر/انقلابی)	گل (سیاسی آدرش/نصب العین)	گلچیں/قفس (سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ/رکاوٹ ڈالنے والے عوامل)

اوپر جلی حروف میں جو الفاظ دیے گئے ہیں، اردو کی عشقیہ شاعری کے صدیوں پرانے الفاظ ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں ان کی سیاسی معنویت کے امکانات کی تلاش [illegible] کر دیے گئے ہیں۔ عہد حاضر میں فیض احمد فیض کی شاعری میں بھی انھیں علامت سے مربوط کیا ہے اور ملک کی اجارہ داری اور بے کاری اور منافقت کے خلاف بھی انھیں الفاظ کے ذریعے احتجاج کی آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صدیوں کے چلن سے یہ الفاظ بڑی حد تک فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان کی حیثیت پامال مفہوم کی ہے تاہم ان میں ترقی پسند معنویت کا ایک زبردست نظام پوشیدہ ہے جس کی [illegible] قومی و سیاسی بیداری کے ساتھ ابھرنے والے نئے انقلابی مفاہیم بھی انھیں

عالم کے ذریعے ادا کیے گئے۔ جہاں تک ان علامتوں کے استعمال کا تعلق ہے، یہ فیض احمد فیض اور دوسرے متعدد ترقی پسند اور دیگر شعرا میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن فیض نے انھیں کام میں لاتے ہوئے انفرادی شان کس طرح پیدا کی اور معنی آفرینی اور حسن کاری کا حق کس طرح ادا کیا۔“

نارنگ صاحب نے اپنے مضمون میں فیض کے کلام سے ان مثالوں پر روشنی ڈالی ہے جو فیض کے کلام کی ساختیات پر بحث کا کام ہے۔ فیض کی شاعری کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیض میر کی طرح اداسی کے شاعر ہیں۔ فیض ایک کامیاب حزن و فراق کے دلدادہ نہیں۔ ان کا تخیل عشقیات، اصناف، رومانیت، شراب، محبت، جنگ و رنگ شراب ہے۔ ان کی شاعری میں فراق کے درد کی کسک اور بے چینی رچی بسی ہے لیکن مسلسل مضمونِ عشق کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ وصال کا شدت سے منتظر رہتے ہیں اور وہ صبح میں بیعت پہنچنے سے کر لیتے ہیں۔ وہ ہر شام سے ہی سحر کے خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں یہ مسئلہ افسردگی کے سپرد نہیں کرتا کہ وہ میدان میں ایک ہلکی بات کا عظیم شعر ہے۔ اکثر ایسی کیفیت اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ آخر کار وصال ضرور آئے گا۔ ان کے فراق میں حرمان و یاس کا گذر نہیں:

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

....

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

....

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

....

کہ اک ذرے کے ہوئے جاتے ہیں رستے روشن
میری منزل کی طرف جب سے قدم آئے ہیں

شبلی نعمانی اپنی شعر کی تعریف میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور زبان میں صفائی نہ ہو تو اس کی قدر نہیں رہتی۔ یعنی وہ روزمرہ میں ہو اسی لیے شاعری میں روزمرہ کو شمار کیا ہے جو شعر میں ہوتا ہے۔ روزمرہ میں الفاظ کی ترتیب اور نشست ہماری روزمرہ کی زبان کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن شعر میں یہ اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا حاصل لفظوں پر کسی طرح سے حاوی ہو۔ جس طرح سے ایک مطلق انسان حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے سامنے الفاظ ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں۔ وہ بعض جملوں کو چھوڑ کر بعض کو توڑ کر بعض کو موڑ کر اور بعض کو بعض الفاظ سے جوڑ کر کے دھاگے میں ایسے پروتا ہے کہ مدعا کو ہر ایک تن موتیوں کا ہار نظر آتا ہے۔ بعض مقامات پر شاعر لفظوں کے ذریعہ استعارات اور علامتوں کو روزمرہ سے جدا کرکے اپنی زبان میں بات کرتے لگتا ہے جس میں اس کے تجربات اور مشاہدات کا ذکر ہوتا ہے لفظوں کے استعمال سے شعری انتقاد اور اختصار کی تعمیر میں تھے۔ ان اشعار پر گفتگو تمام کرتے ہیں:

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

....

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

[illegible]

[illegible]

فیض کی غزل کا مقام

قائم نے غزل کو "اک چیز لچری سی بہ زبانِ دکنی تھی" کہا۔

حالی نے جس کو بے وقت کا راگ کہا۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

غالب نے جس کی تنگ ظرفی کا گلہ کیا:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

محمد یحییٰ تنہا اور عظمت اللہ خان نے اسے لائقِ گردن زدنی قرار دیا۔

کلیم الدین احمد نے اسے "نیم وحشی صنف" کہہ کر اردو تہذیب کا ننگ بتایا۔

لیکن ان تمام گفت و شنید کے باوجود وہی غزل اردو شاعری کی آن، بان، جان اور پہچان ہے۔ اردو کے چار بڑے شاعروں میں میر اور غالب غزل کے شاعر ہیں، انیس مرثیہ اور اقبال نظم کے ظاہری شاعر تو ہیں، لیکن ان کی شاعری کی قدر و قیمت ادبی نقطۂ نظر سے اُس تغزل پر بھی ہے جو مرثیوں اور نظموں میں نہاں اور عیاں ہے اور یہی تغزل ہے جو غزل کا مادّہ بھی ہے، غزل کا مبدا بھی ہے، غزل کا مضمون اور مقصد بھی۔

غزل میں گنجائش بہت ہے، یہ اور بات ہے کہ غالب جیسے نابغۂ روزگار کے لیے کچھ اور بھی چاہیے ورنہ:

غزل اور تنگ دامانی کا شکوہ
سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

غزل میں غم اور شادی، ماتم اور شہنائی، فلسفہ اور زندگی سب کچھ سما سکتا ہے، بشرطیکہ وہ ظاہری اور عام نہ ہوں کہ دل کے آتش کدوں میں تپ کر ڈھلے، بقول فراق گورکھپوری، "غزل کے لیے کوئی موضوع یا مضمون شجرِ ممنوع نہیں، البتہ ہر شجرِ خام غزل کے لیے شجرِ ممنوع ہے۔"

غزل کو کسی بھی زاویے سے دیکھ کر اپنے زاویۂ خیال میں ناپ سکتے ہیں۔ اصغر گونڈوی کو اگر غزل کے شعر میں صرف نشاط و مسرت کی روشنی دکھائی دیتی ہے، تو عزیز لکھنوی کو وہ گردشِ زمانہ کا ایسا حلقہ معلوم ہوتا ہے جس میں صرف ماتم نشینوں کی پاکوبی کی آواز سنائی دیتی ہے......

تغزل کا شعار معنوی ہے نقش میں اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

غزل اک دائرہ تھا عشق کے ماتم نشینوں کا
مگر پاکولی احباب سے ہے اب وہ چکر میں

واضح رہے کہ فیض یا ہمیشہ ایسے گئے تقریباً تو بھی شہنیدنی کا معمول قطعی طور پر رکھا لیکن پھر بھی یہ مغشوش ہو سکا کہ عمومی طور پر فیض غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے۔ فیض کی غزلیں عمدہ ہیں یا ان کی نظمیں اور قطعات۔ اگر غزل کی شناخت شعری تغزل سے ہے تو پھر فیض کی ساری عمدہ نظموں کی قدر و قیمت اس میں رچے بسے تغزل کے سوا کچھ اور نہیں۔ فیض نے جس طرح غزل میں روایتی اور کلاسیکی رکھ رکھاؤ جاری رکھا اسی طرح نظم میں بھی تغزل کے ان اقدار کو استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے فیض کی بعض نظموں کو غزل مسلسل یا غزل جیسی کے عنوان سے منسوب ہو کر سکتے ہیں۔ فیض کے یہاں نظموں اور قطعات کے مقابلے میں غزلیں کم ہیں۔ اگر صرف ان غزلوں کو شمار کیا جائے جو خاص غزل کی ہیئت میں ہیں تو وہ لگ بھگ اسی (80) کے قریب ہیں جب کہ نظموں اور قطعات کی تعداد ایک سو اسی (180) سے زیادہ ہے۔ فیض کی غزلوں کے اشعار پانچ سو سے کم ہیں۔ ذیل کی جدول میں غزلوں اور غزلوں کے اشعار کی تعداد دی گئی ہے۔

غزلوں کی کل تعداد

شعری مجموعہ	غزلیات	اشعار
نقش فریادی	14	79
دست صبا	17	114
زنداں نامہ	15	85
دست تہ سنگ	11	60
سر وادی سینا	7	40
شام شہر یاراں	8	41
مرے دل مرے مسافر	3	17
غبار ایام	7	39
کل۔	82	478

یوں تو حسب کتاب میں غزلوں کی تعداد اسی (80) یا بیاسی (82) ہے لیکن اگر ان غزلوں میں شامل "غزل نما نظمیں" نکال دی جائیں تو غزلوں کی تعداد ستر (70) سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فیض نے اپنی پچپن (55) سالہ ریاضت میں بہ مشکل ستر کے لگ بھگ غزلیں کہی ہیں، جن کی تعداد غالب کی اردو غزلوں سے بھی کم ہے۔ اردو کا کوئی دوسرا شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کی غزلیں فیض کی غزلوں کی طرح مشہور ہوئی ہوں یا اس کثرت سے گائی گئی ہوں۔ اگر ہم فیض کے تیئس (23) یا چوبیس (24) اشعار جو مجموعوں میں موجود ہیں، کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اکثر اوقات انھوں نے اساتذہ کے اشعار میں موجود مطالب اور حسرت

موہانی وغیرہ شامل ہیں۔ فیض ان کی غزلوں سے فائدہ اٹھانے کا اعتراف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی رومانی کلام پر مغربی شعراء میں سے بالخصوص کیٹس، ورڈز ورتھ اور شیلے کی شاعری کا اثر بھی ہوتا ہے۔ فیض کی شاعری پر اختر شیرانی کی چھاپ کو ہم ایک مخصوص حد تک بیان کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فیض کی غزلوں پر اساتذۂ فن کے کوئی اثرات مرتب ہوئے تو ان کے ذاتی تجربات اور تخلیقی مزاج سے ہم آہنگ ہو سکے۔ یہ تقاضا دیگر تھا کہ فیض اُن اساتذۂ شعراء کے مقلد نہ تھے بلکہ ان کی بنائی ہوئی زمینوں پر اپنی فصل اگاتے تھے۔ مثال کے طور پر حسرت موہانی کی رومانی شاعری کے رنگ مضمون سے متاثر ہو کر انہی کی عکاسی کرتے ہیں جس میں عشقیہ شاعری کی تخیل، رنگینی، سادگی، شگفتگی کے ساتھ اُن کے جذبے کے والہانہ پن کی بات نہ ہو جائے، لیکن اس میں تخلیقی لپک تخلیقی قوت کارفرما ہو۔

حسرت موہانی نے کہا تھا۔

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

فیض کہتے ہیں:

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام

....

اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

فیض کی وہ غزلیں جو ان کے اولین مجموعہ "نقش فریادی" میں ہیں، ان پر اردو کے روایتی اسلوب کا اثر ہے۔ وہ لب و لہجہ، داستان، انداز سے لے کر اختر شیرانی، حسرت موہانی اور بعض دوسروں کے شعری نصاب میں نظر آتے ہیں:

رازِ الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا
فیض تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

دوسری غزل:

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

اسی طرح کی دوسری غزل میں:

نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آ رہے ہیں
چٹکنے لگی ان نگاہوں سے مستی
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں
چلو فیضؔ، پھر سے کہیں دل لگائیں
سنا ہے ٹھکانے کے دن آ رہے ہیں

....

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے

''نقشِ فریادی'' کی غزلیں اُس دور کی نظموں کے متوازی چلتی ہیں اور کم و بیش اسی انداز کے تجربوں میں ایک دوسرے کا دور ... کی مختلف شکلیں پیش کرتی ہیں۔ ان میں بھی فیض کا وہ لہجہ نہیں، جو بعد میں ''دستِ صبا''، ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ تہِ سنگ'' میں ہے۔ ان غزلوں کو ہم کسی بھی انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کے شعری زمرے میں رکھ دیں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

صرف موضوع یا زبان و بیان کا معاملہ نہیں، یہاں مطمحِ نظر، فیض کی لفظیات کا فرق بھی ہے جو نامانوس اور نامانوس الفاظ سے بچنے کی صورت میں اردو و ہندی کے مخصوص اور کہیں فارسی و عربی لفظوں سے آراستہ ہو کر مصرعوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

روایتی غزل میں بھی فیض کا لہجہ نمایاں ہے جس میں داخلیت کا اثر زیادہ ہے۔ انھیں اشعار میں جب ان کی جدت اور جذبے کے خلوص کے ساتھ رومانی شاعری کا نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ''مرے دل مرے مسافر'' کی آخری غزل کے شعروں میں یہ لہجہ اپنی شناخت کرتا معلوم ہوتا ہے۔

ہم سادہ ہی ایسے تھے کی یونہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی سمجھے کہ بہار آئی
یک جان نہ ہو سکیے، انجان نہ بن سکیے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیرِ شناسائی
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

شان الحق حقی فیض کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ادب میں فیض کا وہ مقام ہے کہ ان کا کلام دوسروں کے لیے سند اور قابل تقلید ٹھہرے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ادب میں کسی بدعت کے موجد یا نئے طرز کے موجد نہیں ہیں۔ ان کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام نکتہ سنجی اور ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی غزل کو اردو غزل کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔"

شرح بے دردئ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی
پھر وہاں باب اثر جانیے کب بند ہوا
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی

......

جذب مسافران رہ یار دیکھنا
سر دیکھنا نہ سنگ نہ دیوار دیکھنا
کوئے جفا میں قحط خریدار دیکھنا
ہم آ گئے تو گرمئ بازار دیکھنا
خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رعب قبا و ہیبت دستار دیکھنا

فیض کی غزلوں میں بعض اشعار جدیدیت کے نقیب ہیں لیکن اغلب اشعار حیرت انگیز حد تک کلاسیکی اور روایتی ہیں جن کو پڑھتے ہوئے کلاسیکی شعرا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فیض نے ان غزلوں میں قدیم غزل کی علامتیں اور ترکیبیں استعمال کی ہیں لیکن جو ذہن ہوتا ہے اس پر بھی متقدمین اور متوسطین کی گہری چھاپ ہے۔

فیض غزل کے شعروں میں رومانیت سے انقلاب کا راستہ بڑی چابکدستی سے اور دلکش انداز میں طے کرتے ہیں۔ روایتی علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں میں سے بعض کو لے کر غم جاناں کے پردے میں غم دوراں کا اظہار کر دیتے ہیں۔

یہ عجز ہوا، بے خوف و خطر اس ہاتھ پہ سر رکھ آئے ہیں
جب کوئے ستم میں وقت سفر نظارۂ بام ناز کیا
جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشم خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگ گل طناز کیا

فیض کی غزل کی زبان بھی سر تا سر غزل کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں "میر" جیسی سادگی بھی ہے اور کہیں قدیم شعرا کی طرح آورد کے بجائے ذخیرۂ الفاظ سے شعر منتقل کر رہے۔

نہ یہ غم نیا نہ ستم نیا کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے
کب تک دل کی خیر منائیں کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے ہم سے کیا منواؤ گے

فیض کی غزلوں کا کلاسیکی رچاؤ اور روایتی انداز جب روایتی جدید لب و لہجہ کی آمیزش کر دیا جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر بھی کسی استاد شاعر کے یہاں، یا کسی میں مومن، حسرت، داغ یا فراق، کلیم آبادی وغیرہ کا ہو۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ
سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

فیض کا ایک روایتی غزل کی فضا میں سانس لیتے ہیں، وہ اساتذہ کے لہجے کی متانت اور پختگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں تاکہ وہ مضامین کی روایتی تراش سے وہ اپنے لہجے کو منفرد بنا سکیں اور اس طرح اپنا الگ اعلان کر سکیں۔ یہ عمل فیض کا تقریباً ہر مجموعہ کلام میں نظر آتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی غزل کے مصرع پر جو غزل 1978ء میں لکھی، اس کے چند شعروں میں اگرچہ کا ایک غزل کا شکار ہے لیکن اس غزل کی آرائش میں کا مادہ ... اس کا سب کچھ نیا ہے اور یہی غزل فیض کا انداز ہے۔

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اولِ صبح
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

اردو غزل میں بہت سے شعرا ردیف سے معنی آفرینی کا کام لیتے ہیں۔ آخر عمر میں بعض اوقات ردیف کو زور دار کرنے کے لیے یا بامعنی مصرع بنانے کو مکمل کرنے کے لیے ردیف کو مصرع پر تھوپ دیتے ہیں، مثلاً اکثر غزلوں میں ردیف "نہیں ہے" سے معنی پیدا کرنا ... چناں چہ ردیف کو اگر مصرع سے نکال بھی لیا جائے تو اس سے کوئی شعر کے معنی میں فرق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ... قافیہ ردیف میں ... سما جاتا ہے جس طرح چاول کی ... ایک دوسرے میں کھپ جاتی ہیں، اور معانی کے لحاظ سے قافیہ ردیف کا محتاج رہتا ہے۔ فیض نے اوپر کی غزل میں "آخرِ شب" کی ردیف سے جو معنویت پیدا کی ہے ... ہر مصرع کا تعلق ردیف سے ... ہو گیا۔

ایک معنوی ردیف "" سے ہے جس میں فیض کی ردیف بیانی دیکھیے ... ایک غزل کی ردیف ... ذہن میں ... ہیں۔ فیض کا ... جس کی صحبت میں ... سے پیدا ...

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے
اگر شرر ہے تو بھڑکے جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے
کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

فیض غزل کی زبان اور بعض صورتوں میں غزل کی معانی کی روایت میں تابع ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مقصد فیض کا غالب سے موازنہ کرنا نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ فیض بھی غالب کی طرح اپنے اظہار میں ندرت پیدا کرنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں تراشتے ہیں اور خیالات کے نئے زاویے تلاش کرتے ہیں۔ لیکن یہ ترکیبیں بالکل نئی نہیں ہوتیں اور ان میں ایک خاص طرح کی معنویت اور حیرت ہوتی ہے اور یہ ادا کسی حد تک ان کی ... میں ... سے ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری کا قاری ... اور اس سحر میں کھو جاتا ہے اسی کو سحر بیانی کہتے ہیں۔

دستِ تہِ سنگ کی غزل کے چند شعر دیکھیے۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

سرِ وادیِ سینا کی غزل:

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا
گرمیِ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا
صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

شاعر انتظار میں وصل کے لمحوں کے تصور سے لطف اندوز ہے۔ وہ محبوب کو کسی طرح بھی عشق پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ گلشن میں آئے تاکہ پھولوں کی انجمن میں ان کے رنگ ... سے ... پھول ... قد ... گلشن کے سرو اپنے قد ... سے ...

سے ہوا انھیں اپنے قد کا ناپ لگ جائے گا۔

فیض نے مصرعِ اولیٰ میں جو مضمون باندھا وہ خود بہت بلند اور تخیل کی تہ داری لیے ہوئے ہے یہ ان کی قادرالکلامی اور نقد نگاری ہے کہ مصرعِ ثانی کو فقط یوں کر دیا، اس سے بہتر شکل شعر کی ممکن نہ تھی۔

فیض نئی تراکیب میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ بعض مقامات پر جدید مضمون نگاری کی خاطر مروجہ لفظوں میں جدید معنی بھر دیتے ہیں جو عام اہلِ زبان کی لغت کے موافق نہیں، لیکن وہ پانی میں آگ لگا دیتے ہیں یا کہیں شیشہ و جام، در و بام، پیغام اور دیے کو کرن کرن سے نام بجھا دیتے ہیں جیسے کہ "دستِ تہِ سنگ" کی اس غزل سے ظاہر ہے:

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں
قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

فیض کی ایک غزل کے مشہور شعر کے مصرعۂ ثانی پر غالب کے رنگ کی گہری چھاپ ہے:

اب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

یہ غزل فیض نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کی لیکن یہ شعر مشہور ہے جو 1928ء کے لگ بھگ کا ہے۔ شاید "راوی" مجلہ میں شائع ہوا ہو۔ اس غیر مطبوعہ کلام میں موجود ہو جس کو فیض نے شائع نہیں کیا اور اس غیر مطبوعہ کلام کا انکشاف انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اختر شیرانی کی شاعری کے ذیل میں کیا۔

فیض کی آخری غزل کا آخری شعر جو شاید اُن کی زندگی کا آخری شعر بھی ہو نومبر 1984ء کی تخلیق ہے۔ اس شعر کا بھی مصرعِ ثانی غالب کا مصرع ہے۔

غالب نے کہا تھا:

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

فیض نے کہا:

سجاؤ بزم غزل گاؤ جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے

فیض نے اپنے شعری مجموعوں میں فارسی اور اردو کے مستند شعرا جیسے نظامی، حافظ، عرفی، میر، سودا، ذوق وغیرہ کے تتبع در

مقبول اشعار لکھے ہیں لیکن سب سے زیادہ غالب کے اشعار کی تضمین کی ہے۔ فیض کے مجموعہ "دستِ تہِ سنگ" میں دو شعر غالب کے سرِ ورق ہیں۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

....

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

فیض کے مختلف شعری اور نثری مجموعوں کے نام بھی غالب کی اردو فارسی شعری ترکیبوں سے اخذ کیے گئے ہیں جیسے "نقشِ فریادی" "دستِ صبا" "دستِ تہِ سنگ" "زنداں نامہ" "میزان" "سرِ وادیٔ سینا" اور کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں غالب کا یہ شعر صفحہ اول پر درج ہے:

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

غالب کے رنگ میں فیض کے چند شعر دیکھیے:

سجا نظر رقیبوں کے انجم جگر کے داغ
جلتے چھپاتے ہیں تری محفل سے آئے ہیں

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

.. ..

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

....

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

....

منتِ چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

....

عشق منت کشِ قرار نہیں
حسن مجبورِ انتظار نہیں

دیکھ آئیں چلو کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانیٔ دل کا

....

بخت ملا جو ہمیں زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

.. .

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

غالب اور فیض کے کلام میں ایک مماثلت دونوں کے درد کے رشتے سے ہے۔ غالب اور فیض دونوں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے شیدا تھے۔ یہ غم انھیں چھوٹی عمر میں ملا تھا جس نے دونوں کے سینے آباد تھے اور اسی وجہ سے دونوں کے کلام میں غموں کی سرشاری ہے۔ غالب نے کہا تھا:

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

....

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

فیض کہتے ہیں:

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

یہ سچ ہے کہ "نقشِ فریادی" جو فیض کا پہلا شعری مجموعہ 1940ء اور 1941ء کے درمیان شائع ہوا اُس کی غزلوں میں ان کی تہذیب کے نمو کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اور اکثر غزلوں میں ان کی حقیقی حالت اور پاکیزگی آویزاں نہیں رہتی تھی لیکن تقسیمِ برصغیر کے بعد ان کے دوسرے دو مجموعوں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کی غزلوں میں ان کا مزاج جو تغیر پذیری طرح سے مختص ہو چکا تھا یہ وہ دور تھا جس میں کلی طور پر فیض ایک معرکۂ تنہائی، قید و بند اور ہجرِ وطن کی صعوبتوں سے آشنا ہوئے تو دوسری طرف وہ اعلیٰ جذبوں کی قدروں سے ہم آہنگ ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیض کی طبیعت اور شعری مزاج میں ایک انقلاب ہوا جس کا ذکر خود فیض نے اپنی تحریروں، تقریروں اور تحریروں میں بھی کیا ہے۔

فیض کی غزلوں میں ان کا ماضی اگر ان کے دکھ درد کی رومانی کیفیت ہو تو اس طرح کچھ مل جاتا ہے کہ غم و محبت اور تعلیم کے جذبات بھی کشش دوراں کی ضرورت نظر آتے ہیں، لیکن فیض خط عقب مضمون کے بیان پر یہ الفاظ مختلف ہو گئے ہیں۔

لیکن اس مدت تک نئے الفاظ کی تعمیر بھی نہیں رک پائی۔

ہاں ہم نفسو آؤ کہ بیداد ہے تیری
یہ تیرگی یاروں نے گزر کر دیا ہے

... .

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

....

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

تو آپ سوچتے ہوں گے وہی فیض جو 1940ء سے پہلے "نقش فریادی" کی غزلوں میں اپنے رومانی لہجے کو حسرت موہانی اور اختر شیرانی کے مروجہ لہجوں پر چلا رہے تھے۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن!
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

وہی فیض شام شہر یاراں کے مرتب ہونے تک پہنچے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک لطیف روشنی ہے جو محسوس بھی ہے اور حرارت سے بھی جاں سوز اور دل گداز بھی۔ انھیں حق پرستی اور اعتبار عزم اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ آزادی کی آواز کوئی روک نہیں سکتا۔ اب گلشن میں تنگ دلی کے دست ستم بہار دست ستم گل چیں بلبل کی آواز اور پھولوں کی خوشبو پر پہرے نہیں لگا سکتے، پھولوں پر قبضے جما سکتے ہیں لیکن بہار پر حکومت نہیں کر سکتے۔

دستِ صیاد بھی عاجز ہے، کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

.. ..

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

لاہور قلعہ میں آپ کس کس کو شہید کر سکتے ہیں لیکن تحریک آزادی کو ختم نہیں کر سکتے۔

پیوند کوئی کریں تو ہم جانیں

اب شہر میں چاہے حکمران مظلوم عوام پر ظلم ڈھائیں، ان کے طور طریق انحصار ہے ٹیپ۔

اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

... .

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

....

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ہم جانتے ہیں کہ تغزل موضوع کی نہیں بلکہ اظہار کی خصوصیت ہے۔ فیض کے شعر میں حالی اور فیض کی غزل کے تغیر میں تغزل کی روٹ کو ترجیح ہوا تھا، جو ان کی بے پناہ مقبولیت کا راز بھی تھا۔ جہاں ترقی پسند شعرا جذبات یا نعرہ بازی کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے وہیں پر فیض یا اختر بیٹھے لیٹے میں وہی مسائل بیان کر رہے تھے جو ایک ترقی پسند معاشرے کے لیے لازمی تھے۔ وہ بھی حقیقت پسندی کو تخیل پسندی پر، رجائیت کو قنوطیت پر، مسئلہ زندگی کو فلسفہ زندگی پر، عوام کو خواص پر، تجربے کو روایت اور حکایت پر، اجتماع کو انفرادیت پر، حوصلہ آزمائی کو حسرت آزادی پر، ہتھیلی چھلکی، انداز دہلی شاعری کو حالی کی شاعری پر، تنقید حیات کو تفسیر حیات پر فوقیت دے رہے تھے۔ ان کی شاعری میں مشرقی اور مغربی شاعری کے قیمتی اثرات موجود تھے۔ فیض کی غزلوں میں اشاروں، کنایوں اور علامتوں میں حزن اور دنیاوی زندگی کے سماجی، سیاسی، معاشی اور عشقی پہلوؤں کے تیکھے جلوے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ "نقشِ فریادی" کے مقدمے میں ن۔ م۔ راشد کا یہ بیان کہ "فیض کسی مرکزی تحریک کا شاعر نہیں بلکہ احساسات کا شاعر ہے" اجتماع کی حجابیں دکھتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں: "غزلوں میں اُردو کے قدیم شعری ادب کے مطالعے کی اچھی جھلک ہے۔ ان کے یہاں غزل کی مخصوص زبان، بالخصوص علامتی ملفوظ ہیں، شیخ اور ناصح، زاہد اور رقیب، محتسب اور کوچہ، دیر و حرم، صبا اور شمع، چمن، قفس، زنداں، بلبل، گل، بہار اور گلاب۔ یہ الفاظ فیض نے غزلوں میں بار بار استعمال کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ مثلاً قفس، صبا، ہجر اور فراق ان کے یہاں نئے معنی کے حامل ہیں، لیکن بعض مثلاً شیخ اور ناصح، بلبل اور گل جیسے بالکل روایتی ہو کر رہ گئے ہیں اور ان سے ترتیب اجزا میں کوئی نیا اشارہ نہیں ملتا۔"

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے
کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیس کی ہے

"اردو غزل جس رستہ پر ان سے آگے نکل چکی ہے وہ راستہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہی فیض کے اپنے اسلوبِ غزل میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ ان سے نئے اشاروں اور نئی تلمیحوں کا پتا چلتا ہے۔"

اس کے برخلاف ڈاکٹر سلیم اختر "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں لکھتے ہیں: "فیض نے اپنے مخصوص اسلوب اور طرزِ ادا سے معاصر غزل کے امکانات میں اضافہ بھی کیا۔"

محمد علی صدیقی کہتے ہیں: "فیض صاحب کے لیے شاعری مشاعرہ لوٹنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک انتہائی سنجیدہ کام ہے۔ اس سنجیدگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شاعری کے پچپن برس میں انہوں نے بمشکل دو ہزار کے لگ بھگ شعر کہے ہیں گویا ایک بیٹھک میں چار شعر بھی نہیں کہے۔"

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں: "فیض کی نظموں اور غزلوں میں ان علامتوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ تشبیہوں اور

استعاروں کو جو شگاف دینے والا استعمال بھی دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے فیضؔ کے تخیل کی بلند پروازی اور رس کے اچھوتے پن پر دلالت کرتے ہیں اور مجموعی طور پر سنئے پیکروں کو تراشنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ تمثیلوں اور اشاروں کی طرح ان سے بھی معنوی وضاحت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی نوعیت بھی مقصدی ہے۔ وہ صرف حسن پیدا کرنے کے لیے نہیں ہیں، ان میں ایک افادیت کا خیال بھی ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے"۔ راقم نے فیضؔ کی شاعری میں تشبیہات، استعارات، علامات، کنایات اور اشارات کا علیحدہ تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

فیضؔ نے پرانے ساغروں میں نئی شراب پیش کی یعنی قدیم روایتی آہنگی سانچوں اور علامتوں میں جدید موضوعات اور نئی حسّیت کو داخل کیا۔ فیضؔ نے غزل کو دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح متروک اور مسترد نہیں کیا، بلکہ اسے نیا شگفتہ لہجہ دے کر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیضؔ کی شاعری میں نظم کی طرح غزل بھی بڑی دلکش اور جاندار نمایاں ہوگئی۔ فیضؔ کی شاعری نے اپنے عہد اور آئندہ آنے والے عہد کو ایک نمایاں جدید موثر لہجہ دیا ہے۔ فیضؔ کے لہجے نے انسانی ذہن اور تہذیب و طریق شاعری میں جدید راہیں روشن کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بیسویں صدی اور آج کی صدی کا دور اقبالؔ کے بعد فیضؔ کا دور ہی مانا جائے گا۔

-☆-

کلامِ فیضؔ: عربی، فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ

ڈاکٹر جمیل جالبی "فیض ایک تقابلی مطالعہ" میں لکھتے ہیں: "فیض کی شاعری کی یہ اہم خصوصیت ہے جو اُسے دُوسرے ترقی پسند شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ن۔م۔راشد بلا تکلف فارسی و عربی کے الفاظ کا سہارا لیتا چلا جاتا ہے۔ جوشؔ و مجازؔ بھی عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، لیکن فیضؔ جو بات کہتا ہے سیدھے سادے الفاظ میں کہتا ہے اور اس سادگی میں اس بلا کا درد، تاثیر، تاثر، متوازن نشتریت اور سنجیدہ جذبات سمو دیتا ہے کہ وہ شان و شوکت جو فارسی الفاظ کا حصہ ہے اُس کی شاعری میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز فیضؔ کے جوہرِ تخیل اور فن کارانہ قوتوں کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے۔ کوئی نظم، کوئی شعر لے لیجیے، سب میں یہی سادگی و پُرکاری ملتی ہے۔ اُن کی زبان جمہور کی زبان ہے"۔

یہ سچ ہے یہ مضمون "نقشِ فریادی" کی اشاعت پہ 1941ء میں لکھا گیا تھا۔ اُس وقت ابھی فیضؔ کی زبان اور لہجہ مشخص نہیں تھا، اور غزل و نظم میں سادگی اور سلاست رواں دواں تھی۔ جس طرح سے ن۔م۔ راشد کے پاس درجنوں ایسی نظمیں ہیں جن میں خارجی، فارسی و عربی کے الفاظ بہت کم ہیں، اُسی طرح فیضؔ کے پاس بھی بہت سی نظموں اور غزلوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور انہی الفاظ کی ترکیبات کی بہتات ہے۔ فیضؔ کا لہجہ روز مرہ سے دُور ہے اس میں دبستانِ داغؔ کی سادگی اور صاف بیانی نہیں، البتہ بعض ابتدائی نظموں، قطعوں اور غزلوں میں یہ اُسلوب ہے۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

....

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

لیکن اغلب غزلوں، قطعوں اور نظموں میں نئے تراکیبات، اجنبی الفاظ اور عربی فارسی کے لفظوں کا فراواں گذر ملتا ہے:

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں
ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں
ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں
آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

اس غزل میں کیا عربی اور فارسی لفظوں کا ہجوم نہیں۔ کیا یہ مصرعے سیدھے سادے آسان سلیس ہندی نژاد الفاظ سے تراشے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ زبان غزل کی روایتی زبان ہونے کی وجہ سے عوام بھی اس سے مطلب و معنی حاصل کر لیتے ہیں، یعنی یہ عربی فارسی کے الفاظ ابلاغ و ترسیل میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ فیض کا فن الفاظ کے انتخاب اور اُن کی ترکیبوں سے زیادہ اُن کی معنی آفرینی میں کمال دکھاتا ہے۔ فیض مصرعِ اول کی بنیاد پر مصرعِ ثانی کا فلک بوس مضمون بناتے ہیں جو اپنی تاثیر میں نشتر کا کام کرتا ہے۔ یہ مضمون اتنا نادر اور دلکش ہوتا ہے کہ اس کا پتا مصرعِ اول سے معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اس غزل کے خمیر میں بھی معنی آفرینی کا شدید عمل نظر آتا ہے۔ ساری گفتگو روایتی غزل کے علامات، ترکیبات اور اشارات میں کی گئی ہے۔ یہی غمِ جاناں کے مسائل سے مربوط غزل کے ساغروں میں نئے معنی کی شراب بھر دی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے عشق و جنوں کی زبان سے نکلی ہوئی بات کوئی روک نہیں سکتا۔ صیاد اور گل چیں نہ بلبل کی فغاں کو اور نہ پھول کی خوشبو کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں۔ ان حرکتوں پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے ہیں۔ آزادی کے نغموں کو روکا نہیں جا سکتا۔ لاہور قلعہ کی جیل میں حسن ناصر کو شکنجے دے کر ہلاک تو کر سکتے ہو لیکن تحریکِ آزادی اور ترقی پسندی کو ختم نہیں کر سکتے۔

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

نیاز فتح پوری نے فیض کی غزل کے مطلع کے مصرعِ ثانی پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اس مصرع کو بار بار پڑھ کر دیکھا تھا کہ سحر کس طرح بار بار گزری ہے۔ اصل میں واقعہ یہ ہے کہ یہ نیاز صاحب کے لیے سمجھنا مشکل تھا، وہ تمام ترقی پسند شعرا کے مجموعۂ اشعار کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے رنگین جامد اور ساکت چیزوں کو بھی بار بار گزارا ہے۔ اس لیے یہ بات کسی کے ذہن پر بار نہیں ہونا چاہیے کہ شاعری میں مبالغہ حسن اور تخیل میں شامل ہے۔ اس غزل میں بھی فارسی لفظوں کا خوب صورت امتزاج ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی میر زنگ آفریں شاعر کی جماعت کی طرح ہر لفظ اپنے خاص لحن اور نغمگی کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری

اس غزل میں وہی فارسی، عربی اور اردو لفظوں کی نشست فیض کے اسلوب اور خاص انداز کی نشان دہی کرتی ہے۔ فیض کے بعض مصرعے شکستہ روی میں نظر آتے ہیں لیکن اکثر مصرعوں میں یہ ترتیب نہیں ہوتی جس سے مصرعوں میں نغمگی اور غنائیت تو بڑھ جاتی ہے مگر سلاستِ زبان متاثر ہو جاتی ہے۔ فیض کے اشعار میں بلا کی غنائیت ہے جس کا راز یہی ہے کہ وہ حروف اور بحر کا انتخاب کرتے ہیں ان کو ایسے الفاظ بھی موجود ہیں جن میں قدرتی نغمگی (Organic rhythm) ہوتی ہے:

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

....

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

بعض مقامات پر فیض نے عربی اور فارسی کے الفاظ محض آہنگ اور صوت، پیام اور ابہام پیدا کرنے کی غرض سے اور نغمگی کو

کہیں نا کہیں تو یاد کرنے کا ہنر بھی فیض خوب جانتے ہیں۔

زباں پہ دل کے فسانے تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں
کبھی کبھی فلک کا سیہ ترین گوشہ
بنا ہے صبح، وہ تمام کہتے ہیں
ہو کر منتظر تو وہی ہے جو خون دل کی کشید
گراں ہے جام کے تجھے دل نظام کہتے ہیں
کبھو تو آ کبھی چلیں فیض، اب تمہیں سردار
تو طریق مرحبہ خاص و عام کہتے ہیں

فیض کی نظموں میں بھی تاریکی کا ہر مصرعہ سے روشن ہے۔ ن م راشد کی طرح بے دریغ عربی اور فارسی الفاظ اور قدیم و جدید تراکیب سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھیں نرم، سلیس اور مروجہ الفاظ کو عمدگی سے برتنے کی صلاحیت ہے ان کو صرف خیال کو شعر بنا کر دل و دماغ میں اتارنے کی عادت ہے۔ وہ ایک نصب العین ایک روحانی فکر یک آتش رکھتے ہیں جس میں ان کا شعری امتیاز اور فکری اعتماد شامل ہے۔ شعور پیدا ہونے میں ایسی شعری تحریروں کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو جذبے کے ساتھ خون کی حرارت اور عزم و حوصلہ کی استقامت کو بڑھاتی ہے۔

گر بازی ہے سلف شمس و قمر، ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائی شب کا کیا ہوگا، انداز سحر کا کیا ہوگا
جب خون جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوق نظر کا کیا ہوگا

....

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں، ہنگامۂ طبل قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

فیض کی ایک بہت مشہور نظم جو لاہور جیل میں 11 فروری 1959ء کو لکھی گئی تھی، "دست تہ سنگ" میں شامل ہے ہماری گفتگو کو مزید تقویت دیتی ہے کہ فیض فارسی عربی کی جدید تراکیب اور مصرعوں میں ان لفظوں کو دل کھول کر استعمال کرتے تھے جو ہر کسی کی قسمت

بجائے اس کے کہ نظم میں لفظوں کی اندرونی آواز نغمگی بن جائے اور مصرعے خوب صورت ترکیبوں میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس نظم کا تجربہ اس وقت بنا تھا جب فیض کو تانگے میں بٹھا کر دانت کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جا رہا تھا۔ لوگ تانگے میں جا رہے تھے۔ جو فیض کو دیکھ کر تانگے کے ساتھ چل رہے تھے۔ فیض کہتے ہیں اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ ایک تجربہ ان کے دل و دماغ سے نکلنے کے لیے بے چین ہے۔ چنانچہ جب وہ واپس جیل گئے تو یہ نظم ہوئی "آج بازار میں پابجولاں چلو" اس چودہ مصرعوں کی نظم میں موجود (17) سے زیادہ فارسی کی تراکیب ہیں لیکن کہیں بھی فارسی کی ثقالت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ زبان کہیں بھی ابلاغ کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو
حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے؟
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ، تہمتِ عشقِ پوشیدہ، پابجولاں، دست افشاں، مست و رقصاں، خاک بر سر، خوں بداماں، شہرِ جاناں، حاکمِ شہر، مجمعِ عام، تیرِ الزام، سنگِ دشنام، صبحِ ناشاد، روزِ ناکام، رختِ دل وغیرہ لفظوں میں چند ایک ہی روز مرّہ سے تعلق رکھنے والے الفاظ ہیں کہ مرقع تیار کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ فیض نے ایک چودہ مصرعوں کی نظم فارسی میں لکھی ہے جو ان کی فارسی سے محبت اور اعلیٰ ذوق کی نشان دہی کرتی ہے اس پر راقم نے ایک مضمون لکھا ہے جو زیرِ ترتیب کتاب میں شامل ہے۔

بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل "لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں" کی بحر میں فیض نے جو غزل لکھی ہے اس میں بھی جو مضمون بندی کی ہے اس کا کمال ہے کہ خیالات کس طرح سے الفاظ و تراکیب میں پیوست ہیں ہوتا ہے۔ ان خیالات کے لیے فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش سے مدد لیتے ہیں:

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے
صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ مے کشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح ورد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے
کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے
نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اس آئنہ رو کی ہے

فیض کی ایک مشہور و معروف نظم جو عرب اسرائیل جنگ کے بعد لکھی گئی جس کا عنوان "سرِ وادیِ سینا" اُن کے مجموعہ کا بھی نام ہے۔ آزادیِ فلسطین پر لکھی گئی یہ اچھی نظم ہے۔ فیض اس نظم کے کہنے کے کئی برس بعد "لوٹس" کی ادارت سنبھال کر بیروت میں مقیم ہوتے ہیں اور وہاں اُن کی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات سے ملاقات ہوتی ہے۔ فیض نے متعدد فلسطین پر کئی یادگار نظمیں لکھیں اور ان کے مجموعہ "مرے دل مرے مسافر" کا انتساب بھی یاسر عرفات کے نام ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے

مجموعہ "سرِ وادیِ سینا" میں لفظوں کی کاریگری اور مضمون کی ندرت شہر آشوب کے انداز میں دیکھیے۔ ان اشعار میں جو لب و لہجہ اپنایا گیا ہے اس کے علاوہ جو الفاظ فارسی عربی کے ہیں ان میں سلاست، روانی، نغمگی کے ساتھ اظہارِ بیان کی نزاکت واضح ہے۔ افسوس یہ ہے کہ فیض کی بیشتر منتخب کلام کی معنویت کی بجائے عوام تک نہیں پہنچ سکا البتہ فیض اور ادب کے اُن قدر دانوں پر لکھتے ہیں اُن کے کلام کو موسیقی والوں نے بہت گایا ہے۔ اُن کے تمام اشعار نہیں منتخب کیے ہیں اور اپنے اشعار کو باقاعدہ گا کر گایا جو بڑی تعداد میں ہیں جن میں نغمگی کی فراوانی بھی ہے:

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

چہرہ نہ کوچہ نہ چشمِ غزالاں
پابند ہیں قامتِ شمشاد قداں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

فیض بعض اوقات مصرعوں کی تراش و خراش پر بہت محنت کرتے ہیں۔ فیض کا یہ عمل ان کے لسانی شعور اور ذخیرہ کی دلیل ہے۔ بعض مصرعوں میں ایسی خوبصورتی موجود ہیں جن کے ترتیب اور کرشمہ تو جب نظر آتے ہیں جب ان پھولوں کی طرح ہیں جو جنگل اور دشت میں اگتے ہیں لیکن ان کے انداز دیکھیے اس غزل کا مطلع:

پھر لگے کسی باب جنوں ترجمانی کا
رنگ بدلے کسی صورتِ شبِ تنہائی کا

یہ غزل بعد ذیل کے چاروں اشعار کے مصرعِ اولیٰ کو فیض نے ہم قافیہ بنا دیا ہے یعنی دہاں، بدناں، قداں اور زدگاں کے استعمال سے جب کہ اس کی شعری ضرورت نہیں تھی۔ اس عمل سے مصرعوں کے ترنم میں اضافہ بھی ہوا لیکن اس سے زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کی تحسین کیے گئے۔ فارسی ترکیب کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ ان مصرعوں اور شعروں سے سیاق کے معنی وہ ترسیل ہوتے ہیں۔

دستِ لب سے بکھرنے لگے گہرِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرفِ شناسائی کا
گرمئ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا
کسی گلشن میں بھی اے سروِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا
ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

فیض کے فن کا اثر ان کا انتخاب بھی ہے جو منفرد ہے۔ وہ اقبال کی طرح عربی فارسی لفظوں سے جہاں جو چیزیں استفادہ کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے ذہنی تصور پیام کی ترسیل کا تقاضا اولیت اور معنویت پر فوقیت کر جاتا ہے۔ اگرچہ ان کی آخری دور کی شعری بلاغت نے ان اشعار کو بھی معنویت کا جامہ پہنایا لیکن غالب کی طرح کبھی یہ ان کی یہ قلم سے ہوتی ہیں:

خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا
غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

. ...

آج ہر موجِ ہوا سے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ کوئی صوت تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی شورِ شہادت ہی سہی
صورِ محشر ہی سہی بانگِ قیامت ہی سہی

بعض اردو تنقید نگاروں نے بجلی پہلوی اختیار کر لی ہے۔ اب فیض میں نعرہ ہونے کی دلیل نگاری مقبول ہو گئی ہے ورنہ جب فیض کے انقلاب کا طلوعِ صبح سے بار بار ذکر کرنا فیض شاعری کی مختلف تصویریں۔ فیض کو آخری عمر میں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ اب عاقد اور ادبی شخصیات ہی موجود نہیں جو صحبت کر لیں۔ اب اکثر طلبہ سستی شہرت کے دلدادہ ہیں۔ فیض کہتے ہیں:

تمھاری حد کے ہوتے ہیں بازار تک
ہم کے پہنچے الماس ڈھونڈ جائیں گے

٭٭٭

فیض کی نظم کی وسعتیں

اُردو شاعری میں آج کل یہ بھی سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ کون سا شاعر نظم کا شاعر ہے اور کون سا غزل کا۔ علمائے شعر و ادب نے اقبالؔ، جوشؔ، عظمت اللہ خان، اختر شیرانی اور ن م راشد جیسے شاعروں کو نظم کا شاعر کہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان شعرا نے کبھی غزل کا تجربہ نہیں کیا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شعرا جب نظم کا دامن ہاتھ میں لیتے ہیں تو اپنے موضوع کو بہتر نبھا سکتے ہیں اور تنگنائے غزل ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ جہاں تک فیضؔ کا تعلق ہے، اگرچہ انھوں نے نظموں کے مقابل تعداد میں نصف سے بھی کم مقدار میں غزلیں کہی ہیں اور تقریباً (2) دو ہزار اشعار میں پانچ سو سے بھی کم اشعار غزل کے ہیں، لیکن فیضؔ کی نظموں میں تغزل ملتا ہے اور وہ بھی عنوان دار غزل معلوم ہوتی ہیں۔ ہم اور دوسرے ادیب و نقاد آج تک اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ فیضؔ کی غزل نظم سے بہتر ہے یا نظم غزل سے، جس طرح ایک تجربہ کار باورچی بریانی کی دیگ کے ایک دو چاول سے اس پوری دیگ کا حال معلوم کر لیتا ہے، اسی طرح ایک عمدہ تجربہ کار پڑھا لکھا ادیب یا نقاد بعض اوقات ایک آدھ غزل یا شعر سے شاعر کی فنی حیثیت کو جاننے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ فیضؔ کے ابتدائی کلام میں جو "راوی" میں اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی تعلیم مکمل کر رہے تھے، ایک غزل کا شعر مشہور ہے جس میں پختگی کے علاوہ شگفتگی، سلاست اور نغمگی بھی ہے۔

لب بند ہیں ساقی، مری آنکھوں کو پلا دے

وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

اس شعر کی بلندی سے فیضؔ کے تغزل کو ناپا جا سکتا ہے کہ وہ بچپن سے ایک عمدہ غزل گو شاعر بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ نقشِ فریادی کی نظمیں بھی اگرچہ ان کی نوجوانی اور جوانی کی نظمیں ہیں لیکن وہ زیادہ تر رومانی اور مریضِ عشق کے ولولوں اور نالوں سے بھرپور ہیں۔ فیضؔ نے علامہ اقبالؔ پر ایک طولانی بحر میں نظم لکھی جس کا انداز نبھا ہے، اس میں رومانیت کی جگہ حقیقت ہے۔ اس نظم کے بارے میں صہبا لکھنوی افکارِ فیضؔ میں لکھتے ہیں، یہ نادر اور یادگار نظم اقبالؔ پر ہے۔ یہ نظم 19-18 سال کے اُس فیضؔ کی ہے جس نے ابھی نام خدا جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تھا اور 30-1929ء کے دوران لاہور میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہ "راوی" میں چھپی تھی اور نایاب ہو چکی تھی۔ ہم برادرم سبطِ حسن اور برادرم اصغر سلیم کے ممنون ہیں۔

فیضؔ اقبالؔ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں، "جہاں تک شاعری میں سنسی بلیٹی (Sensibility)، زبان اور اس کی موسیقیت کا تعلق ہے ہم تو اُن کی خاکِ پا بھی نہیں ہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں، اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانا نہ ہوتا"۔

اقبال

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا، عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا۔ صدائے قم جہاں تک بھی نہ تھی بزمِ دیاں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا، خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیزانگیز ہنگامے، دلیروں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

کسی واماندۂ منزل سے آوازِ درا اٹھی، ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
بنے تقلید کے مارے خوابِ اہرمن سے جاگ اٹھے؛ خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا، فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر اکھڑیں شرر نکلے
زمیں سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے، یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے

جمود و یاس کے سب دائرے تو نے بکھر ڈالے، ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے، ہر اک ذرے کو ہم دوشِ ثریا کر دیا تو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں، ربابِ زندگی کو آتشیں دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ حسن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے، کہ تو نے صد ہزار انجمن کو نور کر ڈالا

(سنہ 1931ء)

اس نظم میں فیض کی ابتدائی شاعری کی خصوصیات کا عکس ہے، الفاظ کی نشست، عربی اور فارسی لفظوں کا گلشن کی چاشنی اور مانوس تشبیہات، زندگی، عروقِ مردۂ مشرق، فسردہ مشتِ خاکستر، واماندۂ منزل وغیرہ کے ساتھ پیغام کی وساطت سے فیض کے کلام کی شناخت ہے۔ یہ نظم فیض کے کلیات میں نہیں۔ ایسی غیر مطبوعہ اور غیر مدون نظمیں ہیں، ان کو ازسرِ نو باقیاتِ فیض میں جمع کیا جانا چاہیے۔ راقم نے "فیض کی" بہت سا غیر مدون کلام جمع کیا ہے۔ کوشش جاری ہے کہ جلد "باقیاتِ فیض" شائع ہو سکے۔ فیض کے کلام میں ان کے معاصر شعرا کی نسبت سیاسی حالات کی عکاسی واضح نظر آتی ہے:

جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض کی نظم "بول" میں وہ مشہور بیان ہے جو شاعر کے ایسے آہن گر کی دکان پر زنجیر کو پگھلتے ہوئے دیکھ کر اٹھتا ہے اور وہ لوہا
اُن آزادی کے خواہاں دو حرکت پذیر اور انقلاب آگاہ کرتا ہے کہ اس زنجیر کے بننے اور اس کے پگھلنے سے پہلے ہی کہتا ہے کہ بول کہ یہ ساری

نظم معنی خیز نظم ہے۔ یہ جیسی سادہ و نرم لفظوں میں تراشی گئی نظم آہنی استقامت کی ترغیب ہے۔ اس نظم میں روزمرہ کے علاوہ صرف ایک اتی تقریب جسم، زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہاں صنعت مراعات النظیر کے تحت لب، زبان، جسم، جان، زندہ، موت، استعمال کیے گئے ہیں، اسی طرح آہن گر، شعلے، سرخ، زنجیر وغیرہ اسی صنعت کا مجموعہ ہیں۔ صنعت تضاد میں زندہ، موت، تھوڑا، بہت وغیرہ ہیں جو حسن شعری میں اضافہ کرتے ہیں اور الفاظ ضروری طور پر نظم میں لکھائے گئے ہیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیض کا اسلوب زبان سے عمدہ کام لیتے ہیں، ان کے استعارے بھی، تشبیہیں و تمام حواس خمسہ سے ادراک کے تاثر پیدا کر دیتے ہیں لیکن زیادہ تر لمس اور بصری تشبیہات ان کی بصری اور لمسی ہوتی ہیں۔ اگرچہ خوشبو سے بھی احساس شامہ کو متحرک کرتی رہتی ہے۔ ہم مثالوں کے ذریعے اشارے کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

(کلیات، سرِ وادیِ سینا)

چمکا ہے روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

(کلیات، دستِ صبا)

نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

(کلیات، سرِ وادیِ سینا)

گلوں میں رنگ بھرے، بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

([illegible])

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی

([illegible])

یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

([illegible])

سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

. .. ...

واقف رنج ہے عمر کی جب تلک آرزو
ہو جائے فیض سے چمن کے بہار ذرا فروغ

. .. ...

گلزار جسم ... جس پہ قبا کے ناز کرے
ورنہ قد ... ترے سرو ... بھی ناز کرے

([illegible])

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ برسا ہے اسی بام سے مہتاب کا نور

([illegible])

اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
"کس کام آئی کس ہاتھ لگی"
اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں

اُس بام کے نوری سوتی ہیں
اس آگ کی ننھی کلیاں ہیں
جن میں میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگمگ جگمگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن"

یہ نظم جو ایرانی طلبہ کے نام کے عنوان سے لکھی گئی تمام تر خواب یا تصور سے متعلق ہے تمام نظم کی امیجری متحرک تشبیہات کو بیان کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دستِ صبا کی نظم "زنداں کی ایک شام" میں اسی کیفیت، مصوری کا کمال ملتا ہے۔

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

اگر آسمان کے ستاروں کو ایک دوسرے سے جوڑا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیڑھی کے مانند پیچ و خم سے جڑے ہوئے ہیں جن کی چمک دمک کے درمیان اس کے ٹکڑے آسمان پر نقش و نگار بنا رہے ہیں یا خوب صورت سیاہ رات کے ٹکڑوں کو جوڑا جا رہا ہے۔ کرائی سے جو زنداں کے درختوں کی بھی عکاسی ہے لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے وطن درخت یعنی دوسرے مقامات سے زنداں میں قید کر لیا گیا ہے مگر تمام سے آسمان پر نقاشی کر رہے ہیں:

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

اس علامتی اور رومانی امیجری میں ایک نورانی دنیا آباد معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کے تخیل میں اس نیم تاریک رات میں تاروں کی روشنی اور آسمان کی نیلی رنگت چاندنی سے دھل گئی ہے اب آبِ نجوم اور عرش کا نیل ایک ہو گئے ہیں کیوں کہ چاندنی کا پھیلاؤ تو سب کچھ اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ اس چاندنی کی وجہ سے جو سایے صحن میں دکھائی دیتے ہیں وہ ایسے لہلہاتے ہیں جس طرح شدید سوچ کے ساتھ عاشق کے دل میں معشوق کی جدائی کی یاد آئے۔ اس نظم کا پورا ڈھانچا (Structure) استعاراتی نظام پر بنایا گیا ہے جس میں فیض نے مصرعوں میں جیسے ہونٹوں سے ٹپکتے مصرعوں کو اصول بنا دیا ہے۔ شانۂ بام، مہرباں چاندنی، دستِ جمیل، آبِ نجوم، موجِ درد، فراق وغیرہ ان چھ سات مصرعوں میں بصری اور لمسی تحریک احساسات کو ابھار دیتی ہے۔ پڑھنے اور سننے والے پر ایک سرور، شگفتگی اور خوشی کا احساس طاری ہو جاتا ہے جیسا کہ شاید پہلی بار ہم ان مصرعوں کی گہرائی اور گیرائی تک نہ پہنچ سکے لیکن ان کے جادو کا اسیر تو ہو ہی جاتا ہے اور یہ ہے فیض کے فن کا کمال۔ پوری نظم میں مسرت و روشنی کو دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم ایک عظیم علامتی نظم ہے لیکن امکان ہے کہ اس نظم کو یہاں تک پہنچ کر ختم کر سکتے تھے لیکن جو چیز فیض کی پہچان ہوتی ہے اور فیض کی شناخت ہے وہ اس نظم کا Climax یا نقطۂ عروج ہے جو ہر بڑا شاعر نہیں پیدا کر سکتا۔ فیض کہتے ہیں:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

پھر آخری تین مصرعوں میں روشنی سے نسبت ہے۔ فیض کہتے ہیں زندگانی شیریں ہے۔ انسان کو انسانی اور فطری تقاضوں پر چلنے اور پھولنے دیا جائے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزاد مرے گا۔ فطرت حرمت اور آزادی کی نقیب ہے۔ ظالم جو زہر گھول رہے ہیں وہ بھی زہر گھولنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن فطرت کا تقاضا ہے کہ حق اور حرمت کی فتح ہوگی۔ اگرچہ وہ عشق و محبت اور حق شناسی کی شمعوں کو بجھا بھی دیں وہ حسن ناصر کو قلعہ لاہور کی جیل میں شکنجہ کس کے ختم کر دیں لیکن آزادی اور روشنی کی تحریک کو نہیں روک سکتے وہ چاند کو نہیں بجھا سکتے۔

کیا یہ انسانی مثبت اقدار نہیں؟ کہ مصرعوں میں عزم اور یقین کا جوش نہیں، یہ اور بات ہے یہاں آخر بازی ہار دی اور نہ پہچانا۔ یہ بات ترقی پسند تنظیم کے لیڈروں کا قصور نہیں، یہ جیسا اور مستقبل ہو آج بھی ترقی پسند تحریک کا مقصد ہے اگرچہ ترقی پسند تنظیم کب کی مر چکی ہے۔ دنیا کا تجربہ ہے جو چیز فطرت نے انسانوں پر مقرر کی ہے وہ ہمیشہ قائم اور دائم رہتی ہے اگرچہ چند لوگ وقت کے لیے شاید فلسفہ کی شکل میں آ کر حقیقت کی روشنی کے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں۔

فیض "دستِ صبا" کے انتساب میں لکھتے ہیں:

"شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے بہاؤ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلاحیت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت۔ زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔"

مسعود حسین خان کہتے ہیں:

"فیض کی ابتدائی نظموں کے بارے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پر انگریزی اور اردو کی رومانی شاعری کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تخیل کو نئی تشبیہوں اور استعاروں سے تانے بانے کا موقع ملا ہے۔ جذبہ اور تخیل کا حسین توازن ہے جو کہیں کہیں پر جذبہ اور زبان پر پوری قدرت ہونے کے باعث ممکن ہو سکا ہے۔"

عالم کی نظم میں اپنے مقامات پر جذبہ اور تخیل کا توازن برقرار رہتا ہے مگر کہیں کہیں دروں بینی غالب ہو جاتا ہے۔

فیض کی ابتدائی نظموں میں رومانیت اور مثالی رومانویت کا نمایاں عنصر نظر آتا ہے۔ یہاں وہ عشق کو سماج کے درد سے جوڑنے کی سعی ہے۔ فیض اپنی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" میں خود اپنی "خلوص" کی معنویت کرتے ہیں۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

اس نظم کے ہر مصرع خیال پر شاعر کو صرف غم جاناں اور جاناں کی آنکھوں میں دنیا کی مسرت، لذت اور ضرورت مل سکتی ہے وہیں یہ تبدیلی نظم کے ماحول اور توازن کو بدل دیتا ہے جو بہت کچھ اور پڑھنے والے کے احساسات کو شدید کر دیتا ہے۔

جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

شاعر پھر صداقت اور سچے جذبوں کی عکاسی کرتے ہوئے ان مناظر کو اس موقع پر بیان کرنے کا جواز خوب صورت انداز میں پیش کر کے آخر کار حسن کی عظمت کا اقرار بھی کر لیتا ہے:

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

فیض کی شاعری کی بنیاد پر دونوں سمت خیالات کی سیڑھیاں حرکت کرتی ہیں۔ اس سفر میں حقیقت سے رومان اور رومان سے حقیقت کی آمد و رفت نظر آتی ہے۔ یہاں جذبہ اور جمال کا ملاپ کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ بعض اوقات چھوٹے اور بعض اوقات بڑے ہو جاتے ہیں مگر آخر بات دونوں قدروں کا احترام حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ فیض بنیادی طور پر جمالیات پسند ہیں لیکن ان کو اس پسندی سے دور رکھتے ہوئے حقیقت پسندی کے حساب میں گم ہو جاتے ہیں لیکن اس حالت میں بھی ان کی تخلیق کا حسن نظر اور ان کے فکر کا

ذاتی حزن کم ہو سکتا تھا۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

....

زمیں پہ اندھیرے کی مہر لگی ہے
تو گلیوں میں ستارے اترنے لگتے ہیں

سوشانگ کامل پیمار رانی لکھتی ہیں:

"بعض شعر لوگ تو عشق اور صرف سیاسی سرگرمیوں کو کام کہتے تھے۔ وہ ساری عمر کام اور عشق کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ انھوں نے زندگی بھر اچھے اچھے شعر کہے اور اچھے اچھے کام کیے مگر ہمیشہ مطمئن رہے۔"

آغا ناصر 'ہم جیتے جی مصروف رہے' میں بھی اسی گفتگو کی تصدیق میں فیض کے شعر سے حوالہ دیتے ہیں۔

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور کام سے عشق الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

فیض رقیب سے صرف اپنا ماضی اور مجازی کیفیات ہی نہیں بلکہ جمالیاتی اور عشقیہ تاثرات بھی بیان کرتے ہیں۔ بیا رازدار مرزی کا کہنا ہے فیض کی شاعری سے متعلق ہونے والی اہم بات یہ ہے کہ محترمہ نے اس نظم کی گہرائی اور گیرائی پر خود اپنی غرض ہی کہیں رکھا ہے کہ صرف تنگ مطالعہ کرنے نے اس نظم کو ازدواجی تہذیب کا تنگ قرار دیا ہے جب کہ یہ نظم کردار کا تنگ ہے اور روایت سے بغاوت کا نیا زاویہ ہے جس میں عاشق رقیب حسن اور درد میں مشترک ہو گیا ہے۔

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے بڑھتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

"فیض میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شعرا کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس نہیں اور یہی ان کی ناکامیابی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دوسری چیز جو فیض میں ملتی ہے وہ ایک قسم کی خود ضبطی ہے۔ وہ اچھے کو لیے دیے رہتے ہیں اور دوسرے باقی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔ وہ ترقی پسندی کا یہ مطلب نہیں سمجھتے کہ بیدار ہو بیدار ہو کا شور مچایا جائے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ "قلم اٹھا تلوار اٹھا"، "مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم"، "اٹھا پھاوڑا، اٹھا پھاوڑا، کھیتی چھوڑ دو!"، "بغاوت میرا مذہب ہے۔ بغاوت دیوتا میرا" اور اسی قسم کی چیزوں کی یلغار کو ترقی پسند شاعری سمجھا جائے۔ بے شک ان کی آواز دھیمی ہے وہ دلی زبان سے باتیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ فنکار وہ جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے۔ وہ فنکار ہیں جذبات پر ضبط کی مہریں لگاتے ہیں۔"

ڈاکٹر نصرت چودھری لکھتی ہیں:

"فیض نے بعض انگریزی شاعروں سے طرزِ فکر سے متاثر ہیں۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں کی تشکیل میں بھی انھوں نے ان شاعروں کے طرزِ ادا سے اثر قبول کیا ہے۔ نظم "تنہائی" آرتھر سائمنز کے بروکن ٹرسٹ (Broken Trust) اور ہارڈی کی دی بروکن اپائنٹمنٹ (The Broken Appointment) کی یاد دلاتی ہے۔ فیض یہاں سوئن برن (Swin Burne) کے ہم مسلک نظر آتے ہیں جہاں انھوں نے اپنی محبت سے گریز کیا ہے اور جہاں وہ انسانی مسائل کو تاریخ کی قوت کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترکیبوں کی تراش خراش، صناعت کے حصول میں استعمال اور طرزِ ادا پر انگریزی شاعری کی چھاپ نمایاں ہے۔"

ڈاکٹر [illegible] لکھتی ہیں:

"جس طرح کلام کی ہے یہ خوبیاں کے باوجود کلاسیکی ندرت کی شاعری ہے کہ کئی شاعر تھے۔ فیض بھی بنیادی طور سے رومانیت کے شاعر ہیں محسوسات کا بلند [illegible] بہترین جدید شاعر۔"

فراق گورکھپوری "اردو کی عشقیہ شاعری" میں لکھتے ہیں:

"فیض اس لحاظ سے انگریزی رومانی شاعری سے بہت قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی شاعری کی بنیادیں اپنے وقت اور اپنے زمانے کی بعض اقدار پر قائم ہیں۔"

فیض بھی اردو کے ان چند شاعروں کی صف میں ممتاز ہیں جنھوں نے وطن کی محبت کے گیت گائے۔ وطنیت اور حب الوطنی اردو شاعری میں فارسی سے منتقل ہوئی ہے۔ اگرچہ حقیقت میں ہر وطن شعرا کے ہاں وطن کی محبت کے ایسے جذبے موجود ہیں لیکن اس موضوع پر خاص طور پر خاص مطالب اس وقت نظم ہوئے جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک پر موضوعات پر شاعری کی گئی اور نظموں کو وطنی شاعری کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ وطن پر آزاد شاعری کی جو روایت اقبال، جوش، حفیظ اور جناب اکبر آبادی کی [illegible] ملتی ہیں۔ یوں تو فیض کی شاعری میں شامل محب الوطنی کی مثالیں موجود ہیں لیکن "نثار میں تری گلیوں پہ" ایک شاہکار نظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ "صبح آزادی" بھی وطن کی محبت کا قصیدہ اور مرثیہ ہے۔

"نثار میں تری گلیوں پہ" کے بارے میں فیض نے ایلس کو 15 اگست 1952ء کے خط میں لکھا:

"جیل کے اندر سے [illegible] بہت [illegible] پورے شعر [illegible] نظم [illegible] ہوتی تھی [illegible] یا [illegible] میں [illegible] کرتے ہیں:
[illegible] آج کل کی تبدیلی میں عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوتی ہے [illegible] اسی وقت [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible]۔
[illegible] کرتے تھے کچھ وقت ہی [illegible] شام کے وقت تک [illegible] ہے قریب قریب ختم کر چکا تھا۔ [illegible]
موجود ہے۔ [illegible] شاید ہم [illegible] شاعر ہو جائیں گے۔"

فیض کی اس نظم میں وطن سے محبت کے جذبے کی شدت ہے۔ وہ وطن کے حالات سے مطمئن نہیں اس پر ناخوش ہیں لیکن محبت اور درد کا احساس رومانی انداز میں سناتے ہیں۔ جیسے معلوم ہے کہ

[illegible] کی نظمیں رومانی شاعری کا اعلیٰ نمونہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ [illegible] محبوب سے قلبی تعلق کے جذبات کی [illegible] کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک تعلق کا دوسرا پہلو بھی ضروری ہے۔

بجا جو دور زنداں گجر تو یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

فیض کے کلام اور ان کے آدرش پر براہ راست [illegible] سب نے ان کی [illegible] محسوس آتے ہیں۔ لیکن فیض نے [illegible] ان سب کا [illegible] جواب دیا اور [illegible] "جواب جاہلاں باشد خموشی" کے مصداق [illegible]

رہے۔ فیض کے چاہنے والوں نے فیض سے زیادہ ان کے مخالفین کو جواب دیا۔ وہ بھی ''کاسۂ آتش بار تو'' یا ''چپ سے زیادہ''

کھوکھلی بین الاقوامی ہم آہنگی کے بجائے خود نمائی میں مصروف ہو گئے۔ فیض کو جتنا ان دوستوں سے نقصان پہنچا اتنا ان کے دشمن

اُن کو نقصان پہنچا سکے۔ دشمنوں کے ہاتھوں میں قتل الرقیب ہو کر بھی جی اٹھے۔ بقول فیض:

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

زنداں میں بھی آتشِ گل کے نکھار کے موسم کو دیکھتے۔ فیض اپنے ایک مداح پروفیسر حسن [illegible] کو لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزی ارشاد! آپ کا مضمون یہاں پہنچا [illegible] ایک بات سے مجھے کچھ اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ایوب خاں کے دور میں اور اس کے بعد بھی [illegible] پر زیادہ زور دیا ہے اور موجودہ حالات پر کچھ زیادہ حرف زنی نہیں کی۔ ملاحظہ ہو ایوب خان کے جشن پر:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

1965 کی جنگ، پلیک آؤٹ، سپاہی کا مرثیہ، یحییٰ خان کا مارشل لا، آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو، ڈھاکہ سے واپسی پر، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، بے گناہ قتل عام کا ایک تعزیہ، [illegible] ہر ایک زندگی کا سامنا ہے، تم جو پیار ایام میں پھر ہار ہوا، آج ظلمِ عظیم دکھائیں گے، دوبارہ [illegible] ''ٹوٹی جھروکے [illegible]'' [illegible] حالات پر [illegible] وغیرہ کئی باتیں زیادہ کھلی اور زیادہ بلند آواز سے کہی گئی ہیں لیکن یہ اپنے مزاج اور طریقۂ اظہار کی بات ہے۔ یہ وضاحت کرنی اس لیے ضروری ہوئی کہ نقاد ادب و سیاست سے متعلق آپ کی جچی تلی باتیں ہیں۔ ان معاملات کے بارے میں آپ کو بصیرت بھی حاصل ہے۔''

ہم اپنی تحریر کو فیض کے دوست ڈاکٹر آئی۔ اے۔ رحمٰن کے قول پر ختم کرتے ہیں:

''فیض کے وہ اشعار جو انھوں نے پاکستان کی آزادی پر لکھے اور جنھیں صبح آزادی کو شب گزیدہ سحر کہنے پر حرفِ ملامت بنایا گیا، وہی شعر پاکستان کے قیام کے پچاس سال بعد مؤرخین کے لیے ملک کی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

٭٭٭

حواشی

٭ یہ شعر ''نذر خالد'' سے نقل کیا گیا ہے۔

کلامِ فیض پر فیض کا ریویو

فارسی کا شعر ہے:

کس نا خارد پشتِ من
جز ناخنِ انگشتِ من

یعنی اپنی کمر کو کھجانے کے لیے سب سے بہتر اپنی انگلی کا ناخن ہی ہو سکتا ہے۔ تخلیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تنقید اُسی لمحہ شروع ہو جاتی ہے جس لمحہ تخلیقی عمل شروع ہوتا ہے۔ ایک فن کار سب سے بڑا اپنے فن کا تنقید کار بھی ہوتا ہے۔ شاعری میں مبالغہ حُسن اور تنقید میں عیب ہے۔ بعض شاعروں نے اپنے فن اور اپنے کلام پر ریویو کیا جو بہت صحیح ہے اور بعض نے مبالغہ کیا ہے جو شریعتِ شعر میں جائز قرار دیا گیا ہے جس کو تعلّی کہتے ہیں۔ میر صاحب فرماتے ہیں کہ "مستند ہے مرا فرمایا ہوا"۔ داغ کہتے ہیں کہ "ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری"۔ غالب کہتے ہیں کہ "میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں"۔ اقبال کہتے ہیں کہ "دگر دانائے راز آید کہ ناید"۔ بہر حال ہر شاعر نے بڑا ہو کہ چھوٹا اپنے جنم دیے ہوئے اشعار کی تعریف کی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی ہے کہ ہر دہی بیچنے والا اپنے دہی کو میٹھا ہی کہتا ہے۔ لیکن مولانا روم یہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ دلبری دوسروں کی زبان سے اچھی لگتی ہے:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در زبانِ دیگراں

عجیب بات ہے کہ فیض کے پاس تعلّی کا وجود نہیں صرف چند اشعار جو اُن کے طریقۂ فن پر اشارہ کرتے ہیں مقطعوں میں موجود ہیں تا کہ اُن کی شاعری اور علامتوں کو سمجھنے میں مدد ملے:

جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

……………………

فیض ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر کہتے رہا کرو بیٹھے

فیض نے سِن اور فن کا یہ راستہ بڑی خوبی سے طے کیا:

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کیوں کہ:

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

یوں تو کئی ناقدوں، ادیبوں، شاعروں، دانش وروں، سیاست دانوں، صحافیوں، مترجموں، تحقیق کاروں، دوستوں، دشمنوں، طالب علموں اور جاہلوں نے فیض کی شاعری پر مختلف زاویوں اور مختلف زاویوں کے تحت گفتگو کی ہے لیکن گھر کا بھیدی جو حال جانتا ہے وہ دوسرے بے چارے کیا جانیں، چاہے کتنے ہی راست اور ژرف نگر کیوں نہ ہوں۔ اس تحریر میں ان کی شاعری کے متعلق اور اس سے مربوط مسائل پر ان ہی کے بیانات جو میں نے ان کے خطوط کے مجموعے "صلیبیں مرے دریچے میں" ان کی کتاب "متاعِ لوح و قلم" اور مختلف مطبوعہ انٹرویوز سے لیے گئے ہیں۔ شاید ہی اردو ادب کا کوئی ایسا عظیم شاعر ہو جس نے اس قدر دیانت داری اور انصاف سے اپنے کلام پر کلام کیا ہو:

14 جون 1951 کو ایلس کے خط میں لکھتے ہیں:

"گرفتاری کے بعد میں نے ابھی ابھی پہلی نظم ختم کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ تین برس میں جتنا کچھ لکھا تھا ان تین ماہ میں اس سے دو گنا لکھ چکا ہوں"۔

9 نومبر 1951 کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"اپنی نئی نظمیں ایک نئے مجموعے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد بالکل غیر شاعرانہ کیفیت طاری ہے لیکن میں پریشان نہیں ہوں کیونکہ یہ کیفیت جلد لوٹ آئے گی"۔

28 نومبر 1951 کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"کل رات ایک نئی غزل مکمل ہوئی۔ کوئی ساڑھے دس بجے میں نے سب ساتھیوں کو سننے کے لیے بستر سے اٹھایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سال کی محنت کی تھی، اور یہ بھی کسی چیز کا کیا ہو"۔

14 دسمبر 1951 کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"تمہارے جانے کے بعد ہم ایک نظم میں الجھ گئے تھے جو آج ہی ختم ہوئی ہے۔ شاعری کا دورہ کبھی کبھی پڑتا ہے اور جب پڑتا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر تھوڑا سا ادھر ادھر ہوئے تو یہ کیفیت کافور ہو جائے گی۔ یہ نظم تھا بھی ہوئی ہے ایک طرح کا تجربہ ہے جو میں نے پہلے نہیں لکھا۔ شعر تو شاید اچھے نہیں ہیں لیکن تجربہ بازی کی کمی نہیں ہے"۔

31 دسمبر 1951 کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"آج کل دو ایک غزلیں نظمیں شروع کر رکھی ہیں جو غالباً جلد ختم ہو جائیں گی لیکن یہ شاعری بے ہودہ چیز ہے۔ اس کی وجہ سے اور سب کام رکے ہوئے ہیں جن میں انہیں خط لکھنا بھی شامل ہے اور آج کل مترجم بھی آیا ہوا ہے۔ بیشتر اوقات اتنا اطمینان نہیں ہوتا ہے کہ اسے ردی کی ٹوکری میں پھینکا جاتا ہے (اسے ہم Tshney کہتے ہیں) اور کبھی کوئی تعبیر ہاتھ نہیں آتی اور بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے Perfecrianism لیکن غالباً اس کا کوئی علاج نہیں ہے"۔

15 جنوری 1952 کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"تین نظمیں لکھنے کے بعد دماغ تھک سا گیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر ادھر رجوع کر سکوں گا"۔

22 فروری 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''ایک دو نظمیں تو پوری بھی لکھی ہیں، لیکن مختصر کرنے کی بجائے فرصت سے نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں [illegible] کا ماحول نہیں
ہے۔ اس لیے انتظار میں ہوں کہ کبھی [illegible] وقت آئے گا''۔

25 مارچ 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''دو نئی نظمیں لکھی ہیں اور امید ہے کہ تمہارے آنے تک ایک اور ختم ہو جائے گی۔ نئے مجموعے کی اشاعت کے
بارے میں تم کو کوئی دقت تو نہیں ہے''۔

22 مئی 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''میں نئی چیز لکھ رہا ہوں۔ شاید پوری ہو [illegible] لکھا جا رہا ہے لیکن نہ لکھنے سے بہتر ہے۔ پھر ایک خوشی یا ملال سے
نئے شعر نکلتے ہیں یا بعض اوقات ہم [illegible] مصرعے صاف کرتے ہیں کئی دن لگ جاتے ہیں اور جب تک
سب درستی کا منتظر رہتا ہے [illegible] ہم [illegible] کے لکھے الفاظ [illegible] پڑتی ہے۔ اس لیے
کہ ہمارے انسان بہتر [illegible] ہیں''۔

21 جون 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''کل رات ہم نے مشاعرہ کیا [illegible] کے [illegible] نظمیں [illegible] کوئی غالب کی چیز نہیں [illegible] تفریح
کا سامان ہو گیا''۔

29 جولائی 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''میرا مجموعہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے جس کے ساتھ ایک مقدمہ بھی لکھی گئی ہے (دیوان اور مجموعہ کا فرق تم جانتی ہو) ان میں سے ایک
نئی نظم لکھی ہے) اس طرح پانچ سال کے اس عرصے کے کام کا نتیجہ [illegible] صاف ہو چکا ہے۔ مجھ
مشکل لگتی تھی [illegible] حقیقی احساس تھے، یہ سب مشکل ہو چکا اور اب کوئی نئی چیز شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن
اس طرح کی تحریروں سے وہی تسلی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات صرف مایوسی اور اداسی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی
لکھا ہوا بہت معمولی اور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا نہیں تھا۔ [illegible]
کیونکہ جو لکھتے تھے اس کا جواز ہوتا تھا۔ لیکن اپنے بہتر کرنے کی مشق کے طور سے لکھنا بالکل دوسری چیز ہے۔
اس میں [illegible] ہے [illegible] ہے اور [illegible]
لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا بہر طور بہتر ہے کچھ نہ لکھنے سے۔ تمہیں بھی اس بات کا زیادہ
تجربہ ہوگا''۔

10 اگست 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

''اب تک تمہیں میرا مسودہ پہنچ گیا ہوگا۔ یہ بالکل مکمل نہیں [illegible] اگلے ہفتے مکمل
ہو جائیں گی اور جب تک یہ اشاعت کے لیے تیار ہوگا [illegible] بھیج سکوں۔ مجھے افسوس ہے
کہ [illegible] سے ابھی تک [illegible] نظمیں [illegible] ہیں [illegible] ہوتا
ہے [illegible] مشکل ہے۔ [illegible] شاعری [illegible]

بہرا اصلی کام ہے اور اب تقطیع میں کیا مشکلات بھی محسوس ہونے لگی ہے اب بھی ہر ا امید ہو سے خالی نہ
کبھی ہوئی کہ تحریر مکمل پہلے جیسی خوبی اور اتنا کیف رہ گیا ہے۔ یہ تو عجیب ہے کہ Bloody Perfectionism
کے طعنوں سے تنگ آ کر اب میں نے پہلے کی طرح خالی بنانے چھوڑ دیے اور نئی تحریر کا کام چھوڑ دیا ہے،
اس لیے کبھی پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہے کیونکہ میں کوئی ایسا شخص بھی
نہیں جو اعتبار کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکے کیونکہ ہر چیز کو اچھا ہونے سے پہلے دیکھ لیتا ہوں۔“

22 اگست 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

”اگر تمہیں یہ آخری نظم پسند آئی ہے تو اسے آخری مسودے میں شامل کر لینا ہوں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ تم ان
کی فہرست کو سے جاؤ۔ یہ دو نئی نظمیں جو تمہیں بھیج رہا ہوں ان سے کتاب کا مجموعہ مکمل ہو جاتا ہے۔
اگرچہ مجھے یقین ہے کہ کتاب کی اشاعت تک شاید دو چیزیں بھی ہو جائیں گی۔ تمہاری کتاب سے اب تک کی
اردو شاعری کے انتخاب پر کام کر رہا ہوں۔ ہر روز دو تین گھنٹے اس میں صرف ہو جاتے ہیں لیکن کام بہت لمبا ہے۔
اس کے لیے کئی مہینے درکار ہوں گے۔ اگر ختم کر سکا تو یہ اچھی چیز ہو گی، لیکن جاتے جاتے شاید ختم ہو جائے،
لیکن اگر ختم نہ ہوا تو پھر جب چھپنے کو ہو شاید بعد میں ہی یہ خود بخود ہو جائے۔“

17 ستمبر 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

”ایلس کی کتنی یاد آتی ہے اس لیے شاید اس نے تمہیں کتاب کا انتظار کرنا چاہیے تاکہ مل کر ساتھ
مطالعہ ہو اور آپ کے لیے نیا بھی۔ کیا یہ ظلم ہے جس کا مجھے خدشہ تھا، وہ تمام آئے بغیر لکھوا دو کہ
کتاب مکمل ہے۔ ایک مطبوعہ نظم جو اس میں شامل نہیں ہے وہ خود حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے بعد طباعت
شروع ہو سکتی ہے۔ سوائے یہ کہ اب تک انتظار نہیں بھی ہو سکتا ہوگا اور اگر اس سلسلے میں صوفی صاحب کی کوئی تجویز
ہو تو مجھے لکھوا دیں۔“

12 اکتوبر 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

”روف کو ایک غزل بھیج رہا ہوں جو میں نے بہت جلدی کے ساتھ کہی ہے۔ ایک اور نظم مکمل ہے۔ پر نظم سے مجھے خاص طور
سے خوشی نہیں ہے کہ صوفی صاحب کے مجوزہ الفاظ میں I don't mind telling you آج کل بڑی الجھن
میں ہوں لکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرا ذہن بدل گیا ہے۔ آپ صاحب
جو تجربہ رکھتے ہیں وہ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف اتنی سی بات ہے کہ
تمام طرح سے ہم نئے تجربے میں ہیں۔ اب نیا تجربہ جو کچھ اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ کہنا چاہیں
اتنا ہی آ جائے ذہن میں جو تصویر ہے اس سے الگ جو بھی ہو وہ الفاظ میں ڈھل جائے۔ اگر اس سے کام
چلا لیا جائے تو اس میں انکار نہیں ہے کہ کام لیا جائے۔ مگر جو پڑھنے والے ہیں ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پڑھتے وقت
محسوس ہو کہ یہ شعر کسی خاص کے آخری انتخاب سے پہلے گئے۔ ہماری بات یہ ہے کہ شاعری نے ہمیں بنا دیا ہے۔ ختم شاید
بہت ہو جائیں گے، مگر اقرار ہے کہ ہم نظم کو کچھ بھی کا کیا ہو سکتا ہے۔
روف سے کہہ دینا کہ آخری نظم مسودوں میں شاید ہم کچھ کر سکیں لیکن اگر کوئی اور اس میں لکھنا آتا تو چھپے

بہت عجیب ہیں۔ رہی انتخاب کی بات تو اگر تم سچ مچ کوشش کرنا چاہتی ہو تو سب سے عقلمند بات یہی ہے کہ کتاب بھی تم ہی کی ہے۔ میں نے تو اس لیے لکھا تھا کہ ذرا یہ شرط تو ہم سے دوسرے بہت سے لوگ اس کے بارے میں تم سے مشورہ کیا کریں گے جو شاید تمہارے لیے تھوڑی تھکن کا سامان ہو۔ بہرحال جو تمہارا جی چاہے کرو۔ صرف "سپاہی بیوی کے نام" پر مجھے اعتراض ہوگا۔ یہ انگریزی میں تو ٹھیک ہے لیکن اردو میں کچھ پھوہڑا معلوم ہوتا ہے"۔

25 مارچ 1953ء ایلس کو لکھتے ہیں

"آج کل اپنے بچپن کی خبر حاضر ہے اور شب و روز بچپن کی یادوں کی بھاری ہے۔ اب میں نے وقت کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس لیے کہ سستی سے جگالی پر اثر پڑنے لگا ہے۔ اس نئے نظام کی خوبیاں معلوم ہوتی ہیں اور آج کل میں ہر کام بالکل وقت پر کرتا ہوں۔ یادوں کے ساتھ اچھے زیادہ وقت گزارنے کو جی نہیں چاہتا، اس لیے میں صبح شام ورزش پر اتنا زور دیتا ہوں کہ تھک کر سو جاتا ہوں اور صبح پانچ بجے جب گھنٹہ بجتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس وقت جیل کی دیواروں سے باہر پہلے مختلف جانوروں کی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر پرندے نکل جانے لگتے ہیں۔ صبح کے منظر پر جو نظم لکھی تھی وہ پہلے بند سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس لیے میں نے اسے قبل از وقت مرنے والوں میں رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ پرانا لکھا لکھایا ہی کافی ہے جو صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ انسان ہیں۔ تم لوگ چاہتے ہیں کہ لوگ اس کو پسند کریں، جو لوگ باتوں سے لطف اٹھا رہے ہیں"۔

10 نومبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"نئے موسم کے خیر مقدم کے لیے ٹوٹی پھوٹی سی ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ اس کی خوشی ہے کہ اب وہ تم تک پہنچ کر کچھ فائدہ حاصل ہو چلا ہے، لیکن جو کچھ میں لکھنا چاہتا ہوں اس پر قلم، اسلوب و اظہار کے مسائل تجربے میں ہیں اور اس امید ہے کہ شاید بعد میں زیادہ دلی موضوعات پر لکھا جا سکے"۔

20 نومبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"پچھلا خط میں نے اس امید میں روک رکھا تھا کہ تمہیں دو نظمیں ایک ساتھ بھیج سکوں گا۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ نظم کے تجربے کو میں نے آخری ترمیم تک چھوڑ دیا ہے اور اس بارے میں اب جو بھیجتا ہوں۔ یہ تجربہ جو تم نے دیکھا ہے زندگی اور تجربات اور سب انسانوں سے مکمل طور پر مختلف ہے لیکن ہم جس طرح کی نظم بناتے ہیں تب میں آج پہلے سے زیادہ شدید تجربات کا مطالعہ اپنے اندر سے کرتا رہتا ہوں اور بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ فنکار یہ نظم ختم ہونے سے پہلے اور اپنے آپ کو جانچ لیتا ہے، لیکن امید اور تخیل کی رو سے کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے۔ خیر اب میں اور دلی کی تصویر جب بھی باہر جو کچھ ہو رہا ہے دیکھتا ہوں، تو دل اپنے آپ سے خوش رہتا ہے اور اس بھی"۔

17 دسمبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"یہ سن کر خوشی ہوئی کہ چغتائی صاحب نے سرورق تیار کر دیا ہے"۔

29ستمبر1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''تاہم اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے پنجابی شاعری[11] کر رہا ہوں، دو نظمیں ہو گئیں۔ پنجابی۔ ان بچوں کو بھیجنے کا ارادہ تھا لیکن بچے شاید نہ جانے گی وہ''۔

''... ہمیں بہار کے نام ایک سلام بھیجنا ہے اور زندگی، دوستی اور محبت کے نام کچھ جن کا میں اب تک منتظر رہا ایمانی ادبی ترنگ ہے جیسا کہ ترانوں کی عادت ہوتی ہے۔ ان دنوں سے نام کی بجائے وہ جس کی صورت ہو جاتے ہیں اور ... کے نام ... ہونے ... کا انکار ہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی خاطر نئے سرے سے کچھ تصویریں کھینچوں، اس خیال سے کہ شاید ہر جگہ ان سے پورا اتفاق نہ کر سکوں۔ لیکن اب کسی ایسی نظم میں آپ کے موضوع کی تکرار ہو گی جو میں اپنی طرف سے ہمارے تعلق پر لکھ چکا ہوں۔ یہ میری سب سے اچھی تصویروں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ نئے شکوں کو ان سے شعر دے دی جائیں۔ میں چیزیں کرلوں۔ شاید اس سلسلے میں کسی کو اور موقع پر انھیں تراش دوں اور صحیح میں جب ہم سب طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہو جانی چاہیے کہ یہ ارادہ ہے کہ ہر ایک روزمرہ قصے سے کہ جو ہے وہ کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم داستان کی حیثیت سے بیان ہو سکے۔ اس لیے کہ ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے عجیب اور دلچسپ دور ہے۔ نہ جانے یہ کبھی لکھ پاؤں گا یا نہیں۔ لیکن ارادہ ضرور ہے''۔

8 فروری1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''آج کل میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی نحو کا حصہ کے لیے علم اور منطق ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ وقت لگے گی''۔

13مارچ1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''مسودہ حیات ترقی کے بارے میں ڈاکٹر کا خط آیا تھا۔ ہماری کتاب کا ترجمہ شاید ضروری نہ ہو، مگر شاید بہتر ہوگا کہ روزانہ کی باتوں سے انتخاب کر لیا جائے۔ اس طرح کا ترجمہ ہو جائے گا اور ڈاکٹر ''نقش فریادی'' کے انتخاب سے بھی کام چلا سکتے ہیں جو ہم لوگ آپ کا ترجمہ کر دیں''۔

11مارچ1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''میں نے دوبارہ نظم طرح شروع کر دیا ہے۔ دو شعر اس ہفتے کے آخر تک ... ختم ہو جائیں گے۔ ایک نئے سرے سے بھی ہو رہا ہے اس کے بعد میں نظم لکھنے کی کوشش کر رہا ہے''۔

22مئی1954ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ ایک اور نظم کا آخر ہے اور دوسری رباعیاں جو ٹکڑوں سے شروع ہو کر مکمل ہو گئی ہے۔ اس میں کوئی ایسی کمال کی بات نہیں لیکن پڑھ کر تم کو اچھا لگے گا''۔

29 نومبر1965ء لندن سے محمد علیم اللہ کو لکھتے ہیں:

''اب تو میں پاکستان ختم کر کے بھی ادھر کی صورت نظر نہیں آتی اس لیے غزل[12] کوئی ایسی نہیں ہوئی۔ ایک نظم بھیج رہا ہوں۔ کیا ایک نظم بھی بچی ہوئی بیان کی''۔

چنانچہ حسن صہبائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"ایک زمانے سے آرزو تھی کہ اردو شعرا کا کوئی ڈھب کا انتخاب مرتب ہو جائے۔ آج کل اسی کام میں مصروف ہوں۔ تھوڑا سا رہ گیا ہے جو عنقریب ختم ہو جاتا ہے۔ حال ہی میں میر اور سودا کو دوبارہ انتخاب سے پڑھا۔ اس سے لکھتے ہوئے کہ سودا میر سے بڑا شاعر تھا۔ یہ سچ ہے کہ میر کے اچھے اشعار کی نظیر سودا کے ہاں نہیں ملتی لیکن سودا کے کلام کی عام سطح میر سے بلند ہے۔ اور کئی دوسرے شعرا میر کی زبان سے چھپائے بیٹھے ہیں۔" (حرف حرف قلم)

میں نے خطوط کا ایک نیا مجموعہ "دستِ صبا" کے نام سے چھپنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ افسوس کہ آپ اب اردو میں نہیں لکھتے ہیں ورنہ میں کہتا کہ آپ ایک تبصرہ لکھ دیجیے۔ چار پانچ سال انگریزی اخبار میں سر مارنے سے جو تھوڑی بہت اردو آتی تھی وہ بھی بھول گئی ہے۔ اس لیے ان خطوط میں بہت سے تسامحات ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ لیتے تو بات صاف ہو جاتا۔

حمید کو لکھتے ہیں:

"قدم قدم پر جوش صاحب کی طرح اپنی جہالت پایا جاتا ہے۔ ہم نے بھی کوشش کی لیکن بالکل یاد نہیں آئی۔ ابھی ابھی ہم نے یاد آیا اور تب سے لاہور ایئرپورٹ پر پورا جلوس موجود تھا۔ سب سے پہلے بے چارے حسن ناصر کی امان ملی۔ امام صاحب یاد تھا اور ان کے لیے دعا کیا کیجیے۔"

"آج صبح شہر میں صرف ایک رات اور آدھا دن قیام رہا۔ اس لیے فرصت سے دیکھ نہ سکے۔ پھر بھی مرزا غالب اور نظام الدین سلطان کے مزار پر فاتحہ پڑھ آئے۔"

فیض نے کوئی (21) طویل انٹرویوز ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہاں مختلف سوالات اور جوابات کو من وعن پیش کیا گیا ہے۔ بعض اردو ادب کے اہم سوالات جن کے اچھے جوابات دیا ہے شامل ہیں۔

مظفر اقبال: ایک بہت عام سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں آپ لکھتے کس طرح ہیں؟

فیض: کس طرح لکھتے ہیں یا کس طرح کا جو ہمیں بھی پتا نہیں کہ کس طرح لکھتے ہیں ایسے ہی۔ ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے: ایک خط یا کوئی ایک اچھا یا کوئی ایک ایسا پورا شعر آ گیا کوئی ذہن میں اور وہ ان سے ذہن میں تھا ہاں سا ہو جاتا، یا پھر کبھی یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی چیف شاعرانے جیسے ہم نے لکھا ہے "کوئی خوشبو کوئی خیال کوئی کہ فرصت" کبھی کام کرتے ہوئے کوئی مصرع ہو جاتا ہے جو ذہن میں کبھی کوئی دھن ذہن میں آ جاتی ہے کبھی کسی قدم واقعہ سے یکایک ایک مصرع ذہن میں آ جاتا ہے جیسے "ہم آئے ہمیں اجنبی کتنی ملاقاتوں کے بعد" کوئی مصرع ذہن میں پہلے آیا ہو گا جواب یاد نہیں۔ پھر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اس غزل کا پورا قاعدہ بنتا ہے کہ مثلاً کوئی کے ذہن میں آ گئی تو پھر باقی آہستہ آہستہ غزل بن جاتی ہے۔ نظم کے بارے میں پہلے خیال سوچنا پڑتا ہے۔ ایک مصرع پہلے ذہن میں آتا ہے سوچا کہ اس کا خیال کیا تھا۔ پھر بنا لیا اس کے بعد باقی کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس کو ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔ پہلی بار دیکھنا کہ یہ ٹھیک ہے یا نہیں ہوتا ہے کہ کہیں عمر بھی ٹھیک کرنا پڑتا ہے۔ پھر ٹھیک بیٹھتے ہیں کہ کہیں کوئی لفظ بے تحاشا تو نہیں ہوا۔ پھر تو یہ کام ہوتا رہتا ہے کبھی ذہن پر کوئی واقعہ یا تجربہ کوئی جذبہ اس قدر شدت سے وارد ہوتا ہے کہ وہ جلدی سے ساری نظم ذہن میں آ جاتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سمجھنے لگ جاتے ہیں ایک مصرع بنا ایک عرصہ بعد پھر آہستہ آہستہ ہو رہا۔

عبادت: فیض صاحب! ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اُردو شاعروں میں سے آپ نے کن کن شعرا کا مطالعہ کیا ہے، اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں؟

فیض: اصل میں مطالعہ تو سب ہی کا کیا ہے اور تو کسی سے ایک ہی شاعر کا نہیں ہے یعنی سب کا..... ظاہر ہے کہ میں نے بچپن میں بھی وقت سے ساتھ ساتھ [illegible] تعلیم کے بعد دوسرے شاعروں کا کلام پڑھا۔

ہاں تو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اردو شاعری میں سے جتنے بھی شاعر تھے سب ہی کو پڑھا تھا، لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھا ہے ان میں کئی ہیں۔ میر، غالب، مصحفی، نظیر، آتش۔

طاہر مسعود: آپ اس رجحان کی اہمیت پر زور دیں گے کہ شاعری کو صحافت یا پاپولزم سے کتنا قریب کر رہے ہیں؟

فیض: شاعری اور صحافت میں اتنا فرق ہے کہ صحافت میں جمالیاتی پہلو نہیں ہوتا۔ جمالیات کو آپ ابلاغ میں شامل کریں تو اب بن جاتا ہے ادب، جمالیات کو خارج کر دیں تو وہ صحافت بن جاتی ہے۔

نصرت: کچھ الفاظ آپ کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ مثلاً صبح و شام، دل، درد، دامن، زنداں، موسم اور بہت سے دوسرے الفاظ۔
کیا یہ الفاظ لاشعوری طور پر آپ کی شاعری کا حصہ بن گئے ہیں یا شعوری طور پر آپ انہیں استعمال کرتے ہیں؟

فیض: بالکل لاشعوری طور پر۔

نصرت: میرا مطلب تھا کہ جس طرح بچپن کی باتیں اور تجربات لاشعوری طور پر ہماری شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں، کیا اسی طرح کچھ الفاظ بھی غیر محسوس طور پر ہمارے اظہار کا حصہ بن جاتے ہیں؟

فیض: شاعری میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کچھ بھی نہیں کرتا۔ شاعری میں آپ سب کچھ شعوری طور پر کرتے ہیں۔ بار بار اگر کوئی لفظ آپ کی شاعری میں آتا ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تجربہ آپ کو بار بار ہوتا ہے، دار و رسن۔ ظاہر ہے کہ جب سے ہمارا تعلق رہا ہے دار و رسن کے علاوہ کچھ پیدا ہی نہیں ہوا ہے یہاں۔

نصرت: آپ ان کے علاوہ دوسرے کچھ متبادل الفاظ استعمال کر سکتے تھے؟

فیض: ٹھیک ہے۔ متبادل الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے مگر ان کے معنی تو یہی ہوتے۔

قفس بھی استعمال ہوتا ہے، زنداں بھی استعمال ہوتا ہے، مقتل بھی استعمال ہوتا ہے مگر تجربہ تو ایک ہی ہے نا۔ میرا خیال ہے زنداں اور قفس بھی تقریباً ایک ہی دائرہ کار کی چیز ہیں۔ دار و رسن پھانسی کی بات ہے۔ یہ تو ایک کیفیت ہے یعنی دار و رسن کی، زنداں کی، قفس کی، مقتل اور دشت و صحرا کی۔ اس کے مقابلے میں بہار، چمن، گلستان، تجربوں اور تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف وہ۔ ظاہر ہے یہ دونوں تجربات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اس لیے یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔

کرشن چندر: فیض صاحب! آپ نے شاعری کب شروع کی؟

فیض: شاعری تو..... شاید ہم نے بچپن ہی میں تک بندی شروع کر دی ہوگی، اس لیے کہ ہم نے کبھی کوئی دیوان نہیں دیکھا، لیکن سنجیدگی سے ہم نے اس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ بات 1929ء کی ہے۔ ہم غالباً بی اے میں پڑھتے تھے جب پہلا مشاعرہ ہوا گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں، شعرا حضرات تشریف لائے تھے۔ آج کل جو فرشی مشاعروں کا رواج چل نکلا ہے، اس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کرسی میز ہوتا تھا، صدر ہوتے تھے، شعرا ہوتے تھے جو کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور

ہم سے پہلے ابھی شاعر بننے کی کوشش میں ہوتے تھے وہ وہاں محفل میں بیٹھتے تھے اور باری باری ان کو پکارا جاتا تھا پڑھنے کے
مشاعرے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ بہت سی اچھی غزلیں سنتے تھے۔ پہلی بار جب ہم نے غزل پڑھی تو بہت داد ملی۔ ایک مشاعرے کی
صدارت منشی ... صاحب کر رہے تھے۔ پہلے وہ بھی بہت دلچسپ تھے اور ... ہم نے بھی ... کہا کہ ... ہمارے
پاس تو صرف ایک ہی غزل تھی۔ ایک بار ہمارے ایک دوست ... نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ ایک نظم لکھ دو وہ ہم سے
لکھوائی تھی جو ہم نے نظم کر کے لکھ دیا تھا ...... ہم نے بھی لکھا دوسرے دن میں وہ منظوم خط پڑھ دیا۔ اس کے بعد مشاعرہ ہوا تو
جہاں حسن ... صوفی تبسم اور عبدالمجید سالک جیسے لوگ ... صاحب فن اور اہل قلم ہمارے پاس آگئے اور کہنے لگے "معلوم
ہوتا ہے ... بہت اچھی ہے۔" ... "ہاں بھئی! ایک شعر لکھا ہے۔ شعر کیا ہے"
۔ ہم نے ... کہ ہم تو ... اس قسم کے جو لوگ ... یہ ہمارے شعری سفر کا
آغاز۔

کرشن: ابھی آپ نے کہا کہ کسی زمانے میں آپ ایک ... کیا کرتے تھے۔ ... کبھی خیال آیا تھا کہ آپ شاعر بنیں گے؟

فیض: اس وقت تو ہم کرکٹر بننا چاہتے تھے۔ اپنی تو ... یہاں تک ہی محدود تھی۔

نصرت چوہدری: ایک روایتی سوال، آپ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کن شاعروں کا اثر قبول کیا ہے؟

فیض: جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس وقت کے جو بھی مشہور شاعر تھے ان کا ہم پر اثر تھا، اختر شیرانی، حسرت موہانی۔

نصرت: جوش ملیح آبادی؟

فیض: جوش کا اثر ہم پر نہیں تھا۔

نصرت: علامہ اقبال کا؟

فیض: علامہ اقبال کا ... اثر تھا مگر جہاں تک براہ راست میرا تعلق ہے وہ میری ابتدائی ... زمانہ تھا اور اس
زمانے میں عام طور سے ہر شخص رومانی شاعری کرتا رہا ہے اس لیے اس زمانے کے جو رومانی شاعر تھے اختر شیرانی، حسرت
موہانی، حفیظ جالندھری ان کا اثر ... زیادہ تھا اور ظاہر ہے کہ انگریزی کے ساتھ بھی لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں انگریزی کے بھی
مشہور شاعر کیٹس اور شیلے تھے انھیں پڑھنے کا رواج تھا ان کا بھی اثر تھا۔ پھر کالج میں ہمارے ... تھے اور ... اس وقت
شاید اختر شیرانی کے شاگرد تھے یا ان سے قریب تھے۔ ان کی دوستی کی وجہ سے ان کا بھی اثر تھا۔ گھر کے ماحول کے ... فارسی
شاعری کا اثر بھی تھا۔ ... عربی پڑھی اس لیے عربی کے حوالے سے بھی تھوڑی سی واقفیت تھی۔

آصف فرخی: آپ کو ... کہ آپ کی شاعری ... لیکن پچھلے دنوں آپ نے ... تعداد میں نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں اور یہ آپ
کے پچھلے انداز کے مقابلے میں ... ہے۔

فیض: کبھی کبھی ہوتا ہے۔ کبھی گاڑی چلتی ہے، کبھی رک جاتی ہے۔

آصف فرخی: اس دوران ... آپ کی شاعری کے اسلوب اور انداز میں بھی خاصی تبدیلی آئی ہے۔ ... لوگوں کو یہ بات
... آپ کے ... یہ تبدیلی ... آئی؟

فیض: ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی تبدیلی ہوئی ہی نہیں۔ ... پہلے ... کرتے تھے، ویسا اب بھی کرتے ہیں۔ ... جو کیفیت ... ہے
... کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے ... کوشش کرتے ہیں ... اللہ ...

گرا ہے یا کسی دوسرے طریقے سے کہا ہے، شعر نہ تو لازم ہی ساتھ لاتا ہے۔ تجربہ جو ہے وہ خود ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کس طریقے سے لکھنا ہے۔ تو یہ ایک نیا تجربہ تھا، یہی دوران جس سے ہم پہلے کبھی نہیں گزرے تھے، اسی وجہ سے اس میں اس کا عکس ملتا ہے، یہ دوران کہ جو ہم کو گزارنی پڑی ہم پہ۔

تحمل: فیض صاحب! اس میں ایک اضافہ کر دیجیے کہ آپ نے آہنگ کا جو نظام اپنایا ہے اس کے پیچھے بھی کسی کا اثر ہے؟ کیوں کہ وہ بھی ایک تجربہ ہے۔ آپ جس طرح لفظوں کی تکرار کرتے ہیں اور لفظوں کے جوڑ بناتے ہیں .....

فیض: وہ یہی ہیں، ایک تو لفظوں کی صوت کا مسئلہ ہے کیوں کہ شاعری میں لفظ اور معنی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارے جو ایک دو بڑے شاعر ہوئے ہیں انھوں نے صوت کی طرف توجہ کی ہے اور وہ تھے غالب۔ کسی نے ان کی شاعری کے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ وہ اس معاملے میں بہت ہی ماہر ہیں۔ الفاظ کی اصوات مرتب کرنے میں انھوں نے جیسی مہارت سے کام لیا ہے۔ چناں چہ ایک طرف تو ہمارے سامنے غالب تھے، لیکن اس کا سب سے بڑا ماخذ سمجھا جائے تو یہ تصور وہاں سے چلتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارے دوست خواجہ خورشید انور نے ہمیں موسیقی کا شوق لگا دیا۔ ہم نے بڑے بڑے استادوں کو سنا۔ استاد برکت علی خاں، عاشق علی خاں اور توکل حسین خاں، بھیجو وغیرہ۔ ان کی موسیقی کا ذوق ہے۔ اس کا شاعری کے ساتھ ہوا یہ۔ بہت کوئی تعلق نہیں، تعلق اس قدر ہے کہ آدمی کے کان اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ وہ جان لیتے ہیں کہ کوئی لفظ بے سُرا تو نہیں ہے۔ جیسے گانے والے کا سُر ہوتا ہے ویسے ہی شعر کا بھی ہوتا ہے۔ جیسے گانے میں غلط سُر لگ جائے تو پتا چل جاتا ہے کہ بے سُرا ہو گیا ہے، ایسے ہی الفاظ میں ہوتا ہے تو ..... اس پر لوگ عام طور سے توجہ نہیں کرتے۔ تو کچھ تو اس ذریعے سے اور کچھ انگریزی شاعروں کی وجہ سے ہمارے ہاں یہ رنگ پیدا ہوا۔ ایک اور بات ..... آپ جسے کہتے ہیں کہ لفظ جو ہیں وہ ہمارے ہاں اس طرح نہیں تھی: یعنی اگر آپ نے کسی آدمی کو شیر کہہ دیا تو سب کو پتا ہے کہ مراد آدمی ہی ہے۔ اس طرح جو استعارہ تھا وہ نہیں تھا۔ ہمارے ہاں سب سے پہلے اسے متعارف کروایا اور یہ کہنا چاہیے کہ اس نے ایجاد کیا، غالب نے اور اقبال نے۔ فارسی سے رشتہ جوڑ کر جنت نگاہ اور فردوس گوش۔ کہا کہ انگریزی میں بھی کہ اس کا تخت بڑا اچھا موجود ہے۔ اس سے ہم نے کچھ ادھر کچھ ادھر سے لیا اور پھر یہ کہ لفظوں کے صرف معنی نہیں ہوتے صوت بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ ہم نے دونوں چیزوں کا خیال کیا۔

تحمل: آپ کی شاعری میں قدیم اور جدید کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے اور آپ کے یہاں دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح تحریک یا نعرہ بازی نہیں ملتی؟ صرف طور سے ان کا ایک مخصوص قسم کی رومانی آہنگی کا احساس پایا جاتا ہے جیسے کہ آپ نے مخصوص فن میں ایک شعر لکھا تھا کہ لیکن اس کی شرح کے لیے ... آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟

فیض: ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی شعری اور تجدید شاعری روایت سے انحراف کر کے نہیں کی جا سکتی ہے، اس لیے کہ اس میں ایک تسلسل ہے اور خاص طور سے ہماری شاعری کی روایات اس قدر وسیع ہیں اور اس میں اس قدر صلاحیتیں اور توانائیاں موجود ہیں کہ اس سے گریز کرنا نا ممکن ہے۔ جہاں تک عربیت اور فارسیت کا سوال ہے اس کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے ہاں ترقی پسندی کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنی اور اخلاقی خیالات میں ... ترقی پسندی کا تو میرے خیال میں یہ ہے کہ لوگوں کے اندر جو کچھ ہے اسے دور کیا جائے اور تعصب کی صفائی کی جائے۔

تحمل: آپ نے ابتدا کے غزل کے بعد نظم لکھنے کی جو ... اس نظم میں آپ کیا پیش کرنے کے متمنی ہیں۔

فیض: جو کچھ ہم نے ... پچھلے تیس برس میں گزری ہے اسے ... سے ... کی آپ بیتی اور جگ بیتی،

تاثرات اور مشاہدات کو مربوط شکل میں پیش کرنے کی خواہش تھی، وقت بدلا تو ممکن ہے نہیں کہ میں مطمئن ہو جاتا، یہ بھی ممکن ہے کہ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں یہ کام کر سکوں۔

افضل نیازی: "... میں آپ کی ایک نظم ہے ... کے عنوان سے ہے جس میں زندگی کے متعلق باتیں کی گئی ہیں، کیا اس میں آپ نے زندگی کو خدا سے مربوط کر کے دیکھا ہے؟

نجمی: زندگی خدا ہی نے پیدا کی ہے، ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہیں۔ ان کے حوالے سے نظم لکھنا ایک فطری سی بات ہے کہ ان کا تعلق کیا ہے۔

افضل: نجمی صاحب! آپ نے باقاعدہ طور سے کسی سے اصلاح بھی لی ہے؟

نجمی: میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ہم میں دوستوں کی ... تھی۔ ہم لوگ اپنا اپنا کلام ایک دوسرے کو سناتے تھے اور ایک دوسرے کی ترمیم بھی کرتے رہتے تھے۔ ... اسی طریقے سے اپنی ... ترمیم کرتے رہتے۔

نصرت: عام طور سے یہ خیال ہے کہ آپ کی وہ شاعری جو آپ نے ... کے پیچھے کی ہے وہ ... خوب ... ہے، اگر آپ کو یہ تسلیم ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ؟

نجمی: زندگی میں ظاہر ہے فرصت زیادہ ہوتی ہے تو آدمی تلاش معاش زیادہ کر سکتا ہے۔ ... مصروفیت کے باعث کوئی کام کی فرصت نہیں ملتی ... شعر پر ... ایک خاص قسم کا بوجھ ہوتا ہے ذہن پر۔ ان دنوں ساری توجہ شعر پر مرکوز ہوتی ہے اور اس وقت آدمی جو شعر کہتا ہے ... لگتا ہے جیسے تخلیق کر لیا ہے کسی نے۔

نصرت: ایک بات اور، آپ نے اپنی بیشتر نظموں میں غزل کے آہنگ، غزل کے لب و لہجے کو اپنایا ہے، حالانکہ نظم کا اپنا اسلوب ہے، اپنا آہنگ ہے، اس کی کوئی خاص وجہ؟

نجمی: اس لیے ہوا کہ ... ہماری زبان کا مزاج بھی یہی ہے۔ شاعری کی ... بدلنے کے لیے بہت بڑا شاعر چاہیے۔ ... نے کوشش کی تھی، اس کے بعد کسی نے آج تک کوشش نہیں کی۔

نصرت: جب کوئی مضمون آپ کے ذہن میں آتا ہے تو آپ کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، تجربے کو یا خیالات کو یا آہنگ کو؟

نجمی: بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی شعر کہتا ہے تو مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے شعر وارد ہوتا ہے۔

نصرت: آپ کے ذہن میں پہلے کیا آتا ہے، پہلے مصرع یا آہنگ؟

نجمی: میرے خیال میں پہلے ذہن میں ایک تخلیقی ... ہوتی ہے، اور جب ... ہیں کہ اس ... کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو کبھی ایک ... ذہن میں آ جاتی ہے تو کبھی ایک ... الفاظ سے پہلے آہنگ آتا ہے جیسے ایک نظم کے بارے میں کہا تھا: "... کی ایک شام"۔

شفیق عقیل: بہت لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی غزل کی شاعری زیادہ ... ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نظم کے شاعر ہیں، آپ نے کبھی اس پر سوچا ہے؟

نجمی: کبھی سوچنے کا موقع ملا ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ کوئی مضمون آتا تو غزل کی صورت میں ... استعارہ کا مصرع ذہن میں آ گیا تو غزل میں ... سے ہوتی ہے۔ ... ذہن میں آئی ... تو ... ہے ...

صورت میں بہتر طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس نظم میں تحت آپ کو خود دینا پڑتا ہے کہ اس کا بیان کیا ہے یا ؟ بعض موضوعات میں اتنا پھیلاؤ ہوتا ہے کہ ان کو غزل میں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ نظم کی صورت میں ادا ہو سکتا ہے۔ تو ہم نے کبھی فضول غور ہی نہیں کیا کہ آج نظم لکھیں۔ وہ تو وہی آتا ہے۔ شعر اپنے پورے ساتھ لے کر آتا ہے۔

مظفر اقبال: آپ کی آخری کتاب "مرے دل مرے مسافر" میں ایک خاص چیز ہے جو دوسری کتابوں سے مختلف ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ آنگن اکیلی پڑی ہے .. سونا سونا آنگن اکیلی پڑی ہے .... جیسے وطن سے دور ہونے کا احساس، میرا مطلب ہے وطن کی دوری ہونے کا ..... تو اس سے آپ کی شاعری میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور دوسرے جو لوگ ہیں اس طرح کے شعر کہتے ہیں، محسوس ہوتے ہیں تو گویا ایک طرح سے کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ہیں یہ شاعروں کی اور ہم نوائیوں کی جس سے اب آپ بھی حصہ دار ہیں اور شریک ہیں اس میں اور......

فیض: ایک طریقے سے یہ ایک طریقے سے ٹھیک بھی ہے۔ ایک طریقے سے تو یہ کہ وطن سے دوری اور وطن سے فرقت...... وہ کیفیت تو مشترک ہے لیکن ہم میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ لوگ تو جبراً نکالے گئے تھے! ہم تو اپنی مرضی سے آوارہ گردی کرتے ہیں۔ ہمیں تو گھر سے نکالا کسی نے نہیں۔ ہمارا جب جی چاہے لوٹ سکتے ہیں۔ وطن سے دوری کا تو اپنا ایک رنج اور فراق ہے۔ لیکن اپنی مجبوری سے دوری کا رنج و فراق ہوتا ہے وہ درد اور کرب ہوتا ہے وہ تو مشترک ہے۔ لیکن وہ جو فرق ہے کہ جبراً گھر کی مجبوری ان لوگوں کا ہے وہ مجبوری تو ہمیں نہیں ہے۔ ہمارا جب جی چاہے گا لوٹ جائیں گے۔

طاہر مسعود: پچھلے دنوں کہیں آپ نے کہا تھا کہ آپ شاعری میں کمال حاصل نہیں کر سکے۔ اس سے آپ کی کیا مراد تھی؟

فیض: یہ اصل بات ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ جو ہماری تمنا تھی وہ پوری نہ ہو سکی لیکن ان تمناؤں کی تکمیل کے بغیر ہی اتنا عمل چل نکلا ہے کہ شہرت کرتا تا شکر گزاری ہوتی ہے۔ ہماری تمنا تھی کہ ہم شاعری میں وہ جو کمال کو پہنچے مثلاً حافظ، غالب، یا میر، اور ہمارا لو کا فیض ہمارے عہد کے شاعر ہیں، ظاہر ہے ہم ان جیسے بڑے شاعر تو نہیں ہیں۔ ہماری مثال تو عربی کے اس محاورے کے مطابق ہے کہ ہم بڑے نہیں تھے بڑوں کے نہ ہونے نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے۔

نصرت: کسی نے کہیں یہ لکھا ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو غالب جیسا شعر کہہ سکتے ہیں مگر بلھے شاہ، وارث شاہ جیسا نہیں کہہ سکتے۔

فیض: یہ بالکل نہیں ہو سکتا مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ بڑا شاعر تو غالب بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پنجابی شاعری والا پیمانہ ہمیں اتنا میسر نہیں جتنا اردو والے کی کلاسیکی روایت پر ہے۔ ہمارے زمین اور ماحول کی مناسبت اب نہیں رہی جو صرف اردو شاعری کے لیے موزوں ہے۔

نصرت: تو پھر آپ نے پنجابی شاعری کی طرف کیوں رجوع کیا؟

فیض: جیسا میں نے پہلے عرض کیا کہ بعض احساسات ایسے ہیں جو صرف پنجابی میں لکھے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی کسان کے لیے شعر کہیں پنجابی تو وہ پنجابی میں کہا جا سکتا ہے اردو میں نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے پنجاب کے کسان کے لیے؟

فیض: جی ہاں، پنجاب کے کسان کے لیے، لیکن یو۔پی کے کسان کے لیے آپ اردو میں نہیں لکھ سکتے وہ تو ان کی بولی میں لکھنا پڑے گا۔

حسن رضوی: آپ نے پنجابی شاعری بھی کی۔ پنجابی میں لکھنے کا خیال آپ کے دل میں کیسے پیدا ہوا؟

فیض: میں نے پہلے بھی یہی کہا تھا کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جن کے اظہار کے لیے پنجابی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اردو میں

لوگ بہت نہیں سمجھ پاتے کیونکہ یہ زبان تھوڑی مشکل ہے اور اس کا تعلق متوسط طبقے سے بھی ہے۔ اگر آپ عوامی اردو میں بات کرنا چاہیں گے تو اردو بولنے کے بجائے کسی علاقے کی مقامی بولی کو اختیار کر رہے ہوں گے یا کسی اور علاقے کی زبان۔

نصرت: پنجابی کے حوالے سے آپ نے کیا خاص بات دیکھی پائی؟

فیض: پنجابی کی خاص بات یہ ہے کہ بہت سے مضامین ایسے ہوتے ہیں جو کہ صرف پنجابی میں لکھے جا سکتے ہیں۔ آپ انھیں اردو میں نہیں لکھ سکتے۔

نصرت: آپ کا اشارہ عوامی شاعری کی طرف ہے؟

فیض: ہاں عوامی شاعری اردو میں ہو ہی نہیں سکتی۔

نصرت: آپ کے اس بیان پر بعض نقادوں کا خیال ہے کہ آپ نے ایسا کہہ کر اردو کو صدمہ پہنچایا ہے۔

فیض: میرا خیال ہے کہ اس میں صدمے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی نیا پہلو نہیں ہے اس میں۔ ہر زبان کا پتہ چل جاتا ہے۔ اردو جو ہے وہ شہری زبان ہے، گاؤں میں بولی نہیں جاتی۔ کسی بھی علاقے کے دیہات میں اردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دہلی سے چند میل باہر چلے جائیں، وہاں لوگ اردو نہیں بولتے۔ لکھنؤ سے تین چار میل باہر چلے جائیں، وہاں بھی اردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو بھوجپوری ہے، تو کہیں برج۔ آپ انھیں عوامی بولی تو کہہ سکتے ہیں مگر اردو نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے کہ اردو عوامی زبان نہیں ہے؟

فیض: جی ہاں، اس معنی میں نہیں کیونکہ اردو خالص شہری زبان ہے۔ دیہات میں کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔

نصرت: آپ نے اپنی شاعری میں کس طرح کے تجربات کیے؟

فیض: بس وہ تجربے جو شعر خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔

نصرت: آپ کی بیشتر شاعری نظریاتی شاعری ہے۔ کیا آپ کے خیال میں "نظریہ" سامنے رکھ کر اچھا شعر کہا جا سکتا ہے؟

فیض: میرا ایک نظریہ ہے مگر نظریے کو سامنے رکھ کر انسان شاعری نہیں کرتا۔ وہ نظریہ شاعری کا جزو بن جاتا ہے جس طرح آدمی کی اپنی ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ اسے سامنے رکھ کر لکھنے کا سوال نہیں اٹھتا۔ شاعری ایک مضمون سامنے رکھ کر نہیں کی جاتی بلکہ وہ مضمون جب شاعر کی ذات اور تجربے، اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے تبھی وہ شعر کے روپ میں ڈھلتا ہے۔

☆

حواشی

۱ تمھارے حسن کے نام (سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام)۔ اس سے پہلے کی پانچ نظمیں یہ تھیں: (۱) ناروشن روشن ہے وہی انتظار کا موسم، (۲) تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے، (۳) تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں، (۴) شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام، (۵) الخ ست ہے "متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے" "کہ یاد رہے اس پہ ضعف تو رکھیے؟"

۲: ہجر نامہ نظم ثنا ہے کہا۔

۳: ہر بار الجھن میں جب اک بس سب جانے والے جو گئے۔

۴: کہاں تو ہم بھی چلیں فیض اب کہیں مرجائے۔

۵: صبحِ نسیم۔

۶: زنداں کی شام۔

۷: کرنل محمد خان۔

۸: پہلے ایلس جارج نام تھا۔ شادی کے بعد ایلس فیض کہلائیں۔ فیض کی والدہ نے کلثوم نام رکھا۔

۹: نقشِ فریادی۔

۱۰: غزل۔ یہ بزمِ آلِ عثماں، بزمِ گلیوں عذاداں۔

۱۱: ہمدمی کی بچھی نعمت تمھیں لگتی تمھیں ملن سے پہلے

۱۲ رنگ ہے دل کا مرے (دستِ تہِ سنگ)

٭٭٭

فیض کی دولتِ تنہائی کا جائزہ

فیض کی شاعری کا ایک اہم اور مخصوص رنگ اُن کا احساسِ تنہائی ہے۔ یہ احساسِ تنہائی مریضانہ افسردگی اور ڈپریشن (Depression) نہیں جو ترقی یافتہ دُنیا کا لاعلاج مرض بن گیا ہے اور جس کی وجہ امپریلزم کی گھنگی سے کالے ہوئے خوفی اور سماجی وحشتوں کی کمی اور طبقاتی گروہ بندی سے پیدا شدہ خلوت ہے۔ فیض کا احساسِ تنہائی ایک صحت مند اور خوش گوار "خمارِ خلوت" ہے جس کا ایک سرا مشاہدہ اور دوسرا سرا مراقبہ سے بندھا ہُوا ہے۔ یہ ایک ایسی خلوت ہے جس میں جلوت پوشیدہ ہے، اِسی لیے جن لوگوں نے فیض کی ہم نشینی سے فائدہ اُٹھایا وہ اِس بات کی بھی تائید کریں گے کہ وہ انجمن میں ہوتے ہوئے بھی تنہائی میں ڈوبے رہتے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ جسمانی طور پر تو محفل میں ہیں لیکن ذہنی طور پر محفل میں نہیں بل کہ خیالات کی انجمن آرائی میں کھوئے ہوئے ہیں۔

انسان گہوارے سے لحد تک اپنے ذہن میں اُن تمام واقعات کو محفوظ کرتا ہے جو شعوری اور لاشعوری طور پر خارجی دُنیا میں رونما ہوتے ہیں۔ کتابی مطالعہ ہو کہ مجلسی مباحثہ یا کائناتی مشاہدہ سب خارجی واردات اُس وقت تجربہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں جب ان پر داخلی جذبوں کا عمل ہوتا ہے اور اِسی کو قوتِ تخلیق کہتے ہیں اور یہ طاقت ہر شخص میں اُس کے فکر کی گہرائی اور وسعت پر مشتمل ہوتی ہے۔

ہر بڑے شاعر نے ایک عمر خلوت میں گزاری۔ میر تقی میر کو گوشہ نشینی میں اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ باغ کی جانب کی کھڑکی کھول کر پھولوں کی محفل میں کھو جاتے، غالب نے کہا" اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے" کہہ کر تنہائی میں صرف ساغر و مینا سے بات چیت کی، میر انیس تمام عمر رات دیر گئے صرف کنول روشن کر کے اُس کے پیچھے شعلے کا ساتھ دیتے رہے۔ اقبال کے مراقبے میں اُن کی تنہائی کا ساتھ دینے میں مولانا روم آتے جاتے تھے۔ جن شاعروں نے اپنے کو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ یا شاعرِ فردا کہا ہے وہ اِس بھری دُنیا میں اپنے کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے داخلی رموز کو اِس لیے بھی بیان نہ کر سکے کہ اُن کا ہم عصر زمانہ شاید انھیں پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ وہ جانتے تھے کہ منصور حلاج کو انا الحق کہنے پر اِس لیے سولی پر چڑھایا گیا کہ انھوں نے خلوت کی بات جلوت میں کہہ دی۔

انسانی دماغ اُس جانور کی طرح ہے جو جگالی کرتا ہے۔ جن جانوروں کو دُوسرے جانوروں کے ڈر سے، یا موسم کی تبدیلی سے کم وقت میں اپنے بڑے بدن کی ضرورت کی وجہ سے تیز تیز چرنا پڑتا ہے وہ آرام اور فرصت کے اوقات جگالی کر کے اپنی خوراک کو مکمل کرتے ہیں۔ اِسی طرح خارجی واقعات، مشاہدات انسانی ذہن میں ہر لمحہ جمع ہوتے جاتے ہیں لیکن ان کی جمع آوری سطحی ہوتی ہے جب تک کہ ذہن پھر ان مشاہدات کو داخلی جذبوں کی چکّی میں نہ پیسے، اِس عمل کے لیے ذہنی اور بعض مقامات پر جسمی تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چناں چہ جن افراد کی قوتِ مشاہدہ دقیق اور وسیع ہوتی ہے وہ دوسرے لوگوں کی نسبت مختصر عرصے میں بہت سا کائناتی علم حاصل کر لیتے ہیں اور پھر داخلی قوتوں سے اِس کی آمیزش کر کے تجربوں کی روشنی میں نئے مضامین تخلیق کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے جو مختصر تنہائی اور ذہنی خلوت کی بات کی اِس کی پرچھائیاں شاعر کی تخلیق پر بعض اوقات عیاں اور بعض اوقات نہاں ہوتی ہیں۔

فیض کی تنہائی میں ایک خاص قسم کی سرشاری ہے وہ اس خلوت میں تصورِ جاناں اور غمِ دوراں کے درد کی لذت سے ہم کنار معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مقامات اور بعض اوقات پر فیض کی تنہائی ایک دلدل کی طرح بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس تنہائی کی روشن اور آخری منزل فکر کا راستہ رہ جاتی ہے اور اس غرض پر خلوت وقتیت اور ماورائی کیفیت میں کھو جاتے اور امید بن جاتی ہے۔ فیض کی ذاتی تنہائی کا نفسیاتی تجزیہ ان کے بعض اشعار میں ان کے تخلیقی اور ذہنی و فکری طرب کا باعث معلوم ہوتا ہے۔

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

محبوب کی یاد کی خوشبو اور اس کے تصور کی روشنی ہی تنہائی کی ہمراز اور درماں بنی رہتی۔

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب

.. .. ..

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں تری دید کو ترستی ہیں

....

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے

خلوت میں انجمن آرائی بڑے شاعروں کا مشغلہ رہا ہے۔ یہاں شعر باطنی تنہائی کی جگہ مل کر دماغی تنہائی کی ہے۔ اگر چہ محض ان میں کیوں نہ ہو۔ بقول غالب ع "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے" مومن خان مومن کہتے ہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

فیض نے کہا:

ہر صبح گلِ رنگ یار سے رنگیں تھا چمن
یاد شب ہا کی تھی یاد تھی آغوش تمام

میری تنہائیوں پہ شام رہے
حسرتِ دید نا تمام رہے

....

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری

فیض نے تنہائی کے موضوع اور تنہائی کے مختلف پہلوؤں کو خوب صورت تفصیل دی ہیں۔ ایک شاہکار نظم "تنہائی" "نقشِ فریادی" میں اور دوسری نظم "پھر تنہائی" "دستِ تہِ سنگ" میں اور تیسری نظم "آج شب کوئی نہیں ہے" آخری عمر کی نظم "ملے ہیں ایام" میں ہے۔ نقشِ فریادی کی مشہور نظم "تنہائی" کا اردو شاعری میں ایک اضافہ تصور کیا جاتا ہے:

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں! بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

یہ دراصل خود شاعر کی اپنی واردات کا خارجی اظہار اور ابلاغ ہے۔ اس خوبصورت نظم میں شاعر کی تنہائی اور خواب بینی (Dreaming) ہے۔ دل اور خیال کی باہمی گفتگو خارجی ماحول میں تنہائی کا کورس ہوتی ہے۔ اس پوری نظم میں علامت ایمائیت اور ابہام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف غمِ جاناں میں معشوق کا شدت کا انتظار ہے جو اصطلاحات کے تمام پہلوؤں سے بھری ہوئی ہے۔ اب تو بالکل ہی معشوق نہیں آسکتا۔ فیض نے آخری دو مصرعوں میں اپنے کھوئے ہوئے معشوق کے آنے کی خواہش کے دروازوں کو مقفل کرنے کی تلقین کر لی۔ اس کے علاوہ دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ غمِ دوراں کی تمام دنیا ملک در ملک وہ وقت ہے جو اپنا پیٹ پالنے کے لیے اپنی جسم بیچتی ہے اور اسے گاہک کا انتظار ہے۔ یہ غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا احساس لیے ہوئے ہے اور رات کی منظر نگاری نے اس میں جوابی حسن کی اقدار سے فائدہ اٹھا کر مرقع بنا دیا۔ اس نظم میں مکالمہ نگاری اور ڈرامائیت اس طرح ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔ ع "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا" میں قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔ ع "سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار" میں راہ گزر کی خاموشی اور بے کلی میں کروٹ بدلتی ہے اور اب یہاں قدموں کے نقش بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے، کیوں کہ چراغ خوابیدہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ مصرعے بے حد پُرتاثیر ہیں اور "نقشِ فریادی" میں فیض کے لہجے کا تعین کر رہا ہے۔ جہاں چہ الفاظ کا انتخاب اور نشست خاص طور پر تاروں کا غبار، اجنبی خاک، قدموں کے سراغ، خوابیدہ چراغ اور بے خواب کواڑ کا جواب نہیں۔ بعض ناقدوں نے خوابیدہ چراغوں کے

ترجمانی کے پیمانوں کی رو سے اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض صحیح ہے، اگرچہ جو بات ہے یہ لفظی معنی "سوتے" کے لیے جا بجا ہیں اور یہ اعتراض بجا ہے اگر خود ہی شاعر نے معنی سمجھے ہوئے ہیں، ہم ہر جا طرح کے ہیں۔ ان تمام کی سب سے اہم بات یہ ہے جو فیض کے کلام کی خاصیت ہے جس کی وجہ سے شعر ... "کو اس سے پتا چلتا ہے کہ ... حقیقت حقیقت سے ... کی ... کو ... ہے۔

فیض کی اس شاہکار نظم "تنہائی" کو سمجھنے اور سمجھانے میں مختلف اہلِ قلم کی آرا میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے انھیں، بعض اس کو ... کا نام دیا اور بعض ... سے ... کا ... دیتے ہیں۔ ہم آغا ناصر کی کتاب سے چند جملے بطور اقتباس پیش کر کے اس کا فیصلہ ... پر چھوڑتے ہیں ... اس نظم کے تجزیے کے دوران ہم نے اس کو ... ابہام سے ... ہے اس کا مختلف ... تعجب کی بات نہیں۔

الف: فیض صاحب نے اپنی نظم "تنہائی" ... سنائی ... ایک ... صاحب نے فرمایا: "فیض! تم نے ... کی ... تصویر کھینچی ہے"...... یہ تعریف سن کر فیض صاحب کے کان سرخ ہو گئے ... صاحب کے ... سے ... دیکھا ہے۔

ب: ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے: "یہ نظم ... ہے ... اس نظم کی ... پڑھ کر ہم یہ ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ ... کی بات ... کس لیے ہے ... شاعر ... والا۔"

ج: معروف نقاد پروفیسر ... لکھتے ہیں: "یہ نظم بظاہر ... ہے لیکن ... ہے ... تنہائی اور انتظار ... کا ... ہندوستانی قوم کا ہے۔"

د: ... اس نظم کے بارے میں لکھتی ہیں: "تنہائی فیض صاحب کی ان نظموں سے ہے جو بہت ... سے ... ہوئے ... کے ... سے ... اور ... کے احساس کا ... کرتے ہیں ... شاعری ... امید اور تنہائی کے ... ایک کہانی ... گئی ہے۔"

ہ: پروفیسر کلیم الدین احمد نے "تنہائی" کو انگریزی ... کی طرح ... کا ... بنایا ہے ... تنہائی کا موضوع ... کے ... ہے۔ ... سب سے اہم ... ہے۔ کلیم الدین احمد لکھتے ہیں: "نظم تنہائی ... کے ... (The Broken Appointment) ... (Broken Tryst) ... کی یاد دلاتی ہے ... فیض ... (Swin Burne) ... نظر آتے ہیں جہاں انھوں نے ... سے ... لی ہے اور جہاں ... انسانی ... کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ... انگریزی شاعری کی چھاپ نمایاں ہے۔

قید تنہائی

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
بے خبر گزری، پریشانیٔ امید لیے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر
حسرت روز ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

فیض نے مارچ 1959ء میں اپنی قید کے دوران قلعہ لاہور کی جیل میں ایک نظم "قید تنہائی" لکھی۔ یہ چند مصرعوں کی نظم پوری عاشقانہ نظم ہے۔ یہ نظم مختصر ہونے کی وجہ سے اپنے ابلاغ میں وقت پیدا کرتی ہے اور آسانی سے صرف ایک بار پڑھنے سے سمجھ میں پوری طرح نہیں آتی۔ یہ نظم خواہش سے سرشار ہونے کے باوجود شگفتگی کی وجہ سے معروف ہوئی۔ ہماری نظر میں یہ نظم فیض کی روحانی تنہائی کے تاریک پہلوؤں کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ نظم ہے جس میں فیض کی خوابناکی (Dreaming) اور تنہائی/خلوت (Solitude) کی آمیزش ہے۔ بعض ناقدین اور ادیبوں نے فیض کی تنہائی کو ان کے اکیلے پن سے منسوب کر کے یہ بھی لکھا کہ فیض صاحب ساری عمر تنہائی سے خوف کھاتے رہے مگر تنہائی نے ان کا تعاقب جاری رکھا۔ یہ سچ ہے کہ فیض محفل آرائی اور ہم نشینی کے عادی بھی تھے اور شوقین بھی تھے، وہ محفل میں خاموش رہتے، جب کبھی ہم نشینوں کو خوش دیکھتے تو خوش ہوتے لیکن فیض کی اس نظم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف ایک اتفاق ہے کہ یہ نظم ان کے مجموعے "زنداں نامہ" میں "قید تنہائی" کے عنوان سے شامل ہے۔ فیض نے اپنی تنہائی کو محسوس اور تصور کیا۔ یہاں شاعر کی تنہائی کسی ملال کا سبب نہیں بنتا ہے۔ اس قید تنہائی میں نور کی لہر ہے جو سحر، امید سحر کے ساتھ ساتھ کاسۂ دل میں صبوحی یاران قدح خوار کے نام ہوتی ہے۔ اسی قید تنہائی میں آزادانہ طور پر کسی نغمہ کی لے، کسی پھول کی خوشبو، کسی جمال کے لب و رخسار کا حسن تصور میں شاعر کے قریب خواب اور بیداری میں بھی ابھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ درد کے شہر کے مانند کبھی تلخیٔ دیروز کے زہر کے امروز ملاقات کے لیے آتا ہے اور نور بکھرا صبح کی تمہید بن جاتا ہے۔

اس نظم کا حسن آس اور امید کی جھلک اور تشکیک ہے۔ رات بیچ شاعر نے اپنے دل کا سہارا لے کر تنہا آفاق پر شوق کی لہر خواب میں بے تاب نظر معلوم آتا ہے، مگر امید شکوہ اور یاس کی ملی جلی کیفیت ہے۔ چناں چہ گذشتہ ہونے کے کل کی کسک اور امروز کی تیرگی آنے والے کل کے لیے بہت کا اظہار کرتی ہے۔ یہاں اس نے محض خواہش کی تکمیل ہے۔

اس قید تنہائی کو ہم فیض کی ایک غزل کے ان شعروں سے جو منٹگمری جیل میں مارچ 1954ء میں لکھے گئے تھے ظاہر کرتے ہیں۔

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود درد کا ہنگام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے
دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

آج شب کوئی نہیں

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت"
کوئی امید، کوئی آس، مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو، تو مرے پاس ہو یا دور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تم
اور نہیں ہو تو کہیں... کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے

تنہائی کے اسی بحر میں فیض کی ایک ہوائی نظم "آج شب کوئی نہیں" ہے۔ یہ نظم "نسخہ ہائے وفا" میں موجود ہے۔ آغا ناصر نے اپنے 1983ء کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم کی خوبصورتی کا مقام [illegible] نہیں کیا گیا۔ یہ نظم ان چودہ مصرعوں کی بہت خوبصورت جذباتی اور سیاسی نظم ہے جس میں داخلیت کی خوبصورت ترجمانی ہے۔ شاعری کے لحاظ سے یہ فیض کی معنوی تجسیم اور احساسات [illegible] شامل کی جا

سکتی ہے۔ مصرعوں کی تکرار اور فقروں کی بھرمار نے اس میں موسیقی کے پہلو کا اضافہ بھی کر دیا ہے، لیکن معنی آفرینی گھٹی ہے۔ پوری نظم کا باطنی رشتہ اور نظم چوتھا بند سے مربوط ہے۔ نظم کا احساس تنہائی اس نظم میں اضطراری کا بھی دخل ہے یعنی تنہائی اور پراسراریت کو بھی مکمل نظم دو مصرعوں سے، دو مصرعوں کے درمیان ہوتی ہے، جو طنز ہی Organic ہے۔ شاعر میں حالت تحیر کا اور شباب کے لئے سے پہ بیتے نے شاعر کی شخصیت کو اس راستے پر ڈال دیا ہو جہاں وہ کسی رہ گزر کو اپنے ذہن میں گزرتے ہوئے دیکھے۔ اگر چہ لاشعوری طور پر اس کے خوبصورت اور میری محبت کے دروازے کھلے ہی نہیں رہے۔ شاعر کو امید و یاس کے علاوہ غم آشوب اور شب و یقین بھی نہیں ہے۔ شاعر کی زندگی میں جو نقش ہیں خوشبو، سماں افراد کا اور صورت جیسے تنہائی کی طرح گزر رہا شباب بھی اب رہا اس سے رخصت ہو چکی ہے۔ یہ مصرع "کوئی خوشبو کا فرصت" "تنہائی کی نظم "تنہائی" سے لیا گیا ہے جو تقریباً چوبیس سال پہلے لاہور کی جیل میں لکھی گئی تھی۔ "آج شب کوئی نہیں ہے" اس ساری نظم میں ایک تذبذب ہے جو اب کوئی نہیں اور ہے کے درمیان گردش کر رہا ہے۔

تم اگر میرے پاس ہو یا نہ ہو تم
ہر گھڑی سایہ گر طرح ہو تم
اور نہیں تو کوئی نہیں... کوئی نہیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے

-☆☆-

فیضؔ مصوّرِ نقوشِ قد و خالِ حُسن

تُو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رُخسار، وہ ہونٹ؟

جہاں تک فیضؔ کی جمالیاتی حُسن یا Aesthatic Sense کا تعلّق ہے اُس کے گہرے نقوش اُن کے پہلے مجموعہ "نقشِ فریادی" ہی میں نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی پہلی غزل کا مشہور شعر خود لب و چشم کا لب بستہ مگر چشم دید گواہ ہے۔ فیضؔ کا پہلا تغزّلی شعر یہ تھا:

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منّت کشِ صہبا نہیں ہوتا

فیضؔ کی نوجوانی اور جوانی پر انگلش رومانی شاعروں کا اثر تھا۔ اُنھوں نے ورڈز ورتھ، کیٹس، براؤننگ وغیرہ ورجنوں شاعروں کا عمیق مطالعہ اپنی بی۔اے اور ایم۔اے انگریزی طالب علمی کے دوران کیا تھا، اس کے علاوہ چند سال امرتسر میں انگریزی ادب کی تدریس میں بھی یہ مطالعہ اور مشاہدہ جاری رہا۔ چناں چہ براؤننگ کی ایک نظم سے خیالات لے کر انھیں اُردو شاعری کے مزاج میں تبدیل بھی کیا۔ شاید فیضؔ کی شاعری کا یہ وہی حصہ ہے جس کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے کہا تھا: "فیضؔ کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوش گوار اثر، جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابلِ قدر عناصر کی ایک قوسِ قزح جلوہ گر ہے"۔ فیضؔ کے خیال میں بسی ہوئی حسینہ براؤننگ کے ہم خیال تھی، اسی لیے بھی اُنھوں نے کہا:

مجھے دے دے!
رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اِک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حُسن سے ظلماتِ دُنیا میں نہ پھر آؤں
گذشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دُھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اِک نظر اِک جاودانی سی نظر دے دے

فیضؔ کے رومانی تخیل سے کبھی وہ ہونٹ، وہ پیشانی، بھنویں اور وہ حسین آنکھیں جُدا نہ ہو سکیں، ورنہ وہ نہیں کہتے:

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

فیض اگرچہ دل کو بہلانے کے لیے یہ بھی کہہ لیتے ہیں کہ:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا"

لیکن خود اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ:

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

فیض کو سب سے اپنے دل کا بھید کھلا، سچے ہیں کہ ان کے اس عمر دست میں دونوں پہلو کے شریک ہیں۔ یہ فیض کی قبا جتنی تھی
جسے زمانہ تہذیب نے گستاخی سمجھا:

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

حسن کے سراپے نے فیض کو سرتاپا تحیر رکھا تھا۔ ویسے تو "نقش فریادی" میں فیض نے ابتدائی جوانی کے "سپنا" دور کے بعد ختم جانے کو "بیتے" سے رشتہ توڑتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ انہوں نے غم جاناں سے غم دوراں کی طرف سفر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عشق کے ابتدائی جذبات سے نہ بچ سکے تھے کہ اسی دور نے پیاری زندگی بسر کر دی۔

فیض نے "موضوع سخن" میں اپنا "محبوب" اور فطری رجحان کا سچا نقشہ کھینچا ہے۔

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

....

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

....

یوں بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

نظم "موضوعِ سخن" ایک قسم کا فیض کا اقرار یا کنفیشن (Confession) ہے۔ یہ جمالیاتی ذوق یا احساس ان کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ فیض جو ابتدا سے غمِ جاناں پہ فدا رہے، آخر عمر تک غمِ جاناں میں بھی غمِ زمانہ کو ضم کرتے رہے۔ چنانچہ ان کی آخری غزل جو ان کی موت سے صرف چند دن پہلے کی ہے، کہتے ہیں:

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

کہاں؟ کہو، غزل گو ذرا یہ ہمدرد
"بہت لگی ہے طبیعت خراب کم کیا ہے"

(فیض)

فیض نے "مرے دل مرے مسافر" کی غزل میں یہ بھی کہا ہے:

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

....

غم بہ دل شکر بہ لب مست و غزل خواں چلیے
جب تلک ساتھ ترے عمرِ گریزاں چلیے

بچپن ہی سے فیض کی عاشق مزاجی اور شاعرانہ طبیعت معلوم تھی۔ فیض جب عشق ہی نہیں بلکہ کام بھی کرتے تھے: وہ سماجی سیاسی معاملات میں کام کرنے کو عشق ہی سمجھتے تھے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ فیض کے دو عشق تھے جس میں ایک کا نام بتا ہی تھا اور دوسرا فیض کام کے عاشق تھے۔ 1976ء کی نظم "کچھ عشق کیا کچھ کام کیا" میں فیض نے اسی عشق کا ذکر یوں کیا ہے:

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا

پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

فیض کہتے ہیں:

رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے
ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے

فیض کے اشعار سے لفظوں کی بندش، ترکیبوں کی نزاکت، خیالات کی [illegible] مضمون کی ندرت [illegible] میر کی سادگی اور غالب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ فیض ترکیبوں میں [illegible] سے [illegible] تمام [illegible] سے واقف ہیں اور وہ حسرت موہانی کی طرح ترکیب کی رنگینیاں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان شعری [illegible] فیض کا لہجہ [illegible] نہیں ہوتا۔ فیض کو ایسا [illegible] ایک منفرد انداز کا [illegible] فلسفہ احساسات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

فیض زندگی کی ضرورت فلسفہ زندگی کے [illegible] زندگی کے مسائل کے شاعر ہیں۔ ان کا عشق [illegible] تک محدود نہیں [illegible] ہے اور جس میں ان کی عشقیہ شاعری [illegible] محبوب کا [illegible] ہے [illegible] رقیب کو بھی دعا دیتے ہیں:

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

فیض کے ہاں [illegible] زندگی کا مقصد [illegible] محبوب کے سراپا [illegible] تو جیسے سب رخسار، قد، جسم [illegible] حسن [illegible] آنکھوں کی تصویر کشی اور [illegible] چشم کی فسوں کاری [illegible] آنکھوں [illegible] کا [illegible] آنکھوں کی [illegible] سے [illegible] میر [illegible] کے اشعار [illegible] فیض [illegible] ہم [illegible] سکے۔

میر:

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

سودا:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

درد:

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

میر:

دیکھی جب ہم نے وہ طوفانِ چشم
بکھر گئے اس رات سے پلنے بچے گل رنگ

مومن:

انداز سے زیادہ ہے مگر ان کے ناز کا
آنکھیں وہ مخموری ہیں جو لب سے عیاں ہوا

غالب:

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

اقبال:

جچتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہم نشیں
پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

جوش:

جس وقت اٹھیں تیر کٹاری آنکھیں
بیچی اٹھیں کی بھاری بھاری آنکھیں
جنگلی جنگل کی جیسے نیلی آنکھیں
منگلی منگلی سی کنواری آنکھیں

فراق:

یہ مدھ بھری آنکھیں ہیں کہ پیمانے چھلکیں
ہے چھیڑ ناز کہ حافظ کی غزل

مضمون کی مناسبت سے بتانا یہ ہے کہ ہم نے جب بزرگ شعرا کے تغزل میں آنکھوں پر ان کے اشعار نقل کیے ہیں۔ اسی سوچ پر ہم آگے اشعار آنکھوں پر ادب کے چند اشعار اور غزل کے موضوعات پیش کر کے فیض کی شاعری کا جمالیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

حسن کے ہر تخیلاتی کی طرح فیض بھی رنگ اور خوشبو کے تذکرے سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار آپ خود ملاحظہ کیجیے جو ہر جہت کی انسانی تصویر اور تشریح کے پیش نظر ہے جس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا۔

خوشبو اور رنگ بدلنا:

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام

....

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

....

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح ، دوپہر ، کبھی شام
بنی بساطِ غزل ، جب ڈبو لیے دل نے
تمھارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

....

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

....

ضیائے بزم میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم

....

تری رشک سے ہر انجمن گل بداماں
تذکرہ چھیڑے تیری پیرہن آرائی کا

آنکھیں:

فیض نے بہت عمدگی سے اس راز کو سمجھایا ہے کہ آنکھوں کی کیفیات کو لفظوں میں پیش نہیں کیا جا سکتا:

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

....

خمار خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں

....

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے ؟

....

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

....

یہ غزال چشماں اگر سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنج قفس بہاراں

....

جب تری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی راہ لے گا

....

ساغر چشم میں تیرے رخ روشن کا جمال
نرمی لب سے پریشاں تری آواز کا رنگ

لب و رخسار:

وہ بدن گلی سے جن کے بہار والے ترسیں
عشرت دیدۂ رخ جسم و ساحل پیدائی

....

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

....

ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

....

دیکھیں ہم بھی کہ یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

....

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگ لب سے ہے

دولت لب سے پھر اے خسرو شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

... .

وہ خواب سارے شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر سو بکھر گئے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے

... ...

بیاض رخ پہ سحر کی صبا جبیں آزردہ
سپید دوش پہ بادلوں کا ہجوم

....

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

.. .. .

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

قد و قامت:

دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

. . . .

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد، جسے سروِ سہی نماز کرے

... .

ترے قامت و رخسار و لب و گیسو کے
پیرہن جسم پہ لیتے ہیں ترے بے صورت رنگ

....

ترے جمال سے ہر صبح پہ وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پہ سجدہ کی پابند

شیخ جیسا ہے وہ تو بس وہی ہے

خوبیاں تن کچھ اس سے زیادہ

حسن کا ہر پہلو مشکل اور دقیق ہے شعری تخلیق کا مسئلہ ہے۔ اس کام کے لیے فطری جمالیاتی احساس کی جو اعلیٰ ضرورت ہے وہ ہر ایک میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھی مشکل مضمون جذبات نگاری ہے جہاں الفاظ عاجز ہو جاتے ہیں اور کیفیت پوری طرح عیاں نہیں ہوتی۔ ہر شعر مختلف کا اندازہ نہیں ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو شعر میں ڈھالنے کے لیے استادی اور قدرت بخشش کی ہوتی ہے اور یہ کسی بڑے شاعر سے ہو سکتا ہے۔ جہاں جہاں کہیں جذبات نگاری جو کا قفل کھلی ہوتی ہے پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے اور ذہن میں ثبت ہو جانے والی شاعری کہلاتی ہے۔

اردو ادب میں معاملاتی شاعری سے دور تک بھرے پڑے ہیں جن کی اہمیت نہیں لیکن فیض کی شاعری خالی نہیں ہے۔ اس کی ایک مکمل مثال نقشِ فریادی کی نظم "سرِ ہم صاحب دوست" ہے۔ یہاں الفاظ کا گورکھ دھندا طلسم سے کم نہیں۔ معاملات اور استعاروں میں جذبات کی نگارش ہے۔

تیرے ملبوس سپیدوں کے عقاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
تیرے رنگ چہرے کے تھمے ہوئے بالوں کے گرد
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
جس طرح عارضِ محبوب کے شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
جیسے گل چیں کے لیے کھلتی ہے خود شاخِ گلاب
جس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

مخصوص اور نقادوں نے معترضات کیے۔ کسی نے بے لاب پن کسی نے خلاف اخلاق قرار دیا۔ ہم صرف یہاں فیض ہی کا شعر درج کر کے بڑھتے ہیں۔

ہوئے کس رنگ میں تعمیر کریں اب شکوے
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

۔۴۲۔

فیض اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں

روزنامہ مشرق مورخہ 9 اپریل 1973ء میں فیض کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں ناصر خالد کے سوال پر کہ "آپ شاعری میں کن شخصیات سے متاثر ہوئے؟"

فیض نے کہا: "میرے کلاسیکی اساتذہ تو شاعری میں سعدی سے لے کر غالب تک کا نام آتا ہے۔ اور میرے اپنے ہم عصروں کا معاملہ یہ ہے، حسرت موہانی اور اختر شیرانی ہیں جن سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر تاثیر، پطرس صاحب، چراغ حسن حسرت اور صوفی تبسم کی شاعری سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے"۔

جاوید شاہین کے ایک مطبوعہ انٹرویو میں فیض صاحب نے ان کے ایک سوال کے جواب میں کہا:

فیض: "ہم نے 1928ء، 1929ء میں جب شاعری شروع کی، ہم اس وقت کالج میں تھے، یہی کوئی بات ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اختر شیرانی تھے اور اختر شیرانی سے زیادہ تھے ن۔ م۔ راشد جو ہمارے ساتھ ہم سے ایک سال آگے تھے تو سلسلہ حسب مطابق سے شروع ہوتا ہے وہ اختر شیرانی اور ن۔ م۔ راشد سے ہوتا ہوا فیض تک پہنچتا ہے، چنانچہ ہم نے جو ابتدا کی وہ انہی کے زیر اثر کی لیکن ہماری کوشش یہ رہی کہ ہم ان کی نقل نظر نہ آئیں۔ اس وقت کا بہت سا کلام ہے جو ہم نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ یہ ہے ہماری ابتدائی اثر پذیری۔"

اس سب سے جو نتیجے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

الف۔ فیض کا ابتدائی کلام حسرت موہانی اور اختر شیرانی سے متاثر تھا۔

ب۔ فیض نے حسرت اور اختر شیرانی کے کلام کی نقل نہیں کی۔

ج۔ اس وقت کا بہت سا کلام فیض نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔

د۔ اگر وہ کلام شائع نہ ہوا تو کہاں ہے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کو باقیات فیض کے نام سے شائع کیا جائے۔

ان مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل ہم فیض صاحب کے اس انٹرویو کا اقتباس پیش کریں گے جو شکیل احمد خان صاحب کے نام سے مقبول ہوا جو کتاب فیض احمد فیض میں موجود ہے۔

شکیل خان: آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت شاعری میں دو بڑی شخصیتیں تھیں۔ ایک اختر شیرانی اور دوسرے حسرت موہانی۔ اقبال کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ایک عظیم الشان آواز اور ایک منفرد لہجے کے تھے۔ وہ بالکل الگ تھے۔ اس حوالے سے آپ اُس زمانے کے ادبی ماحول کے بارے میں کچھ بتائیے۔

فیض: بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کو تو ایک طرح سے مولانا حسرت موہانی کا اثر کہنا چاہیے۔ دراصل 1920ء اور 1930ء کا جو

ابتدائی زمانہ تھا۔ اس میں ہمارے ہاں رومانیت کی ابھی چلی تھی اور ابھی کئی طرح کی ابھریں تھیں۔ ایک تو ٹیگور کی "گیتانجلی" کا قصہ تھا،
اس سے طرح طرح کی چیزیں لکھی جا رہی تھیں۔ ایک زمانے میں یورپ میں بھی Aestheticism اور ادب برائے ادب کی تحریک چلی
تھی۔ اس کی کچھ سماجی، اقتصادی اور سیاسی وجوہات بھی تھیں۔ پہلی عالمی جنگ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد یورپ اور ہمارے ہاں بھی
حالات پہلے سے بہت بہتر ہو گئے تھے۔ [illegible] ادب برائے ادب اور جمالیات
اور رومانیت کا کچھ چرچا زیادہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ترقی پسندوں میں سب سے پہلے اس کا اثر حسرت موہانی نے قبول کیا اور رومانی شاعری
شروع کی۔ ہمارے ہاں اختر شیرانی اس کے نمائندہ شاعر تھے۔ غزل کے جو دو بڑے اسکول تھے، دلی اور لکھنؤ کے، ان میں سے
دلی اسکول میں [illegible] ایک طریقے سے زندگی سے قریب تھا لیکن اس میں [illegible]
نمایاں تھی۔ حسرت موہانی نے رومانی شاعری کو زندگی سے قریب تر کیا۔ حسرت موہانی جسے فاسقانہ شاعری کہتے تھے وہ تو
بازاری شاعری تھی جو رومانی شاعری۔ ویسے اگر ہم [illegible] اس سے پہلے جائیں تو ہمیں اس کی ابتدا مثنوی زہر عشق سے کرنی
چاہیے۔ وہ پہلی مثنوی ہے جس میں حقیقت پسندانہ طور پر جذباتی معاملات اور جذباتی کاروبار تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے
ہیں۔ اس کے بعد مولانا حسرت موہانی نے دلی اور لکھنؤ کے بیچ سے ہٹ کر غزل میں سچے جذبات کا اظہار کیا اور جس طرح
سے لوگ عاشقی کرتے تھے (شریف لوگ، بازاری لوگ نہیں) اس کو بیان کیا۔ ٹھیک ہے اس زمانے میں تو بڑی بھی مختلف
قسم کی پابندیاں تھیں۔ [illegible] بہت گنجائش بھی تھی۔"

یہ بات عجیب تھی ہے کہ اختر شیرانی جیسے شاعر کو اردو شعر و ادب نے بعض ان کے ہم عصر [illegible] انھی کی زندگی میں ان کے نام
سے [illegible] طور پر اختلاف کرتے ہیں۔ بعض تنگ نظر ادیب نما [illegible] نقادوں اور [illegible] نے ان کے کلام کو رومانی شاعری [illegible]
معمولی وجہ کی بازاری [illegible] کی شاعری [illegible] ان کی شاعری کا [illegible] کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible]
شاعری جس میں [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] جذبات [illegible]
رہ گئی۔ اختر شیرانی کے ساتھ [illegible] کی اور [illegible] کی۔ اختر شیرانی کا انتقال (43) سال کی عمر میں ہوا۔ اور آج ان
کے انتقال کے ساٹھ سال بعد بھی کوئی ایسا نوجوان ان کے شایان شان سامنے نہیں آیا۔

ہماری اس تحریر کا مقصد اختر اور فیض کی شاعری کا تقابل نہیں بلکہ فیض کی شاعری میں اس جہان کا [illegible] کا سراغ پانا
ہے۔ اختر شیرانی فیض ہی کی طرح شاعری میں کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ مجتہد تھے۔ انھوں نے رومانیت کی [illegible] کیا۔
انھوں نے اپنی [illegible] آپ بنائی جس میں [illegible]
انتظار کرتے ہیں۔ [illegible] اور شاعری کا [illegible] اردو میں [illegible] شاعری کی طرح معشوق [illegible] کے حوالے
سے اشاروں اور علامتوں میں [illegible] تھا۔ اس [illegible] اختر شیرانی نے [illegible] اپنی معشوقہ اور محبوبہ [illegible] کے
ساتھ [illegible] ان کے [illegible] اختر نے عاشق اور معشوق [illegible] کی [illegible] قریب کر
دیا۔ اسی لیے اس دور کی شاعری میں [illegible]

زمیں پہ بھیج دے آج اے بہشت اپنی بہاروں کو
بچھا دے خاک پہ اے آسماں اپنے ستاروں کو
تمام فضا کو دے [illegible] نکہت [illegible] کو

رو ہے نور چاند کی کرنوں سے گھبرانے کی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور مثل نکہت مستانہ رہتی تھی

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اختر کی شاعری میں حسین استعارے، رمز یا کنایات اور خوبصورت تشبیہات ہیں جس سے وہ اپنی محبوبہ ظفر کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کی اداؤں سے لطف لیتے ہیں، اپنی روح کو گرما لیتے ہیں اور ہجر میں بھی احساس کی شدت و جذبے کی صداقت اور خلوص کی روح پھونک کر ایک حقیقی یا فرضی حسن کی کسی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں اور وہ اپنی دلی محبت کی ذات سے سرشار رہتے ہیں۔
فیض نے بھی رومانی جذبے کو اتنے دل آویز سے شعلہ ور کیا ہے کہ جیسے یہ شعلہ زیر دامن کسی آتش گل کی طرح دہکتا ہے:

ہے خیمہ زن کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بن مو سے
رواں ہو برگ گل تر سے جیسے سیل شمیم

....

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

....

بات نکلی ہوئی آئی ہے کہاں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلف طرحدار ہے کون
پھر در دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دل وحشی کا طلبگار ہے کون

اختر شیرانی بھی فیض کی طرح اعلیٰ اور ادبی جذباتی نظمیں رکھتے ہیں۔ یہاں جذبے کی فراوانی میں جو دل پہ گذرتی ہے اسے رقم کیا ہے۔ شیرانی نے بھی خارجی واردات کو پہلے اپنے دل کے نہاں خانوں میں بسا کر اپنے دل کے درد کی بنا پر سطح قرطاس پر بکھیرا ہے جو زندگی سے ہی اثر و نمود رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی شیرانی کی نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "انتہا کی بات! اف! میرے خدا

"آج کی رات" میں جذبات کا سیلاب ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کی شدت سے تھک کر شاعر آخری بار اپنا اظہارِ محبت کر کے دل ہی دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک انوکھا مگر نظم کا نہایت ہی فطری اختتام ہے۔

ہم میں تجھ کو کبھی کوئی بھی ہو گی کہ نہیں
جذبۂ ناصبوری بھی ہو گی کہ نہیں
شرم سے دور خلوت بھی ہو گی کہ نہیں
یوسف بن کے زلیخائی بھی ہوتی کہ نہیں
آج کی رات اک عمر کے تماشے کی رات

فیض کی نظمیں بالعموم جذبہ و احساس کی بلندیوں پر ختم ہوتی ہیں۔ ان نظموں کا اختتام بے حد شدید ہوتا ہے۔ فیض اپنی تشبیہات، استعارات، علامات اور کنایات میں تصرف سے کئی نئے معنی پیدا کر لیتے ہیں ان کی آخری لے نئے جوہر بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

....

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

....

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو

....

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہو گی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

.. ..

آج کی رات پوچھو نہ اے دوستو
دور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن

....

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

اختر شیرانی کی شاعری میں عشقی واردات کے ساتھ ساتھ زندگی کے افکار پر بھی خوب صورت اشعار موجود ہیں۔ وہ جمالیات کے تذکرے میں وطن کی محبت، قومی روح، آزادی اور حریت کا درس بھی دیتے ہیں۔ اختر شیرانی کی شاعری کے اس حصے سے لوگ نا واقف ہیں۔ اختر شیرانی کی زندگی پر بھی فیض کی طرح دونوں عالمی جنگوں کے دور رس عظیم عہد کے اثرات پڑے جس کی گواہی ان کے اشعار سے واضح ہے۔ شیرانی انسان کی آزادی کو عشق سے بالاتر مقام عطا کرتے ہیں۔

عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

....

سخت بد بخت ہے وہ بادل کی روانی سے
جہاں میں کوئی نہ ہو تلخ کام آزادی

انگریزی اقتدار، جاگیردارانہ نظام اور مغرب کے تعصب کے خلاف فیض نے بھی آواز اٹھائی ہے کہ اور وہ یہ فیصلہ یوں دیتا ہے:

عہد حاضر کو بھر کر کی جوانوں سے
یہ بھر دے یہ تنگ جرأت ہو لے
مغربی قوموں کی جڑ تک ہلتی تہذیب نے
مشرقی قوموں کی آزادی ہلتی جسم پر لے

اب شاعر محبت کے خوابوں کو ختم کر کے حق پرستی کے لیے اپنی جان کو چھوڑ کر جانبازی کے لیے تو بھی تقاضوں کو موجود ہے۔ وہ قوم کو بیدار کرتا ہے۔ یہی وہ قدم ہے جو فیض نے بھی اٹھائے ہوئے کہا ہے۔ عمر کی زندگی اور شاعری خوب صورت بنا دیا۔ شیرانی کہتے ہیں:

سن وقت کی آواز آئی ہے یہ دور غفلت ختم ہوا
ساغر کو الٹ دے جام کو اٹھا بیکار عشرت ختم ہوا
جانبازی کی نوبت آ پہنچی رونا اے دل ہے ختم ہوا

ہیں جام و سبو بے کار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی دوسرے ناقدین کی طرح اختر کو ایک خاص رومانی شاعر کہا ہے جو ایک خوش دل عاشق کی طرح معشوق سے رومان اور عشق کرنے میں خاص مقام رکھتے ہیں جس سے ان کے کلام میں ایک لطف و رنگینی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی نظمیں بھی انقلاب اور آزادی کی نغمہ سے رنگین ہو جاتی ہیں۔

یہ بھی ہے کہ رومانیت کے دور سے نکل کر حیات اور زندگی کے مسائل پر اختر شیرانی کے یہاں ان کے چھ سات مجموعوں میں شعور بہت کم ہے جب کہ فیض کی شاعری میں زندگی اور حیات کی ترجمانی زیادہ ہے جو "نقش فریادی" میں

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

سے شروع ہو کر

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

سے ہوتے ہوئے

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

تک جاری رہتا ہے یعنی اس مقام پر

جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

تک بھی

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

اب یہ کہ:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض سے قبل روایتی غم جاناں کا یہ جملہ بھی ملتا ہے:

غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

اختر شیرانی فیض کی طرح جن کے دو دو دیوان باغ و کائنات تصاویر، تنہا، دریا دیوان کے ساتھ ساتھ ان کے تین اکرام و

محنت کش، کسان اور مزدور کے درد سے واقف ہیں۔ شیرانی کی نظم کا بند دیکھیے:

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی بتا
کس حال میں ہیں کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن فردوسِ وطن
وہ سروِ وطن ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

فیض کہتے ہیں:

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

اختر شیرانی اور فیض کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فیض نے رومانی منظر نگاری، تشبیہات، استعارات اور علامات کو محمود اور ادا کیا استعمال کیا ہے وہ اختر شیرانی اور حسرت موہانی سے ضرور سیکھا ہوگا۔ "نقشِ فریادی" کی رومانی شاعری پر اختر شیرانی کا اثر خاص طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو بتدریج کم ہوتا گیا اور "مرے دل مرے مسافر" تک تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔

جیسا کہ فیض نے اپنے انٹرویو میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ شروع میں ان کا ابتدائی کلام کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا۔ اگر اس کلام کو بازیافت فیض کے نام سے شائع کیا جائے تو فیض فہمی میں ایک اضافہ ہوگا۔

فیض اور اختر کی شاعری کا منصب اور مشترکہ مقصد اختر شیرانی کا یہ شعر ہو سکتا ہے:

عظمتِ فکر کے رخشندہ جنونوں کی قسم
ذرّے ذرّے کو حریفِ مہِ تاباں کر دیں

کون بڑا؟ جوشؔ یا فیضؔ

(ادبی محاسبہ یا گروہی مغالطہ)

شاعروں کے درمیان تقابل کرنے کی روایت اردو شاعری کی دلچسپ روایت ہے۔ ہر دور میں اس وجہ سے گروہ بندیاں ہوتی رہیں جس کی نوعیت اور شکل اگرچہ شعر و ادب پر منحصر ہوتی۔ گزشتہ چند برسوں سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ علامہ اقبال کے بعد بڑا شاعر کون ہے؟ یہ سوال زیادہ تر ان افراد نے اٹھایا تھا جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا، چنانچہ ابتدا میں جوش کے ساتھ جدید شاعری کے معمار فراق، فیض، ن۔ م۔ راشد، میراجی، مجاز اور اختر الایمان کے نام لیے جاتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مقابلہ صرف جوش اور فیض کے درمیان محدود ہو گیا ہے اور یہ بھی علامہ اقبال کے بعد! اور بعض افراد نے اقبال اور فیض کا تقابل کر کے فیض کو اقبال سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ الطاف رؤف "ہمارے فیض صاحب" میں لکھتے ہیں:

فیض صاحب بعض معاملات میں بہت ہی واضح تھے۔ ایک دفعہ ملک کی ایک بڑی سیاسی شخصیت میرے کمرے میں تشریف فرما تھی اور کچھ دوست وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے آکر بیٹھتے ہی آمد فیض کا ذکر چھیڑا اور فرمایا کہ مقصود ان کا بھی یہی تھا کہ انھوں نے کہا: فیض صاحب آپ بہت بڑے شاعر ہیں اور آپ کی عظمت میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا ہے اور آپ ہمارے دلوں کے قریب ہیں مگر میں تو آپ کو اقبال سے بھی زیادہ بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ اب یہاں فیض صاحب نے اپنے مزاج کے بالکل برعکس بڑی واضح صورت میں فرمایا کہ نہیں بھئی ایسا نہیں ہے۔ اصل میں اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا شاعر میر ہے، انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب اور بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال۔ اور یہ جو ہم لوگ شعر کہتے ہیں اس کی بھی اہمیت ہو تو آپ..... سمجھیے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر مشہور شاعر بڑا نہیں ہوتا اور ہر بڑا شاعر مشہور نہیں ہوتا۔ اس لیے مقبولیت، معروفیت، محبوبیت اور شہرت کو معیار بنا کر بڑی شاعری کی میزان پر انصاف کی ترازو سے تولنے کا دعویٰ کرنے والے کو مغالطہ ہو سکتا ہے۔ جو بھی ضروری ہے اور یہ قول میر انیس:

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
سب کچھ ہے اس دنیا میں بس انصاف نہیں ہے

فیض اور جوش ہم عصر تھے تقریباً پچاس سال سے ایک دوسرے کو جانتے اور مانتے تھے۔ فیض نے جوش پر اپنے مضمون "جوش صاحب اور ان کی نظم" اور انٹرویو میں تفصیل سے گفتگو کی۔ جوش نے بھی فیض کے متعلق اپنے خیالات کا خوب صورت اظہار کیا، یہ تعارف لکھے جو فیض کے مقام کو متعین کرنے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔

فیض اور جوش کی شخصیتوں اور مزاجوں میں بڑا فرق تھا۔ فیض خاموش اور متانت تو جوش بلند آہنگ اور بے تکان۔ فیض نرم خو اور دھیمے لہجے کے مالک تو جوش گرم خو اور جوش و خروش کا پیکر۔ فیض منکسر المزاج اور متانت تو جوش جلالی مزاج اور ہیبت کا مذاق، اگرچہ

دونوں پٹھان، دونوں خان، دونوں رئیس زادے، دونوں حسن کے شیدا اور دونوں انقلاب کے عاشق۔ پروفیسر [illegible] پوردلی سے اگر کوئی [illegible] کہتا جواب میں [illegible] منعقدہ ایک محفل میں جس کی صدارت خود پوردلی صاحب نے کی تھی فیض اور جوش نے شرکت کی اور اپنے اپنے کلام سے مشاعرہ لوٹ لیا۔ پروفیسر پوردلی کہتے ہیں فیض کے ساتھ بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دریا کے کنارے [illegible] بیٹھے ہیں جب کہ جوش کے رعب و دبدبے اور تمکنت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قلعہ دار کے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فیض اپنے اخلاق، انکساری اور خوش مزاجی سے لوگوں کے دل موہ لیتے۔ ایک بار جو فیض سے ملتا ان کا عاشق ہو جاتا اور اس طرح ان کے چاہنے والوں کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا جب کہ جوش اپنی صحبت، گرم مزاجی اور تیز زبان سے اپنے حلقہ احباب اور اپنے چاہنے والوں کو دور کرتے جاتے لیکن پھر بھی جو لوگ ان کی قلبی واردات سے واقف تھے وہ ان کی گہرائی سے جوش سے پیار کرتے تھے۔ نعیم آفریدی کے والد نذیر آفریدی نے کہا تھا:

[illegible] سے اب ہم لوگ کیوں نہ کہیں
کہ ہم [illegible] زوال اقتدار کرتے ہیں

فیض اور جوش کی بحث میں اس مضمون کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے اور ہر شخص اپنے تفکر اور منطق کے تحت اس مضمون سے کچھ [illegible] مطالب و مواد پیش کرتا ہے وہ مضمون حقیقت میں ترقی پسند تحریک اور اس وقت کی تنظیم کے [illegible] روداد [illegible] نے فیض سے لکھوا کر [illegible] شائع کروایا تو [illegible] فیض کے مجموعہ مضامین "میزان" میں شامل [illegible] ترقی پسند تحریک کے بعض حامیوں کو جوش کے خلاف [illegible] شاعر انقلاب جوش کو [illegible] ان کی شاعری کی [illegible] ہوا تھا۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

آغا ناصر [illegible] فیض کے اس مضمون کی بابت لکھتے ہیں [illegible] روداد [illegible] نے ایک دن کہا کہ ہم جوش پر مضمون چھاپنا چاہتے ہیں لیکن مضمون فیض سے لکھوایا جائے۔ اشرف علی [illegible] میرے ساتھ تھے کہنے لگے [illegible] فیض صاحب سے کہیں [illegible] مضمون ہم لکھ نہیں سکے۔ اشرف علی اور ہم فیض صاحب کے پاس پہنچے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مطلب عرض کیا [illegible] "بالکل ٹھیک ہے، مضمون تو ہونا چاہیے مگر [illegible] جوش صاحب کا کلام بھی دیکھنا ہے!" [illegible] فیض [illegible] جوش کا [illegible] ہے۔

ماہنامہ [illegible] پریس میں چھپنے کے لیے جا رہا تھا [illegible] فیض کا مضمون ابھی نہیں آیا تھا۔ [illegible] "بھائی [illegible] روداد [illegible] مصیبت [illegible] آپ نے مضمون [illegible] اس [illegible] کرم [illegible] آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا، آپ بولتے جائیے [illegible] لکھتا جاؤں گا۔" [illegible] فیض صاحب کا کرم ہے کہ [illegible] میری بات مان لیتے ہیں، کہنے لگے "اچھا کل آ جائیے، مضمون ہو جائے گا۔" [illegible] جوش صاحب [illegible] پریشان [illegible]

نقصان اٹھا رہے۔ انھوں نے پہلے ایک مسودہ الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ادھر ادھر کچھ ڈھونڈا۔ پھر وہ بھی رکھ دیا۔ پھر کرسی اور مسودہ اٹھایا کہ گھر اٹھتے رہے۔ آخر بجے کے قریب کچھ کاغذ لے کر اندر چلے گئے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن میں مضمون ترتیب پا چکا ہے۔

اب جس مضمون کا ذکر ہے وہ جن اشعار پر مشتمل تھا انھیں نے وہ بعد میں چھاپ کر دینے کا کچھ حصہ لکھنے کے بعد مضمون تیار تھا ان کے ملاحظے اور نظر ثانی کے لیے یہ مسودہ ان کے پاس رکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن مضمون موصول ہوا۔ جو "نیا ادب" میں شائع ہوا اور اب ان کے مجموعے میں بھی موجود ہے"۔

یہ مضمون 1945ء کے ایک رسالے "نیا ادب" میں شائع ہوا اس کا عنوان تھا "جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے"۔ اس مضمون کو پوری طرح سے سمجھنے کے لیے فیض کے تنقیدی نقطۂ نظر سے واقفیت ضروری ہے۔ فیض لکھتے ہیں: "آج عام طور سے انقلابی معنوں میں انقلابی نظریے سے اشتراکی نظریہ مراد لیا جاتا ہے۔ غالباً جوش بھی اسی نظریے کے قائل ہیں اور اسی سے مطابقت کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ ان کا کلام اشتراکی نظریے سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے۔ اگر یہ صحیح نہیں ہے تو جب تک وہ اپنے نظریے کی وضاحت نہ کریں تنقید بے سود ہے۔ اس مضمون میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہی بات صحیح ہے اور صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشتراکی مقاصد کے مطابق ہے"۔

فیض کا یہ سارا مضمون اسی مفروضے پر لکھا گیا ہے کہ صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشتراکی مقاصد کے مطابق ہے اور اس نظریے پر جوش یقین رکھتے ہیں اور اسے صحیح مانتے ہیں۔ چنانچہ فیض کے علاوہ بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے جوش کو سمجھانا چاہا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جوش محض اشتراکی تقریر کا انقلابی نظریہ نہیں۔ ... "حسن اور انقلاب" کو اشتراکی نظریے سے کوئی ... ان کی ... نظمیں اور ... اشعار ان کی ... سے جوش شاعر انقلاب ... محض اشتراکی نظریہ پر ہی نہیں ... فیض نے یہ مضمون ... اقبال سے ... شروع کیا تھا ... جوش کے متعلق ... کیا لیکن ... مطالب کا اندازہ ... کیا۔ پھر آگے اس مضمون میں لکھتے ہیں: "میری ذاتی رائے میں ... جوش کی ... اس اعتبار سے ان کی انقلابی نظموں سے زیادہ ہیں۔ بہرحال اس وقت ان کے انقلابی ... کلام کا سوال ... ان کے تنقیدی کلام کی اہمیت کو اشتراکی نقطۂ نظر سے پرکھنا مقصود ہے۔ اشتراکیت کے بنیادی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ انقلاب کسی فرد یا کسی ایک شخص کی ذاتی کوشش ... یا ... کا نتیجہ نہیں ... معاشی اور اقتصادی ... کی ... اور کشمکش سے ... ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں فرد کی اہمیت ... کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جوش کی شاعرانہ طبیعت ... نظریے کے خلاف ہے۔ ... انانیت پسند اور انفرادیت کے ... واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ انقلاب کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور سے اس کی ... کوئی جگہ نہیں ہوتا ... کوئی فرد ... ان کے ابتدائی انقلابی کلام میں ... جوش ... ہیں:

میت کے سب ... کی ... آہ ... نہیں
... واقف ہے ... جب ... چھا جاتا ... نہیں

. ...

قسم اس جوش کی جو ازلی نجیب ابھارے گا
کہ اے ہم داستاں تجھے ... کو ... پکارے گا

مٹی تری تیغ رواں باطل کے سر پہ جھکانے کو
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم ہونے ابھی نہ پائے گی

....

اور ہاتھوں میں جب ہو ظلمت کا سامنا
رعب و شکوہ، جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ تیغ گیر کی ہیبت کا سامنا
قہر و جلال و ملک و مہابت کا سامنا
لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے

یہ مصرعے کوئی نہیں بھلا سکا کہ ایک قوم انقلاب کی بات کرتی ہے۔ سے لئے جا رہے ہیں کہ ماتمی جلسوں سے اب شخص شعر پڑھا ہم ہیں لیکن یہ تو خیر ایک شعر ہے ان کے بعد بہتر طور پر جدت پیدا کرتا ہے۔ وہ انقلابی اشعار پڑھتا ہے جو فیض کی نظم کا اثر ہیں اور جو ہے، جوش صاحب نے لکھا ہے۔"

فیض نے پہلے بھی اشعار جوش کے اتباع میں لکھے، قرآن کی اور حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات فیض کے بعض حضرات شعر کا مطلب ہے، مثلاً فیض کا جوش کے شاہکار مرثیہ "حسین اور انقلاب" سے ہے۔ حسین ایک شخص ہے لیکن اپنی شخصیت میں ایک عظیم شخص ہے۔ مرثیہ (72) شہیدوں کی مختصر قربانی کا پیمانہ بھی ہے، ہم اس مرثیے کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جو کہ پڑھنے والے قصداً رکھیں، مرثیہ اشعار کا ہر طرح کے ہیں پر دعوت بغاوت کے حامل ہیں۔ ہم نے جوش کے صرف ایک ہی مرثیہ "حسین اور انقلاب" سے چند اشعار منتخب کرکے یہاں پیش کیے ہیں۔

کیا کیا حیات انساں کی تھی مشکلیں، نہ پوچھ
کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں، نہ پوچھ
دنیا کی ہر فضا ہے غم و اندوہ سے دوچار
ہر شخص کی طرح میں ہے جسم شکستہ یار
تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دمبدم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اس راہ میں ہے صرف اک انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حنین ہے
جس سورما کا اسم گرامی حسین ہے
جس کا وقار، عدل و سیادت کی مراد
جو زرنگار حق تھا، وہ تقدیر جہاد

تکمیلِ زندگی میں بنے رنج برقرار
قدرت کی ایک موج ازلی ہے جس کی داد
جرأت پہ جس نے سر کو فدا کر کے دم لیے
جدّت و صداقت کو بقا کر کے دم لیا
فتنوں کو جس پہ ناز تھا وہ دل بجھا دیا
جس نے چراغِ دولتِ باطل بجھا دیا
طاقت کی شے کو خاک میں جس نے ملا دیا
تختِ آمریت کے ، قصرِ تجارت کو ڈھا دیا
جس نے بڑا ہے : رعبِ امارت اڑا دیا
ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا
اس طرح جس سے ظلم ، سیہ فام ہو گیا
لشکر یزید ، ذلیلِ زمانہ ہو گیا
یہ صبحِ انقلاب کی جو آتی کل ہے نمو
یہ جو چل رہی ہے صبا - پھوٹ رہی ہے ضو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرا رہی ہے لو
درپردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رو
اے قطبِ تمدن کے مقدس ترین نام
اے چہرۂ انقلاب کے ابرِ جمال خرام
پھر زندگی ہے تشنہ و بیکل بڑا اے حسین
پھر حریت ہے مجرمِ الزام اے حسین
ذوقِ فساد و ولولۂ شر لیے ہوئے
پھر عصرِ نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے
مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے
پھر گرم ہے لہو کا بازار دوستو

[illegible]

جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا

[illegible]

یہ جہاں اور سے تری انسان آگہی کا شعور
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بوئے گلستاں
نازپرور تتلیوں کا پاسدار

ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کسان کے متعلق چند روایتی معلومات کے علاوہ کوئی تصویر شاعر کے ذہن میں نہیں ہے۔ اسی طرح آگے چل کر کسان کے دل کے متعلق وہ یوں تصویر کشی کرتے ہیں:

دل میں جس کے حسنِ تخیل تحصیلِ جامِ آب و رنگ
قصرِ گلشن کے دریچے، شیشۂ تخیل کا در
نبض گیرِ شجروں کے بدنی، رازِ فطرت کا مزاج
خوں بہا تیغ جوہردار کے ظلم و تاراج
جسم پر جس کی ڈھنی پرورِ خلقوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو تیغ دہقاں کا پیام

یہ الفاظ بھی جوش کی درباروں کے قصیدہ گوئی والی روایت کا عکس ہیں تو ہیں اختر شیرانی کے ترجمان نہیں۔ کسان اور ان کی محنت کی تصویر کے لئے یہ تصویر آتی ہے۔

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
جسم پر تن، وحشت آب رفتہ کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم ہے ہوا کچھ بھی نہیں
ایک دن اور یہ ہجوم سوزِ دل یا رب امنڈ
یہ تجھ سے اے ملک، سرمایہ داری ہو نہ جائے

اگرچہ مجاز نے کسان اور محنت کش مزدوروں کے بارے میں اسی قسم کے اشعار کہے ہیں لیکن فیض اس کا مقام الم انگیز ہے کہ کسان کی محبت مری کچھ بے نشانگی ''ہی روحانی جذبات کی عکاسی کے بعد فوراً محنت بے کی اور ان کی تصویر کشی کی ہے۔ کسان کے متعلق یہ اشعار لکھیں:

پادشاہِ جہاں، والیِ ما سوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹواری نے کاٹ لی ہے
دُوسری: لیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے

نقشِ فریادی کی نظم میں کہتے ہیں:

تیری صُورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے

پھر فوراً اسی نظم میں رُخ بدل کر کہتے ہیں:

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جوش ہوں کہ فیض یہ لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے؟

فیض نے 1944ء میں جو اعتراضات جوش کی انقلابی شاعری پر کیے تقریباً اُسی قسم کے اعتراضات ترقی پسند تحریک کے حکموں اور مختار شاعروں نے بعد میں فیض پر کیے۔ ساحر لدھیانوی نے فیض کی شاعری میں ظلم کے خلاف اور غریبوں کی حمایت میں تند اور باأثر لہجے کی کمی کا گلہ کیا۔ شاید وہ فیض سے حبیب جالب کے لہجے کے منتظر تھے۔ ''حکمراں ہو گئے کمینے لوگ''

جب فیض نے صبحِ آزادی کی نظم میں لکھا:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وُہ انتظار تھا جس کا، یہ وُہ سحر تو نہیں
چلے چلو کہ وُہ منزل ابھی نہیں آئی

تو سردار جعفری نے سخت اعتراض کیا تھا کہ یہ نظم تو ترقی پسند شاعر کی نظم معلوم نہیں ہوتی ایسی نظم تو مسلم لیگ یا آریہ سماج کا شاعر لکھ سکتا ہے۔ آخر عمر تک پھر فیض نے کبھی جوش پر اس طرح کے اعتراضات نہیں اٹھائے۔ تقریباً بیس سال بعد 1964ء میں فیض نے عبادت بریلوی کو انٹرویو میں کہا:

عبادت: جوش صاحب کی چیزیں آپ نے پڑھی ہیں؟

فیض: جی ہاں۔

عبادت: جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: جوش صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ بہت دنوں سے نیاز حاصل ہے اُن سے۔ اُن میں خاص قسم کا ایک وفور اور ایک خاص قسم کی قدرتِ کلام ہے اس سے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں، لیکن بہت پُر گو ہیں۔ غالباً قدرتِ کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب ہی بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے اور بالکل خالص یا کچھ کم خالص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے اور احتیاط نہیں کرتے تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو اُن کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض

نمونہ کلام شامل کیا گیا۔

عبادت: فیض صاحب! تجربے کے بغیر شاعری یا ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ کوئی نظریاتی نظم یا کوئی نعرہ نہیں نکلتا جس میں کسی شاعر کے پاس ضرور ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر انقلابی ادب کی شاعری کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: نظریے کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بڑے مغالطے ہیں۔ تجربے کے بغیر تو کوئی بھی کسی شاعر یا ادیب کو کسی نظریے سے یا ادیب کو کسی نظریہ ہے، سمت کا پاس یا کوئی منشور وغیرہ کلام پیش کرے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ یا کوئی بھی تجربہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یہ آپ جو آپ کی اصطلاح ہے نظریے سے دیکھتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا شاعر یا فنکار یا ادیب معلوم یا میسر نہیں ہے جس کے ذہن میں زندگی کے متعلق کچھ تصور نہ ہو یا انسانی اقدار یا کوئی نظریہ نہ ہو اور وہ کسی احساس اور تجربے پر منحصر ہو۔ ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو یا بے ربط یا اتفاقی طرح سے ہو یا بری طرح ان کے لیے ہو کرنا چاہیے یا نشر کرنا چاہیے اور اس کی صرف جاری ہے یا اس صرف نہیں جو تب ہے۔ کوئی نہ کوئی حسن کی صورت تخلیق آزادی نہیں ہو سکتی۔ ہر فنکار اور ادیب کے لیے ضروری ہے۔

کرشن کانت نے "اعتراف فیض" کے مقالے میں لکھا ہے کہ فیض کی شاعری سے 1928ء کے بعد ڈاکٹر محمد علی ... کی ایک طرف غزل کی تکرار ... کے ... دوسری طرف نئے رجحان ... نظموں ... سے ... کے جو نظریے سے ... ایک نئی زندگی ... تمام ... جنگ ... الطاف حسین حالی سے ... شاعری ... اقبال اور جوش ہی تھے۔ اس میں ... جوش کا اقبال کی ... کے ... اپنی شاعری کا ... کے ... ان کے ... سب اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن صدیقی نے "جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ" میں جوش کے مقام کے تعین میں "ہم جن کو ہیں غالب کے طرفدار نہیں" کا حق ادا کیا ہے۔

"جوش کی شاعری وقت تک بہتے ہوئے inrercial river کی طرح نظر آتے ہیں ... آواز ... زبان ... حالات کی ... صورت وقت کے ... حد تک ... شعری ... کی ... اقبال کے بعد ... شاعری کا سب سے بڑا نام مانے جاتے ہیں۔ یوں تو 1947ء تک جگر، آنند نرائن ملا، حسرت، اصغر گونڈوی اور ... فراق گورکھپوری، ... احمد ... مجاز ... مخدوم ... احمد ندیم قاسمی ... علی سردار جعفری ... کا ایک ادبی ... فیض احمد فیض ... ندیم قاسمی ... اختر الایمان اور جمیل ... کی شکل میں موجود ہے۔

لیکن جوش 1947ء میں ... کے ... ایک ... کی ... شعری ... حیثیت سے ... اس کے ... سوال ... ہے یا نہیں ... فیض سے زیادہ اہم ہے یا کم۔ ... تمام ... میں جوش ایک بھاری ... کی صورت میں موجود ہے ہیں"۔

ڈاکٹر ... نے اپنے مقالے "جوش کی نظم میں" ... جو ... بات لکھی ہے وہ ... اقبال یا فیض کی ... لکھا کہ ... Comphasl ... شعری ... کا ... جوش کی ... شاعری سے جہاں

معرفتِ الٰہی اور حقائق کائنات کے رموز دیکھتا ہو، جس کو اُردو کا حافظ و خیام سمجھتا ہو وہ بھی جوشؔ کی رجائیت سے مطمئن نظر نہیں آتا البتہ یہ دور جوشؔ کا پہلا دور تھا۔ اگر لسان العصر اکبر الٰہ آبادی زندہ رہتے اور جوشؔ کی فتوحات دیکھتے تو ضرور جوشؔ کے اس شعر پر ایمان لاتے۔

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوشؔ

میں شدّتِ نمود سے ناآفریدہ ہوں

فیضؔ نے جوشؔ کی آوازِ انقلاب سے متاثر ہو کر انھیں اپنے زمانے کا سودا کہا ہے۔ فیضؔ کی نظم "بیادِ جوشؔ و فراقؔ" میں فراقؔ کو میرؔ اور جوشؔ کو سوداؔ الفاظ کے استعمال کی رُو سے کہتے ہیں:

اک ہمہ غلغلہ، اک ہمہ شبنم

تیغ زن ایک، ایک نغمہ سرا

اک کی آواز بانگِ بلبلِ عجم

ایک کا ساز بربطِ گنگا

ایک رمّازِ نکتہ ہائے خرد

ایک سیّاحِ کشورِ دل ہا

ایک ساتھ آئے، ساتھ ساتھ گئے

عصرِ حاضر کے میرؔ اور سوداؔ

فیضؔ جوشؔ کے فن کے کمال سے واقف تھے۔ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی انھیں موقع ملا فیضؔ نے بڑی محبت سے اس کا اظہار کیا ہے۔ جن لوگوں نے صدقِ دل اور بے طرفی سے جوشؔ اور فیضؔ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں فیضؔ جوشؔ کے کلام سے فیض یاب ہوئے۔ ایک مختصر سے مضمون میں جو اُردو ڈائجسٹ کے چوتھے شمارے میں شائع ہُوا فیضؔ نے جوشؔ سے اپنے تعلقات کا ذکر اُن کی شخصیت کی رنگینی اور اُن کی زبان کی فصاحت و بلاغت پر اس طرح تبصرہ کیا ہے: "جوشؔ صاحب سے پہلی ملاقات 1932ء میں ہوئی جب لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے دوران اس انجمن کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی جب تک لکھنؤ والوں کے کان میں ہماری شاعری کی بھنک نہیں پڑی تھی اور انجمن کے ان دو چار اراکین کے علاوہ جو امرتسر سے آئے تھے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا، چنانچہ جب کانفرنس کے اختتام پر محفلِ مشاعرہ برپا ہوئی تو ہمیں غالباً آخری بار سامعین کی صف میں بیٹھ کر مشاعرہ سننے کا اتفاق ہُوا۔ اس کے بعد چائے کی دعوت پر جوشؔ صاحب سے رسمی سا تعارف ہُوا لیکن بات کچھ آگے نہیں بڑھی دو چار برس بعد دہلی میں ایک سرکاری قسم کا مشاعرہ تھا جس کا اہتمام ہر سال وزارتِ خزانہ کی جانب سے ہمارے سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کیا کرتے تھے۔ مجھے وہ واقعہ پیش آیا تھا، جب ہمارے ایک بزرگ دوست اے۔ ڈی اظہر مرحوم نے بھولے سے کہہ دیا کہ جوشؔ صاحب! مشاعرے میں خواتین بھی ہوں گی اس لیے ذرا احتیاط کیجیے گا۔ جوشؔ صاحب فوراً بگڑ گئے اور مشاعرے میں جانے سے انکار کر دیا۔ بعد میں بہت منت سماجت کے بعد راضی ہوئے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے، جوشؔ صاحب مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔ یہ لکھنؤ میں آپ نے کیا حرکت فرمائی تھی، میاں تم کوئی نا کتخدا لڑکی ہو کہ تمھیں مردانے میں آنے سے ڈر لگتا ہے یا شعر کہنا کوئی ایسا معیوب فعل ہے کہ آپ اس سے شرمندہ ہیں۔ آخر وہاں کیوں ہمیں محروم رکھا۔ اُن کی ادا ہی یہ تھی کہ کم عمر لکھنے والوں پر شفقت بھی فرماتے تھے۔ ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ شعر کی داد دینے میں جتنے فراخ دل تھے، زبان پر گرفت کرنے میں اُتنے ہی سخت گیر۔ جب وہ اسلام آباد وارد ہوئے تو ہم

کبھی پوچھ بیٹھتے کہ جوش صاحب آپ کی رہائش کہاں ہے؟ تو [illegible] جوش صاحب کی زبان تو غلط ہے جواب آپ کہنا
تھے کہ آپ کی اقامت کہاں ہے؟

مشاعروں میں بھی یوں ہوتا تھا کہ اگر کسی نے ہاتھ میں کچھ پلا دیا جیسے اکثر اوقات ہوتا تھا اور جوش صاحب نے اپنی مرضی [illegible] زبان میں [illegible] تو کسی عقیدت مند نے ٹوکا: جوش صاحب [illegible] ہے اور جوش صاحب منتقل ہونے کے بجائے اُلٹا اعتراض یا مجادلہ پر اتر آتے [illegible] تو بولے "[illegible]" مشتعل ہو گئے۔

جوش صاحب اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ بقول شاعر میرا حرف ثانی ہے۔ یہ حقیقت ہے اگر اس پر یہ اضافہ کرتے کہ میرا حرف [illegible] تو تصور [illegible] ہے۔ ان کے کلام اور ان کا مزاج بھی اسی سے مرکب ہے۔ اس لیے کہ ان کی [illegible] بھی عاشقانہ نہیں [illegible] اور ان کی [illegible] یاد ہے۔ عشق کے معاملات ہوں تو [illegible] کا مضمون تو [illegible] وجد کے بارے میں بھی جو ان کا مرغوب موضوع ہے [illegible] زندگی میں [illegible] کے بجائے [illegible] بیان کرنے پر اکتفا کی اور انقلاب کی نظموں میں بھی جو ان کا مرغوب موضوع ہے [illegible] اور معاشرتی اسباب و عوامل پر غور کرنے کے بجائے [illegible] جلال و قتال پر فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا۔ اس لیے علامہ اقبال کی زبان میں "[illegible]" کی روایت بن گئی۔

فیض جوش کے انتقال پر "[illegible]" میں "جوش کا شیوۂ مردانگی" کے ذیل میں لکھتے ہیں: "جوش مرحوم کا معمول تھا کہ اگر کسی محفل یا تقریب میں کسی شناسا کو [illegible] دیکھتے تو بلند آواز سے پکارتے میاں [illegible] آؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر جوش کی ذات یا کلام کے لیے کسی ایک صفت کا انتخاب کرنا چاہیں تو وہ یہی مردانہ پن، شیوۂ مردانگی ہے جسے مرزا غالب نے "[illegible]" سے تعبیر کیا تھا [illegible] اور ایک طرح سے شاعری کی [illegible] ان کے ذہن میں [illegible] صاحب قلم ہو صاحب سیف ہونے سے کم نہیں [illegible] اور شجاعت چاہتا ہے۔ [illegible] جوش صاحب کو [illegible] حالات میں آپ نے [illegible] کے خلاف اپنے قلم کا عَلم بلند کیا اور [illegible] اس نظم کے جلوے میں الفاظ [illegible] کا ایسا [illegible] میدان میں اتارا کہ ان کے [illegible] کی جگہ [illegible] صاحب میں [illegible] بچنے سے ہی گئی۔"

فیض نے اس مختصر سی تحریر میں [illegible] اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے جس میں جوش کی قادر الکلامی اور الفاظ پر [illegible] کی جاتی ہے [illegible] جوش کے [illegible] شعر کو الفاظ کے [illegible] اور [illegible] الفاظ کو شاعری [illegible] علامہ شبلی نعمانی نے کہے تھے [illegible] جوش [illegible] صدی [illegible] سے شروع ہوئی اور ابھی تک جاری ہے [illegible] جوش کے [illegible] کے معترضین کی [illegible] ادب میں باقی رہ گئی۔

[illegible] لکھتے ہیں: "جہاں تک الفاظ کے ذخیرے کا تعلق ہے جوش اس دور کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ راقم کی تحقیق کے [illegible] مرزا [illegible] اردو ادب کے [illegible] شاعر ہیں جنھوں نے اردو ادب [illegible]

کے تمام شاعروں سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جوش الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ خود جوش کہتے ہیں الفاظ کی حیات ہے۔ الفاظ بھی آدمیوں ہی کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، بیمار پڑتے ہیں اور تندرست ہوتے ہیں، مہنگے ہو جاتے ہیں اور سستے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ الفاظ بھی اپنے خاص مزاج، عادات، رسوم، روایات، عروج و زوال اور القاب رکھتے ہیں۔ الفاظ کی زندگی میں بھی ذات پات اور مذہب و معاشرت کا روگ ہے۔ الفاظ بھی انجمنیں اور سوسائٹیاں بنا کر رہتے ہیں۔ الفاظ میں بھی بعض افراد انسانوں کی طرح نیک نام ہوتے ہیں اور بعض بدنام۔ بعض معززین پہنچے ہوئے دیوتاؤں کے مندروں میں رہتے ہیں، دوسرے رکھے ہوئے درباروں میں اور بعض تھکے ہوئے بازاروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ بعض الفاظ کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں اور بعض دور سے پہچانے جاتے ہیں تو انھیں زنجیروں سے باندھا جاتا ہے۔ الفاظ میں کتنے ہی بیمار بھی ہوتے ہیں اور آزادی قرار پانے کی راہ میں امیر بھی ہوتے ہیں غریب بھی۔ الفاظ انسانوں کی طرح اجتماعیت کے شریف اور رذیل اور بعض بے سہارا ہونے کے مظہر ہوتے ہیں اور بعض بے زبان، بعض بہرے اور بعض قدم کے بعض لنگڑے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض سے گلے میں باہیں ڈال کر پیار اور کان میں چپکے چپکے باتیں ہوتی ہیں۔

زمانوں کے بیشمار طبقوں میں مختلف ادیبوں اور شعرا کے ہوائیے طبقے ہیں جن سے ان کی بے تکلفانہ میل جول اور تعلقات ہوتی ہے۔ ادیبوں سے اگرچہ الفاظ کی ملاقات داستانوں اور افسانوں سے ہی ہوتی ہے لیکن الفاظ ان سے زیادہ احتیاط سے ملتے ہیں۔ ان کے برخلاف شاعروں کو انھوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں۔ شاعر آدمی بات تو ان کے محرموں اور خوابگاہوں میں آ سکتا ہے ان کے کمرے ناموں میں بھی شاعر سے پردہ نہیں کرتے۔"

اسی لیے تو الفاظ کی بابت جوش نے کہا:

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
تاویل و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پہ تتلیاں اڑتی ہیں
الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

....

اشعار کو زندگی دیتا ہوں
افکار کو آہنگ عطا کرتا ہوں
الفاظ کو بخشتا ہوں شکلِ اجسام
آواز کو آنکھوں سے دکھا دیتا ہوں

ہم نے دیکھا کہ فیض کے خیالات میں بے حد ہمدردی کا انقلاب آ چکا تھا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' کے آخری صفحہ میں فیض کی گفتگو کو یوں بیان کرتے ہیں، 'میں نے کہا فیض صاحب! یار لوگوں نے جناب جوش ملیح آبادی کو شاعر انقلاب بنا دیا اور بعض نے لیے جیلوں کی سیر کر رہے ہیں آپ کو اس قسم کا آج تک کوئی خطاب نہیں ملا۔ کہنے لگے، بھئی جوش صاحب آپ وارث تھے زمانہ بہت جلدی کے قائل ہیں اپنے اوقات اور آداب کے پابند شاعری سے تھے ہم دراصل ہر ایک کی سی صاحب کمال اور اس سے قابل احترام تھے۔ ہاں مندر میں ایسے اس قسم کے خطاب ہیں نہ آتے تو ہیں سمجھو بال بچ گئے۔ میں نے پوچھا فیض صاحب اور کیسے بالکل ٹھیک کہا ہوں۔ ہم نے پڑھنا شروع کیا۔ ہنسی داد بھی تو ہوئی۔ اس وقت لکھتو ہیں میں ہوں

گئے۔ اسی زمانے میں ایک ادبی شخص وارثی صاحب بھی ہوتے تھے [illegible] عربی میں سنایا کرتے تھے۔ وارثی صاحب ایک مرتبہ ہمارے ہاں آئے اور ہمیں [illegible] سے زیادہ [illegible] جب وہ ہوٹل کے قریب ہی آ گئے۔ کہنے لگے، ہمیں دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے [illegible] دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا کلام سنتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے [illegible]۔ جب ہم گئے جناب [illegible] وارثی ہم پر عاشق ہو گئے ہیں۔ [illegible] مجھے فیض نے ساتھ لے جا کے [illegible] کے بعد پوچھتے کہ کچھ [illegible] ہم صاف صاف کہہ دیتے [illegible] قوالی [illegible] تھی۔ یہ سب [illegible] آ گئے، [illegible] تکلف [illegible] رکھتے ہوئے ہم نے وارثی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تو کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے "انا للہ" فرمایا اور کہا "نہیں تو مجھے [illegible] کا نمبر ہے"۔ اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ فیض نے کہا [illegible] آنکھیں بند کر لیں۔

اس واقعے سے ظاہر ہے کہ فیض صاحب نے بڑی خوب صورتی سے موضوع بدل دیا اور جوش کے خلاف جواب لکھنے کی بجائے جوش کی تعریف بھی کی۔ فیض، سہیل احمد خان کے انٹرویو میں کہتے ہیں: "یہ فسادات کا وقت تھا۔ جب ہم نے جوش صاحب پر مضمون لکھا اور کہا کہ یہ انقلابی شاعری نہیں ہے [illegible] اور دوسرے دوستوں سے [illegible] پڑتا"۔

شاداب قدیر لکھتے ہیں: "اس حقیقت سے چشم پوشی ناممکن ہے کہ جوش اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت بھی سب سے زیادہ متنازع فیہ رہی ہے۔ جوش کے بارے میں یہ بات اکثر دہرائی جاتی رہی ہے کہ وہ تضادات کے شاعر ہیں۔ جوش نے الفاظ کا استعمال [illegible] ایک [illegible] ہے اور [illegible] سے کام لینے سے قاصر رہے ہیں۔ جوش کی الہامی شخصیت میں بھی وہ متضاد عناصر کارفرما ہیں۔ ایک کی نگاہ میں جوش لفظوں کے ساحر، الفاظ کا سلطان، [illegible] ہیں اور دوسرے کی نظر میں ان کی شاعری بے طرح [illegible] کرتی ہے"۔

حق بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ اتنا اختیاری بھی نہیں اگر کوئی [illegible] شاعر [illegible] انقلاب، محبت، شعری [illegible] اور تصوف کی بجائے [illegible] جوش کے تمام نظم و نثر کا مطالعہ کرے تو یہ [illegible] ہو جائے گا۔ جوش کو اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر کہنے میں تامل نہیں کرتے۔ فیض اور جوش کے تعلقات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کا [illegible] فیض کے [illegible] جوش کے کلام کو جوش کے [illegible] مطالعے سے [illegible] کیا ہے اور اس لیے [illegible] حافظ [illegible] بیانات رقم کر دئے۔

"فیض محبت و انقلاب کا شاعر" میں ثاقب رزمی لکھتے ہیں: "جناب محمد صفدر میر اپنے مقالے "Faiz Legacy: Love and Revolution" میں لکھتے ہیں: "فیض کو بہت پہلے ہی اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر مان لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو ان کے ترقی پسند نظریات اور سیاسی معتقدات پر معترض تھے اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے اگرچہ انھیں [illegible] تھا کہ اتنا اچھا آدمی کمیونسٹوں کے زمرے میں آ گیا"۔

ہمیں تعجب ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے [illegible] اس کا حوالہ کیا ہے؟ افسوس ہے کہ مستند حوالوں کے بغیر بعض لوگ اس طرح کے [illegible] قلم بند کر دیتے ہیں جس سے غلط فہمی کی ترویج ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے دلچسپ مضمون "جوش یا فیض" کو اس [illegible] سے شروع کرتے ہیں: "آج کل ہمارے ہاں کے [illegible] ادبی

حلقوں میں اس نتیجے پر کافی زور دیا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر جوش ہیں۔ ان کے مؤیدین میں پروفیسر مجنوں، [illegible] اور ڈاکٹر عتیق احمد، رفعت سروش اور سید عابد [illegible] پیش پیش ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی مرتبہ کتاب "جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ" میں حرف آغاز میں تحریر کیا ہے کہ "اردو کے عظیم شاعروں کی فہرست میں جب ہم آتے ہیں تو میر، غالب، انیس اور اقبال۔ اس کے بعد دوسری فہرست بڑے شاعروں کی ہے۔ اس فہرست میں سب سے پہلا نام جوش ملیح آبادی کا ہے۔ اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ہیں۔"

اور پھر ان خیالات پر اظہار کرتے ہیں "جوش نے شاعری کا ایک نیا انداز ایجاد کیا۔ ان کے لب و لہجہ، نظم اور غزل [illegible] بیسویں صدی میں اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر کہا جائے تو حقیقت سے [illegible] ذاتی پسند کی بات اور ہے اور [illegible] سے بہت بڑا شاعر ہے۔"

اس مختصر اور مفید مضمون میں جو مطالب اور موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں [illegible] تنقیدی نظریوں اور ماخذ کے حوالوں کی روشنی میں [illegible] ایک تاب تحلیل دی جا سکتی ہے۔ اس مقالہ کا مرکزی خیال جدید شاعری ہے۔ یہاں مضمون نگار [illegible] غالب اور اقبال اس لیے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے پاس [illegible] عام آدمی کا غم درد اور انسانی زندگی کے مسائل و معاملات کی بازگشت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب، مادیت کے باوجود ان کی شاعری پر اثر انداز ہوگی اور یہ شاعری آج بھی اتنی ہی مقبول ہے اور [illegible] جتنی ان کے زمانے میں تھی۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی اہمیت و افادیت بڑھتی جا رہی ہے۔ غور کیجیے تو تقریباً یہی عناصر فیض کی شاعری میں بھی موجود ہیں۔ آپ کا انداز انسانی [illegible] ایک خوش حال مستقبل کی آرزو، معاصر حاضر کے ظلم و جبر کے خلاف پُر خلوص احتجاج، دل میں اتر جانے والے لہجے میں شاعری کا مستحکم جمالیاتی نظام، وارفتگی اور معصومیت والی فکر و نظر غالب دونوں سے قریب کر دیتی ہے۔ فیض کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ جوش اور فراق نہیں پیدا کر پائے۔ [illegible] کو صدمہ نہیں پہنچاتی۔ فن کا ایک نیا رنگ اور ماحول کی طرح ہمارے فکری اور جمالیاتی احساسات کو متاثر کرتی ہے۔ آفاقیت، سچائی، جمالیاتی اقدار اور خیال کو یکجا کرتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد سب سے بڑے شاعر ہونے کا تاج اگر کسی کے سر پر سجتا ہے تو وہ شاعر فیض ہیں۔ فیض جیسا کہ جوش ملیح آبادی نے [illegible] نے فیض سے بڑا شاعر قرار دیتے ہوئے [illegible] بنا دینا حقیقت ہے۔ ایک بنانے حقیقت۔"

اور اگر جوش کی فکر و نظر کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان دوستی اور زندگی کا جمال اور [illegible] جوش کی شاعری کے موضوعات میں شامل ہیں جن کی بنا پر جوش کی شاعری کو تنقید [illegible] جوش کی شاعری کی خصوصیات پر بحث کی گئی اور ادب میں موجود ہیں۔ [illegible] تم جوش کی شاعری میں ملتی ہیں۔ [illegible] ہے کہ فیض اور جوش دونوں بڑے شاعر ہیں اور دونوں کا ہم عصر ہے اور ایک دوسرے کے عقیدت مند ہیں۔ جس مقام پر فیض نے یہ کہا تھا:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اس مقام سے بہت پہلے جوش گزر چکے تھے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے دوسرے لوگوں کے لیے تھا جو شاعر بننے کی منزل میں ابھی تھے۔ جوش اس وقت تک شاعر انقلاب بن چکے تھے۔

جوش کہتے ہیں:

میری بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا
پڑھ کلمہ لا الٰہ الا انسان

....

مرکز ارض و سما غول نہ با ہے انساں
بس تجلی میں نقطۂ پرکار ہے انساں

....

بے شک انسان کا دشمن ہے خدا کا دشمن

. ...

مری عظمت بشر کو دعوت فو دت کے دم سے تھی
نہیں اب بیٹھنے کا، انساں کو انساں کر کے چھوڑوں گا

آل احمد سرور نے سچ لکھا ہے: "جوش سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں، سماجی ناہمواریوں کی [illegible] حالی [illegible] انسانیت کا ذکر [illegible] کی طرف اقدام، مولویوں کی ریاکاری، معاشرت میں روپے کی کارفرمائی برداشت نہ کر سکے اور چیخ اٹھے۔ جذبات کی شدت سے ان کی آواز میں گرج اور کڑک آ گئی اور غم و غصہ نے الفاظ کو شعلوں میں بدل دیا۔"

دوسرے عالم میں بھی دنیا سے میری جنگ ہے
تا بہ ثریا سے قدم بھی کم کروں تو ننگ ہے

....

کھیل اے نوع انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولاں ہے تو کیا

....

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر

اگر ادھر فیض کے پاس آزادی صبح تھی "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" اور جگر کی آزادی [illegible] دل کی [illegible] ہے تو ادھر جوش کی نظم "ماتم آزادی" تھی اور جس کے [illegible] لکھتے ہیں لوگ [illegible]۔

فیض جوش کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انھیں بھی سودا اور میر جیسا شاعر مانتے تھے۔ فیض کی کسی تحریر یا تقریر سے جوش کی [illegible] کا ثبوت نہیں ملتا۔ [illegible] فیض نے [illegible] اور جس کا عنوان "[illegible]" ہے [illegible] جوش کی [illegible]۔ فیض اور جوش معاصر تھے لیکن باہمی [illegible] جوش نے فیض کے حوالے سے [illegible] کے [illegible] سے [illegible] فیض [illegible] اپنے ایک خط میں [illegible] کرتے ہیں "[illegible]" اور [illegible] جوش نے [illegible]۔ اگرچہ ہم نے

تو تعجب ہوئی، یہ صدا آ چلی ہے کہ جو ہوا سو ہوا، اس کو بھی بھلا، اور جو ہونا ہے اس کا بھی بھلا۔ اپنوں اور پرایوں کی دوستی سے اتنا تو مجھ کو یقین ہو چکا ہے کہ ان رنجشوں سے کیا فکر کیجیے۔"

سرفراز اقبال نے "دامنِ یوسف" میں اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی مشاعرے میں جو ضیاء صاحب کے کسی وزیر کی صدارت میں منعقد ہوا تو بعض بکے ہوئے شاعروں نے وزیر کو خوش کرنے کے لیے جوش اور فیض کے خلاف بہت زہر اگلا تھا جس کی بہت اچھے انداز سے تردید کی گئی تھی۔

سید فیض محمد اقبال جعفری نے شاہد حسن جمال کی اس تحریر کو تسلیم کیا ہے کہ جس دن جوش کا انتقال ہوا اس دن فیض نے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی تھی، چنانچہ اس ملاقات کے دوران فیض نے ضیاء الحق سے پوچھا کہ وہ جوش کے جنازے میں شرکت کریں گے تو ضیاء الحق نے اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر کہا کہ وہ شرکت نہیں کر سکتے۔ اس وقت فیض نے جنرل ضیاء الحق سے کہا کہ آپ کو شرکت کرنی چاہیے کیوں کہ اب کوئی ایسا بڑا شاعر پاکستان کی زمین میں پیدا نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے اپنی کتاب "پس نوشت (جلد دوم)" میں شیخ منظور الٰہی کی خود نوشت "آدم کی بات" کے حوالے سے جوش کے جنازے کی روداد بیان کی ہے جس سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ اس دن فیض نے جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کی تھی۔ شیخ منظور الٰہی لکھتے ہیں:

> "وہ بڑا سرد دن تھا جب یہ خبر ملی کہ جوش صاحب انتقال کر گئے۔ کوئی تیس سوا سو لوگ تھے جب ایک کمرہ دالان کی صورت میں ہم میت لے کر چلے۔ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس وقت دیکھا تو اقبال دیتھیال فیض صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ تدفین کے بعد اپنے مسلک کے مطابق صف باندھے کھڑے تھے۔ فیض صاحب اس تقریب میں شامل ہو گئے۔ وہ صاحب صدر نے بھیجے ہوئے تھے"۔ (صفحہ 137)

ان تمام تحریروں اور بیانات سے یہ پتا چلتا ہے کہ فیض نے کبھی جوش کے متعلق منفی آرا نہیں دیں، بلکہ فیض کے انتقال کے بعد بعض فیضیوں نے جو "شاعرِ انقلاب" کی صداقت کو اپنے سے زیادہ کا حقدار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، شاید اسی بات کو دیکھتے ہوئے جوش یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ملک بھر کی معروف ادبی شخصیات پر مشتمل ایک سوال نامہ جو مختلف ادیبوں اور دانش وروں کو بھیجا تھا، اس کا پہلا سوال یہی تھا کہ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش سب سے بڑے اور عظیم شاعر ہیں؟ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان افراد نے خاطر خواہ جواب نہیں دیا بلکہ اکثر دانش وروں نے دوسرے سوالوں کے جوابات میں اپنے نقطۂ نظر سے دوسرے جوش کو سب سے بڑا شاعر قرار دیا اس کے لیے آپ جوش صاحب کا کلام جدید شعرا کے مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں۔ جوش یا فیض کے مضمون نگار شخصوں نے فیض کو جوش سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ ان کے مضمون کے اقتباسات سے آپ جوش کی بڑائی کا نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ یقیناً جوش کی شاعری کو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا ہے۔

بڑا غم اس صدی میں کم از کم 1955ء تک جوش اردو شاعری کے افق پر سب سے زیادہ چمک دار ستارہ رہے اور بعد والے شعرا بھی جوش کے اثر سے بچ نہ سکے اور اگر بیسویں صدی 1955ء تک ہی میں ختم ہو گئی ہوتی تو شاید جوش کو اقبال کے بعد کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لینے میں مطلق تکلف نہ ہوتا۔ لیکن اس صدی کے نصف دوم میں اردو ادب و شاعری میں جو انقلابی تبدیلیاں آئیں، نئے رجحانات پیدا ہوئے، فکر کے نئے زاویے قائم ہوئے اور اظہار و اسلوب کی نئی جہتیں پیدا ہوئیں، ان کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہنا سخت مشکل ہو گا کہ اقبال کے بعد جوش ہی اس صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

جوش کے عہد آفریں بڑے شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ ان کی شاعرانہ توانائی اور قدرتِ کلام سے ان کے مخالفین بھی انکار

نہیں کرتے۔ اقبال اور اکبر کو چھوڑ کر اس عہد میں جتنا بڑا ذخیرۂ الفاظ جوش کے پاس تھا وہ نظیر زمانی کو چھوڑ کر کسی دوسرے شاعر کے پاس نکلے تو نکلے۔ وہ اس ذخیرے کو جس طرح چاہتے تھے، جامعیت و بلاغت کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے۔ لفظوں سے بیاہ نہار رچا سکتے تھے، سامعین کو حیرت زدہ بلکہ دہشت زدہ کر سکتے تھے، رومانی اور جمالیاتی شاعری سے دادِ سخن کا انبار لوٹ سکتے تھے مگر وہ جو شاعری کی اعلیٰ ترین صفات ہوتی ہیں اور جو قاری کو لفظی حد کے اس طرف کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہیں، جس میں گہری معنویت اور تہداری ہوتی ہے اور جس کا اثر دیر تک دل و دماغ پر رہتا ہے، ان صفات کا جوش کے یہاں نسبتاً کم اندراج ملتا ہے۔

بالخصوص جوش اس عہد کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کے دامن کو وسعت دی ہے۔ اس کو طرزِ ادا کی نئی سمتوں سے روشناس کرایا ہے۔ مرثیہ اور رباعیات بھی دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ سے شاعری میں کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی رباعیات کا تو معاصر اردو شاعری میں جواب ہی نہیں ہے۔ فراق، امجد، جاں نثار اختر سب کی رباعیات اپنی جگہ خوب صورت اور منظم ہونے کے باوجود جوش کی رباعیات کے مقابلے میں کم تر ٹھہرتی ہیں۔

فیض 23 مئی 1952 کو حیدرآباد سنٹرل جیل سے اپنی بیوی ایلس کو لکھتے ہیں: "تمھیں لگا ہو گا کہ میں اداس ہوں۔ شاید یہ درست ہو کہ کچھ جا رہا ہے لیکن یہ لکھنے سے بہتر ہے۔ چونکہ اپنی مرضی یا ارادے سے تو شعر نہیں لکھا جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور جب تک سب درست نہ ہو کام نکالنا دشوار ہے۔ غالباً یہی وقت ہم جیسے دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو بھی پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ ہمارے سامنے اپنی بہترین تخلیق اور استادی کی نظیر ہیں۔ خود جوش کے لیے کسی نے کیا خوب کہا ہے "من آنم کہ من دانم"۔"

آخر میں اس گفتگو کو سردار جعفری کے مضمون "لکھنؤ کی ایک رات" کے چند جملوں پر ختم کرتے ہیں: "وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر 1941 کا مہینہ تھا۔ ہم آل انڈیا ریڈیو سے پنڈت رفیع کا مشاعرہ پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ صدارت کے فرائض شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے انجام دیے۔ آج نوجوان کے نظم سنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ عمر ترقی پسند شاعروں کا کلام سنتے آئے تھے:

جوش کی بحثِ صدارت میں نہیں دیکھی دلکر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

☆

فیض اور بادہ و ساغر

غالب نے بے شک یہ شعر تصوف اور مشاہدۂ حق کے لیے ہی کہا تھا جس کا معروف مصرع یہ ہے:

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن خود غالب کے کلام میں بادہ نوشی اور مے کشی کے بارے میں لطیف اور نادر مضامین ملتے ہیں جنھیں شرابِ طہور، شرابِ تصوف اور شرابِ عشق سے کوئی تعلق نہیں۔ غالب ایک قصیدے کی تشبیب میں، جو انگریز ریذیڈنٹ کی مدح میں ہے، مے نوشی کی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

بے مے کسے ز کلبۂ من ماجرا مجو
سرد است ہوا آتش بے دود گوئی

(بغیر شراب کے عالم میرے ہاتھ میں نہیں چلتا۔ موسم خنک ہے، دستانے نہیں؛ دھویں کی آگ تو کہاں ہے)

باید کہ صراحی بود آتش ہمہ
تا ناخن ما روئی دہد ذوق لالئی

(صراحی تو ہو جیسے شراب سے گل دار ہے (بھری رہے) تاکہ پینے والے کے ناخن سے ادا ہو مضامین نکلیں)

یہی نہیں بلکہ غالب نے بادہ و ساغر اور شیشہ کو دوسرے مطالب میں بھی استعمال کیا ہے: چنانچہ آثار الصنادید کو جو قصیدہ میں [illegible] شعر لکھے اس کے ایک شعر کا ترجمہ ہے: "بغیر معانی کے حروف الفاظ کا ذخیرہ ہے یا بادہ بے [illegible] سادہ ساغر پیش کیے گئے ہیں"۔

گفتہ را از معنی خالی اگر فزوہ ام ہست آن
بادہ نیم شیشہ و ساغر مہیا کردہ است

عمر خیام کی اس شاعری اور رباعی سے ہم واقف ہیں جس میں وہ خالی ساغر کو زمین پر پھینک کر توڑ دیتا ہے یا غالب نے اس منظر کو بہت پہلے کہہ دیا ہے کہ غالب بادہ دولت کے گھر دور رہے ہیں جنھیں شراب سے محروم ہوئی ہیں جس کا اثر نشہ اور خمار ان کے نطق پر [illegible] سے لگتا ہے۔ لیکن اس واقعہ کو ہم نے کئی صورتوں میں بھی دیکھا ہے کہ شرابی خالی شیشہ یا ساغر پسند نہیں کرتا اور اسے غصے میں توڑ دیتا ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ شاعروں نے رندی کے ان خوبصورت پہلوؤں کو بھی نظم کیا ہے جسے [illegible] کہتے ہیں [illegible] سے ساغر کی شراب [illegible] پیدا ہوتی ہے۔ فیض بھی اس آواز اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت سے واقف تھے جس کا اس تجربے اُن کے تخیل میں جا بجا سے [illegible] کی ایک مثال شاید یہ ہے۔

"دستِ تہِ سنگ" میں ایک نظم "پاس رہو" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ اس نظم میں ہر زاویۂ نگاہ سے رات کی تاریکی میں ان تمام چیزوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے ذہن کا تعلق تو شام، صبح، شب سے رکھنے سے ہے۔ پوری نظم منظر نگاری کا کرشمہ ہے اور قوتِ سامعہ کا نمونہ ہے۔ اگر چہ قوتِ شامہ، قوتِ لامسہ اور ذائقہ کے نمونے بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ نظم "جس گھڑی رات چلے" سے شروع ہو کر "مرے پاس رہو" پر ختم ہوتی ہے جس میں شاعر نے اپنے محبوب کو قریب سے مخاطب کیا ہے۔

جب شراب صراحی سے انڈیلی جاتی ہے تو وہ چھلکتی ہوئی بچے کی طرح آواز کرتی ہوئی لگتی ہے۔

اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقلِ مے
پھر نا آسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے

نظم کے مصرعوں اور فقروں میں آواز کی جھنکار اور خوشبو کی پھوار دیکھیے:

جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کی کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی ماتمی سنسان سیہ رات چلے
میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو

فیض کی ایک غزل جس کا مطلع ہے:

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

اس میں بھی مضمون یعنی شراب اور ساغر کو بہت ہی خوب صورت طرح سے باندھا ہے۔ یہاں استعاروں کی معنوی مشابہت کی گہرائی اور خیال کی ندرت اس شعر کو کمال دیتی ہے:

بامِ مینا سے ماہتاب اترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے

جب صراحی کے سرے سے شراب ساغر میں ڈالی جاتی ہے تو وہ سیال سفید چھوٹے چھوٹے دائروں کی شکل میں اس طرح لگتی ہے جیسے صراحی کی چھت سے چاند زمین کی جانب اتر رہا ہے۔ چونکہ جب ساقی کے ہاتھ کا بلوری جام سرخ شراب سے بھر جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کے ہاتھ میں آفتاب آ گیا ہے۔ اس شعر میں ماہتاب، آفتاب اور بامِ مینا استعاروں کی صورت میں آئے ہیں۔ چھوٹی بحر میں ایسے خوبصورت و بے مثال شعر کہنا فیض کا ہی کمال ہے۔

فیض نے اکثر غزلوں، نظموں اور قطعوں میں شراب، مینا، ساغر اور قلقلِ مے جیسے متعلقات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ مجاز لکھنوی کی شاہکار غزل کے بعد ترقی پسند شاعروں نے ان قدیم علامات میں نئے اشعار اور معنی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکے ترے عارض کے گلاب اور زیادہ

فیض نے "دستِ تہِ سنگ" کی غزل میں حُسن کو یوں دو آتشہ کیا ہے:

چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

فیض نے غزل کے مطلع میں شیشے اور جام کو بُجھا کر نئی قدروں کو آگ لگا دی۔ بہرحال شاعری کی شریعت میں معنی تہ در تہ اور نئے انداز سے نکالنے کا ہنر مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بُجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بُجھ گئے ہیں

....

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا

فیض نے نظم "منظر" کے منظر کو شراب، جام اور صراحی سے متحرک اور رنگین بنا دیا۔

بہت آہستہ بہت ہلکا، خنک رنگ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

فیض کی "دستِ صبا" کی مشہور اور طویل نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" کی پوری بنیادی مرکزیت شیشے، جام اور شراب کی علامات سے حاصل کی گئی ہے۔

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

....

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

....

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب داماں پُر ہو سکتے ہیں

....

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

الغرض ہم نے طویل نظم کے چند اقتباسات پیش کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ قدیم غزل کے مے، ساغر، مینا اور خرابات کے ظروف سے ذہن رنگ کا مضمون تھا، اسی رنگ میں ڈھلتے ہی کامیاب تخلیق بنی فیض کی شاعری کی شناخت ہے۔ یہ بھی بتایا ہے جو فیض سے فرسودہ امداد بیسویں صدی میں فیض کی عطا پر ختم بھی ہو گیا۔

فیض نے مختصر شعری ذخیرہ میں ان علامتوں کا جگہ جگہ مختلف پیکروں کی صورت میں ذکر اور اظہار یہ رواج چلتا ہے جس کا مختصر تذکرہ اس مختصر تحریر میں ممکن نہیں۔ ہم یہاں صرف چند مصرعوں اور شعروں کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں:

ساقی رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت

.. ..

نہ گل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

....

یارانِ آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

....

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر

جب ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کے قلم کو حکومت نے تحریر میں خاموش کر دیا تو کہا:

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

....

مطلوب نگاہاں ہے تو بے یقینی محفل مے گساراں ہے تو بے حس
نہ وہ صبح ورد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

....

یار اغیار ہو گئے ہیں
اور اغیار مُصر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے ہیں
اب کوئی ندیمِ باصفا نہیں
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں

....

لب پہ ہے تلخیِ ایام ورنہ فیض
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

....

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے

سجاد ظہیر کے نام ان کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا اس میں بھی کچھ علامات مرموز ہیں:

سحر قریب اب آئی کے جام ساقی
کریں اہتمام دور جام ساقی
بساط بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمع محفل بزم والو
پیو اب ایک جام الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

ہم اس مجموعے کو فیض کی آخری غزل ہو نومبر 1984ء کے آخری شعر پر ختم کرتے ہیں، اس کا مصرع ثانی غالب کے شعر سے لیا گیا ہے:

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
(غالب)

....

سجاؤ بزم غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
(فیض)

☆

فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام

(منصفانہ تجزیہ)

دنیائے ادب کے شعرا کی طرح اردو ادب کے ہر شاعر کے کلام میں زبان اور بیان کی غلطیاں موجود ہیں۔ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا دیوان ہو یا اردو شعرا کے باوا آدم ولی دکنی کا کلیات، سب عروض کے قلم زد ہوئے ہیں۔ اردو کے خدائے سخن میر تقی میر سے لے کر موجودہ عہد تک اس فن کے نقص سے جلوہ گر ہیں۔ اگر میر کے چھ دیوانوں میں بہت سے پست اشعار ہیں تو بے دردی ہو تو اس سے میر کی نرگسیت ثابت ہوتی ہے۔ اگر میر انیس کے مرثیوں کی اغلاط کو کوئی چھانٹ کر نکالے تو ایک الگ کتاب تیار ہو سکتی ہے، تو اس پر کتنے لوگوں نے توجہ کی۔ کیا ہم نے غالب اور مصحفی کی معرکہ آرائی کی داستان نہیں سنی۔ علامہ محمد اقبال جو بظاہر اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے تھے لیکن جو شخص بھی ان کے کلام پر زبان و بیان کے حوالے سے بات کرتا تو انھیں بخشتے نہ تھے۔ بانگِ درا میں مطبوعہ نظم کے اشعار آج بھی بلند آواز میں ردیف و قافیہ کا پتا دیتے ہیں۔ کلامِ خالق اور مخلوق کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک اغلاط سے پاک اور دوسرا نقص سے مجبور۔ فیض کی شاعری بھی اغلاط اور اسقام سے پاک نہیں۔ ان کے کلام میں زبان، بیان، محاورے، الفاظ، تراکیب اور قوافی کی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ بعض لوگوں نے فیض کی شاعری کی زبان میں الفاظ کے ذخیرے کی محدودیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ فیض کے کلام کے سلسلے میں بعض لوگوں نے مبالغہ اور بعض لوگوں نے معاندانہ رویے سے نقصان پہنچایا ہے۔ ایک طرف یہ حد سے زیادہ جو ظ۔ انصاری بیان کرتے ہیں وہ عبرت آمیز ہے:

''سنہ 197ء کی بات ہے۔ فیض ماسکو آنے والے تھے۔ ان سے پہلے تازہ مجموعۂ کلام پہنچا 'سرِ وادیٔ سینا'۔ شب تک میں تمام دیکھ لیں: کئی بار وہ غالب کی طرز کی ترکیب اپنائے ہیں: ''نکہتِ فریادی''، ''دستِ صبا''، ''نشہ جب تک'' کے بعد انھوں نے یہ مصرع دیکھیں تو: (غالب نے اپنے زمانے کے کوٹ پہ ''نکالا تھا'') کا حساب برابر ہے۔ سوئی خالی کا نام لکھ کر میں حیران ہوا (اور خود موضوع بھی) آگے اس پر بے دھڑک شعر کا صرف تین شعر:

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمھاری
ہر سادہ ورق، جس سخن کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمد صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمھیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

کیا ہوا اگر ان چھ مصرعوں کا مضمون لے گئے کے دوسرے شاعر نے بھی باندھا ہے۔ لیکن ایک نظر ہی میں سب سے آنکھیں کی راہ
ہیں ہیں ہو گئے ہو رہے ہیں۔ آج اس نظم کی ہیں بعد کی ... زبان کی لذت، بیان کی ندرت، ان کی ... کی کیفیت، ان کی زندگی کی
انفرادی انداز کی ہے جو ہو سکتی ہے جو ... ہوئی ہے"۔

دوسری طرف رشید حسن خاں صاحب کی یہ رائے ملاحظہ ہو جو یہ لکھتے ہیں کہ "فیض اردو شاعری کے مزاج شناس سمجھے جاتے ہیں اور
اردو کی تہذیب ہیں تو فیض کے کلام پر ... ادب ... نے ان میں ... مثالیں ہیں تعریف کرتے ان کے کلام میں بھی زبان اور
بیان کی خامیاں ہی ہے لیکن بعض ناقدین ادب نے تعریف کے ساتھ کم اور اصلاح کی طرف توجہ زیادہ کی ہے جس پر خود فیض نے توجہ نہ
کی۔ ان میں ... علی خاں اثر، کلیم الدین احمد، علامہ ... مجنوں گورکھ پوری، ... ماہر القادری، ... صدیقی اور ... رشید حسن خاں
وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔ ہم اس تحریر میں ان کے اقتباسات اور اعتراضات کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات اور ان کے جوابات ساتھ ساتھ
پیش کریں گے۔

کلیم الدین احمد نے اپنے طویل مضمون "فیض" میں جہاں کئی مقامات پر فیض کی شاعری کو سراہا اور دوسرے ترقی پسند شعرا کی
انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کئی مقامات پر فیض کی شاعری میں فکر و خیال اور مضمون کی کمزوریاں دکھانے کی کوشش کی ہے
شاید یہ نظم جو انھیں پسند ہے دوسرے کے لیے ... ہو اور یہی ان کی ... ہے۔ لکھتے ہیں:

"فیض نے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور "رقیب سے" ... میں بھی اشارہ کیا ہے۔

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

"موضوعِ سخن" میں کہتے ہیں:

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

یہ دونوں انھیں انتہائی متضاد خیالات ... لگتی ہے اور وہ ان انھیں سے ... کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری
ترقی رک گئی ہے اور ان کی شاعری کے چشمے کا پانی ... ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کشمکش میں فیض کا فیصلہ ... ہی ... طرف ہے۔ وہ کہتے تو ہیں کہ زمانے میں محبت
کے سوا بھی دکھ ہیں اور وصل کی راحت کے سوا اور بھی راحتیں ہیں اور یہ ان کی فکری پہچان ہے لیکن ... ان کا ذہن بار بار
اسی طرف کھنچتا ہے۔ "موضوعِ سخن" میں وہ لکھتے ہیں:

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

...

یہ اک اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

ان دونوں ٹکڑوں کو غور سے پڑھیے، پہلی مثال میں شعریت کا عنصر وہ غالب سا ہے لیکن موجود ہے۔ دوسری مثال میں یہ بات نہیں۔ فیض شعوری طور پر ترقی پسند ہیں۔ مارکسی خیالات کو اپناتے ہیں، کہتے ہیں: "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔" فیض نے اس جدوجہد میں "حسبِ توفیق" شرکت کی ہے۔ لیکن یہ شرکت فن کا تقاضا نہیں اور اس شرکت کی وجہ سے اُن کے فن میں کوئی گہرائی نہیں آئی ہے۔ ان کے فن پر پردہ پڑتا چلا گیا ہے۔

مشکل یہ آ پڑی ہے کہ فیض شعوری طور پر مارکسی شاعر بننا چاہتے ہیں اور غیر شعوری طور پر جذبات انہیں کسی دوسری سمت لے جاتا ہے۔ اُن کے شعور اور تحت الشعور میں ایک قسم کا تصادم ہوتا ہے اور اس تصادم کا اثر اُن کی شاعری پر اچھا نہیں پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری "شکستِ زنداں" "کتنے کم آب" تک ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دستِ صبا" کی نظموں میں کیفیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ "میرے ہمدم میرے دوست"، "دو آوازیں"، "تاریک گلیوں پہ" میں اچھی نظم بننے کے امکانات تھے۔ بعض بعض ٹکڑے اچھے بھی ہیں۔ لیکن پوری نظم میں بے کیفی سی رہ جاتی ہے۔ مثلاً "میرے ہمدم میرے دوست" اچھی طرح شروع ہوتی ہے۔

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی

لیکن آگے بات نہیں:

گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے

ان شعروں میں کوئی بھی خوبی نہیں، استعارے بھی غلط ملط ہو جاتے ہیں۔ حرفِ تسلی تو دوا ہو سکتا ہے جس سے بیمار جوانی کو شفا ہو جائے لیکن اس دوا سے تذلیل کے داغ بھی دُھل جاتے ہیں، اجڑا ہوا دماغ جی اٹھتا ہے اور بے نور دماغ منور ہو جاتا ہے۔ دوا ایک استعارہ ہے۔ "اجڑا، بے نور، دماغ" دوسرے استعارے ہیں اور یہ سب بُری طرح غلط ملط ہو جاتے ہیں۔"

فیض کی شاہکار نظم "ایرانی طلبہ کے نام" جس کے بارے میں درجنوں ناقدوں نے اسے فیض کی عمدہ ترین نظموں میں شمار کر کے تعریفوں کے پُل باندھے ہیں، اس کی بابت کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

"نقش فریادی" کے دیباچہ میں فیض نے اعتراف کیا تھا: اب مضامین کے لیے تجسس کرنا پڑتا ہے۔" "دستِ صبا" میں یہ تجسس کی شکل صاف اُبھر آتی ہے۔ "ایرانی طلبہ کے نام" ایک نظم ہے، جس میں ترقی پسند موضوع ڈھونڈا گیا ہے اور اس میں فیض نے بڑی کاوش کی ہے اور ٹیکنیک کی خوبیاں بہم پہنچائی ہیں۔ اس لیے ایک ظاہری لفظی حُسن تو آ گیا ہے لیکن ان لفظوں میں زندگی کی، شاعری کی گرمی نہیں۔ حسین لیکن سرد اور بے جان سی چیز ہے۔

یہ ذہنی اُلجھن کا نتیجہ ہے کہ جب اُن کی بات اُٹھائی جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی رُکاوٹ ہے، ایسی زبردست رُکاوٹ ہے کہ اُس سے پیچھا چھڑوانا ممکن نہیں۔ اسی لیے باتیں اُکھڑی اُکھڑی ہوتی ہیں، آواز دبی دبی ہوتی ہے جیسے کوئی بھاری پتھر سینہ پر رکھا ہوا ہو "زنداں کی ایک شام" اور "زنداں کی ایک صبح" کو پڑھیے۔ اسی اندرونی رُکاوٹ کا احساس ہوتا ہے، گویا سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں اپنے چنگل سے شعر کی نازک پریوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور شعوری طور پر زور لگانا پڑتا ہے کہ اس چنگل کے دباؤ سے چھٹکارا ہو، یہ رُکاوٹ دُور ہو جائے، اسی شعوری کوشش، زور کی وجہ سے شعریت کا رس خطابت کی جھاگ سے بدل جاتا ہے۔

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بُجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں"

کلیم الدین احمد نے زنداں کی ایک شام میں گھٹن محسوس کی ہے جو نظم کے مضمون کے برعکس ہے شاعر تو شام کے پیچ و خم ستاروں کے زینے سے رات کو زینہ زینہ اُترتا رہا ہے، جہاں جب صبا پاس سے گذرتی ہوئی پیار کی باتیں کرتی ہے جس میں اشجار دامن فلک پر نقش و نگار بنا رہے ہیں، اُفق پر چاندنی پھیل رہی ہے۔ یہ سب کیفیات دل کے دریچوں کو کھول رہی ہیں، یہاں کس کے سینے پر بھاری پتھر رکھا ہوا ہے اور یہ جنات کن پریوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ شاعر امیجری کو وسعت دے کر کہتا ہے:

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بُجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں!

کیا اس سے بہتر رجائیت اور عزم اور زندگی کا مضمون ہو سکتا ہے۔ ایسے نقد کو کیا کرے کوئی جو اس طرح سے اشعار کا تجزیہ کرے اور ادبی دُنیا خاموش رہے۔

نظیر صدیقی اپنے ایک مضمون "فیض اور فیض کی ترقی پسندی سے بغاوت تک" میں لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری پر اردو کے نئے ممتاز نقادوں نے آنکھیں بند کر کے اور دل کھول کے اس کی داد بھی دے چکے ہیں..... بعض اوقات مجھے یہ وسوسہ بھی ہوتا ہے کہ فیض کی مقبولیت میں ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہم اردو والوں کی اس کمزوری کو بھی دخل ہے جس کا نام تغزل ہے۔"

نظیر صدیقی آگے کہا ہے:

"سجاد ظہیر نے زنداں نامہ کی نظم "ملاقات" کی بڑی تعریف کی ہے۔ فیض کے بعض اور نقادوں نے بھی اس نظم کو پسند کیا ہے لیکن مجھے اس نظم میں بڑا ابہام نظر آتا ہے اور اس کا ایک سبب تو یہ ہے جو مجھے سمجھ میں آ سکا ہے۔ اس نظم کے کئی مصرعے ادھورے رہ جاتے ہیں جیسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً:

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو چکے ہیں
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
الم نصیبوں ، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے

ہیئت کے اس مبہم تجربے کا جواز یہ ہے کہ شاعری میں موجود ہے لیکن معاملہ اس تجربے کو کامیاب کرنے سے قاصر ہے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ فیض نے یہ نظم اس طرح نہیں لکھی ہوگی جس طرح کتاب میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعض مصرعے چار رکن کے ہیں اور بعض تین کے۔ کاتب نے غلطی سے ہر مصرعے کو دو رکن کا مصرعہ بنا دیا ہے۔ مثلاً اس نظم کے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ چھ رکن کا ہے اور اسے یوں لکھا جانا چاہیے تھا:

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں لاکھ مشعل بکف ستاروں کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں۔

اگر یہ توجیہ صحیح ہے کہ تو اس نظم کی ہیئت پر میرا اعتراض ختم ہو جاتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ فیض کی تصنیف میں کتابت کی ایسی غلطی ممکن نہیں۔ اس نظم کی سب سے نمایاں ہیئت فیض کی ہیئت کے بجائے کاتب کی ہیئت ہے"۔

یہاں نظیر صدیقی کا اعتراض صحیح ہے۔ اس قسم کے ابہام فیض نے دوسری نظموں میں بھی کیے ہیں۔

"فیض ان شاعروں میں سے ہیں جو اپنی فکری حیثیت سے مدح کے بجائے کمال کے ادراک میں واقع ہوئے ہیں۔ یہ بات بھی کچھ کم افسوسناک نہیں کہ فیض کے نقاد عام طور پر ان کی شاعری کے نقائص اور معائب کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے۔ اشارہ تو ایک طرف وہ دبی زبان سے بھی اس کا اعتراف تک نہیں کرتے کہ فیض کی شاعری میں قدم قدم پر زبان، بیان اور فن کی غلطیاں ملتی ہیں۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کا فرض تو صرف زیادہ تر اگر کسی نے کسی حد تک انجام دیا ہے تو ان نقادوں نے جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں۔ مثلاً نیاز فتح

یوں نے ''نگار'' کے ایک پرچے میں فیض کی دو تین غزلیں شائع کی تھیں اور ساتھ نوٹ میں ان غزلوں کی لفظی غلطیوں کی طرف فیض کی توجہ دلائی تھی''۔

نظیر صدیقی نے ظفر علی خان، اثر، رشید حسن خان اور دوسرے ناقدین کے جمع کیے ہوئے اعتراضات کا حوالہ دے کر لکھا:

''فیض کی تیس چالیس برس کی پیداوار میں چند مثالیں سرسری طور پر دیکھی جائیں تو ان سے بحث کی گئی ہے۔ اگر ہر مجموعے کی ہر نظم اور ہر غزل پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو ان کے اغلاط و اسقام کی فہرست ایک طویل مقالے کی شکل اختیار کر لے گی۔ یہ صورت حال کیوں واقع ہے کہ فیض کی اہم سے اہم نظم اور اچھی سے اچھی غزل بھی بے داغ نظر نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ بیان و فصاحت کے اصول بہت نازک ہیں، لیکن بڑے فن کار کا کمال اسی میں ہے کہ وہ ان اصولوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی شعر گوئی کو درجۂ کمال تک پہنچا دے۔

اب اردو زبان سے تعلق رکھنے والوں کو فن کی تحقیق و تکمیل میں زیادہ تر ریاضت و کاوش سے کام لینا چاہیے تھا لیکن موجودہ اردو ادب میں صورت حال برعکس ہے۔ یہاں بے اصولی اور اجتہادی جذبے کا زور ہے اور بے اصولی ہی کی حمایت کی جا رہی ہے بلکہ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے شاعروں کی بے اصولی اور بے راہ روی کو نقادوں کے گروہ کے اور فیصلے کی سند بھی مل جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ان کا کہنا تو یہ ہے۔ مگر ابھی فیض جیسے شاعر کو ایسی غلطیوں سے بچنا چاہیے تھا۔ تعجب ہے کہ ہمارے معاصرین ان اغلاط کا نوٹس نہیں لیتے ہیں۔ فن کے معاملے میں ان کی بے احتیاطی باقی رہی تو آئندہ نسلوں کے لیے ان کی حیثیت مثال سے زیادہ عبرت کی ہوگی''۔

ظفر اقبال ''فیض کی شاعری'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیض کی شہرت اور شاعری نے شاعری کے متعلق اس کے قارئین کے ذہنوں کا احاطہ کر رکھا ہے..... فیض تمام تر مقبولیت اور اہمیت کے باوجود فیض کی شاعری یک رنگی ہے۔ اس میں یکسانیت اور ایک ہی موضوع کی تکرار ہے لیکن گہرائی مفقود ہے۔ وہ رقت کا عمل اور محبت کا منظر کر سکتی ہے...... اس نے شاعری کی فرسودہ ڈگر پر چلنا سیکھا۔ فیض نے اپنی شاعری کو جس طرح اس سے الگ طور پر محروم رکھا ہے..... فیض کی شاعری آج بھی اچھی لگتی ہے اسے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ سب سے زیادہ خطرناک بات ہے جو کسی شاعری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے''۔

اس موقع پر ہم صرف ان غلطیوں پر غور و خوض اور نکتہ گیری کے لیے اہل علم اور فکر جلیل کی توجہ دلاتے ہیں۔ فیض نے کہا تھا:

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

انور سدید اپنے مضمون ''فیض کی غزل'' میں فیض کی ان مسامحتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

الف۔ محمد حسین شعر میں ''کر دو نذر'' کی ترکیب ہے جو درست نہیں:

کتنے ہی بل ابھی باقی ہیں ہمارے لیے بھی تری سرکشی سے ہم
ہاتھ بھی ہم کو کراب اپنے مقابل ہی پڑا لے جائیں گے

(احتراضِ نبیجہ بے تُکی نا بندی)

ب۔ مندرجہ ذیل شعر میں تنافر یا عیب ہے

تجھ بنا اب ہم بیٹھے ہیں
آپ اپنی حرم کی بات کرو

(اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

ج: بعض جگہ تعقید کا عیب ملتا ہے یعنی مثلاً آزادی اور سولہ غزل والی نظم میں بے ترتیبی موجود ہے۔ مثلاً

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

"آئیں گے چلے" کے بجائے "چلے آئیں گے" زیادہ فطری انداز ہے۔ (یہ بے جا اعتراض ہے۔ کوئی ضرورت نہیں۔ سید تقی عابدی)

د: بعض اشعار میں ابہام و غموض بھی رکھا گیا ہے۔ مثلاً

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

ہونٹوں کو سرخی کی بنا پر شفق سے تشبیہ دینا بالکل درست ہے مگر آنکھوں کو چاند سے کیا مناسبت ہے۔ آنکھوں کو جام کہا جا سکتا ہے۔ (جام دیکھے تری آنکھوں میں) اور چہرے کو چاند کہنا درست ہے۔ (چاند دیکھا ترے چہرے پہ) (اعتراض غلط نظر آتا ہے۔ سید تقی عابدی)

ہ: بعض جگہ لایعنی اضافات کا وجود ہے۔ مثلاً

گر لطف بہ من تو خود کا دیت مرہم
کہ یہ کہنہ جہ خوبی نسخ اوقات تھے

یہاں چار اضافتیں مسلسل آ گئی ہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہیں۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

سجاد ظہیر صاحب نے اس شعر کی بہت تعریف کی ہے اور لکھتے ہیں:

"اس کی داد تو فیض یا مرزا نوشہ ہی کے لیے جنھوں نے علم و ایمان اثر اللہ ہے" (زنداں نامہ دیباچہ صفحہ 77)

ممکن ہے کہ سجاد ظہیر یا مرزا نوشہ اس شعر کی داد دیتے مگر جناب یہ نہیں کہ مرزا نوشہ اس شعر کی داد کے قائل تھے۔

سجاد ظہیر "زنداں نامہ" کے پیش منظر میں "روداد قفس" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری میں ایک محبِ وطن کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑکتا ہے۔ لیکن اس کے قیام میں پاکستان کے محنت کشوں کا وہ بلک پسینا اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل نہیں ہے۔ ان کی شاعری کو "زرنگ رودوں" محلوں اور ایوانوں سے نکل کر سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے"۔

فیض کی نظم "صبح آزادی" پر اعتراض کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا تھا کہ یہ بات تو مسلم لیگ اور جماعت اسلامی والے بھی کہہ سکتے ہیں۔ فیض کو چاہیے تھا کہ ان کا مقصود جس سحر سے ہے اس کی طرف واضح اشارہ کرتے۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ فیض نے بھی اس آزادی سے خوش ہو کر نہیں لکھا تھا۔

گلزار کہیں سے وجہِ کے رنگ ہی بہار ہے

ماہر القادری "فیض کی شاعری اور زبان و بیان" میں لکھتے ہیں:

"ایک دعوت میں زبان و بیان کا ذکر چھڑا تو فیض صاحب نے کہا کہ 'ہم لوگ زبان و بیان کی پروا نہیں کرتے'۔ ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی!"

قادری صاحب نے تقریباً پچیس اشعار کا حوالہ دے کر ان پر زیادہ تر بیان اور زبان کے اعتراضات کیے ہیں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کر کے صرف شمارہ میں اپنی رائے بھی دیں گے

1) اسی منظرِ تبسم کی فراوانی کو
باصبر دیکھ چکی یار کو گرد بتا تھا

تبسم کی فراوانی کیا ہوتی ہے؟ پھر اس پر مستزاد "صبح دیپ"! اس شعر میں حرفِ جار (پ) اور زیادہ کھٹکتا ہے شعر کا مطلب کس قدر الجھ گیا ہے: (بادی النظر میں تو یہ کھٹکتا ہے اور شعر کے مفہوم میں الجھن ہے۔ خوش ذوقی شرط ہے۔ سید تقی عابدی)

2) خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں

زلفیں تو پریشان ہوا کرتی ہیں مگر "آنکھوں" کا رخ پہ پریشان ہونا پہلی بار پڑھنے میں آیا۔ پھر "عنبریں" آنکھوں کی کیا زلف و گیسو کی صفت ہے۔ اس لیے کہ زلفوں کا سیاہ اور خوشبودار ہونا زلفوں کی صفات میں داخل ہے۔ آنکھوں کا خوشبو سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے! (آنکھیں چار ہونی ہیں، فارسی کے طرز پر چشمِ پریشاں کا ذکر کیا ہے۔ مذاق شرط ہے۔ سید تقی عابدی)

3) چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بنِ مو سے
رواں ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم

شمیم (خوشبو) کے لیے "سیل" کا لفظ خوشبو کی لطافت پر بار ہے۔ "موجِ شمیم" کہنا تھا۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

4) چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

چشمِ میگوں کو عاشق کی طرف کر دینے سے دستِ قدرت کس طرح بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ مصرعِ ثانی میں شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واضح ہو کر نکل نہیں سکا۔ "معرفت" ہے جو موزوں الفاظ استعمال نہ ہونے کے سبب "ابہام" کی نذر ہو گئی ہے۔ (دستِ قدرت سے مراد گردشِ ایام ہے اور عاشق کے ہاتھ چشمِ میگوں سے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ تجربہ شرط ہے۔ سید تقی عابدی)

5) فیض صاحب کی مشہور نظم کا مصرع ہے کہ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

"محبت مانگ" ...... یہ زبان اور محاورہ کہاں ہے؟ بول کوئی نہیں کہتا کہ فلاں شخص نے فلاں شخص سے محبت مانگی ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے اور یہی مطلب نکلتا ہے... کہ میرے محبوب مجھ سے پہلی سی محبت کی امید نہ کر یا مجھ سے اب محبت اور وفا کا تقاضا نہ کر۔ (ادا "منگی" تلفظ کا اورد ہے "پہلی سی محبت" کا ہے۔ محبوب کے ساتھ ... اور ... ہے۔ فیض ایک جدید شاعر بھی تھے۔ سید تقی عابدی)

6) [illegible]

[illegible]

"[illegible]"

7) ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز

مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

"[illegible]"

8) [illegible]

[illegible]

رات کے تحت ... [illegible]

[illegible]

9) [illegible]

[illegible]

[illegible]

دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

[illegible]

[illegible]

اسی طرح: جو بھی نظر سے اپنا ... [illegible]

[illegible]

....

10) شوق کی راہ میں ... [illegible]

شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

[illegible]

11) تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام

"عکسِ رخِ یار" کا نتیجہ "چہکنا" ہوتا ہے نہ کہ "لہکنا"! ایام تو بولتے ہیں کہ بہار لہک رہا ہے... مگر اس طرح کون بولتا ہے کہ دن اور راتیں لہک رہی ہیں؟ (انگریزی شاعری کا اثر ہے۔ بعض ناقدوں نے تحسین قرار دیا ہے۔ سید تقی عابدی)

12) صد ناز سے اترا کرتی ہے
صہبائے غمِ جاناں کی پری

"بصد ناز" کہنا چاہیے تھا! (مطلب ادا ہو گیا، قباحت نہیں۔ سید تقی عابدی)

13) پھر نادانوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ مہمان کون ہے؟ یہ معلوم ہوتا ہے جس بے چارے کا "شہپر" توڑ دیا گیا۔ (علامتی شاعری میں ہوتا ہے اگرچہ مفہوم نہیں۔ سید تقی عابدی)

14) بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

"درد کا چاند" کیا ہوتا ہے۔ پھر چاند کے ڈوب جانے کو "بجھنا" نہیں کہتے۔ (درست ہے، مگر تخئیل میں کئی اور شعری لطف میں زیادتی ہو گئی ہے۔ سید تقی عابدی)

15) ایک نظم ہے "ملاقات"، اس کے چند مصرعے یہ ہیں:

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

رات کسی درد کا شجر بھی ہوتی ہے!! یا للعجب! پھر ہزار مہتابوں کا "نور رونا" اس سے بھی عجیب تر۔ نور تو خرچ کرتے ہیں، "نور رونا" کون بولتا ہے؟ (ہم عصر شاعری کو منطق کی کسوٹی پر کس نہیں سکتے۔ سید تقی عابدی)

16) سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

1۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

2۔ [illegible]

[illegible]

(اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

3۔ کرے کوئی تیغ کا نظارا اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

پہلے مصرع میں لفظ "اُن" کے بدلے لفظ "اُس" چاہیے۔ قاتل کو اُن کوئی نہیں کہتا۔ علاوہ بریں جسم و تن میں لفظ جسم یا تن حشو قبیح ہے اور خیال میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ: بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جائے تن سے پہلے۔ زبان میں جسم و جان ہے یا جان و تن نہ کہ جسم و تن۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

4۔ اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

لفظ تقاضا کی تکرار بدنما ہے۔ مصرع یوں ہو سکتا تھا: (تکرار میں حسن ہے ورنہ مصرع اثر کا ہو جاتا۔ سید تقی عابدی)

مآل بیں مصلحت اُدھر ہے اِدھر تقاضا ہے دردِ دل کا

5۔ ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

حدیث کرنا زبان نہیں۔ بار بار کی تکرار بھی نامطبوع۔ (بار بار تو زبان پر بار نہیں مگر حدیث کرنا ٹکسالی نہیں پنجابی ہے۔ سید تقی عابدی)

6۔ انھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

معلوم نہیں ہوتا کہ فیض تخلص ہے یا اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ امر شاعری میں ہمیشہ معیوب سمجھا گیا ہے جب تک مومن کی طرح تخلص ذو معنین نہ لایا جائے۔ (یہاں فیض تخلص کے طور پر آ ہی نہیں سکتا۔ فیض کے کلام میں بعض مقامات پر صنعتِ حسنِ تخلص ہے۔ سید تقی عابدی)

7۔ آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

گویا کے الف کا دبنا ذوقِ سماعت پر سخت گراں ہے۔ تکرار یہ عیب دور کر دیتی: بھولے تو یوں کہ جیسے اِن
(اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

8۔ گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے

لفظ خوبی حشو ہی نہیں بڑے بھدے طریقے سے استعمال ہوا ہے۔ محوِ مدحِ تیغِ ادا سے مطلب پورا ہو جاتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے: کیوں کر محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے۔ (شعر عمدہ ہے تیغ کی خوبی کی مدح اور بدی کی ہجو بھی ہو سکتی ہے۔ سید تقی عابدی)

9۔ ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

دُکھوں کا بہت، ہم پایا دوا ہوتا گیا۔ بہت کی جگہ کوئی بہتر ہوتا۔

ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

(اعتراض بجا ہے۔ سید تقی عابدی)

10۔ لب پہ ہے تلخیِ مئے ایام ورنہ فیض
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

"مئے ایام" عجیب۔ کاش پہلا مصرع اس طرح ہوتا: لب پہ ہے تلخ کامیِ ایام ورنہ فیض

(فیض کو بہ حیثیت شاعر اجتہاد کی اجازت حاصل ہے۔ سید تقی عابدی)

11۔ جس رنگ سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

دوسری جگہ بھی جان کے نون کا اعلان ہونا چاہیے۔ دل نہیں مانتا۔

یہ جان تو آنی جانی ہے آئی گئی کچھ بات نہیں

(جان کے نون کا اعلان ضروری۔ مگر آخر کا مصرع غیر ضروری ہے۔ سید تقی عابدی)

12۔ دل مدعی کا حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

معشوق کا نام مدعی کا حرفِ ملامت۔ اس میں جو ذم کے پہلو نکلتے ہیں، اُن کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور سب کچھ جانے دیجیے مومن کے اس شعر کے بعد یہ ہرگز مجموعہ میں شامل کرنے کے قابل نہ تھا۔ (غزل میں واسوخت نما شعر جدید شاعری میں ملتے ہیں۔ سید تقی عابدی)

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

13۔ پھر اور زہر ہم قافیہ۔ حالانکہ اُن کے اردو میں پھر بفتحِ اول و دوم ہے، اور زہر میں حرفِ دوم ساکن ہے۔ یہ عیبِ قافیہ ہے، اسی طرح ادا اور دوا کو ہم قافیہ کیا ہے، حالانکہ اُن کا ادا بالفتح ہے اور دوا بالضم۔

(اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

14۔ لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ

انگار بجائے انگارا۔ لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار۔ میرے کان آشنا نہیں۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

15۔ ناپید، تاکید، عید وغیرہ کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

شہر میں چاکِ گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

(اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

فیض کی شاعری پر سب سے زیادہ شدید اعتراضات رشید حسن خان نے کیے ہیں۔ یہ اعتراضات ان کے ذہنی جمود میں بعض سے اور کافی سرسری ہیں۔ اگر چہ ہمارے نزدیک محض شعری اعتراضات محض زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ان کا پیمانہ کا ... ہیں اور ان جذبے کے بجائے مضامین و الفاظ سے ہے طریقہ انہیں غیر منفعل فکر و نظر سے پرکھا جائے تو ان کی ناقص ... کرتے ہیں۔ ... کی طرح خود قبول نہیں کرتے۔ لکھتے ہیں:

"نقد و نظر کی بنیادی حیثیت سے دیکھا جائے تو فیض کی بڑی خوبی سے متعلق کچھ کہا جائے گا کہ ... خوش ادائی کی ... کی طرف ... جائے گی۔۔۔۔ یہ ان ... ایک نقص ... [illegible] ... کے بجائے ... کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری کے متعلق اب جو کچھ لکھا جائے گا اس کو ... کے ساتھ ... کا مستحق قرار دیا جائے گا۔"

ہمارے نقد و دانست میں ... [illegible] ... تخلیقی ... نظم ... طرح ... کر کے ... ہے اس پر ... کے ... ادبی ... سے ادب کے ... اصول ... آنے کا ... ہے۔ ... کے ... سے مرتب نہیں کرتے ... کلام ... کلام کو ... اور ... کرنے کے بعد ... صاف طور سے بیان کر دیئے ہیں۔ ... ایک فطری ... کا ایک پہاڑ کے ... پہاڑ ... ہے۔ ... ان کا ... رشید حسن خان کے ... فیض کی شاعری کے ... دیکھ ... لیا۔

رشید حسن خان فیض کے شعر سے استفادہ کر کے ... نقل کرتے ہیں:

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

رشید حسن خان لکھتے ہیں:

"ان کی شاعری کا بڑا حصہ ... آئینہ داری کرتا ہے۔۔۔۔ ان کی ... اور ... کے ... میں ... ہے ... کے ساتھ ... ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ... آواز ... مجموعہ بن جاتی ہے۔"

ہماری نگاہ میں ... اور ... کا ... صورت ... فیض کی شاعری ہے۔ اگر رشید حسن خان کو ... نظر آئے تو اس کا علاج ... کے پاس بھی نہیں۔

رشید حسن خان لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری کی اصل خوبی ان کا ... اظہار ہے جس میں تغزل کا رنگ و آہنگ ... ہوتا ہے ... ان کی شاعری کا ... ہے۔ تجربات کی ... اور ... کی ... کے اہم اجزا ہیں۔"

اس کے بعد ... فیض کی مختلف نظموں پر ... کرتے ہیں جیسے ... کی ایک ... میں مختلف ... کے ساتھ ...

گئے ہیں۔ ''تنہائی'' کا شمار اُن کی اچھی نظموں میں ہوتا ہے۔ ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' اوسط درجے کی نظم ہے۔ اس میں جوش و خروش اور زورِ بیان ہے مگر جذبے کی پیچیدگی اور احساس کی تہ داری سے یہ تہی داماں ہے۔ ''تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں'' بالکل سپاٹ ہے۔ نظم ''انتساب'' پر لکھتے ہیں:

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیِ ما سوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہیں

خاصی طویل نظم ہے۔ یہ محض سیاسی نعرے بازی ہے۔ ایسے مقامات پر وہ شاعر کے بجائے کم رتبہ سیاسی مقرر نظر آتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر شاعری میں عدمِ توازن کا نقش گہرا ہوتا رہتا ہے''۔

جو بات دبے لفظوں میں وزیر آغا نے ''فیض کے کلام میں ابہام'' کے ذیل میں کہی، جس چیز کو انیس ناگی نے معترضانہ طور پر بڑے شاعر کے المیہ میں بیان کیا، اُس کی جگالی بغیر کسی حوالے اور شہادت کے جوش صاحب کے کالموں کا سہارا لے کر خان صاحب نے اس طرح کی:

''جب خیالات میں تنوع نہیں رہتا تو کبھی کبھی الفاظ کی تعداد بڑھ جاتی ہے، یعنی الفاظ کی کثرت، خیالات کی کمی کا کفارہ ادا کرتی ہے۔ لفاظیت سے، مفہوم ذرا سا۔ جوش صاحب نے ایسی لفاظی کی بے شمار مثالیں اپنے مجموعوں میں محفوظ کر دی ہیں۔ فیض کے یہاں اس کی بدترین مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کی شاعری کی عمر جس قدر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس لفظی نمائش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس جھوٹی نمائش میں وہ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ اُن کو یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ خاص خاص لفظوں کا معنویت سے کچھ تعلق بھی ہے۔

فضول لفظ آرائی نے اُن کے کلام میں ایک اور خرابی پیدا کی ہے کہ بہت سے مقامات پر سادہ سی بات بڑے تکلف کے ساتھ کہی گئی ہے۔ سیدھی سی سامنے کی بات ہے لیکن غیر ضروری لفظوں کے پھندوں میں اس کو کسا گیا ہے، یا تعبیر میں کاواک پن اس طرح در آیا ہے کہ سادگی کی جگہ تکلف نے لے لی ہے بھدے پن کے ساتھ زبان و بیان کی جادوکاری اور کلام کی بے اثری میں بہت سے اضافے

اس طرح بھی ہوئے ہیں۔"

یہاں پر راقم اپنا موقف واضح کر دینا چاہتا ہے۔ بہ قول ع۔ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں" یہ دستاویز جس میں یہ مضمون بھی شامل ہے "فیض فہمی" ہے "فیض پرستی" نہیں، کیوں کہ "فیض پرستی" سے فیض کو "فیض دشمنی" سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ شاعری میں لفظوں کا کاروبار ہے، یہاں کا مسئلہ انہی لفظوں کی فقرہ بازی اور ان سے کھیلنا ہے۔ یہاں کیا کہا جا رہا ہے صرف کافی نہیں بلکہ کیسے کہا جا رہا ہے وہ بھی اہم ہے۔ یہ کہنا کہ:

"ان کی شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ ان کی دنیا میں صرف قید خانے نہیں، اور نہ انسانی تصور با تہم آزادی تک محدود ہو سکتا ہے۔ گریز یا سیاسی مسائل کے بیان میں اور نظریاتی وابستگی کی تفسیر میں اتنی گہری نہیں ہوتی کہ وہ عام انسانی تصورات کی طرح وسیع الذیل بن سکے، ان کے یہاں جو یکسانیت ہے، وہ بالآخر ذہن کو تھکا دیتی ہے۔"

راقم ہی نہیں بلکہ جس کسی نے بھی فیض کو پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ فیض کا دائرۂ شاعری بہت تنگ نہیں، اگرچہ بہت وسیع بھی نہیں۔ ہمیں انتہا پسندی سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔ جس ناقد کو فیض کا معروف شعر:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

ایک اوسط درجے کا شعر محسوس ہوتا ہو تو اس کی اعلیٰ سطح کا معیار کہاں سے لائیں؟

رشید حسن خان رقم طراز ہیں:

"فیض نے کچھ غزلیں نسبتاً مشکل زمین میں بھی کہی ہیں۔ کسی مشکل زمین میں غزل کہنا مشاقی اور قادرالکلامی کی آزمائش کرنا ہے اور یہ فیض کا کمزور ترین پہلو ہے۔ جس چیز کو مشاقی کہتے ہیں، اس سے انھیں دور کی نسبت ہے اور یہی احوال قدرتِ کلام کا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو غزلیں کچھ مشکل زمینوں میں ہیں، ان کا حشر سب سے زیادہ برا ہوا ہے۔

غزل ملاحظہ ہو:

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں
قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

کم مشقی اور زبان و بیان کے نکات سے کم آشنائی کا یہ کرشمہ ہے کہ ہر شعر بجھا ہوا ہے۔ "پیغام بجھ گئے ہیں"، "نام بجھ گئے ہیں"، "در و بام بجھ گئے ہیں" ان بے جوڑ ٹکڑوں کے ساتھ سب کچھ بجھ کر رہ گیا ہے۔ "چراغِ رخ" کے ساتھ "شمعِ وعدہ" کا جوڑ لگانا تو بدذوقی کی انتہا ہے۔

...ذمہ دار محاورے کا استعمال تجلی کی شاعری میں بے طرح نظر آتا ہے اور اس کی وجہ سے کلام کی فصاحت اور بیان کا حسن دونوں مجروح ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہی نہیں کہ محاورہ کیا ہے اور انہیں کس لفظ کا کہاں استعمال کیا ہے، اس کی نسبت کا تقاضا کیا ہے، ہو یہ کہ معنویت کا تقاضا کیا ہے۔ مثلاً "مر کرنا" ایک محاورہ ہے اور حسب ضرورت محاورہ ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک انھوں نے روا رکھا ہے، آئیے ملاحظہ کیجیے:

مر کے وہ سوز کہ چھٹی نہ کوئی بوند غزل

معلوم ہے دل شہر یہ بہانے کب سے

اور اسی طرف معنی تو کچھ نہیں کی کہ "سوز مر کرنا" کوئی محاورہ نہیں۔ اردو والے اس طرح نہیں کہتے ہیں کہ "غزل" نے "بہ" "بکھر گیا" ہو جاتے ہیں، دراصل یہ "سوز" کے لیے کیا لائے؟ "مر کرنا" لے آئے، دیکھیے بغیر حسن بیان پر کیا گزر رہی ہے کی اور زبان کی صحت پر کیا بیت جائے گی۔ (امتحان ہے یہ ۔ سیمتی عابدی)

جگنی ہے رات، مجھی: غزل بیتا کر

لقب مرا درد کا ... ہی تو ہے

"غزل ابتدا کرنا" بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔ عاشق اور عاقل سے کام ہونے کا نہیں کا ایسی ہو جو تقاضا ہے آگیا ہے شعر کہ وہ سوچے بغیر کہ مناسبت اور مطابقت کا استعمال کیا ہو گا۔ وہ کہہ کام ان سب پر ... کی حیثیت رکھتا ہے۔ (امتحان ہے یہ ۔ سیمتی عابدی)

دل ملتا کے حرف ملامت سے شاد ہے

اے جان جاں! یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

"حرف ملامت" کی ترکیب نے "حرف" کی معنویت کو برقرار رکھا تاکہ دل کو شاد و مسرور کر دیا تھا لیکن دوسرے مصرعے میں "یہ حرف ترا نام ہی تو ہے" کہہ کر اس پر بھی پانی پھیر دیا اور "حرف ملامت" آ گیا جو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ "حرف" ترکیب کے اخیر بھی موجود ... طرح ... ہے۔ اس کو کہا ہے کہ ہر ... ملانے والا"۔ (بات نکلی ہے ۔ سیمتی عابدی)

جیسا کہ رشید حسن خان نے کہا ہے کہ تجلی نے الفاظ کی نشست کا خیال نہیں رکھا اس کی وجہ سے فصاحت متاثر ہوئی۔ محاورے میں جا بجا جو نقص ... آتے ہیں ... تجلی کے مضامین ... کی آواز ... لیے۔ تجلی اپنے فن کے لحاظ سے ... ہوئے تھے ... جب کہ خود شعر و ادب کے مجتہد تھے۔

جب نئے ادب ... کسی شاعر کی فن اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے تیار کر لیا ہے تو ... خوب آ جاتا ہے ... کی کوشش میں اپنے ہاتھ بھی رنگین کر لیتے ہیں ... تنقید کا تماشا دیکھیے، یہ حق ہے کہ ایک ... ہر حرف ... دیکھنا ... کر اسے ... بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح ایک ... کام ہو ... حرف ... آنکھوں میں ... ذاتی ... ہے ... دوسروں کی آنکھوں میں بھی ... پڑتی ہے۔ ایک مثال ... ہے، رشید حسن خان لکھتے ہیں:

... ایک ... کتنا ... سے تجلی کی غزلوں میں ... ہے ... ہے جس نے ... کے ... میں ان کی غزلوں کو مقبول بنایا ہے اور خیالات و بیان کے لحاظ سے ... ہے جس کی وجہ سے ... ہم ... کرے گا۔

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

تو دوسرا مصرع سنتے ہی لوگ بجا طور پر جھومنے لگیں گے۔ اسی طرح جب کسی مجمعے میں لوگ یہ سنیں گے کہ:

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن!
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

تو خوش وقتی کی تلاش میں آئے ہوئے لوگ اگر وجد میں آ جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ یہی حال اُن کی لکھی ہوئی قوالیوں کا ہے اور اُن غزلوں کا بھی جو قوالی کے کام بخوبی آ سکتی ہیں مگر ہم سب جانتے ہیں کہ نغمگی، تہ داری کا بدل نہیں بن پاتی"۔

مختلف غزلوں کو لکھ کر آخر میں یہ شوشے دیے گئے ہیں:

مطلع:

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

(مضامین بھونڈے پن کے ساتھ نظم کر دیے گئے ہیں)

مطلع:

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

مقطع:

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

(مقطع کے سوا دوسرے اشعار دلکشی اور شعریت سے محروم ہیں اور نتیجتاً تاثیر سے بھی)

مطلع:

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے یہ اکرام ہی تو ہے

(شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ بقول محمد حسین آزاد "پھس پھسے شعر" کہتے چلے گئے ہیں)

اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

"اے چشمِ تماشائی" اور "دیکھو" میں شتر گربہ ہے۔ (اعتراض بجا ہے۔ سید تقی عابدی)

ع جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

"بو رشی کرتا" زبان سے باہر کی چیز ہے۔ (تکلف کی بات نہیں ہے۔ مجازی شاعری میں عام ہے۔ سید تقی عابدی)

جسے مجروح سپاہوں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

"برفاب" آب برف کا مترادف ہے اور برف کے پانی یعنی جسموں کا پگھلنا بے تکی بات ہے۔ "برفاب" برف کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ (ان ابیات نے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا اس طرح برف سے پیدا ہونے والی کیفیت کو خوب صورت کر دیتی ہے۔ سید تقی عابدی)

فیض ہی نے کہا ہے:

جب خون جگر برفاب ہوا
اور آنکھیں آہن پوش ہوئیں

یہاں "برفاب" صحیح طور پر استعمال میں آیا ہے۔

گر مرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ

"بے نور دماغ" کو جی اٹھانا عجیب ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ تیرا یہ بے نور دماغ منور ہو جائے تو ایک بات ہو سکتی تھی۔ مگر وہ اجڑا ہوا بے نور دماغ جی اٹھے گا اس طرح کوئی نہیں کہتا۔ (قاری میں کہتے ہیں ... اعتراض ٹھیک نہیں۔ سید تقی عابدی)

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے

"جسے سرو نماز کرے" معلوم نہیں کس زبان کی لم ترانی ہے۔ یہ اردو کا اعلیٰ محاورہ تو ہے نہیں۔ (نماز میں سرو کی طرح احترام میں قیام رہتا ہے شاعر اس سے استفادہ کرتا ہے۔ سید تقی عابدی)

صحن چمن میں ساقی کسی کو ہے مصرف
قیام ایک سر کوہسار کا موسم

"کس مصرف" فصاحت بیان کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

ایک تو نطق کی بخیہ گری سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسری بات یہ کہ "نغمے بکھرنے لگتے ہیں" اس کی جگہ یہ کہ وہ لب کی بخیہ گری کرتے ہیں تو تکلف کی پرواہ سے خالی نہیں۔ نطق و لب کی بخیہ گری میں چھا رہے ہیں ہے اور اسی نے ان کو غیر واضح کر دیا ہے۔ (کہاوت ... شاعری قصہ مختصر ہے تعریف ہے۔ ... سید تقی عابدی)

رشید حسن خان صاحب نے اپنے مضمون کے اختتام پر ... ان کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ذہن کے پردے سے اہم واقف ہو گئے۔ ... فیض اور شعری زبان کے حوالے ... تھے اور ان ... ۔ اشعار ... تھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"جڑ" لے جائیں گے "زبان کے لحاظ سے نامانوس ہے۔ دوسرے شعر میں ادبار کے معنوں سے نالا ہو !! تاقیامت بھی کی نظر آتے۔
(اعتراض درست ہے۔ سید تقی عابدی)

تم یہاں اہلِ دل بیٹھے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

"آپ نے نرم" استعمال نہیں ہوتی۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

ع "دل کھول نہ پائے سے نکلے ہوئے ایام"

"نکلے ہوئے ایام" مبہم ہے۔ (کیا مضائقہ ہے اردو شاعری کو تھا نگوارہ ہے۔ سید تقی عابدی)

ع ہر درد کو اُجیالا ہر ایک غم کو سنوارا

"سنوارنا" غیر مانوس طرزِ کلام ہے۔ (... سے معنی نہیں اور اس سے غلط ہے۔ یہ جمالیاتی طرزِ کلام ہے۔ سید تقی عابدی)

ع نفس جاناں کو دو گئے کہ کرنے لگی میری نظر

"نفس کو دو گئے کرنا" خوش مذاقی کی جان پر ستم توڑتا ہے۔ (ذاتی ذوق پر منحصر ہے۔ سید تقی عابدی)

غیرتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

دامن کے تار تار ہونے کے لیے یہ کہنا کہ اس کی صحت جاتی رہی ہے درست نہیں۔ دامن کا صحت سے کیا علاقہ؟ (اگر دامن
وسیع ہو تو ممکن ہے۔ سید تقی عابدی)

تم ہیں اہلِ دل بیٹھے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

(یہاں "آپ اہلِ حرم کی بات کرو" صحیح نہیں۔ "آپ اہلِ حرم کی بات کریں ہونا چاہیے"۔ سید تقی عابدی)

ع ہر ایک کو ہم پہ ان خیالوں کی ضمانت

(ضمانت کی جگہ غلط۔ ضمیر "ہم" ہونا چاہیے۔ تقی عابدی)

دامن کو صحیح ہونے کا ... غلط ہے دامن کرنے یہ واضح ہو سے دیکھیے ہے۔

تا آتوں کے تو لب پہ بیٹھے ہیں عتاب
بازو تو لے ہوئے ہتھ ... ہوئے آئے ہیں

"کا" ہونا چاہیے کیونکہ "لب" کی تعمیم نہیں۔ (اعتراض صحیح ہے۔ سید تقی عابدی)

آخر میں ہم یہی کہیں گے کہ فیض نہایت بڑے شاعر تھے جن کی عظیم شاعری سے کوئی دیوان منسوب ہو۔ فیض احمد فیض
سے ہم کو ... میں اور ... تحریروں میں "فیضیات" کی اصطلاح لکھنے اور پڑھنے میں آئی۔ اگر یہاں فیضیات سے مراد فیض کے
فن اور شخصیت پر بات چیت ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر اس کا مطلب کوئی شاعری کا دیوان ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اردو
شعر و ادب میں چند عظیم شعرا اور ان سے منسوب چار دبستان ہیں۔ جن میں میر تقی میر سے منسوب دبستان کو "نکاتِ میر" کہتے ہیں۔
ذہنی طور پر ... نے ادب و شعر کے لیے "میریات" کے بجائے "میر کا انداز" ہی کہا ہے۔ ... میر کا انداز تحت ...

جاتا ہے جیسے منسوب "غالبیات"، میر تقی میر سے منسوب "انیسیات" اور محمد اقبال سے منسوب "اقبالیات"۔ یہ چاروں نے مکمل جدید شاعری کے معنی سے ہیں۔ ان جیسے شاعروں کی شاعری آفاقی شاعری تسلیم کی گئی ہے۔ ہر بڑا شاعر ایک خاص لہجہ اور زبان اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ ادب کے معنی و آہنگ میں تصرف کرتے ہوئے اپنے خاص الفاظ کی تراش خراش بھی کرتا ہے اور یہی الفاظ اس کا سرمایہ ہیں۔ خاطر کرتے۔ معانی عطا کرتا ہے۔ الفاظ اس کی تخلیق ہوتے ہیں۔ وہ ان سے اپنے طرزِ بیان کے مزاج کے مطابق جیسا چاہے ویسا کام لیتا ہے۔ اس کے ہم عصر اور آئندہ آنے والے قبول کر لیتے ہیں۔ جدید شاعری کو مختلف زاویوں سے پرکھا جاتا ہے۔ فیض کی جدید شاعری شاعری کی پہچان نہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جدید شاعر نہیں ہوا، بلکہ اس کی شاعری جدید شاعری کی صف میں لا کھڑی کی گئی۔ وہ اس طرح ضروری نہیں کہ ہر بڑا شاعر جدید ہو۔ مقبولیت اور شہرت شاعری کے معیار کے الگ الگ پیمانے ہیں۔

ایک اچھے شاعر کی صفت یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر بولے، وہ سچ ہو۔ اس کا کلام اس لیے عظیم اور آفاقی شاعری میں شمار نہیں کہ اس نے کوئی جدید دبستان یا طرزِ بیان کا موجد ہی نہ بنا دیا۔ بلکہ اس لیے کہ ان لفظوں کی تہوں کو استعارے کے ذریعہ منکشف کیا۔ یہ اس کا جوہر ہے جو پیدا کرتے ہوئے "ہم آہنگ" سے لاتے ہیں ان لفظوں کو۔ صرف نیک خیالی شہرت دیکھ کر ہی نہیں سمجھی جا سکتی۔

فیض نے متعدد مقامات پر اچھے اور برے کلام کی وضاحت کی ہے۔ نقش فریادی میں ایک پورا مضمون فیض کا ہی بیان ہے جو اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی عظیم اور شعرا کی صف میں شامل نہ کیا۔ ہم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فیض کی شہرت سے بعض لوگ جلتے ہیں، علامہ اقبال سے بھی بڑا شاعر مانتے ہیں۔ ان سے کوئی کلام نہیں مگر تعجب ہے کہ فیض اپنے بارے میں کہتے ہیں:

''جہاں تک شاعری میں Sensibility، زبان پر عبور اور مہارت کا تعلق ہے ہم تو ان کے مقابلے پر کچھ بھی نہیں۔ علامہ اقبال کو شاعر ہی سمجھنے لگے اور ان کے سامنے میرا نام لیا جاتا تو ہمیں کوئی شرمندگی نہ ہوتی۔''

فیض نے اپنے 15 اگست 1952ء کے خط میں لکھا:

''جیل کے دروازے پر بیگم، بیٹیاں اور دوست ملیں تو بہت خوشی ہوئی تھی، ہم جیسے آزاد دنیا میں نکلے ہیں اور زندگی یاد آ رہی ہے۔ آنکھیں ترستی ہیں۔ عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوئی اور یقین نہیں آیا کہ اب ہم بھی اس دنیا میں لوٹ آئے ہیں۔ مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ لکھنے میں کچھ وقت لگ گیا اور اتنا کہ وقت تک نہیں آیا۔ قریب قریب تیرہ برس گزر چکے تب بھی تک ابھی تک اس کا اثر موجود ہے اور کچھ عرصہ رہے گا۔ اس بات کا خدشہ ہے کہ واقعی ہم نئے دور کے شاعر ہو جائیں گے۔''

اگر یہ کیفیت برقرار ہو تو ہم ان کا مستقبل قیاس کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے "غزلیات" اور "نظمیات" اور جانے کتنے مجموعے ہم اٹھا لائے ہیں۔ فیض آج کے بڑا شاعر ہیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد رہے

....

فیض اور فیض خیال سے ہم نے
جانا سمندر کی زمیں کی ہے

فیض کے انٹرویوز

(اٹھائیس (28) انٹرویوز میں چار سو اٹھاون (458) سوالات)

فیض سے منسوب ذیلی فقروں میں فیض کے کئی انٹرویو شائع ہوئے ہیں۔ شاید ہی فیض پر کوئی کتاب تصنیف یا ترتیب دی گئی ہو جس میں ان کے انٹرویوز یا انٹرویوز کے اقتباسات شامل نہ ہوں۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی روزنامہ ایسا ہو جس میں فیض کا انٹرویو یا اس کے اقتباسات یا اس پر تبصرہ نہ کیا گیا ہو۔ ہماری تحقیق کے مطابق فیض کے مطبوعہ انٹرویو کی تعداد بائیس (22) ہے۔ ہم نے فیض کے انٹرویوز میں وہ تحریریں شامل کی ہیں جو فیض نے مختلف اشخاص کے سوالات کو جوابی صورت میں دیے ہیں جو ہمارے پاس مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ مرزا اظہر احسن کا مضمون "عہد طفلی سے عنفوان شباب تک" اگرچہ انٹرویو کی شکل میں لکھنے کی ناکام کوشش ہے، چنانچہ اس مضمون کو انٹرویو کے زمرے میں رکھا نہیں گیا۔ بعض انٹرویو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اور مختلف عناوین کے تحت تکرار کے ساتھ مختلف جریدوں اور کتابوں میں شائع ہوئے، ان کا کوئی جائزہ کر احتیاط سے رد کیا گیا۔ انٹرویو کے وہ سوال اور جواب جو فیض کی بجائے دراصل انٹرویو کرنے والے شخص کی خود نمائی سے متعلق تھے، حذف کر دیے گئے۔ جو سوال تکرار ہوئے، ان میں سے صرف وہی سوال انتخاب ہوا جس کا فیض نے مکمل جواب دیا۔ فیض کے پڑھنے والے فیض کے اس ہنر سے خوب واقف ہیں کہ وہ بعض اوقات جواب کو ٹالنے کے لیے "ہاں" "ہوں" سے کام چلا لیتے تھے۔ اگر ہمارے انتخاب اور تدوین میں بعض سوالات کی تکرار دکھائی دیتی ہے تو اس کی وجہ فیض صاحب کے جوابات ہیں۔ انھوں نے کچھ جداگانہ اور کچھ تشریح اور تفصیل سے دیے ہیں۔

بعض سوالات جو گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں تقریر کے بعد کیے گئے جس کو رسالے "مشعل" میں شائع کیا گیا، وہ سوال اور جواب بھی اس انتخاب میں اس لیے شامل کیے گئے کہ اس سے پاکستانی کلچر، ادبیات عالم اور اردو زبان کے علاوہ پاکستانی ثقافت اور اسلامی اقدار پر فیض کے خیالات اور ان کے فکر کے وہ پہلو روشن ہوتے ہیں جو فیض فہمی کے لیے ضروری ہیں۔ یہاں وضاحت کرتے چلیں کہ یہ گورنمنٹ کالج کے رسالے نے شائع کیا تھا۔

قارئین کی سہولت کی خاطر ہم نے فیض سے کیے جانے والے سوالات کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ مطالب پوری طرح سے خانوں میں بند نہیں کیے جا سکتے، چونکہ ان کی حدیں متعین نہیں ہوتیں۔ فیض کے سوالات کو ابتدائی تعلیم، ذاتی نجی مسائل، اردو اور پنجابی شاعری، ادبیات عالم، مذاہب، اردو زبان، تحریک طبقے، سیاست، ترقی پسند تحریک، صحافت، پاکستانی کلچر، روزنامچہ، لندن، روس اور نئی نسل کے مسائل پر تقسیم اور ترتیب دیا گیا ہے۔

فیض کے انٹرویوز ان کی عمر کے ایک بڑے حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ فیض کا پہلا انٹرویو 1964ء اور آخری انٹرویو 1984ء میں لیا گیا۔ یوں یہ تمام انٹرویو 20 سال کے عرصہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ انٹرویو کے سوالات اور جوابات میں ایک لفظ بھی زیادہ یا کم نہیں

بنا دیا گیا ہے۔ ایسے الفاظ جن سے انٹرویو کے متن پر اثر نہیں پڑتا جیسے "سگریٹ سلگاتے ہوئے" "ہنستے ہوئے" کو نکال دیا گیا ہے۔ تحقیق کے دوران انٹرویو کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، یہاں جو کتاب سے کام نہیں لیا گیا اور بار بار نہیں آئی جس سے بہرحال تھوڑا مضمون پر خاص اثر نہیں پڑا۔ بعض سوالات میں سوال کنندہ کا پورا نام شائع نہیں ہوا اس لیے ایک جدول میں تمام اشخاص کے نام درج کیے گئے ہیں۔ اس ایک طویل انٹرویو میں جو تقریباً ساڑھے چار سو سوالوں پر پھیلا ہوا ہے صرف سے زیادہ ہیں۔ اسلوب تحقیق کے مطابق موجود ہیں جن سے بہت سی گتھیاں کھولی جا سکتی ہیں اور بہت سی الجھنیں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

انٹرویو کرنے والے افراد

1:۔ انتظار حسین — 2:۔ افتخار عارف — 3۔ ماجد قرار
4:۔ حمایت بریلوی — 5:۔ اشفاق احمد زیدی — 6۔ آئی اے رحمن
7:۔ ارشی گولڈ — 8:۔ جمیل جالبی — 9۔ مجتبیٰ احمد خان
10:۔ ملک زر حسن — 11:۔ سعادت سعید — 12۔ حسن رضوی
13:۔ کمال جالبی — 14:۔ آصف فرخی — 15۔ حمیرا صدیقی
16:۔ جیلانی کامران — 17:۔ محمد مسعود — 18۔ شفیع عقیل
19:۔ مسعود اشعر — 20:۔ نصرت چوہدری — 21:۔ امرتا پریتم
22:۔ محمود تقی — 23:۔ خالد فاروقی — 24۔ سید مرتضیٰ بخاری
25:۔ غلام حسین اظہر — 26:۔ صفدر میر — 27:۔ مظفر اقبال
28:۔ افضل امام

....

نمبر شمار	اشخاص	تاریخ	روزنامہ/جریدہ	مقام	عنوان	ملاحظات
1	افتخار عارف	1984ء	ماہ نو	لندن	ہم انسانی شعور کی تخلیق کو ساری دنیا کا انعام	زبانی گفتگو۔ احمد فراز کے ساتھ
2	حمایت بریلوی	1982ء	مشرق جمہ	لندن	فیض احمد فیض سے جنگ کے بارے میں	ایشیائی ادب۔ ۔ ۔ کے ساتھ
3	حسن رضوی	15 فروری 1987ء	ہفت روزہ	لاہور	فیض صاحب کی باتیں	انٹرویو اور ملاقات
4	مجتبیٰ حسن خان	....	ہفت روزہ	لاہور	فیض صاحب سے بات چیت	مرتب فیاض احمد / فرحت ظفر
5	ارشی گولڈ	1984ء	....	لندن	ہم کیا کرتے کیا جاتا ہے؟	زبانی گفتگو
6	غلام حسین اظہر	....	قومی زبان کراچی	کراچی	فیض نمبر	
7	منیزہ	1978ء	روزنامہ جنگ	کراچی	روایت عرب و عجم	
8	ملک زر حسن	15 فروری 1974ء	روزنامہ حریت	کراچی	غالب.......	ترجمہ ملک زر حسن نے کیا

9	ادریس فاطمہ	19 اپریل 1973ء	روزنامہ حریت	اسلام آباد	ادب و حیات	
10	مریم ندیم	....	....	لکھنؤ	فیض سے گفتگو	
11	منیزہ قمر	....	فیض احمد فیض	لاہور	فیض نے کہا.......	مرتبہ ضیا ساجد/فرحت ظفر
12	حمید صدیقی	....	اوراق شب گزیدہ	...	فیض صاحب کے ساتھ ایک گفتگو	
13	نصرت چوہدری	....	فیض کی شاعری	لاہور	فیض سے ایک گفتگو	
14	آغا ناصر	1984ء	فیض احمد فیض	لاہور	فیض کا آخری انٹرویو	مرتبہ ضیا ساجد/فرحت ظفر
15	نامعلوم	....	؟	کراچی	تحریک اور ادب	
16	نامعلوم	...	گورنمنٹ کالج لاہور راوی	لاہور		
17	نامعلوم	....	گورنمنٹ کالج لاہور	لاہور	پاکستانی تہذیب، کلچر، اسلامی ثقافت	
18	نامعلوم		گورنمنٹ کالج لاہور راوی	لاہور	ادب اور ثقافت	
19	مظفر اقبال	24 جون 1984ء	فیض فکر اور حوالے	کینیڈا	فیض سے مکالمہ	اشفاق حسین
20	عابد حسن	1984ء	....	کراچی	فیض احمد فیض ایک انٹرویو	
21	اشفاق حسین	1976ء	روزنامہ مشرق	لاہور	باتیں ادب کی	مرکزی کتاب مرزا ظفر الحسن
22	افتخار امام	....	فیض فکر اور حوالے	کینیڈا	فیض اور قرآن و حدیث کی تعلیم	اشفاق حسین

....

عبادت: آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی اور وہ کون سا ماحول تھا جس میں آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گزارے؟

فیض: 7 جنوری 1911ء ہے پیدائش۔ یہ میٹرک اسکول کے سرٹیفکیٹ سے اخذ کی گئی ہے اور میں نے سنا ہے کہ اس زمانے میں اسکول میں جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ سب جعلی ہوتی تھیں۔ اس لیے کہ وہ اس حساب سے لکھی جاتی تھیں کہ لڑکا کم عمری میں میٹرک پاس کر سکے۔ جس کے بعد انگریزی سرکاری نوکری کے لیے عمر کم ہونی چاہیے۔ تو بچپن میرا سیالکوٹ میں گزرا۔ اسکول میرا مشن سکول تھا۔ اس کے ساتھ میرے استاد شمس العلماء مولوی میر حسن صاحب تھے جن سے علامہ اقبال نے بھی پڑھا۔ اس زمانے میں عربی فارسی بھی پڑھی اور ان سے زیادہ قریبی استاد تھے مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی۔ بڑے فاضل تھے۔ انہوں نے ان سے بچپن میں ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں۔ ان کے علاوہ قرآن اور حدیث کی تعلیم بھی ان سے پائی۔ تو بچپن تو یہیں گزرا۔ ایف اے تک میں نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی پھر لاہور چلا گیا۔

عبادت: پھر لاہور میں کون سے اساتذہ ایسے تھے جن سے آپ نے استفادہ کیا؟

فیض: لاہور میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ وہاں ہمارے انگریزی کے استاد تھے جو اپنے زمانے میں مستند سمجھے جاتے تھے

ایک پروفیسر لینگ بارن، دوسرے پروفیسر ڈرتھ جو آج کل یہاں پر ہیں۔ تیسرے ہمارے بخاری صاحب تھے پطرس، اس کے علاوہ فلسفے میں پروفیسر چیٹرجی تھے، عربی میں ڈاکٹر صدرالدین مرحوم تھے۔ اگرچہ میں فارسی کا طالب علم نہیں تھا لیکن قاضی فضل حق صاحب سے مراسم تھے، اس لیے کہ وہ ہماری بزمِ سخن کے صدر بھی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اُن دنوں جو زیادہ معتبر اور بزرگ ادیب اور لکھنے والے تھے وہ بیشتر یکجا ہوا کرتے تھے۔ تاثیر مرحوم کے گھر یا صوفی تبسم صاحب کے یہاں یا بخاری صاحب کے یہاں..... تو زیادہ تعلیم تو میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے اندر نہیں ہوئی کالج کے باہر ہوئی۔ خاص طور پر پروفیسر بخاری صاحب کے یہاں تو باقاعدگی سے ہر مہینے ایک محفل ہوا کرتی تھی جس کا نام انھوں نے "بزمِ اُردو" رکھا تھا جو بعد میں "بزمِ احباب" کے نام سے مشہور ہوئی، دوسرے صوفی صاحب کا دیوان خانہ تھا جہاں ہمیشہ لوگ رہتے تھے۔ تیسرے تاثیر صاحب کا گھر تھا۔ اُس زمانے کے بیشتر بزرگوں سے انہی لوگوں کے دولت کدوں پر ملاقات ہوئی۔

عبادت: اچھا فیض صاحب! یہ بتایئے کہ آپ نے شاعری کب شروع کی؟

فیض: یہ تو مجھے یاد ہے کہ تک بندی کیسے شروع ہوئی۔ شاعری کب شروع کی، یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ لڑکوں کا ایک مقابلہ کرنا چاہیے۔ شاعری کا نہیں شعر سازی کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ کہا گیا کہ مصرعِ طرح پر آپ سب لوگ طبع آزمائی کریں تو انعام دیا جائے گا۔ اس قسم کا جو پہلا مقابلہ ہوا اُس کے منصف اور جج تھے شمس العلما مولوی میر حسن صاحب۔ اتفاق سے اُس مقابلے میں انعام مل گیا۔ انعام سے زیادہ وہ تحفہ تھا جو ہم نے پسند کیا اور انعام مجھے یاد ہے، ایک روپیہ ملا تھا۔ شہر میں منشی راج نرائن ارمان دہلوی صاحب رہتے تھے تو انھوں نے ایک محفلِ مشاعرہ قائم کر رکھی تھی، ہمارے گھر کے بالکل ساتھ۔ اُس کے باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے، اور ایک بزرگ ہوا کرتے تھے منشی سراج الدین مرحوم جو کہ علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے، اُن کا ذکر بھی ہے علامہ کی تحریروں میں۔ منشی صاحب ہمیشہ صدارت کیا کرتے تھے، وہ کشمیر میں میر منشی تھے۔ جب اُن کی ریذیڈنسی سیالکوٹ میں آجاتی تھی تو وہ بھی سیالکوٹ آجاتے تھے اور اُن کے ساتھ مشاعرہ بھی آجاتا تھا۔ پانچ چھ مہینے، شاعری کا بازار گرم رہتا تھا، وہاں پر ہم بھی جایا کرتے۔ مصرعِ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ بہت دنوں تک خیر ہمیں ہمت نہ ہوئی کیوں کہ منشی سراج الدین صاحب بڑے فقرے باز آدمی تھے۔ جب کوئی شعر سنانے کے لیے آیا اور ایک شعر اُس نے پڑھا تو منشی صاحب نے اساتذہ کے دس شعر اسی مضمون پر سنا دیے۔ تو بہت دنوں کے بعد ہمیں ہمت ہوئی۔ ہم نے ایک غزل پڑھ دی۔ خلافِ توقع منشی صاحب نے داد دی۔

کہا: "برخوردار یہ تو اچھا ہے"۔ یہ تو سب تک بندی کا زمانہ تھا۔ اُس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں گیا ہوں تو بی اے کے دوسرے سال میں محض مشقِ سخن کے لیے نہیں بلکہ کچھ احوالِ دل بیان کرنے کے لیے شعر کہنے کی ضرورت پڑی۔

عبادت: اچھا اُس زمانے کی وہی نظمیں ہیں جن میں رومانی رنگ و آہنگ ہے اور جو "نقشِ فریادی" کے پہلے حصے میں شامل ہیں۔

فیض: جی ہاں "نقشِ فریادی" کی نظموں کا پہلا حصہ تو گورنمنٹ کالج ہی کے زمانے کا ہے۔

عبادت: اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک اگرچہ باقاعدہ تو نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن اُس کے شروع ہونے کے آثار موجود تھے۔

فیض: ہاں ترقی پسند تحریک اصل میں کوئی تین چار برس بعد شروع ہوئی۔ اگرچہ اُس زمانے میں کچھ تصنیف شروع ہو گیا تھا، لیکن باقاعدگی سے 1933ء میں شروع ہوئی۔ لیکن فضا میں اُس کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ 1935ء میں جب میں نے تعلیم ختم کر کے امرتسر میں پڑھانا شروع کر دیا تھا، "ایم اے او کالج" میں، تو اُن ہی دنوں یہ تحریک ہوئی اور اُس کے ساتھ رابطہ پیدا ہوا۔

عبادت: آپ نے یہ نظمیں لکھی ہیں "رقیب سے"، "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" یہ اس تحریک کے بعد کی ہیں؟

فیض: اس کے بعد کی۔ دراصل یہ اس وقت لکھی گئیں جب تھوڑا بہت سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا۔ پہلی نظم ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"۔ آپ نے ان نظموں کا حوالہ دیا وہ اس کے بعد کی ہیں یعنی 1935ء اور 1940ء کے درمیان کی ہیں۔

انجم رومان: آپ کا گھر سیالکوٹ میں تھا، وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے کے حوالے سے بچپن کی کچھ یادوں میں ہمیں بھی شریک کرتے ہیں۔

فیض: بچپن کی یادیں یعنی یہ کہ جب ہم نے ہوش سنبھالا یعنی پانچ چھ یا سات سال کے ہوئے تو پہلا کام ہم نے قرآن شریف حفظ کرنے کا کیا۔ ایک مولانا صاحب مقرر کیے گئے کہ ہم کو حفظ کروائیں۔ تو ہم نے تین سپارے حفظ کیے۔ اس کے بعد ہماری آنکھیں دکھنے آ گئیں۔ تو ایک چھٹی ملی یہ بھی ہے کہ آپ ابھی پوچھ رہے تھے کہ اس کے بعد ہم آگے حفظ نہ کر سکے۔

ابتدا میں ماسٹر عطا محمد سے عربی، اُردو، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ہم مدرسے میں داخل ہوئے۔ ہمارے ابا جو تھے وہ انجمن اسلامیہ کے صدر تھے، اس لیے پہلے ہمیں وہیں داخل کرایا گیا۔ ہم جب پہلی مرتبہ مدرسے بھیجے گئے تو بڑے اہتمام کیے گئے۔ ہمیں نئے کپڑے پہنائے گئے، آنکھوں میں کاجل لگایا گیا۔ بڑا دھوم دھام سے کیا گیا اہتمام ہوئے۔ روکو وزیر نے گاڑی میں بٹھا کر مدرسے پہنچایا۔ یہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹاٹ بچھا ہوا ہے اور میلے کچیلے کپڑوں میں بے چارے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ تو آنکھیں بھر آئیں اور رونے لگے کہ یہ کہاں ہم کو لا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔

احمد فراز: فیض صاحب کی زندگی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہے۔

فیض: انہوں نے اپنے بچے لگانے ہم کو بہت ندامت ہوئی اور فیصلہ کیا کہ آج کے بعد ہم یہ نہیں کریں گے۔ ہم اسی اسکول میں رہے۔ پھر چھوٹے وہاں کے ہم اس اسکول میں رہے کہ جنہوں نے ہماری زندگی خراب نہیں کی۔ آپ کے ابا جان انجمن کے صدر تھے اس لیے ہر ماسٹر ہمیں سلام کرتا تھا۔ امتحان وغیرہ ہوتے تو نمبر بھی زیادہ ملتے تھے۔ فارسی عربی میں اس سے زیادہ پڑھ چکے تھے جو وہاں کے استاد پڑھاتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے اپنے ابا سے کہا کہ ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ اس کے بعد ہم مشن اسکول چلے گئے۔

یہ بھی اس زمانے کی بات ہے کہ جب کانگریس اور خلافت کی تحریک چلی تھی۔ امرتسر میں مارشل لا لگا تھا۔ سارے شہر میں ایک طرح کا ہنگامہ تھا، سیاسی گہما گہمی تھی۔ باہر سے لیڈر آتے تھے اور ان کے لیے شہر بھر میں جلسوں کے ساتھ نعرے لگائے جاتے تھے۔ جلسوں سے پہلے کئی کئی دن تیاریاں کی جاتی تھیں۔ جب ان کا جلوس نکلتا تو ہندو مسلمان سب اکٹھے ہوتے تھے اور نعرے لگتے تھے۔ ہر بولے سو نہال، ست سری اکال، اور نعرۂ تکبیر "اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوتی۔ کوئی نعرہ "بندے ماترم" کی آواز لگاتی تھی اور اس کے بعد علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گایا جاتا تھا۔

یہ ہنگامے ہوتے رہتے تھے۔ ہمارے ہم عمر بچے کہ شہر کے بڑے بڑے رئیس تھے تو کہتے تھے کہ آپ بھی تحریک میں حصہ لیجیے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تو بہت چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس میدان میں کود پڑیں مگر گھر والے اچھے بچوں کا خیال رکھتے ہیں، یہی بڑا ہوتا ہے۔ اور جب ہم کو اس میدان میں کود پڑنے کا موقع ملا تو انگریزوں نے انجمن حمایت اسلام کا خطاب بدل دیا۔

انجم رومان کے سوال "علامہ اقبال سے ملاقات" کا جواب دیتے ہوئے فیض صاحب نے کہا:

یہ پوچھیے کہ پہلی بار ہم سیالکوٹ میں کب آئے...... انجمن اسلامیہ کا ہر سال ایک جلسہ ہوتا تھا جس میں مسلمانوں کے بڑے بڑے

لیڈر آئے تھے۔ اور سنایا: انجمن کے صدر تھے۔ ہماری عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ جب ہم نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا تو ۔ جلسے میں ہمیں قرأت کرنے کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ ہم نے بہت ناز سے قرأت شروع کی تو انجمن کے ممبروں نے خوش ہو کر ہمیں اٹھا کر منبر پر کھڑا کر دیا۔ وہاں ہم نے تھوڑی سی قرأت کی۔ یہ تھی ہماری پہلی پبلک تقریر (Public Appearance)۔ ہمارے ہاں کئی شہر کے رئیس تھے، ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین تھے اور شہر جانے کیا کیا تھے۔ وہ بڑے منتظم کمشنر وغیرہ ہوتے ہمارے گھر آتے تو ہمارے بڑے بھائی طفیل اور چھوٹے بھائی عنایت کو چھوڑ کر ہمیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ ہم انگریزی بول لیتے تھے۔ ان کو یہ اچھا بھی لگتا تھا۔ اس طرح پبلک لائف سے بچپن میں ہی واسطہ پڑ گیا۔ جب ہم ساتویں آٹھویں جماعت میں پہنچے تو بڑے بھائی کے ہم جماعت ہمارے محلے میں رہتے تھے، کہنے لگے: "تم شاعری کا شوق رکھتے ہو، کوئی شعر بھی کہا؟" ہم نے کہا: "شاعری تو کبھی نہیں کی۔" کہنے لگے: "ہم ایک مصرعہ دیتے ہیں اس پر غزل کہو۔" ۔۔۔ ہم نے اس طرح کا ۔۔۔ اس طرح کی ہیں۔۔۔ انھوں نے سارے سکول میں مشہور کر دیا۔ ہمیں بہت ندامت ہوئی کہ ہم سے ... ہم نے ... تھے ... سے معافی مانگی اور کہا کہ "آپ نے مجھے سارے سکول میں مشہور کر دیا"۔ تو یہ تھی شاعری میں ہماری پہلی کوشش۔ پھر ہم جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہمارے ماسٹر ... نے ایک مصرعہ دے کر سب کو غزل کہنے کی دعوت دی۔ شمس العلما سید میر حسن جج تھے۔ ہماری غزل کو پہلا انعام ملا۔ حالانکہ ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ غزل کے آدھے مصرعے وزن سے خارج تھے۔ شمس العلما نے خوش ہو کر ہمیں ایک روپیہ انعام دیا۔ یہ پہلا انعام تھا جو ہمیں ملا تھا۔ آج تک یہ انعام یاد ہے۔

رحمٰن: اپنے بچپن کے متعلق بتاتے ہیں؟

فیضؔ: میرے والد بہت بڑے اور اچھے انسان تھے۔ انھوں نے جب اپنا گاؤں چھوڑا تو وہ بچے تھے لیکن اپنی ذاتی کوششوں سے انھوں نے تعلیم حاصل کی اور ... سرکار کے درجے تک پہنچے۔ اس کے بعد جب وہ واپس آئے تو انھوں نے وکالت کی پریکٹس کے لیے سیالکوٹ کے قریب اپنے گاؤں کا انتخاب کیا۔ اس کے ساتھ انھوں نے سیالکوٹ شہر میں کئی ادارے کھولے۔ اس کے بعد وہ اپنے گاؤں میں ایک ... تھے۔ ہماری پہلی ایک مسجد کھولنے کے نقیب کے طور پر ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بچپن کی تربیت نے اپنی مذہبی روایات سے واقف کرایا۔ اپنی والدہ سے مجھے تعلیم اور بچپن کا سبق ملا۔ میری والدہ میرے والد کی تیسری بیوی تھیں۔ پہلی بیوی سے ... میری والدہ سے بڑی تھیں۔ اس کے باوجود کہ انتظام میری والدہ نے کیا، پھر اس عمر میں جب ... میری بچی تھیں ... اور ہمارے گھر آ گئیں، گھر کی آمدنی ختم ہوگئی۔ میری والدہ نے ہم کو بڑی مشکل سے پالا پوسا۔

رحمٰن: کیا ان دنوں میں آپ پر سخت غربت اور تنگی کے دن بھی گزرے؟

فیضؔ: ہاں، ہمیں یاد ہے کہ ہم بچے ہی تھے لیکن کوشش کرتے تھے کہ اخراجات کے لیے والدہ پر بار نہ ہوں۔ ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ۔ کئی مرتبہ ایسے بہت سے مواقع آئے کہ خودداری کی تربیت دوستوں سے بھی ... کرتا تھا۔ یہ ساری باتیں بڑے صبر کی تھیں۔

عبادت: سنا ہے آپ علامہ اقبال سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

فیضؔ: جی ہاں، ان سے کئی مرتبہ نیاز حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہمارے ہم وطن تھے۔ دوسرے وہ میرے والد کے دوست بھی تھے۔ دونوں ہم عصر

تھے۔ یورپ اور انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ تھے۔ چونکہ یہاں سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے ایک دفعہ بچپن میں ہوئی تھی، جب کہ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیالکوٹ میں انجمن اسلامیہ تھی۔ اس کا ہر سال جلسہ ہوا کرتا تھا۔ انجمن اسلامیہ کا سکول تھا۔ وہ تھوڑا سا سکول تھا اور وہاں پر کبھی کبھی علامہ اقبال ان کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لیے آیا کرتے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے انہیں انجمن اسلامیہ کے جلسے میں دیکھا۔ مجھ کو اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لیے دیا گیا تھا کہ میں سکول میں پڑھتا تھا۔ علامہ صاحب سکول میں، مجھے قرأت سنانی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھے اٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا تھا۔

اس کے بعد میں گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے آیا تو علامہ سے ملنے لے گئے۔ یہ اتفاق تھا کہ قاضی فضل حق صاحب کے نام ان کا خط تھا، مجھے افسوس ہے کہ وہ خط قاضی صاحب نے چھپا لیا۔ وہ اس کے بڑے عزیز تھے اور ہمارے والد کے دوست تھے اس لیے ہمیں تو ان کے پاس جانے میں کچھ جھجک ہوتی تھی۔ انٹر کالج سے نکلنے کے بعد کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جب طالب علم کل ہند کانفرنس میں شرکت کر کے مدراس سے لوٹے تھے تو ہم نے گورنمنٹ کالج کی طرف سے اور یونیورسٹی کی انجمنوں کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا تھا۔ ایک اور بات یاد آئی ہمارے صاحب علمی کے آخری دن تھے۔ گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں پھر ایک مقابلہ ہوا تھا، بصورت دیگر یا تھا اقبال۔ اس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا۔ صوفی تبسم نے ہم سے کہا: "تمہیں نظم ٹھیک ہے، پہلے اچھی طرح سے پڑھ دو۔" تو ہم نے کہا تھا "علامہ اقبال کے سامنے تو ہم نہیں سنائیں گے"۔ چنانچہ وہ نظم ہم نے پڑھ دی۔
اس کے بعد تاثیر صاحب، صوفی صاحب اور مالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔

انجم رومانی: فیض صاحب، اکثر لوگ آپ سے بہت باتیں کرتے ہیں، آپ کا اعتراض نہ ہو تو ہمیں بتائیں کہ ان کون کون سی باتوں کی جنہیں آپ چاہیں گے کہ آپ سے پوچھا نہ جائے۔

فیض: اتنی بہت سی باتیں ہیں، مثلاً کے طور پر ہمارے معاملات میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں، وہ تو ہم نہیں بتائیں گے..... اس کے علاوہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی باتیں ہیں جو آپ سے چھپائی گئی ہیں۔ ہماری زندگی تو ایک کھلی کتاب رہی ہے۔

افتخار عارف: ہم طلبہ تک آپ کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور زندگی گزاری ہے اور یہاں تو سب زندگی گزاری ہے۔ کبھی کوئی پچھتاوا بھی آپ کو ہوا؟

فیض: ایک بچپن والا ہے کہ جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ہماری Ambition یہ تھی کہ ہم ایک بڑے کرکٹر بنیں۔ ابھی تک بھی کبھی کبھی ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ٹیسٹ کرکٹر ہیں اور کرکٹ میچ کھیل رہے ہیں۔ .. ایک تو وہ ہم نہیں بن سکے۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے۔

احمد فراز: فیض صاحب یہاں آپ سے تھوڑی سی گزارش کرنا چاہیں گا کہ اگر آپ کرکٹر بن بھی جاتے تو پانچ سات سال تک آپ کا جو خواب تھا وہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا، بعد میں کرکٹ سے ریٹائر ہو کر تو ادھر آنا ہی تھا آپ کو۔

فیض: یہ تو دوسری بات ہے جناب۔

احمد فراز: میں سوچ رہا تھا لندن کے حوالے سے اور انگلستان کے حوالے سے کہ .

فیض: انگلستان کے حوالے سے یہ کہ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس سے کچھ پہلے ہم نے کیمبرج میں داخلہ لیا تھا۔ جانے کی تمام

نہ ہوں مشکل تھیں۔ میری جو زندگی ہماری سیٹ تھی۔ ہم نے بہت کچھ بھی چلائے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم امرتسر کے کالج میں پڑھاتے تھے۔ کالج کرکٹ ٹیم کے صدر تھے۔ ایک سردار صاحب تھے جو ہماری کرکٹ ٹیم کو سامان مہیا کرتے تھے۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ وہاں کام کاج کر کے کام چلا لیں گے۔ سردار صاحب سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ''یہاں کیوں کرتے ہو آپ ہمارے ساتھ بزنس کیا جو جی، ہم آپ کو مال کی فروخت پر معقول کمیشن دیں گے۔ مگر ایک شرط ہے کہ نیمی جوتشی سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرنا۔ آپ کو ان سے ملنا ہوگا''۔ ہم نیمی جوتشی کے ہاں پہنچے۔ وہ کوئی پنڈت وہ جوتشی کہیں تھے ریلوے میں ملازم تھے۔ جوتشی صاحب نے ہمارا نام اور تاریخ پیدائش معلوم کی۔ کچھ حساب کیا۔ پوچھا نام تھوڑا سا لکھا وہ بولے آپ تو جاتے کہیں رہے ہیں۔ ہم نے پوچھا ''کیا مطلب؟'' تو بولے ''آپ ولایت جانے کا ارادہ رکھتے ہیں''۔ ہم نے کہا ''ارادہ نہیں بلکہ یہ طے ہے۔ ہماری جیب میں ٹکٹ ہے۔ کیمبرج میں داخلہ مل چکا ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں''۔ وہ بولے ''آپ ابھی یہاں سے کہیں نہیں جا رہے ہیں''۔ اور واقعی ہوا یہ کہ چند ہی ماہ بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہمارا انگلینڈ جانا ختم ہو گیا۔ وہاں لے جانے والا تو ممکن ہی نہیں رہا۔ اس طرح وہ انگلستان ہمارا نہ جانا ہوا۔ ہم جب سے آج تک کوئی بھی جوتشی ملتا ہے تو اس کی بات پر کچھ یقین ہو جاتا ہے اس قسم میں بھی۔

جمیل زبیری: فیض صاحب آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ بہت سی باتیں آپ کے لٹریچر میں، اپنی گفتگو میں جو مقصد بتاتی ہیں کہ آپ نے بتایا ہے۔ جو کوئی دیکھا آپ نے میں جو آپ نے بیان کیا اور ان کی طاقت کی کوئی جگہ ہے۔ اس تجربے سے واقعے نے آپ کو کس حد تک متاثر کیا؟

فیض: متاثر صرف اس حد تک کرتا ہے کہ ان کی بات سچ ہو گئی۔ کبھی کبھی تکا بھی لگ جاتا ہے۔

کراچی: کوئی ایسا کام جو آپ کرنا چاہتے تھے اور وہ نہیں ہوا؟

فیض: ایسے تو بہت سے کام ہیں جو ہم کرنا چاہتے تھے اور نہیں ہوئے اور ایسے بہت سے کام بھی ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ ہم نے کر دیے۔ ہم سمجھتے ہیں جو کام نہیں کرنا چاہتے تھے وہ ہم اس لیے نہیں کر پائے کہ جس طرح کام کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ مثلاً ہم یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو چھوڑ کر ادب خاص طور پر اردو شاعری کے بارے میں، اقتصادی اور تاریخی پہلوؤں کے بارے میں ہم کے پیچھے کر کے لکھیں کہ ہماری غزل کیسے بدلی اور کیوں بدلتی رہی۔ مختلف زمانوں میں مختلف ادوار نے کیسے اور کیوں جنم لیا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد تنقید کیسے بدلی۔ وغیرہ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو کوئی لکھی گئی ہے جس میں بہت کچھ ہے۔ اس میں ادبی معاملات پر غور کیا گیا ہے اور ادب کے جو معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں ان پر تو غور نہیں کیا گیا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہم کوئی کے سر تحقیق کر کے اس خلا کو پُر کر دیا جائے۔ یہ کافی لمبا اور محنت طلب کام ہے جو ہم ابھی تک نہیں کر سکے۔

طاہر مسعود: فیض صاحب! آدمی کی یہی خواہش رہتی ہے کہ وہ خوش رہتا ہے اور جو خواہشیں مثلاً عزت، شہرت، محبت اور خوشحالی کے حصول کی خواہش لاشعور میں ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو آپ کے اندر شاید ہی کوئی ایسی تمنا ہو جس کی تمنا آپ نے کی اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ خدا کی اتنی ساری نعمتوں کے میسر آ جانے کے بعد بھی آپ کو اپنی زندگی میں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے؟

فیض: یعنی بات یہ ہے کہ ہم نے زندگی سے جتنا مانگا تھا اس سے زیادہ ملا۔ کبھی کبھی تو ہم یہ سوچ کر بے حد افسردہ ہو جاتے ہیں کہ جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے وہ ہم سے نہیں ہو پایا شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی جم کر بیٹھنے کا۔ اپنی زندگی تو ہمیں ایک جگہ پر ٹھہر کر رہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس کے فائدے بھی ہوئے کہ ہمیں مختلف طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور ان سے بہت سے رشتے ناطے قائم ہو گئے۔

طاہر مسعود: لوگوں نے آپ کا جس بے پناہ طریقے سے خیر مقدم کیا ہے اور آپ کو جس شاندار طریقے سے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے کیا

آپ کے یہ احساسات اس کے خلاف ردِ عمل کے طور پر تو پیدا نہیں ہوئے ہیں؟

فیض: یہ بھی ایک پہلو ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی کمال پیدا نہیں کیا، جو کچھ ہمیں کرنا چاہیے تھا وہ ہم نہیں کرسکے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ مزدور کو کم معاوضہ ملے تو اُسے رنجش ہوتی ہے، اور زیادہ مل جائے تو ندامت ہوتی ہے۔ ہمیں ہماری خواہش سے زیادہ ملا ہے، اس لیے شکایت تو نہیں ہے، لیکن تھوڑی سی حیرت ضرور ہے کہ آخر ہم نے ایسا کیا تیر مارا ہے؟

طاہر مسعود: گویا آپ کی زندگی میں جتنے موڑ آئے، اس میں آپ کے ذاتی ارادوں کا کم اور حالات کا دخل زیادہ رہا۔

فیض: جی ہاں حالات ہی اس نوعیت کے پیدا ہوتے گئے جو ہمیں دھکیل کر اس طرف لے گئے۔ ورنہ ہم کبھی وہ راستہ اختیار نہ کرتے۔ بہرحال اگر جاپان اور جرمنی حملہ نہ کرتے تو ہم فوج میں نہ جاتے۔ یا پاکستان بننے کے بعد سیاسی حالات اچھے ہوتے تو ہمیں جیل کیوں جانا پڑتا۔ اس نوع کے معاملات میں ایک حد تک حالات کا دخل ہوتا ہے، اور ایک حد تک آدمی کے اپنے اختیار کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، یا تو یہ کہ سب کچھ نظر انداز کرکے حالات سے سمجھوتا کرلیا جائے یا پھر یہ کہ سمجھوتا نہ کریں اور حالات کا جو تقاضا ہے، ان تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

رحمٰن: مرزا ظفر الحسن صاحب نے متاعِ لوح و قلم میں آپ کی تقریباً سبھی تحریریں یکجا کردی ہیں، کیا آپ کے لکھے ہوئے اداریوں کو بھی کوئی صاحب یکجا کر رہے ہیں۔

فیض: پاکستان ٹائمز کے اداریوں کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے، ایک دوست رحمٰن اختر صاحب اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اور ادبِ لطیف اور لیل و نہار کراچی کے اداریے مرزا ظفر الحسن مرتب کر رہے ہیں۔

اظہر: فیض صاحب آپ عبداللہ ہارون کالج سے الگ کیوں ہوگئے؟

فیض: یہ ادارہ قومی تحویل میں لیا جانے والا تھا اور مجھے گھر بھی واپس آنا تھا۔ کراچی میں کالج بن گیا، ہسپتال بن گیا، آڈیٹوریم بن گیا، اتنا کچھ بن گیا اب آگے دوسرے لوگ چلائیں۔

اظہر: آپ نے اس ادارے کی سربراہی کیوں قبول کی تھی؟

فیض: جس علاقے میں عبداللہ ہارون کالج قائم کیا گیا اُس میں ہائی سکول کے علاوہ تعلیم کی اور سہولتیں نہ تھیں، اُس علاقے میں اکثریت غریب عوام کی ہے۔ ماہی گیر، گاڑی چلانے والے اور مزدور پیشہ لوگ جو بچوں کو کالج میں بھجوا نہیں سکتے تھے۔ یہ علاقہ بُرے لوگوں کا مرکز تھا، یہاں ہر قسم کا غیر مستحسن کاروبار کیا جاتا تھا، اکثر بچے غلط راہ پر بچپن ہی سے پڑ جاتے تھے، یہاں عبداللہ ہارون نے یتیم خانہ بنوایا تھا جو ہائی سکول کے درجے تک پہنچ گیا تھا، باقی کچھ نہیں تھا۔ اُن کے جانشینوں کی مصروفیات کچھ اور تھیں، بجز لیڈی نصرت ہارون کو اس ادارے سے دلچسپی تھی۔ لندن سے واپسی پر اُنھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم یہ کام سنبھالیں۔ ہم نے جا کر علاقہ دیکھا، بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا، یہاں پہلے انٹرمیڈیٹ کالج بنایا پھر ڈگری کالج پھر ٹیکنیکل سکول اور پھر آڈیٹوریم کچھ رقم ہارون انڈسٹری سے خرچ کی گئی، کچھ ہم نے فراہم کی۔ ماہی گیروں کی سب سے بڑی کوآپریٹو سوسائٹی تھی، انھوں نے ہمیں ڈائریکٹر بنالیا، ہم نے طے کیا کہ سوسائٹی کے اخراجات سے مچھیروں کو مفت تعلیم دی جائے اور اُن بچوں کے سب اخراجات بھی ادارہ برداشت کرے، اس کالج میں طلبہ کی اکثریت کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

اظہر: ان اُمور کے علاوہ اس ادارے کو ایک مثالی ادارہ بنانے کے لیے آپ نے کن اُمور پر توجہ دی۔

فیض: کراچی میں خاص طور سے ہنگامے، بے چینی، ہڑتالوں وغیرہ کے قصے ہوتے رہتے تھے طلبہ اور اساتذہ میں بھی رابطہ نہیں تھا، ہم

نے کوشش کی کہ اس میں اصلاح کی جائے۔ طلبہ اور اساتذہ مل کر کام کریں۔ چنانچہ ہمارے کالج میں جب ملک بھر میں ہڑتال نہیں ہوئی تو گورنمنٹ ادارے بند ہو جاتے تھے مگر ہمارا کالج کھلا رہتا تھا اور سب لوگ پڑھائی کے لیے آتے تھے۔ اس کالج کا تعلیمی معیار دوسرے کالجوں سے بالکل مختلف تھا۔ عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ کی بصیرت میں اضافے کے لیے لائبریری کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس محنت سے ہم کو بڑی مدد ملی۔ اساتذہ اپنے اپنے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھنے لگے۔ میرے خیال میں محدود وسائل کے باوجود یہ تجربہ خاصا کامیاب رہا۔

اظہر: آپ اس وقت کلچرل ایڈوائزر کی حیثیت سے جو کام کر رہے ہیں، اس کی اہمیت زیادہ ہے یا اس کام کی جو آپ نے پاکستان ٹائمز کے مدیر کی حیثیت سے سرانجام دیا۔ کیا اس وقت آپ کی حیثیت زیادہ تابناک نہیں تھی؟

فیض: اخبار نویسی بالآخر تو ہم بھول ہی جائیں گے۔

حمید: فیض صاحب! آپ اپنے ذاتی وسائل سے کوئی اخبار جاری کر سکتے ہیں؟

فیض: اب وہ صورت نہیں ہوئی جو اس وقت تھی۔ اخبار کا مالک کوئی اور ہو گا، انتظامیہ کوئی اور ہو گی۔ پہلے پالیسی ہمارے ہاتھ میں ہوتی تھی، پالیسی بنانے والے ہم خیال لوگ تھے۔ جب تک وہ لوگ ساتھ نہ ہوں جو حقیقی معنی میں اچھا اخبار کس طرح نکال سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر شعر لکھ سکتے ہیں لیکن انفرادی طور پر اخبار نہیں نکالا جا سکتا جب تک کہ پالیسی ان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کے علاوہ مجھ سے کسی نے کبھی پوچھا بھی نہیں کہ ہمارے لیے کام کرنا چاہیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں ہم سب یہ کرتے رہیں گے؟

اظہر: کیا ملک آپ سے رہنمائی کی توقع کر سکتا ہے؟

فیض: ہم تو یہ توقع رکھتے ہیں کہ کوئی شخص ہماری رہنمائی کرے۔ ہم نے شعروں کی تمام باتیں سب اہل علم کو جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا تھا اور راستہ اختیار کیا تھا۔ آپ ہماری رہنمائی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟

اظہر: آپ اس وقت جو کام کر رہے ہیں اس میں آپ کی ذاتی رائے کو کس حد تک دخل ہے یا اس کی چوٹی کسی اور کے ہاتھ میں بھی ہے؟

فیض: اس وقت ہمارا کام محض مشورہ دینا ہے۔ کوئی مانے نہ مانے۔ ہم تو صرف کہہ سکتے ہیں۔

اظہر: آپ نے پاکستان آرٹس کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے کئی سال تک کام کیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ثقافت کی ترقی کے لیے کیا کیا؟

فیض: پاکستان آرٹس کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے میں نے بہت سی تجاویز حکومت کو پیش کی تھیں جن میں پاکستان نیشنل آرٹ گیلری، پاکستان نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فوک لور، نیشنل اکادمی آف لیٹرز وغیرہ کا قیام تھا اور فنکاروں کی مالی امداد اور ان کی ضروریات کے مناسب انتظام کی سفارش کی تھی۔ اس کے علاوہ صوبائی اور ضلع کی سطح پر ثقافتی اداروں کی تشکیل تھی۔ ان میں سے کچھ ادارے پر عمل درآمد کی ابتدا ہو چکی ہے لیکن اب تک زیر غور ہیں۔ میری موجودہ ذمہ داری صرف ثقافتی امور میں مشورہ دینا ہے جہاں تک پہنچانا ہے کہ حکومت کرنا ہے یہ ہم کرتے رہیں گے۔"

حمید: فیض صاحب، اب ایک ہلکا پھلکا سوال۔ آپ کو نثر سے غزل میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ نے بہت سے شعر کہے ہیں۔ ان کے پیرایہ اظہار آپ کی شاعری میں بھی ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کس شاعر نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

فیض: ویسے روایتی جواب تو یہ ہے کہ سارا ہی ہے۔ لیکن یہ مشکل ہے کہنا۔ اس وجہ سے کہ کبھی ایک صورت پسند آتی ہے تھوڑی دیر بعد دوسری صورت نظر آ جاتی ہے لگتا ہے کہ یہ زیادہ اچھی ہے۔ یہ قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ اگر ہم غور کریں کہ ذہن پر نقش کس کا باقی ہے تو سب سے زیادہ نقش تو شیخ کا ہے۔ اس کے بعد پھر کہ جو ہے [illegible] مطلب کی ہے مرشد کا تھا بھی ہے۔

مسعود: شخصیتوں کے معاملے میں بھی یہی بات ہے۔

فیض: شخصیتوں کے بارے میں یوں ہے کہ کچھ تو ایسے لوگ ہیں جن سے ہم مرعوب رہے (انھیں چھوڑ دیجئے جنھیں کتابوں میں پڑھا) لیکن ذاتی طور پر جن کا نقش ذہن میں بہت گہرا ہے تو ان لوگوں میں سے تو ایک ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں اگر ہم نے قلندر دیکھا ہے تو وہ ذاکر حسین صاحب تھے۔ دوسری سیاسی شخصیت تھی شیخ عبداللہ کی افتخار خان سے ہم ملے ہیں۔ گاندھی جی سے بھی ملے ہیں۔ تو کہا [illegible] سے سرسری ملاقات ہوئی مگر وہ جب سے ہم ضرور ملے لیکن ان کو ہم اس صف میں شامل نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے وہ بہت عظیم شخصیت تھے۔ پھر جینے والوں میں ایک تو [illegible] اور [illegible] سے اعتبار میں سب سے قریب سجاد ظہیر اور [illegible] اور ان سب سے زیادہ تھے۔

مسعود: سیاسی شخصیتوں میں یاسر عرفات سے آپ بہت قریب رہے۔

فیض: ہاں! ایک یاسر عرفات ہیں۔

مسعود: اب آخر میں آپ یہ بتائیے کہ کیا پروگرام ہے آپ کا۔

فیض: ابھی نظم کے لیے تو کسی پروگرام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے دوسری کچھ مشکل نہیں آ رہی ہے کہ ہم کیا شروع کریں۔ اس سے میں [illegible] پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ پچھلے چار پانچ سال کا Back Log ہے اسے پورا کر لیں۔ چنانچہ دیکھئے دو تین سال کے رسائل اور کتابیں منگائی ہیں تا کہ اس عرصے میں جو ذہنی رکاوٹ ہے اسے صاف کیا جائے۔ پھر ذہن میں بہت سی باتیں ہیں لیکن ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

نگار عارف: آپ نے کہا تھا کہ گاندھی کی آواز پر بھی تو آپ نے نظمیں لکھے تھے۔

فیض: ہاں! ان دنوں ہم لیڈر تھے۔ [illegible] سے نغمے ہم نے لکھے جیسے "آتی ہے [illegible]....."

[illegible]: عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے ابتدائی عمر یا دور کو سیاسی زندگی شمار کیا ہے۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟

فیض: یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن ہم حساب نہیں کر سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ یا چھ سال کے بعد انسان کو اپنا کام بدل لینا چاہیے جیسے ہم نے پہلے پانچ سال پڑھایا۔ پھر پانچ سال فوج کی نوکری کی۔ پھر اس کے بعد پانچ چھ سال صحافت کی نذر کر دیے۔ اس کے بعد پانچ سال جیل خانے گئے۔ اس کے بعد ہم نے کچھ کام کیا۔ چار سال [illegible] سے ہم سمجھتے ہیں کہ آدمی کو کسی ایک رٹ میں نہیں لگا رہنا چاہیے۔

حسن رضوی: ایرانی انقلاب کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

فیض: ایرانی انقلاب تو بڑا انقلاب ہے اور فرانسیسی ریوولوشن کے بعد اس قسم کا انقلاب دنیا میں نہیں آیا۔ روس، چین، ویت نام وغیرہ کے انقلابوں میں فوجوں کے درمیان جنگ تھی۔ ایران میں براہ راست عوام کی فوج اور مسلح اداروں سے لڑائی ہوئی ہے۔ یہ صرف عوام نے فتح کر دیا ہے۔

آصف فرخی: [illegible] آپ باہر گئے ہوئے تھے، یہاں پاکستان میں ایک عام خیال یہ تھا کہ اس سب کو [illegible] ہو جائے گا

اور اسی پس منظر سے اگر کسی ترجمان تھا مگر پھر بھی لوگوں نے کہا کہ اس کی پالیسی سے مغرب والوں کو اختلاف ہے۔ افغانستان کے مسئلے پر اور آپ روس نواز ہیں، اس لیے آپ کے اس سال یہ انعام جیتنے کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ تو اس پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

فیض: ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اول تو نوبل پرائز ہی تو کئی طرح کے۔ یہاں تو لکھا کسی آدمی کے حوالے کیا جاتا ہے۔ کئی امیدوار ہوتے ہیں۔ ذہن پر تو محدود کیا جاتی ہے۔ بعد میں انہیں تو اپنے تجربے ملی تھی کہ جب نامزدگی ہوئی ہے ضروری تو نہیں ہے کہ ہر کسی کو انعام ملے۔ اکثر ہوتا ہے جیسا کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل پانچ سال پہلے الفریڈ نوبل کی کتاب کو ملنے والا ہے۔ ان کو پانچ سال سے یہی کہا جاتا رہا ہے کہ پچھلے سال انہیں ملے گا دو انعام ہے تو اس میں اس دور کا فلسفہ نہیں ہے۔ ہم کوئی دور کے کہنے پر نہیں ہیں۔ تو یہ ہم کہتا تھی جو ان کا اپنا طریقہ ہے اس طریقے سے جب انھوں نے مارکیز کو انعام دیا۔ مارکیز بہت بڑا مصنف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اسے ملنا چاہیے تھا۔ انعام سے پہلے بڑا ادیب ہے۔

حسن رضوی: آج کل ہمارے ہاں ایک اصطلاح چلی ہوئی ہے محب وطن اور غیر محب وطن۔ آپ اس کی تعریف کیا پسند فرمائیں گے؟

فیض: ابھی تک یہ بات ہم جانتے ہیں، غیر محب وطن کے بارے میں معلوم نہیں۔ محب وطن کے معنی تو اس لفظ میں موجود ہیں۔ جہاں سے اختلاف ہوتا ہے اس کا تعلق حب الوطنی یا غداری سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق آپ کے نظریے سے ہے کہ آپ کے نزدیک حکومت کیسی ہونی چاہیے۔ جو آپ سے متفق نہیں ہیں ان کو آپ غیر محب وطن کہہ دیتے ہیں۔ یہ جھگڑا ہمارے ملک کے علاوہ کہیں رائج نہیں ہے۔ انگلستان میں بہت سے مخالف گروپ ہیں لیکن وہ آپس میں ایک دوسرے کو غیر محب وطن نہیں کہتے۔

سعادت سعید: آپ کے تنقیدی مجموعہ "میزان" کے بعد بھی لوگ آپ کی تنقید کے منتظر ہیں۔ آپ نے تنقید کے میدان سے کنارہ کشی کیوں کی؟

فیض: ہمارا کوئی کالم نہیں تھا۔ "میزان" میں جو کچھ ہے وہ ریڈیو کی تقریریں ہیں۔ اس زمانے میں ریڈیو کے پروگرام پروڈیوسر مرحوم کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ریڈیو پر ہوتے تھے۔ مسائل پر بحث، ڈاکٹر تاثیر اور ہم بیٹھ کر پروگرام وضع کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کے لیے تقریر لکھنا آج کی طرح نہیں تھا کہ کچھ سوچے سمجھے کوئی چیز تیار کر لی۔ بحث کرنی پڑتی تھی اور ریڈیو کا اپنا ادارہ بھی بہت بڑا تھا۔ میرے بیشتر تنقیدی مضامین اسی زمانے کے ہیں۔ پھر ہم نے "ادب لطیف" کی ادارت بھی کی۔ اس کی وجہ سے تنقیدی مضامین لکھنے پڑے۔ اس کے بعد ریڈیو اور رسالے سے رشتہ ٹوٹ گیا اور ہم فوج میں چلے گئے۔ وہ وقت ہی نہیں ملا۔ واپس آئے تو پاکستان ٹائمز کی ادارت ہمارے حوالے کر دی گئی۔ اب یہ وقت بالکل ہی نہیں تھا۔ پھر تنگ آ گئے تو جیل خانے میں تنقید لکھنے کی بجائے شاعری پر اکتفا کیا۔ بعد میں تنقید کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔

حسن رضوی: ریڈیو اور ٹی وی پر ان کے پروگراموں کے بارے میں آپ کا خیال؟

فیض: ٹی وی کم ہی دیکھتے ہیں یا کبھی دیکھتے ہیں، اس سے زیادہ کوئی رائے نہیں ہے۔

قتیل شفائی: آپ فلمی تو نہیں ہو گئے؟

فیض احمد فیض: قسم کی بات ہے حضرت شمن۔

ناز خیالوی: فلمیں کیوں نہیں ہوئیں؟

فیض احمد فیض: [illegible] تھا۔

[illegible]؟

[illegible]؟

فیض احمد فیض: [illegible]۔

رضی: آپ کی [illegible] آپ کے [illegible] ہے؟

فیض: [illegible] ڈاکٹروں کے [illegible] ہوں۔

رضی: آپ [illegible] ہے؟

فیض: ہاں! اب بھی [illegible]۔

رضی: [illegible] ہے؟

فیض: [illegible] ہیں۔

رضی: آپ کا [illegible] نہیں رکھتے؟

فیض: [illegible] ہیں۔

رضی: [illegible]؟

فیض: آپ [illegible] ہے۔

رضی: [illegible]؟

فیض: [illegible] 1955 [illegible] ہے۔

رضی: آپ کی [illegible]؟

فیض: [illegible] ہے۔

رضی: [illegible]؟

فیض: [illegible] گیا۔

رضی: [illegible]؟

فیض: [illegible] گیا۔

ذوالفقار بخاری: آج کل ہر ادبی پرچے میں زیادہ تر مذہبی شاعری دیکھنے میں آ رہی ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

فیض: ہر دور میں حکومت کے طریقِ کار اور حکمتِ عملی سے بھی لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ حمد اور نعت ہر دور میں کہی گئی ہے۔ ہر دیوان کا آغاز ان سے ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال اور دیگر بڑے شعرا نے مذہبی حوالوں سے شاعری کی ہے۔

اجمل نیازی: "دستِ تہِ سنگ" میں آپ کی ایک نظم حمد کے عنوان سے جس میں زندگی کے متعلق باتیں کہی گئی ہیں، کیا اس میں آپ نے زندگی کو خدا سے مربوط کر کے دیکھا ہے؟

فیض: زندگی خدا ہی نے پیدا کی ہے۔ ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہیں۔ ان کے حوالے سے نظم لکھنا ایک نوع کی حمد ہے کہ ان کا تعلق خدا سے ہے۔

رحمٰن: جب بات روایت کی چل نکلی ہے تو ہمارے یہاں مذہب کے اثرات اور اس کی روایتیں بھی تو ہیں؟

فیض: یہ تو ہمارے نظام کا مجموعی ڈھانچہ ہے۔ لیکن ان روایتوں کا اظہار دو طریقوں سے ہوا ہے ایک تو صوفیوں کا طریقِ اظہار ہے جب کہ دوسرا محض رسمی۔ رسمی طریقِ اظہار میں سطحی باتوں پر زور دیا گیا ہے جب کہ صوفیوں کا طریقہ اس سے بالکل الگ رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ حضرت رومیؒ میرے مرشد ہیں۔

افضل: کیا یہ صحیح ہے کہ جب آپ جیل میں تھے تو قیدیوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے تھے کوئی اور تعلیم نہیں؟

فیض: یہ بالکل صحیح ہے کہ میں قیدیوں کو قرآن وحدیث پڑھایا کرتا تھا۔

افضل: موجودہ دور کے کسی اسلامی مفکر سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟ اور اگر ہوئی ہے تو کس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے۔

فیض: اس دور کے آخری مفکر تو اقبال ہی تھے۔ اُن سے قبل شبلی نعمانی اور مولانا آزاد تھے۔ مجھے سید سلیمان ندوی سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا ہے اور مولانا آزاد سے بھی سرسری طور پر ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے لیکن میں زیادہ قریب تر جن سے رہا اور جن کی مجلسوں میں میں اکثر بیٹھتا تھا وہ ذات تھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی۔ بلاشبہ اُن کی ذات سے میں نے کافی کسبِ فیض کیا ہے۔ ویسے میں نے بچپن ہی سے کوئی سات سال کی عمر میں اپنے شہر کے سب سے بڑے عالم مولانا ابراہیم صاحب مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور روزانہ درسِ قرآن میں شریک ہوا کرتا تھا۔

افضل: انتہائی ادب کے ساتھ ایک ذاتی سوال پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں وہ یہ کہ جس طرح جگر مرحوم نے آخری وقت میں تصوف کو گلے لگایا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بھی اس خصوص میں اُن کا اتباع کریں؟

فیض: امام صاحب پہلے یہ بتایئے کہ تصوف کا تصور آپ کی نگاہ میں کیا ہے۔ میں تو اپنے آپ کو ادنیٰ طریقے سے تصوف کا پیرو سمجھتا ہوں۔ اس مسلک پر تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے مگر رشتہ طریقت تو میرا ابھی اُن ہی سے چلتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شک و شبہات کی بنیاد پر لوگوں نے الزام تراشی کا وتیرہ اختیار کر رکھا ہے۔ کسی پہ کچھ الزام چسپاں کر دو۔ کسی پر کوئی بہتان عائد کر دو۔ یہ سب اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ ان طریقوں سے اسلامی تعلیمات کی توہین کی جاتی ہے۔

افضل: موجودہ دور کے علما جیسے مولانا طیب صاحب یا مولانا مودودی یا مولانا علی میاں سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟!

فیض: مولانا مودودی صاحب سے میری اکثر و بیشتر ملاقات رہی ہے کبھی جیل کے اندر اور کبھی جیل کے باہر، لیکن میں نے دینی معاملات پر کبھی اُن سے تبادلہ خیالات نہیں کیا۔ اس لیے کہ اُن کا ایک سیاسی مسلک بھی ہے دین کے علاوہ، اور وہ اس طرح

بات یہ ہے کہ مجھے اشتراکیت کی کوئی صورت نظر نہیں آئی [illegible] اس کے علاوہ انھوں نے اپنی بھی روحانی موضوعات کو نہ چھیڑا اور میری عادت یہ ہے کہ میں ذہنی معاملات پر بحث نہیں کرتا۔

احسن بخاری: آپ کے گھرانے [illegible] پیر اور گدی [illegible] بھی رکھتے ہیں جو صوفیوں کی صفات ہیں۔ ہمارے بعض [illegible] تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کے باطن میں بھی روشنی ہے؟

فیض: [illegible] کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ اگر شعر و ادب کے طریقے سے دیکھا جائے تو ہماری شاعری تصوف ہی سے ہے۔ اس کی [illegible] اہلِ باطن [illegible] سے متعلق ہے۔ طریقت اور شریعت کے تقاضات ہمارے [illegible] اہلِ طریقت انسان دوستی، محبت اور آشتی کا درس دیتے تھے اور زندگی اور دنیا پر تنگ نظری اور تعصب کے خلاف تھے۔

[illegible]: [illegible] آپ [illegible] میرے [illegible] ایک [illegible] سے آپ کے ساتھ [illegible] وہاں آپ نے ایک عرس پر حاضری دی تھی۔ آپ کی دستار بندی بھی ہوئی تھی اور آپ نے روحانی [illegible] آپ [illegible] کرتے ہیں؟

فیض: یہ ہمارے بچپن کا قصہ ہے۔ ہم تو بھائی آدمی ہیں [illegible] عرس [illegible] ہوتا تھا [illegible] لالٹین کی روشنی [illegible] پڑھے جاتے تھے [illegible] تھے اور دیہات کے لوگ [illegible] کرتے تھے۔

[illegible]: ایک [illegible] آپ نے فرمایا تھا کہ [illegible] کے قطعے پر ایک گاؤں [illegible] آپ کا [illegible] تھی۔ اس کے بارے میں فرمائیے؟

فیض: مرزا صاحب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا [illegible] وہاں [illegible] بادشاہ تھے۔ ہمارے ابا ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ہم بچے [illegible] بادشاہ کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ یہ بات بہت [illegible]

اشفاق احمد: فیض صاحب نے کہا ہے کہ شاعری کے [illegible] تو صوفی ہیں [illegible] کہ آپ [illegible] کے ساتھ [illegible] ایک [illegible] کی حیثیت میں کرتے ہیں [illegible] تیسری بات یہ ہے کہ صوفی [illegible] صاحبِ حال ہوتا ہے یا صاحبِ حال کی بات کرتا ہے [illegible] سے یہ بات پوچھتے ہیں [illegible] ہیں کہ وہ کتاب کو باطن سمجھتے ہیں اور حال کی بات کو پسند کرتے ہیں۔

فیض: [illegible] جب تک [illegible] نہیں پہنچے تھے [illegible] کا معمول یہ تھا [illegible] نماز پڑھنے لے جاتے اور [illegible] کے بعد [illegible] اس سے یہ [illegible] انسان کی [illegible] لازمی ہے۔ ہم نے [illegible] کی ہے کہ [illegible] اور ایک حدیث بھی ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ [illegible] نظر رکھا جائے۔

[illegible]: [illegible] صاحب آپ نے [illegible] کی [illegible] تکمیل کی ہے۔

فیض: [illegible] ہم [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] شغل [illegible] ہم نے [illegible]

حسن رضوی: علمائے دین میں سے بھی کسی سے آپ متاثر ہوئے ہیں؟

فیض: جی ہاں سید سلیمان ندوی، عطاءاللہ شاہ بخاری سے بہت سے علما اور شعرا سے صوفی تبسم کے گھر میں ملاقات رہی ہے، کیوں کہ شہر سے باہر کا جو بھی کوئی عالم یا شاعر آتا تھا شام کو اس کی نشست صوفی تبسم کے گھر میں ہُوا کرتی تھی۔ وہیں سلیمان ندوی سے ہماری ملاقات ہوئی۔ میراجی نے میرے ایک مصرع "خوابوں کی مشعل گل ہیں" پر ادبی دُنیا میں اعتراض کیا تھا۔ میراجی کو عربی کہیں آتی تھی، میں نے سید سلیمان ندوی کو نظم سنائی۔ انھوں نے بڑی داد دی اور کہا مشعل گل ہیں میں کیا خرابی ہے، بالکل درست استعمال ہے۔ انھوں نے سند کے طور پر حافظ کا مصرع پڑھا کہ "کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است"

حسن رضوی: مولانا مودودی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فیض: جیل خانے میں اُن سے سرسری ملاقات رہی۔ جب میں امرتسر میں تھا تو انھیں اپنے کالج میں بھی بلایا تھا۔ نثر بہت اچھی لکھتے تھے، اور اپنے نظریے کے حوالے سے عالم آدمی تھے۔

قتیل شفائی: اسلامی ادب کی تحریک کے سلسلے میں کچھ فرمایئے۔

فیض: ہمارے خیال میں مسلم ممالک میں مسلمان لکھنے والوں کی ادبی تحریک اسلام ہی کا حصہ ہے۔

اجمل نیازی: عربی ادب کے مطالعے نے آپ کی شاعری پر کیا اثرات ڈالے ہیں؟

فیض: ہم نے اسے جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔

شفیع عقیل: فیض صاحب! ایک بات پوچھوں۔ بڑی رسمی سی بات ہے کہ آپ نے ابتدا میں جب شاعری کی طرف رجوع کیا تو کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا یا صرف شوق یا کوئی ماحول کا اثر تھا؟

فیض: شاعری کی طرف رجوع کرنا اوّل تو پہلے یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دماغ میں یا ذہن میں شاعری کا کوئی کیڑا موجود ہے یا نہیں؟ پہلی شرط تو وہ ہوتی ہے۔ دوسری شرط یہ کہ کوئی جذباتی تجربہ اس قسم کا ہو جس کو شعر میں منتقل کرنے کی اُلجھن ہو۔ تیسرے یہ ہے کہ آس پاس کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات اس قسم کے ہوں کہ اُن کا دماغ یا ذہن پر اتنا بوجھ پڑے کہ آدمی اُن کے اظہار کی کوشش کرے۔ تو یہ بھی چیزیں ایک جگہ تھیں، کہ جب ہم نے لکھنا شروع کیا تو اقتصادی بحران کا زمانہ تھا۔ اس بحران میں بے روزگاری، غربت اور افلاس، ہمارے معاشرے میں ایک کرب و اضطراب کی کیفیت تھی۔ پھر اپنے ذاتی تجربے بھی ہوتے ہیں وہ بھی تھا۔ تیسرے یہ ہمیں حُسنِ اتفاق سے اساتذہ ایسے مل گئے جو لاہور شہر میں جمع تھے۔ ہمارے شہر سیالکوٹ میں بھی مشاعروں کا کافی چرچا تھا۔ علامہ اقبال کی وجہ سے اور کچھ شاعروں کی وجہ سے، ہمیشہ سے تعلیمی معیار سے اور ثقافتی اعتبار سے ترقی یافتہ شہر تھا۔ پھر ہم جب لاہور اُٹھ آئے تو یہاں پر جمگھٹ تھا ستاروں کا۔ خوش قسمتی سے طالب علمی ہی کے زمانے میں ہمیں اُن کی محفل میں داخلے کا شرف حاصل ہو گیا۔ پھر مرکزی نکتہ جو تھا وہ صوفی تبسم کا گھر تھا اور اُن کی بیٹھک تھی۔ شام کو وہاں سب جمع ہوتے تھے۔ سالک صاحب، حسرت صاحب، ہری چند اختر اور ڈاکٹر تاثیر کی صحبت حاصل ہوئی اور تھوڑے ہی دنوں میں اُن کی صف میں شامل ہو گئے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے شاعری شروع کی۔

شفیع عقیل: اس سلسلے میں اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ اچھی شاعری کے لیے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ چیزوں کا لفظ میں نے غلط استعمال کیا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

فیض: سب سے پہلے تو جو چیز کام آنا چاہیے جو خدا کی دین ہے۔ یہ آدمی خود پیدا نہیں کر سکتا۔ ہے تو ہے، نہیں ہے تو نہیں ہے۔ اس

کے بعد پھر یہ کہ آدمی کی نظر کتنی وسیع ہے اور آپ کے دل میں جگہ کتنی ہے۔ اگر آپ صرف اپنی ذات تک اپنی نظر محدود رکھیں تو اس میں بھی اچھی شاعری پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ محدود قسم کی شاعری ہوگی لیکن اگر آپ یہ تین دائرے سمجھ لیں۔

1۔ اپنی ذات کا دائرہ۔

2۔ معاشرے کا دائرہ۔

3۔ ساری دنیا کا دائرہ یعنی عصر انسانی برادری کا دائرہ۔

ان میں آدمی نے جو بھی لکھنے کی کوشش کی ہے اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ ایک تو یہی ایک بات ہے، دوسری بات وقت کے اعتبار سے ہے یعنی دوسرے تین دائرے وقت کے ہیں۔ ایک تو ماضی ہے۔ اس کی روایت کے بارے میں آپ کی آگاہی کتنی ہے؟ اور اس سے آپ کا کتنا ربط ہے؟ دوسرے یہ کہ معاصر وقت کے جو تقاضے ہیں اور جن حالات میں آپ زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں انسان پر کیا گزر رہی ہے؟ اس پر آپ کی کتنی نظر ہے؟ یہ دائرہ ایسا ہے جس کا آپ کے معاصر وقت کے حقائق کا دائرہ۔ تیسرے یہ کہ آنے والا وقت ہے اس کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی ہیولیٰ ہے یا نہیں؟ یا آپ کو ماضی اور حال کو سامنے رکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں کوئی خواب دکھائی دیتا ہے یا نہیں؟ یہ تینوں چیزیں ایک طرف مکانی دائرے ہیں اور دوسری طرف زمانی دائرے۔ ان میں جس قدر وسعت ہوگی، وسعتِ نظر اور وسعتِ نظریہ ہوگی اس کے مطابق کسی فن کار یا ادیب کی تخلیقات کا معیار ہوگا اور یہی اس کا مقام ہوگا۔

شفیع عقیل: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی غزل کی شاعری نمایاں ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نظم کے شاعر ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر سوچا ہے؟

فیض: نہیں سوچنے کا تو سوال ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ کوئی مضمون آتا ہے تو غزل کی صورت میں ہے یعنی اگر کسی اچھا سا مصرع ذہن میں آ گیا۔ غزل میں تو پہلے سے موجود ہے۔ اگر کوئی ذہن میں آئی، مجرد ذہن میں آ گئی اور معلوم ہوا کہ جو کچھ کہنا ہے وہ اس صورت میں بہتر طریقے پر ادا ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس نظم میں تو آپ کو خود طے کرنا پڑتا ہے کہ اس کی ہیئت کیا ہے۔ تو بعض موضوعات میں اتنا پھیلاؤ ہوتا ہے کہ ان کو غزل میں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ نظم کی صورت میں ادا ہو سکتا ہے۔ تو ہم نے کبھی شعوری طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا کہ اب نظم لکھیں۔ وہ تو آتا ہے۔ شعر اپنے ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔

شفیع عقیل: فیض صاحب! آپ کا کیا خیال ہے ہمارے ہاں جو یہ رجحان ہے اب نثری ادب کا پلہ بھاری ہے یا نظم یعنی منظومات کا؟

فیض: یہ جس کے بارے میں تو کوئی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھئے آج کل تو ادب کا جو کچھ حصہ ہے وہ نظم ہی میں لکھا گیا ہے۔ تو جو لوگ شاعری کرتے ہیں وہ شعر کہنے والوں کو کہتے ہیں۔ شعر آسانی سے لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی زبانی ذریعہ ہیں۔ پھر مشاعرے کا ادارہ موجود ہے۔ اس کی وجہ سے شاعری کو سننے والے اور پڑھنے والے زیادہ مل جاتے ہیں۔

شفیع عقیل: کیا نثر میں آزاد نظم بھی ہو سکتی ہے؟

فیض: ہاں! شعر تو آپ نثر میں کہتے ہیں، موسیقی میں تو غزل کہتے ہیں۔ پھر نظم کا ذریعہ ہاتھ آ گیا اس سے شعر لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ تب یہ کہ جس نثر کو ادا کرنا ہو وہ سب سے پہلے اس طرف توجہ دیتا ہے۔ پھر یہ معنوی کاری کی ہے۔ اس کے لیے آخر زندہ رہتا ہے۔ شاعر کا آخر یہی ہے کہ زندہ ہو کر موجود ہے۔

شفیع عقیل: منظومات کی بات پر ذرا تخصیص کر لیں کہ ہمارے ادب میں نظم جاندار معلوم ہوتی ہے یا غزل؟

فیض: بھئی یہ تخصیص مشکل ہے کیوں کہ جو غزل اچھی ہے وہ لکھنا زیادہ مشکل ہے ایک اچھی نظم لکھنے سے۔ کیوں کہ غزل میں اساتذہ اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ اس میں کوئی نیا راستہ پیدا کرنا، کوئی نیا موضوع یا مضمون، نئی طرزِ ادا اور نئے الفاظ، استعارے اور نئے تلازمے پیدا کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے نظم نسبتاً آسان ہے۔ مختلف ادوار میں کہیں نظم کا رواج زیادہ رہا اور کہیں کم۔ جیسے 1935ء۔1930ء میں مثلاً لوگ کہتے تھے، یہ غزل تو بہت پرانے زمانے کی ہے۔ بالآخر غزل پیچھے رہ گئی لیکن اس کے بعد غزل میں ایک نیا رنگ آیا اور پھر سے اس کا عروج شروع ہو گیا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غزل کو یا نظم کو برتری حاصل ہے، یہ تو منحصر ہے اس پر کہ اچھی غزل کس نے کہی یا کس نے اچھی نظم کہی۔

شفیع عقیل: فیض صاحب! آج کل جو نثری نظم لکھی جا رہی ہے وہ آپ کو پسند ہے یا ناپسند؟ اس کے بارے میں کچھ کہیں؟

فیض: اس میں بھی یہ ہے کہ لکھنے کی کوئی بات ہو، جذبہ ہو اور مفہوم ٹھیک طریقے سے ادا ہو جائے تو وہ نظر آ جاتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نظم ہوتی ہے یا نثر ہوتی ہے۔ نثری نظم کوئی نہیں ہوتی۔ نظم میں جو ایک تلازمہ اس کا ہے کہ اس میں کوئی آہنگ، لحن اور لے ہونی چاہیے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ عروض ہو۔ اس میں ایجادات بھی ممکن ہیں اور اختراعات بھی، لیکن نالے کو پابندِ لے کرنا ضروری ہے۔ حیات کی کوئی بھی لے ہو وہ اس میں نظر آئے کہ وہ نظم ہے نثر نہیں، کیوں کہ نثر بکھیرنے کو کہتے ہیں اور نظم یکجا کرنے کو۔ تو نظم تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قاعدہ قانون ہے۔ وہ قاعدہ آپ اپنا لیجیے۔ اُستادوں کو نہ مانیے لیکن قاعدہ تو ہونا ہی چاہیے۔

شفیع عقیل: آپ علامہ اقبال سے بھی ملے ہیں۔ اس بارے میں کچھ بتایے؟

فیض: اقبال تو ایک طرح سے ہمارے چچا تھے کیوں کہ ہمارے ابا کی اُن سے دوستی تھی۔ ہمارے ابا نے اور اُنھوں نے ساتھ ساتھ بیرسٹری کی۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو وہ لاہور جا چکے تھے، لیکن جب ہم نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ہمارے ابا ہمیں اُنھی کے پاس لے گئے تھے، سفارشی خط کے لیے۔ قاضی فضل حق فارسی کے پروفیسر ہُوا کرتے تھے۔ اُن کے نام علامہ سے خط لیا تھا اور اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے خط لے لیا۔ ہم کہا کہ یہ خط پڑھ کر واپس کر دیجیے۔ ہمارا خیال تھا کہ خط اپنے پاس رکھ لیں گے لیکن قاضی صاحب نے خط ہمارے حوالے نہ کیا، اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں علامہ سے ہماری دوسری ملاقات ہوئی۔ ہم نے گورنمنٹ کالج میں مسلم طلبہ کی ایسوسی ایشن بنانے کی کوشش کی۔ اُس زمانے میں ہم بھی مسلم لیگی ہُوا کرتے تھے۔ تو جب ہم اُن کی خدمت میں پیش ہوئے ہمارے ایک دوست شیخ محمد حمید اور ایک چودھری ساتھ تھے کہ آپ ہماری ایسوسی ایشن کا افتتاح کیجیے تو فرمانے لگے:

''میاں، میں تو کہیں جاتا نہیں اور پھر تم کسی ایسے آدمی کو بلاؤ جو تمھیں پیسے ویسے بھی دے''۔

اُنھوں نے کہا: ''نواب ابراہیم علی خاں بیٹھے ہیں۔ انھیں لے جاؤ۔ یہ تمھاری امداد بھی کر دیں گے''۔

اس کے بعد جب ہم نے پڑھانا شروع کیا تو ہمارے اساتذہ پطرس، تاثیر، صوفی تبسم، حسرت اور سالک صاحب وغیرہ جن کے ہاں ہم اکثر حاضر ہُوا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ دو چار بار ہم نے بھی حاضری دی۔ پھر جب علامہ اقبال راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے لوٹے تو ایک یومِ اقبال کا اہتمام رکھا گیا اور اس میں موضوع ''اقبال'' رکھا گیا۔ ہم نے نظم لکھی اور ہمیں تمغا مل گیا۔ بعد میں صوفی تبسم نے اصرار کیا کہ ہم علامہ کو یہ نظم سنائیں۔ خیر وہ تو ہماری ہمت نہیں پڑی۔ ہم نے اُنھیں لکھ کر بھیج دی۔ صوفی تبسم نے بتایا کہ اُنھوں نے تعریف کی۔ ہم نے وہ نظم چھپوائی نہیں، شاید ''راوی'' والوں نے چھاپ دی تھی۔

سمجھتا ہے۔

شفیع عقیل: بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت سے ادیب اور شعرا اخبارات سے منسلک ہو گئے اور ان کے کچھ اقتصادی مسائل بھی حل ہو گئے۔ مالی آسودگی اور آرام میسر ہوا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: ہاں ایسا بھی ہے۔ ہماری جوانی کے زمانے میں شعر و ادب کے پیسے کوئی نہیں دیتا تھا۔ اب مشاعرے ہیں، رسالوں میں۔ یہ بھی کہ جب تقسیم کے بعد ریڈیو بنا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں شاعروں کو معاوضہ دینا شروع کیا ہے اور یہ بجائے خود ایک ترغیب ہوتی ہے نئے لوگوں کے لیے۔ تھوڑا سا ان کے پیٹ بھرنے کا سامان پیدا ہو گیا اور شعر کہنے کی ترغیب بھی پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے یہ اچھا اقدام ہے۔

انجم: آپ نے اقبال کے منظوم فارسی کلام کے ترجمے کی جو خواہش ظاہر کی ہے اس کام میں آپ کیا پیش رفت کر سکے ہیں۔

فیض: جو کچھ ہم پر اور پوری دنیا پر پچھلے تیس برس میں گزری ہے، اپنے دور کے حوالے سے آپ بیتی اور جگ بیتی، تاثرات اور مشاہدات کو مرتب کر کے پیش کرنے کی خواہش تھی۔ وقت ملا تو ممکن ہے یہ کام مکمل کر لیتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ یہ کام کر سکوں۔

انجم: آپ نے ترکی کی شاعری کے کلام کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ کیا وہ کام مکمل ہو چکا ہے؟

فیض: قریب قریب مکمل ہے۔ مجھے یہ کام آہستہ آہستہ کرنا رہتا ہے۔ جب کبھی فرصت ملتی ہے یہ کام جاری ہے۔

انجم: روسی میں آپ نے کس شاعر کو ترجمہ کیا ہے۔

فیض: کئی ترکی شاعروں سے جانی ہے۔

انجم: آپ نے اپنے مجموعہ کلام کے دیباچے کے لیے ن۔ م۔ راشد صاحب کو منتخب کیوں کیا، جب کہ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے نہیں تھا بلکہ وہ اس سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔

فیض: ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ شاعر وہی تھے۔ ذاتی دوستی بھی شامل تھی اور ایک حد تک وسیع معنوں میں انھیں ترقی پسند بھی سمجھتا ہوں۔

انجم: راشد صاحب نے آپ کو محسوسات کا شاعر قرار دیا ہے، کیا اس بات سے آپ کو اتفاق ہے؟

فیض: مجموعی طور پر یہ بات درست ہے۔ ہم نے فلسفہ کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن ہماری شاعری میں ایک فکری عنصر ضرور ہے۔ اظہار کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ کسی کو ایک چیز پسند ہے، کسی کو دوسرا طریقہ۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ دریا سے حقیقت جتنی تقریر ہو، "ہم نے یہ سمجھا ہے اور قلم کرتے رہیں گے" تک بھی جگہ انقلاب کا ظہور ہوتا ہے یعنی محسوسات کا دل ہو تو ہم کہتا ہے ہم سمجھتے ہیں۔ ایسی دو نظموں کو سمجھنے کی کوشش کرتے کہ یہ تصویریں دیکھ کر ایسا کرنا ممکن ہے لیکن اس میں تھوڑی سی مدد کی کی جاتی ہے۔

فاروق خالد: آپ شاعری میں کن شخصیات سے متاثر ہوئے ہیں؟

فیض: میرے کلاسیکی اساتذہ شاعری میں سعدی سے لے کر غالب تک کا نام آتا ہے۔ اور میرے اپنے معاصرین علامہ اقبال، حسرت موہانی اور اے۔ ایس۔ بخاری ہیں جن سے میں نے فیض حاصل کیا ہوں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور صوفی تبسم کی شاعری سے میں نے فیض اٹھایا ہے۔

فاروق خالد: آپ شاعری میں کس مکتبۂ فکر کی طرف توجہ زیادہ مائل ہیں؟

فیض: ہم چونکہ ان کے ساتھ ہم آہنگ نہ تھے اس لیے ان کی ترجمانی کرنی ہوا تھا۔ اپنے شعروں میں زمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

فاروق خالد: شعر و ادب میں آفاقی قدریں کیسے محفوظ رہ سکتی ہیں؟

فیض: آفاقی قدریں اور آفاقی تبدیلیاں، مستقل قدریں یا وقتی قدریں: ان کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ ہر دور کو مختلف حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کا تعلق معاشرے سے بھی ہوتا ہے اور وقت سے بھی۔ چنانچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کو اپنے معاشرے کو سمجھنے کا شعور لازمی ہے۔ رہتا وہ وقتی تقاضا بھی ہے [illegible]۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں۔ کسی معاشرے سے مجلسی [illegible] ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو جن کی بظاہر کوئی حقیقت نظر نہیں آتی اگر ان کا انتخاب کیا ہو، اگر ان چیزوں کے [illegible] آپ کا شعور [illegible] آفاقی قدریں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ وہ بڑا ادب ہو جائے گا۔

فاروق خالد: کون سا ادب بڑا ادب کہلاتا ہے؟

فیض: وہ ادب بڑا ہوتا ہے جس کی حقیقت کا معیار وقت کا امتحان برداشت کر سکے۔ جس میں شعور کا اس طریقے سے [illegible] حقائق کو مستقل انسانی اقدار کے ساتھ منسلک کر لیں۔ ہر دور میں ایک بڑی حقیقت بھی تو ہوتی ہے لیکن وہ [illegible] مستقل [illegible] تصور [illegible] سے کوئی [illegible] چھوٹی۔ بڑا ادب [illegible] ہنگامی نہیں ہوتا۔

فاروق خالد: ہنگامی ادب سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

فیض: وہ ادب جس کا معاشرے کی بڑی حقیقتوں کے ساتھ تعلق نہ ہو صرف ہنگامی اور عارضی ادب کہلاتا ہے۔

کمال خان: آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت شاعری میں دو بڑی شخصیتیں تھیں۔ ایک اختر شیرانی اور دوسرے حسرت موہانی۔ اقبال کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ایک عظیم الشان آواز اور ایک نئے تجربے کے ساتھ بالکل الگ تھے۔ جس زمانے سے آپ اس زمانے کے ادبی رجحانوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔

فیض: بات یہ ہے کہ اختر شیرانی کو تو ایک طرف رکھیے۔ مولانا حسرت موہانی کا ذکر ضرور کرنا چاہیے۔ ان دنوں 1920ء اور 1930ء کے بیچ ابتدائی زمانہ تھا۔ اس میں ہمارے ہاں رومانیت کی تحریک چلی تھی۔ [illegible] کی طرح کی [illegible] تھیں۔ ایک تو ٹیگور کی گیتانجلی کا قصہ تھا اس نے طرح طرح کی چیزیں لکھیں۔ دوسرے اسی زمانے میں یورپ میں بھی Aesthetic اور ادب برائے ادب کی تحریک چلی تھی اور اس کی جو مذہبی یا اقتصادی اور سیاسی وجوہات بھی تھیں۔ [illegible] ہو چکی تھی۔ اس کے بعد یورپ اور ہمارے ہاں کی حالت [illegible] ہو گئے تھے [illegible] مارشل لاء [illegible] کی وجہ سے سب نے ادب اور رومانیت اور [illegible] زیادہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ غزل میں سب سے پہلے ان کا اثر حسرت موہانی نے قبول کیا [illegible] شاعری شروع کی۔ ہمارے ہاں اختر شیرانی ان کے [illegible] تھے۔ غزل کے دو سکول تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے۔ ان میں سے دہلی سکول [illegible] تھی۔ لکھنؤ سکول [illegible] سے زندگی سے قریب تھا لیکن اس میں [illegible] تھی۔ لیکن حسرت موہانی نے دہلی کی شاعری کو زندگی سے قریب تر کیا۔ حسرت موہانی سے پہلے جو شاعری کرتے تھے وہ درباری شاعری تھی اور [illegible] شاعری [illegible] اس سے پہلے [illegible] ان کی ابتدا عشق سے ہوتی ہے۔ [illegible] میں حقیقت [illegible] جذباتی [illegible] کے ساتھ [illegible] گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا حسرت موہانی نے دہلی اور لکھنؤ کے سکولوں سے ہٹ کر غزل میں نئے [illegible] اظہار کیا اور جس طریقے سے عشق [illegible] کرتے تھے [illegible] اس زمانے میں [illegible]

آ گئی لیکن ان کے بعد کی تھوڑی بہت خوش بختی بھی گئی۔

جاوید شاہین: فیض صاحب! آپ نے حسرت موہانی اور اختر شیرانی کے زمانے میں شاعری شروع کی لیکن آپ کی شاعری ان دونوں سے مختلف تھی۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے اس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کا امتزاج ہے۔ آپ کا لہجہ بالکل نیا تھا جو اردو شاعری میں پہلے نہیں ملتا۔ آپ نے اپنی شاعری کے لیے جو موضوع چنا وہ بھی الگ نیا تھا۔ یہ آپ کے ہاں کہاں سے آیا؟

فیض: ہم نے 1928ء، 1929ء میں جب شاعری شروع کی ہم اس وقت کالج میں تھے سیالکوٹ میں۔ اس وقت ہمارے سامنے اختر شیرانی تھے، اور اختر شیرانی سے زیادہ حفیظ، ن۔ م۔ راشد۔ وہ ہمارے ساتھ ہم سے ایک سال آگے تھے۔ تو طبعاً حسرت موہانی سے شروع ہوا ہے۔ وہ اختر شیرانی اور ن۔ م۔ راشد سے ہوتا ہوا تجربہ تھا جس میں ہم نے جو ابتدائی دو تین سال کے زیر اثر کی۔ لیکن ہم روزی کی کوشش میں رہتے تھے کہ ہم ان کی نقل نہ کریں۔ اس وقت کا ہمارا پہلا کلام ہے جو ہم نے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ یہ ہم نے ان کے تحت ہوا۔ بعض دوستیاں بھی ہوئیں ایک تو اتفاق کی بات ہے اور دوسرے خود یہ کہ ہمارے ابا فوت ہو گئے اور ہم اچانک ایک زمیندارانہ سے فاقہ مست ہو گئے۔ اس وقت پتہ چلا کہ محض عاشقی سے کام نہیں چلتا۔ زمانے میں اور بھی دکھ ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہم نے چھوٹی قسم کی ادب زندگی کی طرف شروع کی۔ گھر والوں کا اصرار تھا کہ مقابلے کا امتحان دیں اور کوئی بڑی سی افسری لیں۔ ہم نے امتحان دیا لیکن ہمارا ارادہ تو نہیں تھا اس قسم کی نوکری کرنے کا۔ چنانچہ ہم نے ایک چھوٹی سی نوکری لی۔ اس طرح اتفاق سے ہماری جان بچ گئی۔ ایک تو ذاتی حالات ایسے تھے دوسرے ساری دنیا اس وقت اقتصادی بحران اور کساد بازاری کا شکار ہو رہی تھی (یہ 1930ء کا ذکر ہے)۔ خیر ہمیں ملازمت مل اور ہم چلے گئے امرتسر پہنچے تو وہاں ملاقات ہوئی صاحبزادہ محمود الظفر سے وہ نئے نئے انگلستان سے واپس آئے تھے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر تاثیر، ملک راج آنند، سجاد ظہیر جیسے لوگ شامل تھے۔ ان کے ایک تھے محمود الظفر بھی تھے۔ ہم سارا دن روحانی کا رونا تھا نہیں اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس دہن سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ پھر صاحبزادہ محمود الظفر کی بیگم تھیں ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ تم کس چکر میں پڑے ہو۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ انہوں نے بتایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کے ادیبوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ فضول باتیں کرنے کے بجائے حالات کو سمجھیں کہ کیا ہو رہا ہے اور اس کی ترجمانی کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سب ہم نے ان سے سیکھا۔ پھر ایک سال بعد کانفرنس ہوئی اور پھر تنظیم قائم ہو گئی۔

جاوید شاہین: سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ہے۔ فیض صاحب! یہ بتائیے کہ آپ کے اظہار کے بارے میں کہتے ہیں کہ فیض نے بڑی کامیابی سے روایتی غزل کی علامات سے اس میں نئے معانی شامل کر لیے ہیں۔ آپ اس زمانے میں نظم کی طرف آ رہے تھے۔ لیکن ساری انگریزی اور جدید بات غزل کی بنیاد سے نہیں تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

فیض: بات یہ ہے کہ اختر شیرانی، حسرت موہانی اور ن۔ م۔ راشد کے اثر سے آزاد ہو کر ہم نے نظم کی طرف توجہ کی لیکن غزل کی امیجری استعمال کرنے میں ہم سمجھتے تھے کہ اس طرح آسانی سے بات کی جا سکتی ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ غزل میں جو امکانات ہیں ان سے (جو اقبال کے بعد ہمارے ہاں اس وقت بھی بہت پڑے تھے) لوگوں نے پوری طرح استفادہ نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ہم نے اس وقت فارسی بھی پڑھی۔ کالج میں ہمارے پاس فارسی نہیں تھی عربی تھی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی بدولت ہم نے فارسی پڑھی۔ اس سے پتا چلا کہ غزل میں بہت امکانات ہیں۔ پھر تجربہ ہوتا گیا اور ہم نے نظم میں بھی برتا۔

وہاں پر اختلاف ہوا کہ غزل تو بہت گھٹیا چیز ہے۔ اس کے ذریعے آپ وہ بات نہیں کہہ سکتے ہیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔ نظم بھی ہے جس کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اچھی غزل میں بھی ہوتی ہے لیکن غزل میں سارے لوازمات پہلے سے موجود ہیں۔ نظم میں جو بھی کا سامان کا آپ کو کرنا پڑتا ہے۔ غزل میں صرف یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کو کیسے ترتیب دینا/استعمال کیا ہے اس میں کوئی مشکل چیز ہے بھی ایک طریقے سے یہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ سارا مصالحہ آپ کے سامنے موجود ہے اور مشکل اس لیے کہ اس مصالحے کو اسی طریقے سے دہرانا جیسے کہ دوسرے کر چکے ہیں آپ نے اتفاق کیا یا نہیں کیا ہے۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کو [illegible] مشکل نہیں ہوتی، ذہن کی [illegible] اور پرکھی ہوئی چیزیں [illegible] جو کچھ کہنا ہے [illegible] سامان کا مطالبہ کیا ہے۔ آپ تمام عناصر کی ترتیب اور آہنگ کے ذریعے [illegible] سے الگ اور نئی بنا سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس پر گرفت نہیں ہو سکتی۔ آپ نے خاص سیاسی شعر کہا ہے اس میں تو [illegible] قتل، بھاگ اور [illegible] کا ذکر ہے۔ اگر کوئی گرفت کرنے بیٹھے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تو روایتی انداز سے غزل لکھی ہے۔

سہیل: اس زمانے کی جو ترقی پسند تحریک تھی وہ تو غزل کے اس انداز کے کافی خلاف تھی۔

فیض: تو وہ لوگ بہت خلاف تھے اس کے۔ بات یہ ہے کہ خصوصاً شروع میں جو ہمارے ترقی پسند تھے ان کی طرف سے [illegible] سے [illegible] تھے، احمد علی ہوں یا [illegible] آزاد [illegible] انگریزی کی [illegible] روایتی اور کلاسیکی غزل پر [illegible] نظر نہیں تھی۔ [illegible] انہوں نے اس طرف توجہ کی۔ شروع شروع میں تو ایسا ہوا ہے۔

مسعود اشعر: فیض صاحب! آپ نے ترقی پسندی کا ذکر کیا اور اپنی نظم کا بھی۔ [illegible] بات ہے لیکن آزادی سے پہلے کی جو ترقی پسند شاعری ہو رہی تھی، جیسے علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر [illegible] اپنی نظموں میں [illegible] ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا [illegible] آپ اس تحریک میں ان سب کے شریک تھے۔

فیض: بات یہ ہے کہ ہمارے جو دوست تھے، مجاز تھے، مخدوم تھے، علی سردار جعفری تھے، جذبی تھے [illegible] ان کی بڑی [illegible] وطن پرستی تھی۔ [illegible] ہمارا خیال تھا کہ یہ ہنگامی شاعری ہے [illegible] ہنگامی شاعری اور اچھی شاعری کا بھی ایک مقام ہے [illegible] اس کی علامات [illegible] تو [illegible] جذبے کے اعتبار سے [illegible] عبارت کے اعتبار سے [illegible] اور لفظ کے اعتبار سے بھی [illegible] پختگی [illegible] اختلاف رہا۔ [illegible] ایک بحث [illegible] تھا۔ جب ہم نے [illegible] صاحب پر مضمون لکھا [illegible] انقلابی شاعری [illegible] سردار جعفری اور [illegible] دوستوں نے [illegible] جب پاکستان بنا تو ایک الزام [illegible]

مسعود: جی ہاں! آپ کی نظم "صبح آزادی" پر بھی تو ہر طرف سے [illegible]......

فیض: ہاں دونوں طرف سے ہنگامہ ہوا۔ جب یہاں ترقی پسند تنظیم قائم کی [illegible] پہلے لوگوں نے [illegible] دیا [illegible] اب [illegible] اور [illegible] ساتھ نہیں......

سہیل: [illegible]

فیض: [illegible]...... ہم نے [illegible] سب [illegible] اختلاف [illegible] کا نام [illegible] تھے [illegible] اور ترقی پسندی کو ایک دوسرے کا [illegible] بنانا چاہیے۔ [illegible] ترقی پسندی کے لیے تو لازم ہے کہ [illegible] کے تقاضے پورے کیے

جیسی ادبیات یا ترقی پسندی چھپ جاتی ہے۔

جاوید شاہین: فیض صاحب آپ نے ہیئت کی بات کی ہے۔ آپ کی جوانی کے دنوں میں انگریزی نظم: بلینک ورس، فری ورس اور نظم معریٰ وغیرہ بہت زوروں پر تھا۔ موضوع کے لحاظ سے تو نہیں لیکن ہیئت اور تکنیک میں ان کا بہت اثر تھا تو کیا ان رجحانات کے سلسلے میں آپ نے ان سے کبھی اثر قبول کیا؟

فیض: ہاں کیا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہر ادب جس کا اپنا ایک تسلسل ہے اس کی کچھ حدیں ہیں اس کی کچھ پابندیاں کسی حد تک محدود ہیں۔ اس کی اپنی روایت ہے۔ جناب انگلستان اور یورپ کا جو ادب ہے اس کا نقش عظیم ہمارے ادب سے بالکل مختلف ہے وہاں پر جس طریقے سے ہیئت یا قسم یا ڈکشن میں جو تبدیلیاں یا اضافے ہوتے ہیں وہ اس کے پیچھے جو روایت چلی آ رہی ہے اس میں داخلی طور پر ہوتے ہیں۔ ہمارے نئے لکھنے والوں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی روایت سے الگ ہو کر ایک خارجی چیز اختیار کر لیں جس کا جوڑ کسی حد تک بالکل نہیں بیٹھا فارسی روایت کے ساتھ۔

مسعود: آپ کی مراد آزاد نظم سے ہے؟

فیض: آزاد نظم کوئی ہے ایک چیز۔ لیکن آزاد نظم سے پہلے بھی الگ چیزیں ہوئی ہیں۔ آپ ہماری لوک شاعری کو لے لیجیے۔ اس میں ہزار طرح کے سانچے ہیں۔ ہزار طرح کے نمونے موجود ہیں۔ ہیئتیں موجود ہیں جن کو آپ تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے عروض اور عربی عروض کا واقعی ایک ہے۔ لیکن ہماری عروض وہ نہیں ہے جو عربی کا ہے۔ آپ عربی شعر موزوں پڑھ ہی نہیں سکتے۔ ہم نے عربی عروض میں اتنی اصلاحات ڈالی ہیں کہ اس کی صورت ہی بدل ڈالی۔ اگر اساتذہ یہ کام کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ لیکن اسے لوگوں کے ذہن سے اتنا دور لے جائیں کہ انھیں جو موسیقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ نثر کی بات دوسری ہے لیکن شاعری جو ہے اس میں ایک لذت کا پہلو بھی تو ہے اس میں موسیقی کا پہلو بھی تو ہے۔ وہ بھی قائم رہنا چاہیے۔

جاوید شاہین: فیض صاحب پچھلے دنوں ایک اخبار میں آپ کا انٹرویو چھپا تھا اس میں نثری نظم کے حوالے سے آپ نے بہت کڑی بات کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حالانکہ آپ نے جن مغربی شاعروں کے ترجمے کیے ہیں انھوں نے بہت نثری نظمیں بھی لکھی ہیں۔

فیض: بات یہ ہے کہ یا تو نثر کہیے یا شعر کہیے نثری نظم کیوں کہتے ہو۔ اگر وہ شاعری ہے تو شاعری ہے نثر ہے تو نثر ہے۔ میں نے کہا تھا کہ جو چیز آپ کو اچھی لگے اس سے اختلاف نہیں ہے۔ مجھے اس اصطلاح سے اختلاف ہے۔

مسعود: اگر وہ وزن اور بحر میں نہیں ہے تب بھی؟

فیض: ہاں وزن اور بحر میں نہیں ہے۔ وزن ایک چیز ہے آہنگ دوسری چیز ہے۔ جس کو عام وزن کہتے ہیں وہ تو ایک عربی ضابطہ ہے۔ حالانکہ یہ ضابطہ ہر زبان میں نہیں ہے جو عربی عروض کا ہے۔ وزن سے مراد تو صرف یہ ہونا چاہیے کہ آہنگ ہو یا کسی قسم کا ترنم ہو۔ انگریزی شاعری میں بہت سی شاعری عروض میں ہے لیکن ہماری جو بولیاں ہیں وہ تو عروض میں نہیں ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری نہیں ہے۔ اس میں وزن نہیں ہے۔ اس میں وزن ہے لیکن دوسرا ہے۔ یعنی وزن کے بغیر آہنگ کے علاوہ کوئی شاعری ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف فارسی یا عربی اوزان اور سانچے جو ہم تک پہنچے ہیں ان کے مطابق ہی شاعری کی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ نیا آہنگ پیدا کرنا چھوٹے موٹے شاعروں کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا شاعر آنے کا

تو وہ یا آہنگ پیدا کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے ممکن ہے کچھ نکل آئے۔

مسعود حنیف: یہ نیا اسلوب تلاش کرنے کی بات ہے؟

فیض: ہاں! یہ بات ضرور ہے۔ مثلاً ہم نے جب شاعری شروع کی یا راشد نے جب شاعری شروع کی تو انھوں نے اپنا آہنگ اور اسلوب تلاش کیا۔ اب اس وقت جو تجربات ہو رہے ہیں ممکن ہیں ان میں سے کچھ نکل آئے۔

مسعود: فیض صاحب! آپ مغربی شاعروں کے اثرات کی بات کر رہے تھے۔

فیض: جب انگریزی شاعری میں ہمارے اوپر سب سے زیادہ جس شاعر کا اثر ہوا وہ ایلیٹ تھا۔ ایلیٹ تو جب کہ ہم دوسرے کورس میں تھا، دوسرے یہ ماڈرن والے تھے، پاؤنڈ وغیرہ۔ وہ ایلیٹ سے ہم نے براہ راست ایک چیز لے لی ہے اور وہ ہے ''ڈرامیٹک مونولاگ'' کہ بات کسی کی ہو رہی ہے لیکن صیغہ واحد متکلم میں ....

سہیل: فیض صاحب! اس میں ایک اضافہ کر دیجیے کہ آپ نے آہنگ کا جو نیا نظام اپنایا ہے، اس کے پیچھے کس کا اثر ہے؟ کیوں کہ وہ بھی ایک منفرد بات ہے آپ جس طرح جملوں کی تکرار کرتے ہیں اور لفظوں کے جوڑے بناتے ہیں.....

فیض: وہ یہی ہے ایک تو لفظوں کی صوت کا مسئلہ ہے، کیوں کہ شاعری میں لفظ اور معنی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں، جنھوں نے صوت کی طرف توجہ کی ہے اور وہ تھے غالب۔ کسی نے ان کی شاعری کے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ وہ اس معاملے میں بہت ہی صناع ہیں۔ متوازی اصوات مرتب کرنے میں انھوں نے بہت ہی مہارت سے کام لیا ہے۔ جہاں پر ایک طرف تو ہمارے سامنے سوئن برن تھے انگریزی کا سب سے بڑا صناع ہے، لہٰذا یہ تصور وہاں سے چلا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہمارے دوست خواجہ خورشید انور نے ہمیں موسیقی کا شوق لگا دیا۔ ہم نے بڑے بڑے استادوں کو سنا۔ استاد برکت علی خاں، عاشق علی خاں اور توکل حسین خاں وغیرہ، ان کی موسیقی کا بھی جو ہے اس کا شاعری کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں، تعلق اس قدر ہے کہ آدمی کے کان اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ وہ جان لے کہ کوئی لفظ بے سُرا تو نہیں ہے۔ جیسے گانے کا سُر ہوتا ہے، ویسے ہی شعر کا بھی ہوتا ہے، جیسے گانے میں لفظ بے سُرا ہو جائے تو آدمی بے مزہ ہو جاتا ہے ایسے ہی غلط لفظ آ جائے تو۔ اب یہ لوگ عام طور سے توجہ نہیں کرتے۔ تو کچھ تو اس قسم سے اور کچھ انگریزی شاعروں کی نقل سے ہمارے ہاں یہ رنگ پیدا ہوا۔ ایک اور بات۔ آپ دیکھیں گے کہ جسے استعارہ کہتے ہیں، وہ ہمارے ہاں ہوتا ہی نہیں۔ یعنی اگر آپ نے کسی آدمی کو شیر کہہ دیا تو سب کو پتا ہے کہ مراد آدمی ہی ہے، اس طرح کا استعارہ نہیں ہے۔ ہم نے اس سب سے پہلے اسے متعارف کروایا، اس کو کہنا چاہیے کہ اس سے اچھی مثال غالب کے اردو فارسی سے پڑھ کر جتنی بار اور فروغ دینے کی کوشش کی۔ انگریزی میں جس طرح اس کا ذخیرہ موجود ہے، اسی سے ہم نے کچھ تصور اور کچھ ابھی بھی۔ وگرنہ یہ کہ دیکھ کر لفظوں کے جو معنی تھے ہم نے صوت بھی بدلے ہیں۔ جہاں جہاں ہم نے نئی چیز پیدا کرنے کی بات کی۔

جاوید شاہین: فیض صاحب! اگر اجازت ہو تو اب گفتگو کو تھوڑا دیر پیچھے آپ نے کسی سارتر سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے اس میں سارتر نے کہا تھا کہ یورپی فنکار خصوصاً سوشلسٹ ملکوں کے پاس اب وہ موضوعات نہیں ہیں جو ایشیا، لاطینی امریکا کے فنکاروں کے پاس ہیں، اس لیے ان ملکوں میں بڑا ادب پیدا کرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ بہت ان ملکوں کے جواب خاموشی آ گئی ہے اور جہاں لوگ مطمئن ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ بات درست ہے؟

فیض: یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس وقت الجزائر کی لڑائی جاری تھی اور سوشلسٹ ملکوں کا ذکر نہیں تھا۔ سارتر نے کہا تھا کہ بڑی لڑائی

نے ہمارے ادب کے سرمایہ [illegible] کے بارے میں [illegible] مغرب [illegible] ترقی نے [illegible] تحقیق وغیرہ [illegible]
[illegible] ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] اس وقت پیدا ہوگا جب [illegible] دنیا کے تصورات
اور مغرب کا [illegible] ہے۔ یہ بات
آج سے تیس سال پہلے کی ہے [illegible]
کسی کے سامنے بھی نہیں آیا۔

[illegible] فیض صاحب اب [illegible]
[illegible] کے دور میں کیا انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا؟

فیض: [illegible]
[illegible] ہونا چاہیے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] پاکستان [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] 1930 [illegible]
[illegible]

فیض: [illegible]

ابرار: [illegible]
[illegible]

فیض: [illegible]
[illegible]

ابرار: [illegible]

فیض: [illegible]
[illegible]

ابرار: اس زمانے کا ایک [illegible] آپ کے

بڑے سے شہر تو آیا تھا؟

فیض: میں پیدا تو سیالکوٹ میں ہوا لیکن باپ کی جاگیریں ضلع نارووال میں تھیں۔ وہاں دہقانوں سے ہیر وارث شاہ کے گانے گائے جاتے تھے۔ میں نے اس طرح ہیر سنی تھی بلکہ شاہ کی کافیاں وغیرہ سوہنی مہینوال یا مرزا صاحباں۔

امرتا: اس وقت پنجابی لکھنے کو جی نہیں کرتا تھا؟

فیض: کرتا تو تھا، پھر احساس ہوا کہ ان استاد شاعروں کا میں کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن پنجابی شاعروں کا میں نے مطالعہ بھی کیا۔ ہمارے جتنے بھی صوفی شاعر تھے ان سے بڑھ کر شاید کوئی شاعر نہیں لکھ سکتا۔

امرتا: کسی ادیب کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے اس کی شاعری یا اس کے افسانوں کا مطالعہ تو کیا ہی جاتا ہے لیکن ذاتی زندگی کے بھی کئی پہلوؤں سے تحریر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جیسے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کو جاننے کے لیے جب اس کے ناولوں کا دوبارہ مطالعہ کیا گیا تو پہلے اس کے خطوں کا مجموعہ چھپ رہا تھا۔ کیا آپ کے خطوں کا بھی کوئی مجموعہ چھپا ہے؟

فیض: ہاں چھپ گیا ہے۔ ابھی حال میں آیا ہوگا۔ اس کی ایک کاپی میں تمہیں بھجوا دوں گا۔

امرتا: آپ کی نظم ہے شاید "[illegible]" وہ آپ نے آخر میں [illegible] کے نام کر دی تھی۔ یہ کس خیال کے تحت اس کے نام کر دی تھی؟

فیض: اس طرح تو اور نظمیں بھی میں نے دوستوں کے نام کر دی ہیں۔ یہ پتہ ہے کہ کس کے بارے میں لکھی ہیں لیکن کسی پر اس کا نام نہیں لکھا۔

امرتا: پھر بھی اس بات کی بات کریں جس کے نام دنیا کے قلم رقم کرتے ہیں۔

فیض: (کھل کر ہنستے ہوئے کہنے لگے) اور ایک ہوتی تھی (t) [illegible] اس سے [illegible] ان کے نام دنیا کے قلم رقم کیے جاتے ہیں۔ [illegible] پہلا عشق تھا [illegible] "نقش فریادی" کی ساری نظمیں میں نے اسی عشق میں کہی تھیں۔

امرتا: لیکن اسے زندگی میں شامل کیوں نہ کیا؟

فیض: وہ سب [illegible] تھی اس وقت زبان کھولنے کی [illegible] اس کا بیاہ کسی بڑے جاگیردار کے ساتھ ہو گیا۔ پھر [illegible] اس کے دس برس بعد دیکھا تو [illegible] میں سوچتا ہوں کہ اچھا ہی رہا۔ [illegible] اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اس سے ان حالات سے [illegible]۔ پھر ایک [illegible] چھوٹی سی لڑکی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ [illegible] محسوس ہوا کہ وہ بچی نہیں بڑی حسین اور جوان عورت ہے۔ میں نے پھر عشق کی [illegible]۔ پھر اس نے [illegible] شادی کر لی اور [illegible] سے گھبرا گئی تھی۔

امرتا: ایک نظم ہے [illegible] "رقیب سے" [illegible] آکہ وابستہ ہیں [illegible] کی زندگی کے عشق میں [illegible] یہ نظم اس کے بارے میں تھی؟

فیض: نہیں، یہ [illegible] کے بارے میں تھی جس کی [illegible] "نقش فریادی" کی نظمیں ہیں۔ [illegible] میں تھا جب کان میں بڑی تکلیف ہوئی تھی۔ مجھے ہسپتال بھیجا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر ہوتی تھی جس نے مجھ سے پیار [illegible] کیا۔ یہاں سے [illegible] آیا [illegible] نظمیں کہتے تھے۔

امرتا: یہ بھی تو ہے شاعری کی بات۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ایلس کو تمہارے ان عشقوں کا علم ہے؟

فیض: ہاں، اصل میں وہ میری بیوی بھی ہیں، میری دوست ہیں۔ اس لیے زندگی بھر کبھی ۔ عشق میں ایک عہد ہوتا ہے جب کہ روز تک میں ایک شان ہوتی ہے۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب مزید عشق نہیں کروں گا البتہ دوستی کروں گا جب بھی کوئی دوستی کے قابل ہوگا۔

سوال: فیض صاحب! آپ ایک مغربی دنیا ہے اس میں کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے کیا اس بارے میں کچھ Comment کریں گے آپ؟

فیض: ہاں مشکلات پیدا ہونے کا سہرا تو ان کے سر ہے (ایلس کی طرف دیکھتے ہوئے) ان کی وجہ سے فاقہ نہیں ہوئی اور نہ ہم کبھی بھوکے رہے۔ کسی نہ کسی طرح پر وقت گزارتے رہے ہم ہیں۔

مظفر اقبال: ایک بنیادی سا سوال کرنا چاہوں گا (ہاں ہاں!) یہ جو لوگ آپ سے زیادہ قریب ہونا چاہتے ہیں کہ جنہوں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ بحیثیت ایک شاعر آپ جس کا دور عالم ہے وہ دنیا کے لئے طویل عرصے سے لیکن اس کے ساتھ جو آپ کی ایک کمزوری ہے وہ اس انا کی ہے جس سے آپ جڑے ہوئے ہیں کہ جہاں سے آپ کے مسائل میں شامل ہیں وہ تو ظاہر ہے ان کے اندر شامل بھی ہیں۔ اب ان معنوں کا عمل اور وہ سارے عوامل جن سے ہم گزرتے ہیں تو کبھی کبھی آپ کو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ نہیں آپ کی شخصیت میں کوئی خرابی ہے، عجیب ہے کچھ ہے جسے محسوس نہیں کر پاتے یا آپ ساتھ نہیں کر پاتے۔

فیض: ہوتا ہے ہوتا ہے، کئی بار ہوتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ...... 40 سال تو ہو گئے اب ہماری ملاقات کو اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم ساتھ رہتے ہیں اور کبھی اب لیکن ہمارا زندہ رہنے دینے زندگی کا اس میں ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میاں بیوی کا ہے کہ خیال کا ان سے اور ان کا خیال ہم کو ہے ان کا اور ان کا احترام اور ہر عمل اس طرح کا ہو جاتا ہے کہ ایک خاص وقت پر آ کر روز مرہ یاں اور زندگی سے وابستہ ہو جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے تھوڑا سا جھگڑا بھی رہتا ہے ہماری جو خالص شرقی چیزیں ہیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتیں لیکن چالیس سال میں اب ان کی بہت ساری تو عادتیں ہو گئی ہیں۔

سوال: فیض صاحب! ہم میں سے بیشتر افراد یہاں تک کے آپ کو نہیں جانتے لیکن ہمیں سمجھائیں کہ شعر کہنے کی وہ کیفیت جو آپ میں پیدا ہو گئی ہے یہ عرف یہ کہ آپ میں اپنا احساس اور پچھتاوہ بھی ساتھ لاتی ہے۔ آپ کے خیال سے آپ شعر کہتے وقت انسانی احساسات کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں جو قوم کے لیے ضروری ہے یہ آپ ذاتی طور پر اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔

فیض: ہاں تو نہیں۔ یہ بات ضرور کہ ایسا ہوا کہ آدمی اپنے آپ سے بھی تو مخاطب ہوتا ہے، اگر ہو جائے تو یہ صورت دوسرا تو ان کی ذات میں ہے اس کے آس پاس اپنے ملنے والے بھی ہیں۔ دوست بھی ہیں اپنے غم بھی ہیں، ہم وطن بھی ہیں، باقی ساری دنیا بھی ہے تو اب اپنی ذات کو ان سب کو بھی ان سے الگ کرنے کی کوشش کرے لیکن وہ الگ نہیں ہو سکتا۔ چاہے شعوری طور سے بھی اور غیر شعوری طور سے بھی ہم نے تو یہی کوشش کی ہے کہ اپنے علاوہ بھی جو کچھ ہے اندر گرد و پیش پر بیت گئی ہے اس کو شعر بنانے کی کوشش کریں۔ اس میں اپنے دل کی بات کو شعر بنانا جتنا آسان ہوتا ہے کیوں کہ جو صورت گئی تو بات اپنے دل سے ہے۔ غیر لوگوں کی ہو خواہ اپنی ہو، اس کو پہنچانے کے لیے اپنے دل اتنی سیدھا پہنچتا ہے تو ایک مقام ایسا آ جاتا ہے جب دونوں میں فرق نہیں رہتا۔ جب اپنے دل کی بات اور دوسروں کے دل کی بات یکجا ہو جاتی ہے پھر وہ فرق نہیں رہ جاتا کہ ہم اپنے دل کی بات کر

ہے تو پھر دوسروں کے دل کی بات کرتے ہیں کیوں کہ اپنی ذات ایک طریقے سے دوسروں میں گھل کر اس طریقے سے تحلیل ہو جاتی ہے کہ من و تو کا فرق نہیں رہتا۔ اب میں وہی۔ اور چنانچہ جو شعر بھی نئے طریقے سے کہا گیا وہ فرق دکھائی دے اور معلوم ہو کہ جان بوجھ کر تصنع کی خاطر یہ شعر لکھا گیا ہے اور دل سے نہیں نکلا ہے تو اس شعر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو وہ جو صحیح ہے کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے تو اگر زبان پر قدرت ہے اور دوسروں کی بات بھی وہ صحیح طور پر کہی نہیں۔ نہ ہی صحیح طریقے سے وارد نہیں ہے تو پھر وہ شعر کو برباد کر جاتا ہے۔ اور جس میں تمام ادب اور تجربہ جان ہوتی ہے وہ ایک ہی ہو جاتا ہے۔ تو ہم نے تجربہ جان لیں اور سب کو سب کر دیں تو جو تجربہ آئے تجربہ بن دیا۔

سوال: آپ کی شاعری میں دردمندی کا احساس ملتا ہے۔ آپ کے جو معاصرین ہیں بالخصوص ان کے یہاں مسائل پر لکھتے ہیں لیکن ان کے انداز میں تخاطب ہوتا ہے۔ تو یہ جو آپ کے معاصرین کے نقطۂ نگاہ میں اور انداز میں تھی اور آپ کے انداز بیان میں جو فرق ہے وہ مزاج کا ہے یا ایک شعوری کوشش ہے؟

فیض: اور شاید کچھ مزاج کا فرق بھی ہو اور یہ شکایت بھی ہے کہ اس پر اتنی توجہ نہیں کی گئی جو ہم چاہتے ہیں۔ اس پر ہمارے ملنے والے زیادہ آدمی ہے کہ ہم کوئی احسان جتا کر بات کرتے ہیں یا [illegible] ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ہم توجہ دلا کر تحریک دیتے ہیں اس لیے شاید کہیں کچھ اس کا خود احساس ہوا ہو قریب سے ہے۔

سوال: دیکھیے آپ کی جو تحریک کی شاعری ہے وہ ناظم حکمت، لورکا، نیرودا، ان کے بارے میں بھی پوچھا جاتا ہے۔ کیوں کہ آدمی تو بہت جذباتی ہوتا ہے اور بہت محسوس کرتا ہے جو آپ جیسے لوگ تھے وہ [illegible] Be Frank۔

فیض: نہیں بالکل فرینک بات ہے کہ ہم تو بہت محسوس کرتے آئے ہیں۔ لیکن جو بات ہے وہ ہم نے عاشقی کی ہے۔

سوال: یہ تو شاعری کی بات ہوگی۔ ذرا [Dumes] میں آپ سے بات کر رہی ہوں؟

فیض: دیکھیے شاعری کی [illegible] عاشقی کرتا۔ زندگی میں عاشقی کرنا وہ الگ چیز نہیں ہے۔

مظفر اقبال: ایک بہت عام سا سوال پوچھا جاتا ہے آپ لکھتے کس طرح ہیں؟

فیض: کس طرح لکھتے ہیں، کس طرح کا تو کبھی پتا نہیں کہ کس طرح لکھتے ہیں! ایسے کہ...... ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے ایک فقرہ یا کوئی ایک بات یا کوئی ایسا لفظ یا [illegible] کوئی ذہن میں۔ اس سے ذہن میں تصویر بن جاتا ہے کبھی [illegible] جیسے ہم نے لکھا ہے [illegible] کوئی خوشبو [illegible] جیسے کوئی [illegible] جاتا ہے ذہن میں، کبھی کوئی [illegible] ذہن میں آ جاتی ہے۔ کبھی کوئی واقعہ ہے یا ایک مصرع ذہن میں آ جاتا ہے جیسے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتنی مداراتوں کے بعد" کوئی مصرع ذہن میں پہلے آیا ہوگا اب یاد نہیں۔ پھر کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی غزل کا پورا [illegible] ذہن میں آ گیا پھر آہستہ آہستہ غزل بن جاتی ہے۔ نظم کے بارے میں پہلے [illegible] سوچنا پڑتا ہے۔ ایک مصرع پہلے ذہن میں آتا ہے [illegible] اس کے بعد [illegible] کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس کو [illegible] کرنا پڑتا ہے [illegible] پڑتا ہے [illegible] ٹھیک بیٹھے [illegible] کوئی لفظ بے محل [illegible] کرتا رہتا ہے۔ کبھی ذہن [illegible] کوئی واقعہ یا تجربہ [illegible] جذبہ [illegible] بہت جلدی سے ساری نظم ذہن میں آ جاتی ہے۔ کبھی یوں ہے کہ [illegible] بیٹھے لگ جاتے ہیں۔ ایک مصرع کا [illegible] پھر آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔

مظفر اقبال: کبھی ایسا ہوا کہ آپ نے چاہا کہ کوئی چیز لکھوں۔ کوئی بڑی چیز، میری پوری شاعری میں جو ایک ستون کی طرح کھڑی ہو اور وہ لکھی نہ گئی؟

فیض: ایک دو بار ہم نے لمبی نظم لکھنے کی کوشش کی تھی جس کے بارے میں خیال تھا کہ اس کو پوری طرح پھیلا کر جیسے انتساب ہے ''سر وادیِ سینا'' کا۔ اس کو طویل نظم بنانے کا خیال تھا، لیکن پھر لکھتے لکھتے بور ہو جاتے ہیں۔ یا وہ ''دستِ صبا'' کی نظم تھی، ''زنداں کی ایک صبح'' کو لمبی نظم بنانے کا خیال تھا کہ آدمی اس کو پھیلا کر پورا تجربہ بنا دے، مگر یہ ہے کہ ہم نے کہا چھوڑو یہ ہو کر وہ نہیں ہوتا۔

افضل: فیض صاحب! آپ نے باقاعدہ طور سے کسی سے اصلاح بھی لی ہے؟

فیض: میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ لاہور میں دوستوں کی انجمن تھی۔ ہم لوگ اپنا اپنا کلام ایک دوسرے کو سناتے تھے اور ایک دوسرے کی ترمیم بھی کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا جو دل کو اچھا لگا ہم اس طریقے سے اس میں ترمیم کرتے رہے۔

افضل: جہاں تک میں نے اپنے ناقص ذہن سے آپ کی شاعری کے متعلق غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی شاعری کو محض پراپیگنڈا نہیں بنایا ہے اور نہ آپ کی شاعری میں کسی قسم کا پراپیگنڈا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نہ آپ کے یہاں خون کا دریا بہتا ہے، اور نہ علانیہ طور سے سرخ جھنڈے کو سلام کیا جاتا ہے بلکہ آپ نے اپنی شاعری میں بے پناہ ضبط و اعتدال سے کام لیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ آپ قدیم ادبی روایات کے باغی بھی نظر نہیں آتے، بلکہ روایات کا آپ کے یہاں خاص احترام ملتا ہے۔ آپ کا اس خصوص میں کیا خیال ہے؟

فیض: بات یہ ہے کہ پراپیگنڈا اور شاعری میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ ویسے لکھنے والے کا کوئی نہ کوئی نظریہ تو ہوتا ہی ہے۔ زندگی کے بارے میں، کائنات کے بارے میں، معاشرے کے بارے میں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شاعری اور صحافت یا خطابت میں ایک عظیم فرق ہے۔ یعنی شعر میں جو بات کہی جائے گی اُس کا انداز شاعرانہ ہوگا۔ اسی طرح جو بات صحافت کے دائرے میں کہی جائے گی اُس کا انداز مختلف ہوگا۔ اس کا فرق یہی ہے جو پوسٹر اور مصوری میں ہوتا ہے۔

افضل: آپ کی شاعری میں قدیم و جدید کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے اور آپ کے یہاں دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح نہ عریانی ہے نہ فحاشی صاف طور سے بلکہ ایک خاص قسم کی رومانی جنسی تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے، جیسا کہ آپ نے ''موضوعِ سخن'' میں ایک شعر لکھا تھا کہ ''لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ'' آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

فیض: ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی معتبر اور سنجیدہ شاعری روایت سے انحراف کر کے نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک تسلسل ہے اور خاص طور سے ہماری شاعری کی روایات اس قدر جامع ہیں اور اس میں اس قدر صلاحیتیں اور گنجائش موجود ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک عریانیت اور فحاشی کا سوال ہے، اس کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ صحیح معنوں میں ترقی پسندی کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن اور اخلاق کو خرافات میں ملوث نہ کیا جائے۔ ترقی پسندی کا معنی میرے نقطۂ نگاہ سے یہ ہے کہ ذہنوں کے اندر جو کج روی ہے اُسے دُور کیا جائے اور قلب کی صفائی کی جائے۔

افضل: اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ترقی پسند حضرات جو اپنی شاعری میں فحاشی یا عریانیت کا بے مقصد اظہار کرتے ہیں۔ کیا صحیح معنوں میں ترقی پسند نہیں ہیں؟

فیض: زندگی کے جہاں اور بھی مسائل ہیں وہاں یہ بھی ایک مسئلہ ہے اس سے فرار تو نہیں مگر جنسیات ہی کو اگر مرکزی نقطہ ٹھہرایا جائے تو یہ یقیناً ترقی پسندی کے خلاف ہے۔

انجم: جہاں تک میں نے پڑھا ہے کہ آپ کی شاعری دو کیفیتوں پر خاص طور سے مشتمل ہے ایک رومان دوسرا انقلاب۔ ظاہر ہے
تعلق ان دونوں کا آپس میں تخلیقی سطح پر کیسے ہو سکتا ہے۔ رومان کے علاوہ آپ اب بڑے انقلاب کے بھی قائل ہیں۔ [illegible]
[illegible] نے ایک جگہ لکھا ہے کہ [illegible] جذبات کا شاعر ہے [illegible]
کے مرکزی جذبات کا قائل بھی۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

فیض: بات یہ ہے کہ جب تک [illegible] ہوتا اس وقت تک [illegible] احساس کے الگ الگ خانے ہوتے ہیں۔ مجھے خیال
[illegible] کے الگ الگ [illegible] میں تقسیم کر رکھا ہے [illegible] ہوتا ہے [illegible]
ہے انسانوں کی زندگی سے [illegible] ان کے ساتھ [illegible] کی جاتی ہے [illegible]
ساتھ ہوتی ہے [illegible] بیان ہوتا ہے [illegible] ایک [illegible] ہو جاتے ہیں جہاں ہر
چیز سے شاعر کے بیان آپ کو [illegible] احساس سے [illegible] کے بیان [illegible] ہے [illegible]
جہاں [illegible] ہے [illegible] آپ کو [illegible] ہے [illegible] رومان اور انقلاب [illegible] ہوتے ہیں
کہ [illegible] شاعر کو [illegible] ہو جاتی ہے جیسے [illegible] کے ساتھ ہوتی ہے۔

انجم: [illegible] آپ کا [illegible] ہے؟

فیض: میرے خیال میں [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] شاعری [illegible] ہے۔ [illegible] سے تو
اب شاعری [illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] جہاں تک [illegible]
[illegible] کا تعلق ہے اس میں [illegible] کا [illegible] بیان [illegible] سے [illegible] آپ [illegible] ہے۔
[illegible] جہاں تک [illegible] کا تعلق ہے [illegible] بات [illegible] کی ہے [illegible] جہاں [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] سے
[illegible] ہے [illegible] جہاں تک [illegible] کے [illegible] کا تعلق ہے [illegible] اقبال سے [illegible] ہیں۔

انجم: [illegible] شاعری کا [illegible] آپ کی [illegible] ہے؟

فیض: ایک [illegible] ہے جیسا کہ [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] اشعار میں [illegible] اقبال نے
جب ایک [illegible] تھے۔ [illegible] شاعری کے لیے [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] جب تک [illegible] سے [illegible] آپ [illegible] کریں گے۔
جب تک کہ آپ [illegible] سے [illegible] تک [illegible] ہے [illegible] کے
[illegible] کہ آپ [illegible] کہ آپ [illegible] ہے [illegible]
مطلب [illegible] ہوتا ہے [illegible] ہے۔ [illegible] آپ کے [illegible] کے [illegible]
[illegible] کہ آپ [illegible] میں [illegible] ہوتے کی [illegible]
کیا فائدہ؟

انجم: [illegible] سے آپ کے بارے میں [illegible] ہے کہ آپ کے یہاں [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو کیا کہنا ہے؟

فیض: شاعری تو [illegible] شاعر اپنا [illegible] سے [illegible] ہے۔

اس ضمن میں یہ کہنا چاہیے کہ اس کی کچھ حد اور سرحد ہونی چاہیے۔ جہاں تک اجارہ داری کا تعلق ہے جس کے متعلق آپ نے کہا
نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں مختلف ادوار اقبال سے شروع ہے۔ البتہ اقتدار اور مختلف طبقات سے لے کر تاریخ میں تلاش کرتا
ہے۔ یہ سب تجربات میرے خیال میں نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ امام صاحب جب انسان کو تعین تک تصور
ہے تو اس کا اظہار بھی تاریخ ہوگا۔

افضل: چند برس قبل آپ سے دوران گفتگو یہ پتا لگا تھا کہ علامہ اقبال مرحوم کے یہاں جایا کرتے تھے تو مجھے یہ خیال ہے کہ
آپ نے ان کی شاعری کا رنگ قبول بھی کیا؟

فیض: آلا تو نہیں ان کی خدمت میں نہیں جاتا تھا لیکن محمود ایاز ان سے نیازمندی کا شرف حاصل رہا ہے اور ان کی صحبت کی سعادت
بھی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میری شاعری میں ان کا رنگ نہیں ہے۔ شعوری طور سے میں نے ان کا
رنگ قبول کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا طرز بیان دوسرا ہے اور میرا دوسرا لیکن جہاں تک زبان و بیان، انسان کی عظمت، عدل و
انصاف، معاشرتی انصاف، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج، یہ سب ان کی تعلیمات کا اثر ہے۔

افضل: آج اقبال کے کس طرز فکر سے آپ کو اتفاق ہے؟

فیض: یعنی عقائد تو باطنی چیز ہیں اور اعمال ظاہری۔ جہاں تک لازمی عقائد کا تعلق ہے اس کا معاملہ حقوق اللہ اور بندے کے درمیان
ہے اور اس کا تجزیہ کرنا ضروری بھی نہیں ہے۔ کچھ عقائد ہیں جن کا تعلق عام زندگی سے ہے جیسے اخلاق و کردار
وغیرہ، اخلاق کے ذریعے آپ لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات سے لوگوں کو آگاہ
کرتے رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اسی صورت میں قدیم عقیدوں کا اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔ مگر ہم ان کی تو ساری کی ساری
ذاتی تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی ہے اور شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میری شاعری اور میرے دینی عقائد میں کوئی تضاد نہیں۔

ضمیر اقبال: مجھے یوں لگتا ہے کہ آج کل ادب میں رجحانات بھی پچیس برس کے لگ بھگ رہتے ہیں۔ پھر تحریک آتی ہے تو پھر ایسے واقعے ہو جاتے
ہیں کہ کسی کتاب کا شائع ہونا ایک ٹرننگ پوائنٹ بن جاتا ہے ایک واقعہ ایک ٹرننگ...... جیسے عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" شائع ہوا
تو لوگوں نے کہا کہ یہ ایک ایونٹ ہوا ہے اردو ادب میں۔ لیکن شاعری میں تو ایسی مثال واضح طور سے نہیں ملتی۔ تو پہلے میں
جب آپ کی "دست صبا" شائع ہوئی تو یوں لگتا ہے ہر طرف ترقی پسندی چھا گئی اور یہ ایک ایونٹ تھا۔ ایک ٹرننگ، ایک واقعہ
اردو شاعری میں..... تو پہلے آپ کس طرح محسوس ہوئے۔ اب دوسروں میں کچھ لوگ آپ جیسا لکھتے تھے تو کیا اس واقعہ
نے آپ کی آئندہ آنے والی شاعری کو نقصان تو نہیں پہنچایا یا معیار کا کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا یہ پایا جاتا ہے ایک [illegible] تو اسے
آپ نے کس طرح سے لیا؟

فیض: یہ تو اچھا سوال ہے۔ جب "نقش فریادی" چھپی تھی تو جب بھی ہم نے سمجھا تھا کہ ہمارا کام ہو گیا ہے۔ جب یہ کتاب
چھپ گئی تھی تو یہ حیرت ہوا کہ اور ہم نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ [illegible] سب لکھتے ہیں لیکن پھر جب "دست صبا" چھپی ہے تو اس میں
ایک نیا تجربہ آگیا ہے۔ [illegible] اس زمانے کے جو حالات تھے اور جو شعور پیدا ہوا تھا، اس کا لوگوں کو ایک [illegible]
اس میں زیادہ گنجائش نظر آئی۔ اس وجہ سے لوگوں نے [illegible] حرکت کرتے آئے ہیں۔ [illegible] اس کا
کوئی جواب نہیں چاہئے۔ اس وجہ سے ہم جو پہلی شاعری کو اس طرح [illegible] تبدیلی [illegible] کرتے
رہتے ہیں۔ "دست صبا" کے زمانے میں بھی جو تبدیلی [illegible] ہے۔ اس کے بعد [illegible] کی طرح کے

دانتا ت کی طرح کے حالات پیدا ہوئے تو ہم اپنے دل پر اور لوگوں کے دلوں پر گذرتی ہے۔ جو ہم نے دیکھی کہ لوگوں پر گذر رہی ہے ہم اس کو شعر میں لانے کی کوشش کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں ..... یہ تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی کمال ہم نے پیدا کیا ہے۔ تو ہم اپنے دل کی بات ہے جس سے شعر بن جائے تو وہ لکھتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ اپنے دل میں کچھ ایسا خاص واقعہ نہیں ہو رہا ہے۔ واردات نہیں ہو رہی ہے، ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں اور پھر شعر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہم نے یہی روش یا انداز ہے پہلے سے ..... تھا جیسے آپ کو پسند ہے!!

مظفر اقبال: آپ کی شاعری میں ایک بڑا عنصر یا بڑی علامت ہے خواب۔ خواب، شہرت، روشنی، سویرا اور میرا مطلب ہے کہ ایک ... جو اپنی تمام تر وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ آپ کی شاعری میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسا خواب ہے ... اصل میں آپ زمانی طور پر بھی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو خواب دیکھنے والی نسل تھی اور اس نے اس خواب کی تعبیر کے لیے کام بھی کیا۔ جنھوں نے آزادی کی تحریک میں شعوری طور پر حصہ لیا۔ وہ لوگ ایک تاریک رات کے مسافر تھے۔ انھوں نے جو سحر دیکھی ... جب ہم دیکھتے ہیں تو اندھیرے سے اندھیرے تک کا سفر نظر آتا ہے۔ وہ ایک تاریک رات سے نکل کر دوسری تاریک رات میں گم ہو گئے اور اس طرح کہ وہ سویرا یا صبح کے خواب تو ہیں لیکن روشنی کا وجود بھی نظر نہیں آتا۔ تو یہ اجتماعی خواب کے ریزہ ریزہ ہونے کا عمل ہے آپ نے اسے جو بیان کیا ہے لیکن اس خواب کی دنیا اور خواب شکستگی کے عمل کے جو دو لازمی نتیجے ہوتے ہیں یعنی ایک تو یہ کہ لوگ اپنے خواب کے بکھرنے کے عمل سے آنکھیں بند نہیں کر پاتے یعنی فرار کی راہ ..... اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کی شاعری یا نثر لکھنے لگ جاتے ہیں۔ ادب اور شعر میں جھنجھلاہٹ کا، غصہ، نفرت، حقارت اور رد کرنے کا عمل ... جس میں تلخی اور ... جیسی شاعری پیدا ہوتی ہے... لیکن آپ نے خلاف یہ کیا کہ دونوں انتہاؤں سے خود کو بچائے رکھا۔ آپ کی شاعری میں ایک قسم کا ایک توازن پیدا ہوا لیکن اس کی تلخی اور نفرت برقرار نہیں اور نہ وہ ہو گی۔ تو آپ نے کیسے اپنے آپ کو مایوسی سے بچایا؟

فیض: یہ تو بات یہ ہے کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ خواب تو ابھی پورا نہیں ہوا ہے ..... (اردو ادب!!!) یہ مصرعہ ایک دلیل ہے۔ اور میر صاحب نے بھی کہا ہے کہ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے، ہم تو ابھی مرے بھی نہیں ہیں۔ موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے ..... یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ تو اگر موت کو ایک بڑا شاعر یہ ..... وقفہ قرار دے سکتا ہے اور کہتا ہے کہ موت کے بعد بھی دم لے کر کوئی آگے چل سکتا ہے تو ہم تو ابھی مرے بھی نہیں ہیں۔ یعنی ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم جو ہے ہمارا وطن ..... تو ابھی ہے اس لیے خواب کے ملیا میٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاعر کا فرض ہے یہ ہے کہ خواب کو زندہ رکھنا یا امید کو قائم رکھنا..... وہ اختیاری بات نہیں ہے۔ وہ تو مجبوری ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی کو قائم رکھنا ... یہ تو ہم کو سب سے بڑی نعمت عطا کی ہے اس سے ناشکری اور اس سے فرار کرنا تو ایک طریقے سے کفر ہے۔ چنانچہ اس مضمون پر ہم نے ایک نظم بھی لکھی ہے ..... "ہم تو مجبور تھے اس دل سے" شاید اس میں ہے "شام شہر یاراں" میں ..... کہ .....

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس میں ہر دم
گردشِ خوں سے وہ کہرام بپا رہتا ہے
جیسے رندانِ بلانوش جو مل بیٹھیں بہم
میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے

اور اس کے آگے کہتے ہیں کہ

ہم نے اس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا دیا فردوسِ نظر

پہلے کا جو ہے منظر ابھی باقی ہے کہ..... ابھی پایا جائے گا ..... آں ..... ہاں

مرہمِ یاس سے مائل بہ شفا ہونے لگا
زخمِ امید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا

تو فلسفہ زندگی جو ہے اس کے ساتھ جو فلسفے کے جو عمود امید کا ختم ہوتی ہے۔ راستے کی آخری منزل تو موت ہے تو آخر وہ راستہ تو گوارا کیسے ہے، اس وجہ سے ..... ہم کو ٹھیک ہے ..... جب آدمی کا زخمِ امید کا مرہم تھا تو اس سے امید کی طرف جانے کے لیے اس کا اقرار کرنا چاہیے یعنی امید کا اور آگے منزل کی طرف چلنے کا ارادہ جو ہے وہ بھی قائم رکھنا ہے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ آدمی اگر..... جب یہ ہے تو اس سے زیادہ کرے۔ جب اضطراب ہے تو اس سے بھی انکار کرے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی جو امید ہے یقین اور ایمان ہے اس کو بھی قائم رکھے کیونکہ اس کو چھوڑ دے تو پھر ایک طرح کی غیر حقیقت پسندی ہو جاتی ہے۔ جو زندگی کو ناقص کر دیتی ہے جس کی ایک مختصر تعبیر ہے کہ وہ کہتے ہیں:

روا ہے بے بسیِ دوراں، کہ بیٹھیں نہ آسمان سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا، ایسے کہیں ہوتا

غالب نے بہت پہلے کہا تھا کہ

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مظفر اقبال: یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ اپنے آپ کو اس ابتدا ہونے سے بچنے کا یقین آپ کے اکثر ساتھی ..... یا تو وہ اپنے المیوں میں ہو کے رہ گئے کہ آج جو آزاد ہو رہے تھے کہ ان کی شاعری یا ان کی تحریر الگ ادب ہو کے اب بن کر رہ گئی ..... یہ دوسری طرف انہوں نے جو پتا چلا اس کا خروج کر دیا۔ تو آپ کے اندر یہ صورت پیدا کیسے ہوئی یا آپ شعوری طور پر اسے پانے کی کوشش کرتے رہے؟"

فیض: نہیں ..... یہ شعوری اور غیر شعوری میں تو کوئی فرق نہیں ہوتا ..... آدمی شعوری طور سے اگر چیزوں کو دیکھے تو اس کا غیر شعور تو اس سے شعور کو متاثر کرتا ہے۔ وہ کوشش یہ کرتی ہے کہ آدمی غیر شعوری کو دبائے رکھتا ہے، غیر شعوری ..... غیر شعوری طور پر تو شاید ہمارا کبھی پیچھے چلا جائے تو بھی چاہتا ہو گا یا وہ سے بچنے کے لیے بھی چاہتا ہو گا ..... یا یہ کہ خاک تالاب اور آرام سے ہم بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہیں۔ تو یہ غیر شعوری طور سے ہوتا ہے کہ نہیں اور اس میں ایک تو یہ ہے کہ ادیب کہتا ہے آپ میں جو منفعل ہو جاتا ہے وہ تو اس کا نصیب ہے کہ بیٹھ جاتے ہیں لیکن اس کے لیے تھوڑا ایمان بھی چاہیے، یقین بھی چاہیے اور کوئی روشنی، کچھ امید کی روشنی ہو، تو کچھ لوگوں کی روشنی ..... اس کی وجہ سے ان میں زندہ رہتا ہے۔ آدمی اگر لوگوں سے کٹ جائے اور الگ ہو کر بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ افسردگی طاری ہو جائے گی اس پر جب تک لوگ ہیں، کاروان ساتھ ہے تو آدمی مایوس کیسے ہو۔

مظفر اقبال: آپ کی شاعری ساری کی ساری یوں لگتا ہے کہ جیسے مسلسل ایک جدوجہد کی کہانی ہے، اور جیسے آپ نے ابھی کہا کہ وہ سحر ... یعنی ایمان و یقین تو یا ایک وقفہ ہے..... لیکن کہیں کہیں آپ نے بہت روایتی قسم کے مضمون بھی باندھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

محتسب شہر سے نے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

تو یہ ایک خالص مخصوص روایتی قسم کی جو چیزیں ہیں جو آپ کی باقی شاعری سے کٹی ہوئی لگتی ہیں کہ وہاں تو ایک مسلسل جدوجہد کا بیان ہے اور بہت زیادہ حقیقت نگاری ہے اور آج کا مسئلہ ہے تو کیسے یہ پرانی چیزیں.....!!

فیض: نہیں یہ پرانی چیز نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ بھی بالکل ہماری ہمعصر چیز ہے کہ محتسب شہر جو ہے اُس سے کشمکش جو ہے شاعر کی یا شریف آدمی کی..... وہ پرانی چیز نہیں ہے، وہ جاری ہے۔ دُوسرا یہ کہ جو صنف ہے شاعری کی..... غزل، اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں آپ پرانی سے پرانی بات اور پرانے سے پرانے رمز و کنایہ کو اس طریقے سے بیان کر سکتے ہیں کہ وہ بالکل ہمعصر حقیقت بن جاتی ہے۔ چنانچہ محتسب شہر کا جب ہم ذکر کرتے ہیں یا واعظ اور زاہد کا ذکر کرتے ہیں تو وہ روایتی بات نہیں ہے۔ وہ آج کی ہمعصر روز مرہ کی حقیقت ہے، چونکہ پرانے زمانے سے جو صوفی کی اور واعظ کی چپقلش نظر آتی ہے یعنی ایک طرف محض تصنع اور رسم و رواج کی پرستش اور دُوسری طرف جو صحیح جوہر ہے نیکی کا اور دین کا اور انسان دوستی کا..... وہی صوفی کی اور زاہد کی پرانی چپقلش تھی وہ آج بھی ویسی ہے جیسے پہلے تھی۔ تو وہ روایت پسندی نہیں ہے۔ نہ صرف یہ ہے کہ پرانے خیال کو دہرایا ہے، بلکہ اس مضمون کو آج کل کی زندگی کے ساتھ منطبق کرنا ہے اور لوگوں کے سامنے لانا ہے۔ یہ کہ ہم روایتی بات نہیں کر رہے ہیں آج کل کی بات کر رہے ہیں۔

مظفر اقبال: لیکن آپ کی زندگی بہت شروع ہی میں، اور جب میں زندگی کہتا ہوں تو شاعری کی زندگی میری مراد ہے، ایک خاص طرح کی فضا کا شکار ہو گئی۔ جیل کی وجہ سے اس میں ایک خاص طرح کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو کیا اس سے آپ کا کینوس محدود نہیں ہو گیا۔ جیل کی چار دیواری کا محدود ماحول۔ وہی پرندے، وہی ساتھی، اور کبھی کبھی تو وہ بھی نہیں۔ وہی چار دیواری، وہی پہرے دار..... تو اس سے ایک ابتدائی دور میں کنڈیشنڈ نہیں ہو گئی آپ کی شاعری؟

فیض: نہیں اس سے اُلٹ ہوتا ہے، کنڈیشنڈ۔ تو اس طریقے سے تو کنڈیشنڈ ہونی چاہیے۔ اس میں ایک نیا رنگ، ایک نئی جہت، ایک نئی ڈائمنشن ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ بہت سی چیزیں کہ ذہن پر باہر آدمی نے روز مرہ زندگی میں غور نہیں کیا ہوتا۔ اُن کا حُسن اور بدصورتی اُسے نظر نہیں آتی اپنی معروفیات میں..... اس لحاظ سے تو انسان کی حیات اور طرزِ احساس جو ہے وہ وہاں جا کر اور زیادہ نازک ہو جاتا اور کچھ حسی لُطف پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو یہ بات ہے، دُوسری طرف یہ کہ جیل خانے میں بیٹھ کر آدمی کو باقی سارے عالمِ موجودات پر نظر ڈالنے کی زیادہ فراغت سے فرصت ملتی ہے۔ چنانچہ جیل خانے میں جا کر ہم نے افریقہ پر نظم کہی اور دُوسری ایسی چیزوں پر نظم لکھی کہ جن کے بارے میں باہر تو جو ہی نہیں جاتی وغیرہ وغیرہ..... تو اس طریقے سے باہر کی دُنیا اور زیادہ نزدیک ہو جاتی ہے، یا بہت دُور ہو جاتی ہے، اور دونوں طرح سے عمل ہوتے ہیں۔ اس سے مقید آدمی نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ جیسی آزادی جیل خانے میں ملتی ہے ذہنی طور پر وہ باہر نہیں ملتی۔ اس لیے کہ باہر تو آپ روز مرہ کی اُلجھن اور جھنجھٹ جو ہیں اس میں آدمی اتنا اُلجھا ہوا ہوتا ہے کہ پورے کینوس کو دیکھنے کی فراغت نہیں ملتی۔ اس طریقے سے جیل خانے میں ذہن زیادہ کھل جاتا ہے۔

مظفر اقبال: اچھا آپ کی آخری کتاب "مرے دل مرے مسافر" میں ایک خاص چیز ہے جو دوسری کتابوں سے مختلف ہے اور جو لگتا ہے کہ وہ
تنہائی کی چیز ہے ..... [...] ہے..... مجھے یاد ہے [...] کلام ہمارا مطلب ہے غریب الوطنی ذرا ہوتے
تو اب سے آپ کی شاعری میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور دوسرے جو لوگ ہیں اس طرح کے شاعر ناظم حکمت ہیں،
محمود درویش ہیں تو کیا ایک طرح سے کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ایک برادری ایسی ہے شاعروں کی یا شاعروں کی جس کے
اب آپ بھی حصہ دار ہیں اور شریک ہیں اس میں اور......

فیض: ایک طریقے سے ہے، ایک طریقے سے نہیں بھی ہے۔ ایک طریقے سے تو یہ کہ وطن سے دوری اور وطن سے فرقت ..... کیفیت تو مشترک ہے لیکن ہم میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ لوگ تو جلا وطن کئے گئے تھے.. ہم تو اپنی مرضی سے آوارہ گردی کر رہے ہیں۔ ہمیں تو حکومت نے نکالا نہیں ہے۔ ہمارا تو جب جی چاہے وطن جا سکتے ہیں تو وطن سے دوری کا تو یہ ہے کہ ایک درد اور فرقت ہے۔ یہ بھی نہیں کہ بس [...] وطن سے دوری کا [...] احساس ہوتا ہے [...] ہوتی ہے وہ تو مشترک ہے۔ لیکن وہ جو فرق ہے کہ ان کی مجبوری ان لوگوں کی ہے اور وہ مجبوری تو ہمیں نہیں ہے۔ ہمارا جب جی چاہے گا لوٹ جائیں گے۔

مظفر اقبال: مطلب ہے کہ [...] بھی ہے جیسے یہ ہے کہ

ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا

فیض: ہاں وہ تو ٹھیک ہے کہ شاعری ..... یہ اتفاقی طور پر تو ٹھیک نہیں ہے کہ [...] تو نہیں ہو گیا...... ہم نے دیکھا کہ اس وقت لکھا ہے کہ ان حالات میں لکھی گئی ہے۔ تو ان لوگوں سے ہماری حالت مختلف ہے کہ جس طرح سے مجبوری ان کو ہے ہمیں تو اس طرح سے نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم تو جا سکتے ہیں مگر ہمیں کسی نے روکا تو نہیں ہے۔ [...] جب ہم [...] چاہے گا چلے جائیں گے۔ اب محمود درویش اور فلسطینی ہمارے لوگ جو ہیں [...] کر دیا گیا ہے ان کا [...] ہم لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ناظم حکمت جن کو چودہ سال قید ہوئی اور پھر انہیں فرار ہو کر [...] ان کے [...] جانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ تو ان کا [...] ان کی مجبوری جو ہے وہ ہم سے زیادہ ہے۔ لیکن اس حد میں تو نہیں ہے۔ لیکن اب بھی یقین ہے کہ ہمارے چاہنے والے محبت کرنے والے بہت ہیں لیکن پھر بھی اس سے فرقت اور تکلیف تو کم نہیں ہوتی وہ تو اپنی جگہ ہے۔

مظفر اقبال: اچھا ایسا ہے کہ یہ جو اتفاقی طور پر آپ کئی سال سے باہر ہیں ملک سے تو کس طرح [...] چیزیں ہیں ایک مختلف پس منظر میں نظر نہیں آتیں۔ جب آپ کسی چیز کو آنکھ کے بہت قریب کر کے دیکھتے ہیں تو وہ چیز نظر نہیں آتی اس کے خدوخال زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں تو کیا آپ بھی [...] محسوس کرتے ہیں دوری سے ....!

فیض: ہاں ایک حد تک تو ٹھیک ہے کہ باہر [...] سے آدمی ذرا زیادہ [...] دوسری طرح سے دیکھ سکتا ہے کہ اس میں آدمی ذاتی طور سے [...] میں [...] نہیں ہوتا جو کہ لوگوں پر گزرتی ہے [...] جو لوگوں پر بیت رہی ہے وہ آپ پر ذاتی طور سے تو نہیں بیت رہی۔ اس لئے آپ کے دل پر جو بوجھ ہوتا ہے وہ اس طرح سے نہیں پڑتا جس طرح وہاں [...] گزرنے کا [...] ہوتا۔

یعنی اردو کر رہی کچھ بھی زبانوں سے ہوتی ہے اس کو شاید زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

مظفر اقبال: آپ کی شاعری میں جو زبان کا مسئلہ ہے کہ آپ بڑی روانی سے ہماری تراکیب میں اساتذہ سے استفادہ تو استعمال کرتے ہیں جو ہماری روایتی ہے عربی کا حصہ ہیں۔ لیکن ایک بالکل نیا طرز ان میں نظر آتا ہے۔ کبھی آپ کوئی زبان، نیا محاورہ استعمال کرنے کا شوق نہیں ہوا جیسے آج کل بہت سے لوگوں کو ہے یا ضرورت محسوس کبھی ہوئی؟

فیض: یہی بات ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ذخیرہ جو ہماری اردو شاعری کا ہے، جو زبان کے ذخیرے ہیں، باقی اس میں ایسی چیزیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے نئے کام لئے جا سکتے ہیں کبھی کبھی۔ لیکن ان سے نکلنے کے لیے کوئی بہت بڑا شاعر چاہیے۔ جو بہت بڑے شاعروں کا کام ہوتا ہے مثلاً یہاں تو ایک صدی تک تو یہ ہوا کہ لوگ دلی کے اور لکھنؤ کے انداز پر لکھتے رہے۔ میر نے دردمندی سے اور جعفر زٹلی نے، غالب اور اقبال نے اپنا اپنا خود سے اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس کا دائرہ بھی ان کی وجہ سے بہت بڑا ہوا ہے۔ اس کی وسعت بھی۔ لیکن کسی حد تک تھوڑی بہت کوشش ہم نے بھی کی ہے۔ اس سے آگے جو نئی بحث نہیں ہوئی کہ اس لیے کہ ہمیں لگتا ہے کہ نثر اور نظم کا فرق تو قائم رہنا چاہیے اور وہ فرق کس طرح سے قائم رہ سکتا ہے کہ نثر اور نظم میں ایک اہم ترین فرق ہے۔ نظم نام ہے چیزوں کو یکجا کرنے کا۔ نثر نام ہے چیزوں کو بکھیرنے کا..... تو نظم کا منصب یکجائی ہے قاعدہ..... کوئی شاعری تو قاعدہ کے بغیر کسی قاعدے کی پابندی تو کرنا ہی چاہیے۔ وہ قاعدہ جو ہے وہ آہنگ اور ترنم کا بھی ہے اور وہ ایک منطقی ربط جو بات کی ہوتی ہے۔ تنظیم ہے وہ مربوطیت ہے۔ شاعری منطقی ربط کی بات ہے اور یہ فرق قائم رکھنا..... منطقی ربط بھی لازم ہے اور اس میں بھی آزادی کرتے ہیں تو اس کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ تو تکرار کی اکتاہٹ ہے۔ کہا جاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری روایت نے جو کچھ دیا ہے اس کا بھی ابھی ہم نے پوری طرح سے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ابھی باقی ہیں۔ جن سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں جس کی ہم نے کوشش نہیں کی۔ ایسا ہے کہ ہماری اپنی اصل جو ہے وہ جو ہماری روایت ہے اس سے زیادہ بہتر ہوتا ہے اس سے اس روایت میں جو پنہاں ہے اس کو دوبارہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نئی چیزیں جو ہیں ان کے کہنے کا سلیقہ جو ہے وہ سلیقہ پیدا کرنا..... ایسا کرنے سے تو بڑا شاعر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی اتنی استعداد نہیں ہے۔ (خدا کرے آپ اب ذرا کریں.....) جب ہم نے وہ بات کرنی ہوتی ہے تو ہم جتنا استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں ابھی کہاں کہاں آتا تو ہم بہت سمجھنے لگتے ہیں۔

آصف فرخی: آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی رفتار کم ہے لیکن پچھلے دنوں آپ نے خاصی تعداد میں نظمیں اور غزلیں کہی ہیں اور یہ لگتا ہے کہ پچھلے کئی سالوں کے مقابلے میں یہ تعداد زیادہ ہے۔

فیض: کبھی یہی ہوتا ہے۔ کبھی گاڑی چلتی ہے، کبھی رک جاتی ہے۔

آصف فرخی: اس زمانے میں رفتار کے علاوہ آپ کی شاعری کے اسلوب اور انداز میں بھی خاصی تبدیلی ملتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ آپ کے یہاں یہ تبدیلی آئی ہے تو کیا یہ تبدیلی شعوری تھی یا خود بخود آئی؟

فیض: ہم تو سمجھتے ہیں کہ کوئی تبدیلی ہوئی ہی نہیں۔ ہم جیسا پہلے لکھا کرتے تھے ویسے اب بھی لکھتے ہیں۔ آج بھی جو کیفیت گزرتی ہے دل پر اس کا بھی ایک وقت ہوتا ہے کبھی زیادہ شدید ہوتا ہے، شعوری طور پر ایسا نہیں ہوتا کہ کوشش کر کے کہا جائے۔ البتہ بات کہنے کا یہ نیا طریقہ ہے کہ کسی دوسرے طریقے سے کہا ہے۔ شعر اپنا لازم نہیں ہوتا ہے۔ تجربہ ہے وہ خود ہی اظہار کرتا ہے کس طریقے سے لکھا ہے۔ تو یہ ایک نیا تجربہ تھا جس سے ہم پہلے نہیں گزرے تھے۔ اس تجربے سے اس کا اثر ہو گیا ہے۔ یہی

دوران میں جو کچھ گذر رہی ہم پر۔

سوال: اب تو یہ میر اور سودا کے دور کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اچھی شاعری بھی ہو رہی تھی اور بُری بھی، تو مجموعی طور پر آپ کیا کہیں گے؟ یا میں اپنے سوال کو یوں پوچھ لیتا ہوں کہ شاعری اس مقام سے آگے گئی ہے جہاں آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے اسے چھوڑا تھا یا یہ پیچھے کی طرف چلی گئی۔

فیض: نہیں، پیچھے تو کوئی چیز نہیں جاتی۔ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اچانک ایک ہی وقت میں بہت اچھی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس میں تھوڑا سا ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ پھر گاڑی آگے چلتی ہے تو اس وقت کوئی ٹھہراؤ تو نہیں ہے جس کو لوگ کہتے ہیں کہ جمود ہے، تو جمود تو کوئی نہیں ہے۔ اچھی چیزیں لکھی جا رہی ہیں خاص طور پر نثر میں۔

آصف فرخی: فیض صاحب آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی پوری ایک نسل تھی جس میں آپ کے علاوہ ن۔ م۔ راشد تھے۔ مجاز اور جذبی تھے...... اور مجید امجد تھے...... اور یہ سارے لوگ آج ہم کو دیوقامت نظر آتے ہیں تو آپ کے خیال میں اس نسل نے اُردو شاعری کی روایت میں کیا اضافہ کیا اور اس دور سے بحیثیت ایک شاعر کے آپ کا کیا رشتہ تھا؟

فیض: بھئی یہ اور لوگوں کا کام ہے۔ اضافے وغیرہ کا فیصلہ کرنا تو اور لوگوں کا کام ہے، ہماری Contribution جو ہے اُس کا فیصلہ کرنا دوسرے لوگوں کا کام ہے نا۔ اور رہی بات پوری نسل تو وہ آپ نے خود ہی کہہ دیا کہ یہ لوگ کیسے نظر آتے ہیں۔ آگے جو اس وقت شاعر مصروف رہی ہیں اس کا تنا تو وہی ہے، اس کا Soure تو وہی ہے۔ نئے طرح کے تجربات اور نئی طرح کی صورتیں جو اظہار کی پیدا ہو رہی ہیں یہی Contribution ہے۔ یہی اُن لوگوں کا کام ہے، آپ نے جو نام لیے، راشد، میراجی...... مگر میراجی ہم سے جونیئر تھے بہت جونیئر تھے۔

آصف فرخی: تو اس پوری نسل کے کارناموں میں آپ کی شاعری کیا کسی خصوصی مقام کی مستحق تھی۔

فیض: بس اسی میں ہم بھی شامل ہیں، ہم کوئی ان سے الگ تو نہیں ہیں۔

آصف فرخی: میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا اور آپ کے اسلوب سے لوگوں نے بہت اثر قبول کیا، اس کی نقل بھی کی۔

فیض: ہم سے زیادہ حالات نے متاثر کیا۔ جس قسم کا ماحول ہوتا ہے جس قسم کی فضا ہوتی ہے جس قسم کے تجربات سے لوگوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے، اسی وجہ سے لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے اس میں تھوڑی بہت داد بھی مل جاتی ہے کسی کی پیروی سے۔ لیکن اصل بات تو ماحول اور فضا اور ذہنی کیفیت ہوتی ہے، وہ طے کرتی ہے کہ کس قسم کا ادب پیدا ہوگا اس زمانے میں۔

آصف فرخی: کون سا ناول آپ کو اچھا لگا؟

فیض: بھئی ابھی انتظار حسین کا جو ناول چھپا "بستی" وہ بہت اچھا ہے۔

آصف فرخی: اس ناول کے بارے میں بعض نقادوں نے کہا کہ اس میں ناسٹلجیا بہت ہے۔

فیض: تو کیوں نہ ہو؟ آخر ناسٹلجیا ایک انسانی جذبہ ہے اور فطری جذبہ ہے۔ تو اس میں کیا مضائقہ ہے، ناسٹلجیا تو ٹھیک ہے۔ لیکن اُنھوں نے اس ناول میں صرف ماضی کا رونا تو نہیں رویا، ساتھ میں زمانۂ حال کی جو صورتِ حال ہے اس کو بھی بیان کیا ہے۔ دونوں کا امتزاج ہے اس میں۔ یہ کوئی بُری بات نہیں۔

آصف فرخی: بعض ترقی پسند نقاد کہتے ہیں کہ انتظار حسین کے یہاں ماضی کا جو استعمال ہے وہ مریضانہ ہے۔

فیض: اس ناول میں تو کوئی چیز اس قسم کی نہیں ہے۔ ہمیں تو اچھا لگا یہ ناول۔

عبادت: فیض صاحب! ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اُردو شاعروں میں سے آپ نے کن کن شاعروں کا مطالعہ کیا ہے، اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں؟

فیض: اصل میں مطالعہ جسے کہتے ہیں وہ تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے، یعنی غالب کا..... جیل خانے میں کچھ وقت سودا کے ساتھ گزرا اور کچھ نظیر کے، اور دو ایک دوسرے شاعروں کا کلام پڑھا۔ یوں تو اپنی مدرّسی کے زمانے میں اور پھر ریڈیو کے سلسلے میں تو مجبوراً سب ہی کو پڑھنا پڑا لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھا ہے اُن میں یہی ہیں۔ میر، غالب، سودا، نظیر، انیس۔

عبادت: جدید شاعروں میں سے آپ کس کس کو پسند کرتے ہیں؟ جدید شاعروں سے میرا مطلب ہے وہ شاعر جو علامہ اقبال کے بعد آئے اور آپ کے ہمعصر ہیں؟

فیض: اگر میں کہوں اپنے ہمعصروں میں مجھے فلاں پسند ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ باقی ناپسند ہیں۔ دُوسرے مجاز مرحوم تھے، اور مخدوم ہیں، علی سردار جعفری ہیں۔ ہمارے ساتھ کے جو لوگ ہیں اُن میں یہ ذرا زیادہ پسند ہیں۔ یوں بہت سے اور بھی ہیں جن کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔

عبادت: جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: جوش صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ بہت دنوں سے نیاز حاصل ہے اُن سے۔ اُن میں خاص قسم کا ایک زور اور ایک خاص قسم کی قدرتِ کلام ہے اس سے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں لیکن بہت پُرگو ہیں۔ غالباً قدرتِ کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب ہی بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے یا کچے یا بالکل خالص یا کچے اور کم خالص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے اور احتیاط نہیں کرتے تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں، لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زورِ کلام میں کہی ہیں۔

کرشن: آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا تھا؟

فیض: شعر تو... شاید ہم نے بچپن ہی میں تک بندی شروع کر دی ہوگی۔ جس کا ہم نے کبھی کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔ لیکن سنجیدگی سے ہم نے اُس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ بات 1929ء کی ہے۔ ہم تھرڈ ایئر میں پڑھتے تھے جب پہلا مشاعرہ ہوا گورنمنٹ کالج کے تمام قدر شعرا حضرات تشریف لائے تھے۔ آج کل جو فرشی مشاعرے کا رواج چل نکلا ہے، اُس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کالج میں ایسا ہوتا کہ جو بڑے بڑے شاعر ہوتے تھے، وہ سٹیج پر کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور جو ہمارے جیسے ابھی شاعر بننے کی کوشش میں ہوتے تھے، وہ سامعین میں بیٹھتے تھے۔ اور باری باری اُن کو پکارا جاتا تھا۔ تو ہم نے مشاعروں میں پڑھنا تو گورنمنٹ کالج ہی میں شروع کیا تھا۔ پہلی بار جو ہم نے غزل پڑھی تو بہت داد ملی۔ اُس مشاعرے کی صدارت پطرس بخاری صاحب کر رہے تھے۔ پہلے دور میں بہت داد ملی تو دوسرے دور کے لیے بھی ہمیں بلایا گیا۔ مگر ہمارے پاس تو صرف ایک ہی غزل تھی۔ ایک بار ہمارے ایک دوست برج موہن نے اپنے ایک دوست کے نام ایک منظوم خط ہم سے لکھوایا تھا جو ہم نے نظم کر کے لکھ دیا تھا..... ہم نے مجبوراً دوسرے دور میں وہ منظوم خط پڑھ دیا۔ اُس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا تو چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم اور عبدالمجید سالک جیسے بلند پایہ صاحبِ سخن اور اہلِ قلم ہمارے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ:

''معلوم ہوتا ہے بیل کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے'' میں نے کہا ''جی ہاں لگی تو ہے''۔ کہنے لگے ''ہاں اچھی چیز ہے بہت اچھا ہے شعر کہا کریں''۔ ہم نے سمجھا کہ ہم تو واقعی شاعر بن گئے ہیں جو اس قسم کے پرانے لوگ ہمیں داد دے رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارے شعری سفر کا آغاز۔

کرنل: ابھی آپ نے کہا کہ کسی زمانے میں آپ تک بندی کیا کرتے تھے اس زمانے میں کبھی خیال آیا تھا کہ آپ شاعر بن سکتے ہیں؟

فیض: اس وقت تو ہم اپنے کو شاعر سمجھا کرتے تھے۔ یہی خوش فہمی کا دائرہ یہاں تک ہی محدود تھا۔

نصرت: ایک ذاتی سوال ہے آپ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کس شاعر کا اثر قبول کیا؟

فیض: جب شاعری شروع کی تو اس وقت کے جو بھی مشہور شاعر تھے ان کا اثر آیا۔ مثلاً اختر شیرانی، حسرت موہانی۔

نصرت: جوش ملیح آبادی؟

فیض: جوش کا اثر ہم پر نہیں تھا۔

نصرت: علامہ اقبال کا؟

فیض: یوں تو اس عہد میں پورے دور پر اقبال کا اثر تھا مگر جہاں تک براہ راست میرا تعلق ہے وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں ہم صرف رومانی شاعری کرتے تھے۔ اس لیے اس زمانے کے جو رومانی شاعر تھے، اختر شیرانی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری ان کا ذرا مطالعہ زیادہ تھا اور ظاہر ہے کہ انگریزی کے ساتھ بھی لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں انگریزی کے بھی مشہور شاعر کیٹس اور شیلے تھے۔ انھیں کا رواج تھا۔ ان کا بھی اثر تھا۔ پھر کالج میں ہمارے بخاری صاحب تھے اور صوفی صاحب تھے اور اس وقت شاید اختر شیرانی کے شاگرد تھے وہ ان سے قریب تھے۔ ان کی دوستی کی وجہ سے ان کا بھی اثر تھا۔ پھر کالج کے ماحول کی وجہ سے انگریزی شاعری کا اثر بھی تھا۔ پھر کالج میں عربی پڑھی تو اس لیے عربی شعراء کا بھی تھوڑا سا اثر تھا۔

مہ جبیں: ایک طرف آپ کا شمار عہد حاضر کے نقیبوں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کو جو مقبولیت ملی ہے وہ اقبال کے بعد آپ ہی کا حصہ ہے۔ جو مقام آپ کو ملا ہے وہ جوش بھی اپنے زمانے کے ہیں۔ آپ کے گلے میں جتنے ہار ڈالے گئے اور آپ کی آمد پر جتنی تالیاں بجتی ہیں ان کا عشر عشیر بھی دیگر شعراء کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف آپ کے نقاد ہیں جن میں بالخصوص میراجی اور راشد نے کچھ خیال کے ایسے شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کی شاعری کا مزاج سراسر رومانی ہے۔ وہ ذہنی یادوں کا محرم نظر آتا ہے جسے ہوئے تاثیر۔ وہ شاید اس طرح سوچتے ہیں کہ زندگی کے ذاتی تجربے محدود ہیں۔ آپ کی شاعری میں نہیں ملتا ہے۔ ان کے آپ کے ہاں صرف چیزوں کو Beautify کرنے کا عمل ملتا ہے اور یوں آپ کی شاعری کا کینوس محدود ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: راشد کی شاعری کا پہلو کون سا ہے؟ ان کی شاعری کا تو کوئی کینوس ہی نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں جو ہے وہ ان کی ذات اور لاشعور کے اوپر کیا؟ اسی طرح میراجی جنس کے شاعر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کا کہنے سے کوئی Content نہیں ہے۔ شاعری میں کینوس سے مراد تجربے کی وسعت اور اس کا پھیلاؤ ہے۔ شاعر جب اپنی ذات سے باہر نکل کر کائنات سے اپنا تعلق جوڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے اپنے تجربات کو Beautify کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس کے بغیر ادب کا فن نہیں بنتا۔ راشد بہت اچھے شاعر ہیں لیکن انھیں کتنے لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کیا لکھا ہے اور وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ابلاغ ہی نہیں ہوتا اور شعر تو اسی وقت شعر ہوتا ہے جب وہ دوسروں تک پہنچے۔

طاہر مسعود: بعض کو آپ پر اعتراض یہ ہے کہ آپ کی شاعری خواص تک محدود ہے؟

فیض: دراصل جو خواص تک بھی نہیں پہنچی ان کا ابلاغ بہت ہی تھوڑے لوگوں تک ہوتا ہے۔ خواص میں بھی صرف ان چند لوگوں تک محدود ہے جنہیں کسی حد تک علم کی سہولت یا آسائش حاصل ہے کہ وہ کلاسیکل انگریزی یا فارسی شاعری اور مغربی ادب تک پہنچنے والی تحریکات مثلاً مارکسزم اور کمیونزم سے واقف ہیں اور ان محدود طبقے تک ہی زبان و ادب سے واسطہ نہیں ہے۔ اور پھر اقبال صاحب کی تو ذہنی فارسی ہے اور بیشتر مشکل فارسی جس میں اقبال کو وہ لوگ بھی نہیں سمجھ پاتے جو انگریزی بھی نہیں سمجھتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال صاحب جس ملک میں رہتے تھے یہاں کے لوگوں نے ان کی تعلیم کا ادراک نہیں کیا۔ ان کو یہ موقع ہی نہیں ملا کہ ان کی بات لوگوں تک پہنچتی یا نہیں۔ میرا جی کی بات عوام تک پہنچی کیونکہ وہ گیت کے شاعر تھے اور ان کی شاعری نہایت سہل ہے۔

طاہر مسعود: آپ ابلاغ کی نسبت پر زور دیتے ہیں کہ شاعری کو صحافت ہی سے قریب نہیں کر رہے ہیں؟

فیض: شاعری اور صحافت میں یہی امتیاز ہے کہ صحافت میں جو باتیں پیش کی جاتی ہیں وہ حالات کو آپ ابلاغ میں شامل کر لیں تو ادب بن جاتا ہے اور ان باتوں کو اگر ادب نہ بنایا جائے تو وہ صحافت بن جاتی ہے۔

طاہر مسعود: ایک نقاد نے آپ کی شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ آپ کی شاعری میں نیا پن یہ ہے کہ ایک طرف سرمایہ داروں کی گرفت ہے جو محل بنانے کے خواب دیکھنے والے انقلابی بھی مجبور ہیں اور دوسری طرف ان کی آنکھوں کے رنگ دیکھ کر احتجاج کرنے والے سرمایہ دار بھی آپ کی شاعری سے اسی قدر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کیا آپ ایسے نقطۂ نظر سے اپنی شاعری کی اس خوبی کا تجزیہ پیش کریں گے؟

فیض: میری شاعری کے اس پہلو کو لوگ ترقی پسند تنقید ہی جانتے ہیں یہ ہے کہ زندگی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں جن کا ابلاغ بھی ہوتا ہے۔ ترقی پسند کے علاوہ دوسرے لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ شعر جو لکھا جاتا ہے اس کے معنی بھی ہیں کیا اس کے اندر بھی ضمیر موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شعر کا ایک ہی پہلو نہیں ہوتا ہے جس کا اطلاق سب پر ہوتا ہے۔ غالب اور شیکسپیئر کی شاعری کا بھی ایک دوسرا پہلو ہے جس میں ہر طبقہ اپنے تجربے کا اطلاق کرتا ہے۔ شعر پڑھنے والا شاعری میں سے اپنے مطلب کا عنصر الگ کر لیتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے جیسے ملک میں لازم ہے کہ آپ کی بات صرف ایک طبقے تک نہ پہنچے بلکہ ہر طبقے تک اور ہر سطح پر پہنچے کیونکہ معاشرے میں ہر طبقے کا کوئی نہ کوئی کردار ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کی ترتیب و تنظیم میں ان کا اپنا رول ہوتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ آپ کا پیغام کسی ایک طبقے تک محدود نہ رہے تاکہ وہ لوگ جن کا تعلق مظلوم اور محروم طبقے سے نہیں ہے ان کے ذہن و ضمیر پر بھی حقیقت واضح ہو اور وہ محسوس کریں کہ ان میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر تبدیلی آئے گی تو انقلاب کا اثر عوام پر بھی مرتب ہوگا۔

طاہر مسعود: ویسے بھی شاعری تو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ذہن بدلے جا سکتے ہیں!

فیض: یہی بڑی اہم بات ہے ان تک پہنچنی تو چاہیے۔ خاص طور پر ہمارے جیسے معاشرے میں جہاں مختلف مسائل اور مختلف قسم کے لوگ ہیں کہ ایک طبقے کی بات دوسرے طبقے تک پہنچنی ہی نہیں۔ یا پہنچتی ہے تو وہ ایک دوسرے کو دشمنی سے دیکھتے ہیں۔

نظر اقبال ایک آپ کی نسبت کرتے ہیں، ذہن کا خواب تھا جس کی آپ نے جدوجہد کی تھی۔ جو تھا ان کا "مرد مومن" کا تصور تھا اور پھر اس کے بعد جب خواب بکھر گیا آپ نے جو شعر کہا تھا یہ وہ وقت تھا جب پاکستان بنا اور ہندوستان میں آپ کے بعض

جو نسل ہے تو یہ سارے لوگ اس ساری صورت حال کو اس طرح سے نہیں دیکھتے، یعنی وہ لوگ جنھوں نے پاکستان میں آنکھ کھولی یا شعور سنبھالا یا جو پاکستان کے قیام کے وقت دو چار یا پانچ برس کے تھے وہ تو موجودہ حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ سیاست دانوں نے یہ کیا، ہمارے ملک کا یہ حال ہوا، بین الاقوامی سطح پر، ملکی سطح پر۔۔ تو یہ ایک زبردست احتجاج ہمیں نظر آتا ہے۔ وہاں پر وہ جیسے آپ نے کہا کہ "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" تو یہ چلے چلو والی کیفیت نظر نہیں آتی، وہ یقین نظر نہیں آتا، یہ درمیانی وقفے والی کیفیت نظر نہیں آتی۔ تو یہ فرسٹریشن، احتجاج اور غصے کی جو شاعری ہے اس کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

فیض: نہیں اس میں بھی جنرلائز کرنا میں سمجھتا ہوں کہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اب بھی جو اچھا شعر لکھا جا رہا ہے اُس میں وہ ساری خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ یعنی اُس میں حقیقت پسندی بھی ہے اور احتجاج بھی ہے۔ احتجاج بھی ہونا چاہیے، اُمید بھی ہے اور یقین بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس میں چوں کہ کوئی تنظیم کی صورت یا تحریک کی صورت پیدا نہیں ہوئی، اس لیے آدمی الگ الگ اپنی نجات کا رستہ تلاش کر رہا ہے تو اس میں اچھی اچھی باتیں بھی نکل رہی ہیں، اس میں ہم نہیں سمجھتے کہ ہم نے کوئی بڑا کام کیا ہے جو آج کل کے نوجوان نہیں کر سکتے۔ وہ بھی کریں گے۔ اب وہ اپنی جگہ، اُن کا مقام اپنی جگہ ہے اور اُن میں جن میں کوئی جوہر ہے اور جن میں کوئی دم ہے، اپنے وقت پر وہ بھی مقام پیدا کر لیں گے جو ہماری نسل کے لوگوں نے یا ہمارے وقت کے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔

اجمل نیازی: آپ کے خیال میں پاکستانی ادب کیا ہے، یہ کیا ہو سکتا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے؟

فیض: پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستان کی روایات، حالات، پس منظر اور پیش منظر سے مطابقت موجود ہے۔ ویسے بڑا ادب حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ اس میں مقامیت کے ساتھ ساتھ عالم گیریت اور آفاقیت بھی موجود ہے۔ عالم گیر ادب کا لکھنے والا بھی ایک مقام، ماحول اور ایک طبقے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم، طبقے، جغرافیے، آب و ہوا، تاریخ اور ثقافت سے جس حد تک متاثر ہے اس کا اثر اُس کے ادب میں آئے گا لیکن اس کے باوجود اگر وہ اعلیٰ شاعر یا ادیب ہے تو وہ آفاقیت کی جانب سفر کرے گا۔ شیکسپیئر، عمر خیام، حافظ، سعدی، مولانا روم، غالب کو ساری دُنیا پڑھتی ہے۔ مقامیت کے باوجود ان کے ہاں آفاقیت کے عناصر ہیں۔ ایزرا پاؤنڈ کا کہنا ہے کہ: "بڑا ادب کبھی ٹوپیکل نہیں ہوتا، عصری ہوتا ہے۔ یہ ہر زمانے کے قاری کو متاثر کرتا ہے"۔ پاکستانی ادب وہی ہے جو پاکستان کے کلچر، اس کی خوشبو اور حالات کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اجمل نیازی: آپ سے ایک شکایت کی جاتی ہے کہ آپ نئے شاعروں کو نہیں پڑھتے وہ جو تجربے کر رہے ہیں وہ آپ تک نہیں پہنچتے، کیا یہ شکایت بجا ہے؟

فیض: بجا ہے، یہ شکایت مجھ سے نہیں کرنی چاہیے، پہنچانے والوں سے کرنی چاہیے۔

سعادت سعید: آپ کو اپنے معاصرین اور نئے ادیبوں کی تحریروں میں کس نے متاثر کیا ہے۔ کیا آپ حوالہ دے سکتے ہیں؟

فیض: مختار صدیقی کے ہم بہت معترف ہیں، ناصر کاظمی کے بھی۔ باقی اور بھی بہت سے ہیں۔

سعادت سعید: ہم جاننا چاہیں گے۔

فیض: نام لینے سے میں گھبراتا ہوں کیوں کہ جن کا نام رہ جائے گا، اُن کے ناراض ہونے کا اندیشہ ہے۔

فارغ بخاری: آپ لوگوں کو ناراض کیوں نہیں کرنا چاہتے؟

فیض: بھئی اپنا اپنا مزاج ہے۔ اس کے باوجود بھی بہت سے لوگ ہم سے ناراض ہی رہتے ہیں۔

سعادت سعید: کوئی ناول نگار آپ کو پسند آیا ہو؟

فیض: اس ضمن میں ہم ایک ناول کا ذکر ضرور کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہے "چاکیواڑہ میں وصال" محمد خالد اختر کا لکھا ہوا ہے۔ محض مزے داری اس کے جذبات میں انوکھی چیز بھی ملتی ہے، مزاح نگاری میں "مسحق" کی کیفیت پیدا ہے۔

سعادت سعید: افسانے کی دنیا میں؟

فیض: نئی نسل سے اشفاق احمد ہیں اور بہت سے دوسرے ہیں۔ "اجالا ختم" بھی پڑھا یا اور بیدی اور قاسمی کے افسانے بھی۔

افضل پرویز: حسن عسکری کی کتاب "جدیدیت" کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فیض: حسن عسکری تو بہت اچھے تھے کسی زمانے میں، انھوں نے افسانے بھی بہت اچھے لکھے۔ آخری عمر میں انھوں نے یہ کام ہی چھوڑ دیا اور ایک کتاب "جدیدیت" لکھی جس کا جواب ظفر عارف نے لکھا۔ جس کا عنوان ہے وہ نہایت معقول کتاب ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس میں مغرب کی تحریکوں کو حوالے سے پہلے وہ یہ کہتے ہیں کہ منطق اور استدلال مغربی جنس ہے، بجائے اس کے کہ یہ ہماری عقل ہے تو ظاہر آپ سے بحث کیسے ہو؟ اگر منطق سے کوئی دوسرا آدمی بالکل اس کے الٹ دلائل پیش کرے مشرقی کہا جائے تو بھی تو کیا کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو عظیم تر جن بحث میں منطق اور استدلال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سعادت سعید: جدید نثر نگاروں میں آپ کن نثر نگاروں کو اہم جانتے ہیں؟

فیض: ڈاکٹر محمد حسن، آل احمد سرور، ممتاز حسین، سبط حسن، خلیل احمد، سلیم احمد، صلاح الدین، محمد علی صدیقی وغیرہ۔

حسن رضوی: آرٹس کونسلوں اور اکیڈمی آف لیٹرز کے کام سے آپ مطمئن ہیں؟

فیض: اکادمی تو مجھے معلوم نہیں، اکیڈمی آف لیٹرز پیار کرتی ہے۔ آرٹس کونسل کا تو یہ مصرف ہے کہ ادھر ادھر سے ایک اسٹیج اور موسیقی بہم ہو جائیں اور لائبریریاں بنائی جائیں ملک میں ہماری ثقافت اور تہذیب کی کمی اور ... صورتیں اجاگر کرتا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کام صرف اتنا ہے کہ بیرونی ممالک کے طائفوں کو دعوت دیں اور اپنے طائفے باہر بھیجیں۔ ان کی توجہ اور معاملات پر بھی ہونی چاہیے۔

حسن رضوی: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ جیل میں تھے وہ زمانہ آپ کی شاعری کا سب سے زرخیز زمانہ تھا؟

فیض: یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ جیل خانے میں اور کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی کوئی اور شغل بھی نہیں ہوتا تھا۔ جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسے پھر سے عشق کر لیا جائے، جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر نکلتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جذبات کی شدت میں ہر بات کہتا چلا جاتا ہے۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے جیسا آپ نے دوبارہ عشق کر لیا ہو۔ جیل میں یہ دوسرا عشق شاعری سے تھا۔

طاہر مسعود: پچھلے دنوں کہیں آپ نے کہا تھا کہ آپ عربی میں نظم کا عمل دخل کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی کیا مراد تھی؟

فیض: یہ اور بات ہے لوگ نہیں جانتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمارا انتخاب عربی اور فارسی سے تھا لیکن ان ملکوں کی تحریک کے مجموعوں ان میں شامل ہے کہ حکایت کرتا ہو شاعر ... مثلاً ناظم حکمت، پابلو نرودا، لورکا وغیرہ ہمارے عہد کے شاعر ہیں۔ ظاہر ہے ہم ان جیسے بڑے شاعر نہیں ہیں۔ ہماری مثال تو عربی کے اس محاورے کے مطابق ہے کہ ہم ہوا سے کسی چیز ... ان کے آخر ... تک کہیں پہنچا دیں گے۔

طاہر مسعود: آپ کے ناقدین کے خیال میں آپ کی کیفیت ... ابتدائی زمانے میں تو آپ کو چیزیں ساتھ کسی کے حوالے سے ظہیر ... اور اب ... آپ کو ... آپ کے ... طور پر علامت

(Symbol) کے استعمال کرتے ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: بات یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس، جیل تو خیر سیاست یا اس طرح کے جو واقعات یا قصے ہمارے ساتھ پیش آئے، فرض کیجیے یہ سب پیش نہ آتا تو فی الحال یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ آگے چل کر کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا۔ رہا سوال مخالفین کا تو مخالفین کی بات دوسری ہے۔ اس لیے کہ انھیں ہماری ذات سے مخالفت یا مخاصمت تو نہیں ہے۔ اُن کی مخالفت تو ہمارے سیاسی نظریات سے ہے۔ اگر ہم جیل خانے نہ بھی گئے ہوتے اور کچھ نہ بھی کیا ہوتا تو بھی انھیں ہماری مخالفت کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو مل ہی جاتا۔ اس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم جیل نہیں جاتے تو ہمارے پاس اخبارات رہتے۔ اگر مارشل لا قائم نہ ہوتا تو اخبار ہم سے چھینا نہ جاتا اور ہم صحافت ہی کرتے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی نام پیدا کرنے کی گنجائشیں موجود تھیں، امکانات روشن تھے۔ ہاں ممکن ہے شاعری میں پیچھے رہ جاتے اور صحافت کے ذریعے لوگوں کی خدمت کر لیتے، یا یہ بھی ممکن تھا کہ ہم صحافت میں نہ ہوتے اور مدرسی ہی کرتے رہتے جس سے ہم نے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ ممکن ہے اس پیشے سے وابستگی کے نتیجے میں ہماری استعداد میں اضافہ ہو جاتا اور ہم کم از کم اچھے اُستاد ہو جاتے۔

بس یوں کہہ سکتے ہیں! اِدھر اُدھر کے بہت سے موڑ آئے اور سب کچھ خود بخود ہوتا رہا۔ ہم نے اپنی مرضی سے کوئی بھی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ حالات بدلتے گئے اور ہمیں ان حالات کے ساتھ چلنا پڑا۔ اب یہی دیکھیے کہ اخبارات ضبط ہوئے، لیکن ہم نے انھیں اپنے شوق سے تو ضبط نہیں کروایا۔ اگر یہ سب کچھ اس طرح سے رُونما نہ ہوا ہوتا تو ممکن ہے ہمیں شاعری کرنے کا زیادہ وقت مل جاتا اور ہم اس پر زیادہ توجہ اور وقت دے سکتے یا مدرسی ہی کر لیتے یا کچھ اور۔ جن حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ہمارا نام اس لیے ہو گیا کہ ہم جیل خانے چلے گئے تھے تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ جیل خانے نہیں گئے انھیں شہرت کیوں مل گئی۔ مثلاً فراق صاحب تو جیل نہیں گئے تھے، اس سے اُن کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔

نصرت: آپ نے اپنی شاعری میں کس طرح کے تجربات کیے؟

فیض: یعنی وہ تجربہ تو شعر خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔

نصرت: آپ کی بیشتر شاعری نظریاتی شاعری ہے، کیا آپ کے خیال میں ''نظریہ'' سامنے رکھ کر اچھا شعر کہا جا سکتا ہے؟

فیض: میرا ایک نظریہ ہے، مگر نظریے کو سامنے رکھ کر انسان شاعری نہیں کرتا۔ وہ نظریہ شاعری کا جزو بن جاتا ہے بلکہ آدمی کی اپنی ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ اُسے سامنے رکھ کر لکھنے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ شاعری ایک مضمون سامنے رکھ کر نہیں کی جاتی بلکہ وہ مضمون، شاعر کی واردات قلب، اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے، تبھی وہ شعر کے روپ میں ڈھلتا ہے۔

نصرت: اس سے یہ سمجھا جائے کہ کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جو محض ایک مخصوص نظریے کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے؟

فیض: کیوں نہیں، ہیں ایسے بھی شاعر ہیں جو کہ نظریے کو شعر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نصرت: ایک عام خیال ہے کہ جو بھی ترقی پسند شعرا تھے وہ سب نظریاتی شاعری کرتے تھے۔

فیض: نظریاتی شاعری سارے ہی شعرا کرتے ہیں۔ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی نظریہ تو ہوتا ہی ہے۔ خالی الذہن تو کوئی نہیں ہوتا۔ نظریے کا مطلب یہی تو ہوتا ہے کہ وہ دُنیا کو کس زاویے سے دیکھتا ہے اور کیسا پاتا ہے؟

نصرت: ترقی پسند تحریک اور غیر ترقی پسند تحریک کے شعرا میں آپ کے نزدیک بنیادی فرق کیا ہے؟

فیض: ترقی پسند تحریک کے شاعروں اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو، معاشرے کی تاریخ کو اور معاشرے کے

مستقبل کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں۔ یعنی یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند شعرا کی عاشقانہ شاعری کی مخالفت ہے یا ان پر قید لگا دی گئی ہے کہ وہ فلاں مضمون پر نہیں لکھ سکتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعر یہ کوشش کرتا ہے کہ آج کی دنیا کی جو بھی حقیقت ہے اس کو دیانت داری سے پیش کرے۔ اس میں ہر طرح کے تجربے کی آزادی ہے۔ اس میں ذاتی عاشقی بھی شامل ہے، درس سے سیاسی مسلک بھی شامل ہے، سیاسی جدوجہد بھی شامل ہے۔ اس میں وصل و ہجر، چاندنی، زمین، آسمان، بھوک، مفلسی غرض سب کچھ شامل ہے۔ شاعر سب چیزوں کا ذکر کرتے شعر لکھتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اس میں سے یہ نکال دو اور وہ شامل کر دو یا اس میں سے عاشقی نکال دو اور فقط یہ چیز شامل کر لو۔

نصرت: آپ نے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" جیسی نظمیں لکھ کر عاشقی کو شاعری سے نکال نہیں دیا؟

فیض: (ہنستے ہوئے) نہیں ہم نے نہیں نکالا۔ یہ نظم بھی تو ایک طرح سے عاشقی کا اعتراف ہے۔ بات صرف اہمیت کی آ جاتی ہے کہ کس وقت کون سے مسائل اہم ہیں اور کون سے غیر اہم، ثانوی بھی ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے اخبار کی مثال لے لیجیے۔ یوں تو دنیا بھر کی خبریں ہوتی ہیں، یہ خبریں اخباروں کے پاس روز آ بھی جاتی ہیں۔ مگر سب خبریں تو نہیں چھپتیں۔ پہلا انتخاب تو یہ ہوتا ہے کہ کون سی خبریں چھپیں گی اور کون سی نہیں، اس کے بعد پھر یہ طے ہوتا ہے کہ کس خبر کے لیے کتنی جگہ مخصوص ہو۔ اہم خبر کو پہلے صفحے پر چھاپیں یا پانچویں صفحے پر یہی شاعری میں بھی ہوتا ہے۔
بعض چیزیں یہاں آپ کو اہم نظر آتی ہیں اور بعض چیزیں یہاں کم، یعنی جس کو آپ زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن جو اپنی جگہ ہے۔ جو بھی یہ تجربہ جان لو تو آپ ہر صورت بیان کریں گے خواہ وہ عاشقی ہے، قمر اور چاندنی رات ہے، خواہ وہ خوبصورت مکان ہے خواہ وہ ایک خوبصورت شخص ہے۔ اگر آپ کا تجربہ سچا ہے تو آپ اسے بیان کریں گے مگر یہاں اس کو اتنی اہمیت نہیں دیں گے کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے دنیا میں۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے، اس کی خوبصورتی اپنی جگہ پر ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ کون سی بڑی چیز ہے، کس کی اہمیت زیادہ ہے اور یہی احساس شاعری میں ترتیب اور اہمیت بن کر ابھرتا ہے۔

نصرت: جب کوئی مضمون آپ کے ذہن میں آتا ہے تو آپ کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں: تجربے، احساسات یا تکنیک کو؟

فیض: بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی شعر کہتا ہے تو مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے شعر وارد ہوتا ہے۔

نصرت: آپ کے ذہن میں پہلے کیا آتا ہے، پہلے آہنگ یا امیج؟

فیض: میرے خیال میں پہلے ذہن میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے اور جب یہ سوچتے ہیں کہ اس خلش کو الفاظ کا جامہ کیسے پہنایا جائے، کبھی پہلے کوئی زمین ذہن میں آ جاتی ہے تو کبھی ایک امیج۔ الفاظ سے پہلے امیج آتا ہے جیسے ایک نظم کے بارے میں نے لکھا تھا "تنہائی کی ایک شام"۔

نصرت: جی ہاں ایک بہت خوبصورت نظم ہے۔

فیض: میں نے اس کا تجربہ کیا تھا لندن میں سب سے پہلے شام کو جب دھارے نکلتے ہیں تو ان کے پیچھے نظر آتے ہیں۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اس امیج کو لفظوں میں کیسے ڈھالا جائے۔ بہت سوچ کر خیال آیا کہ اس کو شام کے پیچ و خم سے تعبیر کیا جائے اور مصرع ہو گیا "... " ... بات ذہن میں آ گئی تو ... کوشش کی کہ اس کو آگے بڑھایا

[illegible]

نصرت: [illegible] آپ کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] آپ انھیں استعمال کرتے ہیں؟

نقی: [illegible]

نصرت: میرا مطلب ہے [illegible]
[illegible]

نقی: [illegible]

نصرت: آپ ان کے علاوہ بھی کچھ [illegible] الفاظ استعمال کر سکتے تھے؟

نقی: ٹھیک ہے۔ [illegible]

نصرت: [illegible]

نقی: [illegible]

نصرت: [illegible]

نقی: [illegible]

نقی: [illegible]

مزاج بنتا ہے۔ کسی نے اس کو پیچھے رکھنا پسند کیا، اور بعد میں وہ اک رنگ عام ہو گیا۔

نصرت: مگر اب تو یہ صورت ہے کہ لوگ آپ کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں۔ آپ کے انداز کو اپنا رہے ہیں۔

فیض: میں نے عرض کیا نا: جب کسی عہد کو کا وہی استعارہ بن جاتا ہے اور وہ شاعر کے محسوسات، اس کی ذہنی واردات، کسی محاورے یا آہنگ کو اپنی ضرورت کے مطابق پاتے ہیں تو اس کو زیادہ استعمال کرنے لگتے ہیں، اور پھر ایک خاص انداز کی شاعری ہونے لگتی ہے۔

نصرت: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں فن کو شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ شخصیت سے گریز کا نام دیا ہے۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

فیض: شخصیت کا فن سے فرار یا گریز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ٹی ایس ایلیٹ کے ذہن میں جو بات تھی وہ یہ تھی کہ اگر انسان صرف اپنے داخلی تجربات پر انحصار کرے تو وہ بات اتنی ہی ذاتی ہو جاتی ہے کہ کسی دوسرے کو اس میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ دوسرے لوگ کسی تجربے میں دلچسپی اس وقت لے سکتے ہیں جب وہ خود اس میں شریک ہو سکیں۔ اس اعتبار سے آپ اپنی ذات کو الگ رکھ کر کوشش کریں گے کہ آپ کی ذات کا وہ حصہ جس میں دوسرے بھی شریک ہو سکیں اس کا اظہار کریں۔ اور وہ حصہ جو صرف آپ کی ذاتی بات ہے جس سے دوسروں کو کوئی علاقہ نہیں، اس کو الگ رکھیں۔

نصرت: مگر آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آج کے جدید شعرا تو صرف ذاتی شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا محور ان کے بڑے ذاتی قسم کے داخلی تجربات ہیں۔

فیض: دیکھیے انسان کی ذات اپنے ماحول، اپنے معاشرے سے الگ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے، جو اس کے مسائل ہیں ان سے کوئی بھی شخص اپنی ذات کو بالکل الگ تو نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہے اگر کوشش کرکے بالفرض آپ اپنی ذات کو زندگی اور معاشرے سے الگ کر بھی لیں تو پھر آپ کا وجود باقی زندہ لوگوں کے لیے مہمل ہو جائے گا۔ اگر آپ کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے اور آپ اس کا ذکر کریں تو دوسرا کسی حد تک اسے محسوس کر سکتا ہے کیونکہ چبھنے سے کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ ساری تفصیل بیان کرنے بیٹھ جائیں کہ کانٹا کس طرح چبھا، کس زاویے سے چبھا، کس وقت چبھا تو اس سے دوسروں کا کیا واسطہ۔ شاعری اس حد تک تو انفرادی ہے کہ آپ اپنے دل کے کانٹے کا ذکر کر رہے ہیں لیکن اس تجربے میں اور لوگوں کے تجربے کی شمولیت ہونا چاہیے۔ وہ اس میں داخل ہو سکیں۔ تو اس میں کوئی تضاد ممکن نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ہر شاعر کی ذات کے تین دائرے ہوتے ہیں۔ ایک اس کی اپنی ذات، ایک اس کا معاشرہ اور ایک ساری دنیا جو اس کی ہم عصر ہے۔ جتنا اس کی نظر کا دائرہ وسیع ہوگا، جتنی دور تک وہ دیکھ سکے گا اتنی ہی بڑی اس کی شاعری ہوگی۔ جتنا چھوٹا دائرہ ہوگا اتنی ہی چھوٹی اس کی شاعری ہوگی۔ یہ تقسیم سب سے پہلے آپ کی نظر رکھتی ہے۔ دیکھنا تو اپنی نظر سے ہی ہے مگر اہم یہ ہے کہ آپ کی نظر جاتی کہاں تک ہے۔ اگر کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تو چشم نظر سے کیا ہوگا؟

نصرت: کچھ لوگ اپنی ذات کے حوالے سے مذہب کو دیکھتے ہیں۔

فیض: بڑی خوشی سے دیکھیں مگر جب ان کو کچھ نظر آئے گا بھی تو یہ دیکھیں گے کہ اہم چیز دیکھنے والی نظر ہے۔ وہ کیا دیکھتا ہے یہ بعد کی بات ہے۔

نصرت: نئی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: وہ سب ایک طرح کے تو ہیں نہیں۔ طرح طرح کے شاعر ہیں۔ ان میں سے کچھ اچھے شاعر ہیں اور کچھ برے شاعر ہیں۔ سب کو

ایک لاٹھی سے تو نہیں ہانکا جا سکتا۔

نصرت: میرا اشارہ ہندوستان کے جدید شعرا کی طرف تھا۔ بانی، عمیق حنفی، کمار پاشی، بلراج کومل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علوی اور شہریار ہیں۔

فیض: (ہنس کر) بھائی میں کسی شاعر سے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آج جتنے بھی شاعر ہیں، ان سب کو ایک خانے میں تو رکھا نہیں جا سکتا۔ نئی نسل میں جو بھی شاعری شروع کرتے ہیں، اُن کے بارے میں یہ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آگے جائے گا اور دوسرا راستے میں رہ جائے گا۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اچھے پاتے ہیں، بعض میں امکان نظر آتا ہے، بعض میں امکان نظر نہیں آتا، لیکن کسی کے بارے میں یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بڑا شاعر بنے گا، یہ شاعر نہیں بنے گا۔ اس لیے نوجوان شاعروں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

نصرت: آزاد شاعری میں ایک اہم اور معتبر نام ن۔ م۔ راشد کا ہے، اُنھوں نے بہت خوب صورت نظمیں لکھی ہیں، اُن کی شاعری کو آپ اُردو کی ادبی روایت میں اضافے سے تعبیر کرتے ہیں یا محض ایک تجربے کا نام دیتے ہیں؟

فیض: راشد کی شاعری کے مختلف پہلو ہیں اور اس کے مختلف دور ہیں۔ اُن کی شاعری یقیناً ایک اضافہ ہے۔ اُن کی بہت سی شاعری سچی اور درست شاعری ہے محض تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ ہماری روایت میں شامل ہیں۔

نصرت: اگر ایسا ہے تو اُن کی شاعری آپ کی شاعری کے مقابلے میں کم درجے کی کیوں تصوّر کی جاتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کی تنقید زیادہ کیوں ہوتی ہے اور اُن کی تنقید مقابلتاً کم کیوں؟

فیض: اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راشد یہاں آئے نہیں زیادہ تر باہر رہے۔

نصرت: مگر اُن کے شعری مجموعے تو آئے۔

فیض: ہاں لیکن زیادہ عرصہ اُنھوں نے پردیس میں گزارا، اس لیے اُن کا رابطہ نہیں رہا، یہاں کے لوگوں کے مذاق کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی جو بعد کی شاعری ہے وہ عام پڑھنے والوں کے لیے اتنی مشکل ہے، اتنی مبہم ہے کہ وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ اس کو سمجھنے کے لیے، اس سے لطف اُٹھانے کے لیے بہت مطالعہ کرنا چاہیے، بہت سی کتابیں پڑھنی چاہییں، تھوڑی فارسی بھی آنی چاہیے، تھوڑی سی انگریزی بھی آنی چاہیے۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے پڑھنے والوں سے فاصلہ بڑھا لیا۔ لوگ اُن تک نہیں پہنچ پائے اور نہ وہ اُن تک۔

نصرت: ن۔ م۔ راشد کی شاعری کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

فیض: (کچھ سوچ کر) راشد بہت اچھے شاعر تھے، بہت تہہ دار شاعر تھے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنھوں نے بہت سے نئے تجربے کیے، مگر اُس زبان میں کیے جس سے بیشتر لوگ مانوس نہیں تھے۔ تجربے کی حد تک تو لوگوں نے اُنھیں مان لیا، لیکن زبان اور خیالات کے حوالے سے لوگوں تک ٹھیک نہیں پہنچ سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ عرصے تک ملک سے باہر رہے۔

نصرت: اب میراجی کے بارے میں۔ اُنھوں نے جو اُردو میں گیت لکھے، کیا وہ اُردو گیت کی روایت میں ایک توسیع ہیں یا محض ایک تجربہ؟

فیض: تجربہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے، مگر گیت ہمارے یہاں کوئی نیا تجربہ تو نہیں تھے۔ یہ تو پہلے سے لکھے جا رہے تھے، امیر خسرو سے لے کر آج تک۔ ہاں بیچ میں ایک ایسا دور آیا تھا جب لوگ گیت نہیں لکھتے تھے۔ گیت نظیر اکبر آبادی سے زیادہ کس نے لکھے ہیں۔

نصرت: عظمت اللہ خاں بھی ہیں۔

فیض: جی ہاں عظمت اللہ خاں نے بھی گیت لکھے ہیں، حفیظ جالندھری نے لکھے ہیں۔ گیت کا رواج میراجی کی دین تو نہیں ہے۔ وہ تو

حفیظ کے بعد آئے ہیں، اس لیے گیت نگاری کی ایجاد نہیں ہیں۔ اگر آج کے عہد میں کسی کو ڈھونڈھا جائے تو وہ حفیظ جالندھری ہیں۔

نصرت: آزاد غزل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: آزاد غزل کوئی چیز نہیں ہے۔

نصرت: آپ نے کوئی تجربہ کیا ہے اس ضمن میں؟

فیض: جب یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے تو پھر تجربہ کہاں سے کرتا۔ آزاد غزل ایک مُہمل چیز ہے جس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ غزل ایک فارم کا نام ہے، اس میں آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر آپ اس میں آزادی برتیں گے تو یہ کوئی اور چیز ہو جائے گی غزل کہاں رہے گی۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے کہ غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا؟

فیض: کیوں نہیں ہو سکتا۔ غزل میں تو بے شمار تجربے ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ غزل کے اندر رہ کر غالب نے تجربے کیے۔ استعارے کے، تشبیہوں کے، خیالات کے۔ سب سے بڑے تجربات اقبال نے کیے مگر غزل کی فارم میں رہ کر اس میں فلسفہ، حکمت اور باقی چیزیں لائے۔ غزل کی فارم سے الگ ہو کر غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا، ورنہ وہ کوئی اور چیز ہو جائے گی۔

نصرت: ترقی پسند شعرا کے فوراً بعد کے شاعروں نے میر کے رنگ کو اپنایا مثلاً ناصر کاظمی، مجید امجد، مختار صدیقی وغیرہ۔ کیا ان کی شاعری کا روایت میں کوئی مقام ہے؟

فیض: روایت میں ان کا مقام نہیں ہے۔ ان کا مقام جدید شاعری میں ہے۔ آج کے شاعر کا روایت میں کیا مقام ہے، یہ آج کہنا مشکل ہے۔

نصرت: حالی اور آزاد کی روایت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

فیض: اگر ان کی کوئی روایت تھی تو وہ انھیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کو آج کوئی روایت نہیں مانتا، وہ تو کوئی چیز نہیں تھی۔

نصرت: ایک نیا اسٹائل تو ملا، نئے تجربے تو ہوئے۔

فیض: اُن کی اہمیت ہے، مگر وہ اُن اُصولوں کی ہے جو اُنھوں اپنی شاعری اور تنقید میں بیان کیے۔ شاعری محض الفاظ کی خانہ پُری نہیں ہے۔ اس میں حقیقت کا اظہار ہونا چاہیے۔ اُن کی شاعری جو انگریزی نمونوں پر تھی وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ مگر جو اُنھوں نے اُصول بیان کیے، اُنھوں نے جو شاعری کا مذاق بنایا وہ بعد میں یقیناً نئی روایت کی بنیاد بنا۔

نصرت: عام طور سے یہ خیال ہے کہ آپ کی وہ شاعری جو آپ نے درِ زنداں کے پیچھے کی ہے، وہ بہت خوب صورت ہے۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے تو اس کی کوئی بنیادی وجہ؟

فیض: زنداں میں ظاہر ہے فرصت زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی تراش خراش زیادہ کر سکتا ہے۔ عام دنوں میں دوسری مصروفیات کے باعث آدمی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ شعر پر اتنی توجہ دے سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیل میں ایک خاص قسم کا بوجھ ہوتا ہے ذہن پر۔ اُن دنوں ساری توجہ شعر پر مرکوز ہوتی ہے اور اُس وقت آدمی جو شعر کہتا ہے تو یہ لگتا ہے جیسے نیا عشق کر لیا ہے کسی سے۔

نصرت: ایک بات اور۔ آپ نے اپنی بیشتر نظموں میں غزل کے آہنگ، غزل کے لب و لہجے کو اپنایا ہے، حالاں کہ نظم کا اپنا لب و لہجہ ہے، اپنا آہنگ ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

فیض: اس لیے بھائی کہ ہم کو آتا یہی ہے۔ ہماری زبان کا مزاج بھی یہی ہے۔ شاعری کی لغت بدلنے کے لیے بہت بڑا شاعر چاہیے۔

نظیر اکبر آبادی نے یہ کوشش کی تھی۔ اس کے بعد کسی نے تیج تہوار کی کوشش نہیں کی۔

نصرت: نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

فیض: بہت بڑی شاعری ہے۔ وہ اکیلا شاعر تھا جس نے شاعری کی زبان بدلنے کی کوشش کی۔

نصرت: اس سے پہلے کہ میں آپ سے اجازت لوں کچھ ہندوستانی شعراء کے بارے میں کہیں، آپ نے تو ان پر چڑھائی ہوگی۔

فیض: مجھے تو زیادہ پتا نہیں۔

نصرت: دو سال پہلے تو آپ ہندوستان تشریف لے گئے تھے۔ تب تو کچھ پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہوگا؟

فیض: وہ مصروفیت سے مشاعروں میں سننے کا موقع ملتا ہے۔ مشاعرے میں جب کوئی شاعر پڑھتا ہے تو وہ اس وقت تو خوش ہوتا ہے۔ جب تک کوئی کتاب پڑھنے کو نہیں ملتی تفصیل سے بات نہیں کی جا سکتی۔

نصرت: آپ کچھ شعری مجموعے تو ساتھ لائے ہوں گے، ان میں سے کون سے پسند آئے ہیں اور ...

فیض: ہاں کمار پاشی اچھے ہیں، شہریار اچھے ہیں، ندا فاضلی، ان میں اختر الایمان ہیں، بلراج کومل ہیں، عمیق حنفی ہیں اور بہت سے اچھے ہیں۔

نصرت: اختر الایمان کی شاعری کے بارے میں کچھ فرمائیے۔

فیض: اختر الایمان بہت اچھا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اب کوئی نئی کتاب آتی ہے تو وہ یہاں ملتی نہیں۔ ان کے علاوہ سردار جعفری بھی اچھے ہیں، مخدوم بھی اچھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں کے شعراء اور وہاں کے شعراء میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

نصرت: میرے خیال میں تو فرق ہے۔ لیکن وہاں کی شاعری عوام کے زیادہ قریب رہی۔

فیض: (ہنستے ہوئے) ہاں تھوڑا سا فرق ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔

نصرت: مگر یہ فرق کیوں ہے؟

فیض: اس لیے کہ وہ سب لوگ دیہات کے قریب ہیں۔ ہم تو دیہاتی لوگ ہیں۔ یہاں زیادہ تر شہر کے ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تو بڑے شہر بہت زیادہ ہیں۔ لیکن ہے اور یہ نکلتا ہے اس لیے وہاں کے شاعر زیادہ شہری ہیں۔

نصرت: فراق کے بارے میں کچھ بتائیے۔ انھوں نے اردو شاعری کو کیا دیا ہے؟

فیض: بڑے شاعر کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

نصرت: اردو شاعری کی روایت میں فراق کا بھی تو ایک مقام ہے۔ اس پس منظر میں کچھ فرمائیے۔

فیض: اردو شاعری کی روایت کے دو بڑے ستون میر اور سودا ہیں۔ میر کی جو روایت تھی اس کے بڑے نمائندہ شاعر فراق تھے اور سودا کی جو روایت تھی اس کے بڑے شاعر جوش تھے۔ یہ دونوں روایتیں اردو ادب میں متوازی چلی آئی ہیں۔

اس کے بعد کسی نے الگ کوشش نہیں کی۔ بعد میں کئی بڑے شاعر ہوئے جیسے غالب، اقبال، انھوں نے تخیل بدلا، مضامین بدلے، خیالات بدلے مگر لفظیات نہیں بدلیں۔ استعمال کی ... کے لیے ... زبان میں تبدیلی نہیں۔

نصرت: مگر آپ کے عہد میں لاطینی ... سے نئے تجربے ہوئے اور خاص طور سے آپ کو تو انگریزی ادب پر بھی عبور ہے تو پھر آپ نے روایتی انداز کیوں اپنایا؟

فیض: اس لیے کہ یہی انداز ہمیں اچھا لگا۔

نصرت: فیض صاحب انقلاب کے بغیر شاعری یا بغیر شاعری کا انقلاب ہے۔ کوئی نعرہ، کوئی بڑا خیال کسی شاعر کے پاس

ضروری ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ ادب یا اچھی شاعری کی تخلیق نا ممکن ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: نظریہ کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر بیٹھ کر باقاعدگی سے کسی فلسفے کو، نظریے یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظم دستور العمل پیش کرے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شعری تجربہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ نہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ چیز کہ آپ کس نقطہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا شاعر یا مفکر یا فنکار یا ادیب، مصور یا موسیقار یاد نہیں جس کے ذہن میں اپنے گردوپیش کے متعلق کوئی فکر یا کوئی واضح یا مبہم کوئی نہ کوئی نظریہ نہ ہو اور وہ کسی واضح اور تجربے پر منحصر نہ ہو۔ ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ کیا ہے یہ دنیا کیا چیز ہے یہ زندگی کیوں اس طرح بنی ہے یا کیوں ہے۔ ان کے بہتر ہونے کا امکان ہے یا نہیں ہونا چاہیے یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کس طرف نہیں جا رہی ہے۔ کوئی زیادہ وسیع اور گہری فکر ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر فنکار اور ادیب کے لیے نظریہ لازمی ہے۔

طاہر مسعود: کیا شاعری کی کوئی ایسی قسم ممکن نہیں جسے خود کلامی سے تعبیر کیا جائے؟

فیض: بالکل ممکن ہے۔ غالب جیسی شاعری کا تصور بھی موجود ہے اور اس میں فردیت کا پہلو بھی ہے جو شاعری کے لیے لازم ہے لیکن اس کا میدان بہت محدود ہے۔ یہ ذاتی شاعری بہت چھوٹی ہے۔

سوال: سیاست میں ادیب کی کیا حیثیت ہونی چاہیے اور اس کی زندگی کہاں تک متاثر ہونی چاہیے؟

فیض: ادیب یا شاعر کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کی حیثیت ہے شہری کی تو سیاست کے ہونے سے جو فرائض ہیں وہ اس پر عائد ہوتے ہیں۔ جیسے کسی دوسرے شہری پر عائد ہوتے ہیں اسی طرح شاعر ان فرائض اور ذمہ داریوں میں جو کہ دوسرے شہریوں کی ہیں، ہم ان کی بالکل اسی طرح ادائیگی کرتے ہیں تو اچھے شہری کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ادیب یا اچھے شاعر ہوں۔ تو ایک انفرادی حیثیت شہری کے ان کی مشترک ہے یعنی سب شہریوں کے مشترک اور ہر شہری پر ظاہر ہے اس کی سیاسی ذمہ داریاں ہیں اور سیاسی ذمہ داریوں کا مطلب یہی ہے کہ سیاست کا جو بھی رنگ ہے یا جو بھی سیاست کا ڈھانچا ہے یا نقشہ ہے اس میں اگر خامیاں ہیں تو ان کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر اس میں کوئی خوبیاں ہیں تو ان کو بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس حد تک تو ہر ادیب اور ہر شاعر کا فرض ہے کہ دوسرے شہریوں سے مل کے سیاست کو صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرے اور اس کو غلط روی سے بچانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کے علاوہ اس کی ایک ذمہ داری اس سے الگ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کو ایک ہنر دیا گیا ہے اس کو خصوصیت دی گئی ہے کوئی ذہنی قدرت نے اس کو دی ہے یعنی اظہار کی صفت کی تو اس صلاحیت کو یا اس دین کو اس قدرت نے عطیے کو وہ صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص نہ رکھے بلکہ دوسروں کو بھی حصہ اس میں شامل کر کے بحیثیت شہری کے جو اس کے فرائض ہیں ان کو بحیثیت ادیب کے بھی سرانجام دینے کی کوشش کرے۔ یہ پہلے ادیب کی بات نہیں ہے کوئی ایسا ہے کوئی منظم ہے جو کسی کے سر پر فرض عائد ہوتا ہے کہ جو کوئی اس کا ہنر کا نام ہے یا جو بھی اس کی اہلیت ہے جو اس کی صلاحیت ہے اس صلاحیت کو وہ استعمال کرے اپنے ملک کی سیاست کو صحیح راستے پر لانے کے لیے اب یہ سیاست کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک پہلے ہم نے وسیع اخلاق کے مضمون میں۔

ایک تو سیاست کے معنی یہ ہیں کہ آپ عملی سیاست میں یعنی کسی پارٹی میں شامل ہوں اور جیسے جلوس نکلیں اور جلسے کریں اور تقریریں کریں۔ یہ تو سیاسی ہنگامہ ہے۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ زندگی کی سیاست میں شامل ہونا۔ وہ جو بھی آپ کا ہنر ہے جس کا مرکز آپ کی فکر یا آپ کی اخلاقی زندگی ہے اس سے سیاست کو صحیح راستوں پر لانے میں امداد ملے۔ اب ادیب کا

اور شاعر کا پہلا کام تو شعر لکھنا ہے یا تحریر کرنا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر ایک عمل ہے اسی طرح جس طرح کہ کسی ڈاکٹر کا اپنی جگہ کسی مریض کو شفا پہنچانا، اُس کا وہ بھی ایک عمل ہے۔ اگر ایک ڈاکٹر اچھا ڈاکٹر نہیں ہے تو وہ کتنی بھی اچھی سیاست کیوں نہ کرے وہ بحیثیت شہری کے اُس ڈاکٹر سے کم تر ہے جو کہ سیاست میں حصہ نہیں لیتا لیکن مریضوں کو شفا پہنچاتا ہے۔ اسی طریقے سے ادیب کا کام یہ ہے کہ ایک تو بحیثیت شہری کے سیاست کو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش کرے یا دوسروں کو اس کی طرف آمادہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ لکھتا ہے۔ ''دستِ صبا'' کے دیباچہ میں یہ باتیں میں نے لکھی ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ مشاہدہ کرتا ہے اُس کو کسی نہ کسی طریقے سے عمل میں لائے۔ ایک تو مطالعہ کرے، پھر مشاہدہ کرے اور پھر مجاہدہ بھی کرے کسی نہ کسی طریقے سے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جلسے جلوس کرے نہیں وہ اپنے قلم سے جو کچھ بھی ہوتا ہے اظہار کرنے کی کوشش کرے اُن صداقتوں کا اور اُن نظریات کا سیاسی اعتبار سے ذہن کا وہ قائل ہے۔ چناں چہ شاعر کو سیاستدان ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اُس کو صاحبِ سیاست ہونا ضروری ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ممتاز ادیب و افسانہ نگار انتظار حسین صاحب نے بھی ایک مختصر سا انٹرویو فیض سے لیا تھا جو روزنامہ 'مشرق' لاہور میں 1974ء کو شائع ہوا تھا، جس کا ذکر مرزا ظفرالحسن نے بھی 'عمرِ گذشتہ کی کتاب' میں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمیں تلاش کے باوجود وہ انٹرویو دستیاب نہ ہو سکا۔ بقول مرزا ظفرالحسن صاحب کے انتظار حسین نے فیض سے سات آٹھ سوالات پوچھے تھے مگر وہ سب ایک ہی زنجیر کی مسلسل کڑیاں تھیں، چناں چہ ہم اُس انٹرویو کی رُوداد جس میں اگرچہ سوالات نہیں لکھے گئے مگر جوابات سے مطالب ظاہر ہیں ''عمرِ گذشتہ کی کتاب'' سے نقل کرتے ہیں:

- کہیں تیر کی کہیں میر کی یہ بات اس انٹرویو میں نہیں ملتی۔ اس میں زبان و ادب کی چاشنی اور کہیں کہیں چٹخارا بھی ہے اور طرفین کے نظریاتی اختلاف کے باعث دو ایک چھینٹے بھی۔ انتظار کا ذہن بھی شائستہ ہے اور زبان بھی اس لیے تھوڑی سی تُرشی ضرور ہے مگر تلخی نہیں۔ دیکھیے کیا کیا کھلوایا اور خود بھی کہہ گئے۔
- مجھ پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ مختلف مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں اور بد دیانتی کی چغلی کھاتے ہیں، اس لیے میں چپ رہتا ہوں۔
- آخر عمر تک لکھنے والا کوئی کوئی ہوتا ہے ورنہ عمر کے ساتھ قویٰ مضمحل ہوتے ہیں اور بڑے شاعروں کے بھی ہوتے ہیں۔
- اپنی تخلیقات کے سلسلے میں کیا چھپوائیں کہاں؟ سب رسالے ایک سے نظر آتے ہیں، سب کا طریقہ تجارتی ہے۔
- اچھی شاعری کسی نہ کسی سطح پر ترقی پسند ہی ہوتی ہے۔ باقی رہی نئی شاعری اور نثری نظم تو اس قسم کی چیزیں تو فیشن ہوتی ہیں۔
- خالص سیاسی شاعری ہم سے کبھی نہیں آتی۔
- ایذرا پاؤنڈ کا قول دہراتے ہوئے کہا:

''اچھی شاعری ہمیشہ کمٹڈ ہوتی ہے یا بالکل نہیں''۔

نصرت: اور پنجابی؟ آپ نے پنجابی شاعری بھی تو کی ہے؟

فیض: یہ تو ابھی کی بات ہے۔ کسی نے چیلنج کر دیا تھا کہ پنجابی میں شاعری کر کے دکھائیں۔ ہم نے کہا کہ لو جی دکھا دیتے ہیں پنجابی میں بھی لکھ کے۔

نصرت: پنجابی کے حوالے سے آپ نے پنجابی زبان کو کیسا پایا؟

فیض: پنجابی کی خالص بات یہ ہے کہ بہت سے مضامین ایسے ہوتے ہیں جو کہ صرف پنجابی میں کہے جا سکتے ہیں۔ آپ انھیں اردو میں نہیں لکھ سکتے۔

نصرت: آپ کا اشارہ عوامی شاعری کی طرف ہے؟

فیض: جی ہاں عوامی شاعری اردو میں ہو ہی نہیں سکتی۔

نصرت: آپ کے اس بات پر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ اہم مبالغہ کو مقصد سمجھا ہے۔

فیض: میرا خیال ہے کہ اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ہے اس میں۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اردو جو ہے وہ شہری زبان ہے۔ جتنی بھی بولیاں ہیں وہ کہیں ملی جلی ہیں۔ کسی بھی علاقے کے دیہات میں اردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دلی سے چند میل باہر چلے جائیں وہاں لوگ اردو نہیں بولتے۔ لکھنؤ سے تین چار میل دور چلے جائیں وہاں بھی اردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو کہیں کھڑی بولی تو کہیں اودھی۔ آپ انھیں عوامی بولی تو کہہ سکتے ہیں مگر اردو نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے کہ دیہاتی بولی اپنی زبان نہیں ہے؟

فیض: جی ہاں! اس پر مستزاد یہ ہے کہ پنجابی کی اردو خالص شہری زبان ہے۔ وہ دیہات میں کسی کی بھی نہیں بولی جاتی۔

نصرت: آپ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو غالب جیسا شعر کہہ سکتے ہیں مگر بلھے شاہ یا وارث شاہ جیسا نہیں۔

فیض: بالکل نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ بڑا شاعر غالب بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پنجابی جو ہے وہ ہمیں اتنا عزیز نہیں جتنا اردو ہے اور اس کی کلاسیکی روایت ہی ہے۔ ہمارے ذہن اور دماغ کی [illegible] اب بھی عوامی ہو [illegible] ہے جو صرف اردو شاعری کے لیے موزوں ہے۔

نصرت: تو پھر آپ نے پنجابی شاعری کی طرف کیوں توجہ نہیں دی؟

فیض: جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ بعض مضامین ایسے ہیں جو صرف پنجابی میں کہے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی کسان کے لیے شعر کہنا چاہیں تو وہ پنجابی میں کہا جا سکتا ہے اردو میں نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے پنجاب کے کسان کے لیے؟

فیض: جی ہاں! پنجاب کے کسان کے لیے۔ یو۔پی کے کسان کے لیے آپ اردو شعر نہیں کہہ سکتے وہ کھڑی بولی میں کہنا پڑے گا۔

نصرت: آپ نے خود اپنی زبان یعنی پنجابی کو نظر انداز کیا۔ آپ نے پنجابی میں بہت کم کہا ہے۔

فیض: اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس [illegible] پنجابی کے کلاسیکل شعرا جیسے بابا بلھے شاہ، وارث شاہ، [illegible] نے [illegible] دیا ہے۔ اور پھر [illegible] ذہن سے [illegible] کوئی نہیں کہ آپ اس میں اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ زبان کی [illegible] تعلیم کے دوران بھی پنجابی پر توجہ نہیں دی۔ میں آج تک پنجابی گیت کے ایک مصرعے کے متعلق سوچ رہا تھا اس میں کتنی [illegible] ہے اور کیا آپ اردو میں ایسے اظہار کر سکیں گے:

میری گلی سے نہ جاتی

نے تمھری لوں جگے جوں دا

حسن رضوی: آپ نے پنجابی شاعری بھی کی۔ پنجابی میں لکھنے کا خیال آپ کے دل میں کیسے پیدا ہوا؟

فیض: میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جن کے اظہار کے لیے پنجابی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اردو میں

لوک گیت نہیں لکھے جاسکتے۔ کیوں کہ یہ زبان شہری بھی ہے اور اس کا تعلق متوسط طبقے سے بھی ہے۔ اگر آپ عوامی اُردو میں کچھ لکھنا چاہیں گے تو وہ اُردو کے بجائے کسی علاقے کی مقامی بولی کا روپ اختیار کر جائے گی یا کسی اور علاقے کی زبان۔

کرشن: نوجوان شاعروں کو آپ شاعری کے بارے میں کیا مشورہ دیں گے؟

فیض: شاعری کے بارے میں تین مشورے ہیں۔ پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ جو کچھ لکھو اپنے دل سے لکھو، کسی کے کہنے کی وجہ سے مت لکھو، دباؤ میں آ کر مت لکھو، ثواب کی خاطر مت لکھو حتیٰ کہ سیاست کی خاطر بھی مت لکھو۔ جو دل سے بات نکلتی ہے وہی لکھو، اگر دل سے بات نہیں نکلتی تو مت لکھو۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات تو حقیری چیز ہے۔ اندر سے تم کیا نکال لو گے۔ اندر جو کچھ ہے وہ تو باہر ہی سے آتا ہے۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باہر کیا ہے۔ تو باہر کی بات کے تین حلقے ہیں، ایک تو آپ کی اپنی ذات کا حلقہ ہے۔ خود آپ پر کیا گذری اور آپ پر جو گذری ہے اُس کا آپ کے لوگوں اور آپ کی قوم پر کیا اثر ہوا ہے۔ اس تناظر میں آپ حالات کا جائزہ لیں۔ یہ دو تین اہم مرحلے ہیں ذہن پر انسان کی نظر ہونی چاہیے اور دوسرا آپ کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ یہ امر مدِنظر رہنا چاہیے کہ ماضی سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ حال میں ہم کیا کر رہے ہیں اور مستقبل میں ہمیں کون سے راستے پر چلنا ہے، ان پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ پھر جا کر کہیں بڑی شاعری بنتی ہے جس سے معاشرے کی خدمت ممکن ہوتی ہے۔

طاہر مسعود: عزیز حامد مدنی ایک محفل میں گلہ کر رہے تھے کہ جس طرح مغرب میں ہر بڑا شاعر اپنے پیچھے آنے والے شاعروں کے نام گنواتا ہے اور اُن کی حیثیتیں متعین کرتا ہے۔ آپ نے اس ذمے داری کو کبھی قبول نہیں کیا اور اپنے بعد کے شاعروں کے بارے میں خاموش رہے۔

فیض: بعض بہت سے اچھے لکھنے والے ہیں، اُن میں سے دو ایک نام لے دیں اور باقی نام رہ جائیں تو شکایت پیدا ہوگی۔ میرے کہہ دینے سے کوئی اچھا ہو جاتا ہے اور نہ کوئی بُرا۔

طاہر مسعود: لیکن اس سے شاعر کو تو فوقیت ملتی ہے نا؟

فیض: دیکھیے! قدر کی رائے شاعر کو چھوٹا یا بڑا نہیں بناتی۔ شاعر پیدائشی طور پر چھوٹا یا بڑا شاعر ہوتا ہے۔

رحمٰن: لیکن اس دور میں بھی اور تقسیم ہندوستان کے بعد کے دور میں بھی آپ کی شاعری یا خصوصیت نوجوانوں کو متاثر کرتی رہی۔ ہم نے اُن تنازعات کی طرف اشارہ نہیں کیا جو آپ کے اُس تبصرے نے کیا تھا جس میں ملنے والی آزادی کو داغ داغ اُجالا کہا تھا؟

فیض: آزادی تو محض ایک سراب ثابت ہوئی اور اسی لیے اس سے حاصل ہونے والی خوشی بھی بہت عارضی تھی۔ وہ لوگ آزاد پاکستان میں سیاسی اور سماجی انصاف کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اپنی تحریروں میں بھی انھی رجحانات کا اظہار کرتے تھے اور قدرتی طور پر اکثریت کو متاثر کرتے تھے۔

اظہر: نئے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں۔ کیا آج کے ادیب عصری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں؟

فیض: اچھے اور بُرے ادیب ہر دور میں موجود رہے ہیں، آج کے ادیب پہلے کے زمانوں سے کچھ مختلف تو نہیں ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کچھ ادیب عصری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں اور کچھ نہیں کر رہے۔

اظہر: ہر دور کے ادیبوں کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ضرور ہوتا ہے۔ آپ کی دانست میں آج کے ادیبوں کی اکثریت کا جھکاؤ کیا مثبت اقدار کی طرف ہے؟

فیض: پہلے کے اور آج کے دور میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہ سب وہی ہے جو پہلے تھا۔ آج کے دور میں سیاسی الجھنیں زیادہ ہیں، منزل ذرا صاف نظر نہیں آتی جتنی پہلے نظر آتی تھی۔ اب یہ منزل اور مقصد سے راستے کی تلاش میں ہیں۔ اکثریت یا اقلیت کا مسئلہ اہم نہیں ہے کیونکہ ادب میں مردم شماری تو نہیں ہوتی۔

سوال: اگر زبان کا تعلق تہذیب سے ہے تو اردو زبان کا تعلق پاکستان سے کیسے ہے جب یہ دکن سے چلی اور دلی آئی؟

فیض: یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ ذہن کا سفر ہمارے ہاں بہت کم ہے چنانچہ اس کے بارے میں چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو زبان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ پیدا کہاں ہوئی۔ تحقیق یہ تو کہتی ہے کہ یہ زبان پہلے وہاں پیدا ہوئی ہوگی جہاں مسلمان پہلے وارد ہوئے ہوں گے اور جب پہلے ترکی، فارسی اور عربی زبانوں کا مقامی زبانوں سے اختلاط ہوا ہوگا اور وہ علاقہ تو یہی صوبہ ہے جو پاکستان کا ہے۔ چنانچہ آپ نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے بارے میں سنا ہوگا جنھوں نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہ کہا کہ "اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور دکن میں جوان ہوئی"۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو زبان ہماری تہذیب کا حصہ نہیں ہے۔ اگر یہ نظریہ قابل قبول نہ بھی ہو تو یہ کیا بڑی بات ہے کہ اگر درباری زبان فارسی تھی خاص طور پر مغلیہ زمانے میں، تو امرا اور عوام میں بول چال کی زبان اردو تھی یا اردو کی ایک صورت تھی۔ اور اس تہذیب اور سلطنت میں اس علاقے کو جسے ہم پاکستان کہتے ہیں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ یہاں وہ بڑے بڑے پہلے اردو کے بہت سے ادیب پیدا ہوئے جن کی تحریریں کچھ دستیاب ہوئی ہیں اور کچھ دستیاب نہیں ہوئیں۔ یہ درست ہے کہ چونکہ مرکز دہلی میں تھا اس لیے زیادہ نامور ادیب اور شعرا دہلی میں پیدا ہوئے لیکن دہلی کے شعرا اور ادیبوں کے علاوہ صوفیا، علما، مورخین، منشیوں اور مبلغوں نے جو رسالے اور نثری کتابیں لکھیں وہ اردو میں تھیں اور یہ سب لوگ اسی خطے میں پیدا ہوئے اور اسی خطے میں انھوں نے زبان کو فروغ دیا۔ اس کے بعد جب انگریز آئے تو اردو کو اس کے اپنے وطن میں زوال ہوا اور زبان کا فروغ اور ترقی ان علاقوں میں ہوئی جن کو ہم آج پاکستان کہتے ہیں۔ اس لیے اردو ہماری تہذیبی روایات سے الگ چیز نہیں ہے بلکہ اس کا اہم جزو ہے۔

اگرچہ اس زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مقامی زبانیں بھی ہیں اور ان زبانوں کی اپنی تاریخ ہے، ان کا اپنا ادب ہے اور ان کی اپنی تہذیبی اہمیت ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اردو اور مقامی زبانوں میں اس قسم کا ارتباط پیدا کریں اور ایسا رشتہ پیدا کریں کہ یہ زبانیں بھی اور اردو بھی ہمارے ہاں فروغ پا سکیں۔

سوال: کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جس زبان کو آپ اردو یا ہندوستانی زبان کہتے ہیں اب وہ زبان نہیں رہی جو کبھی اسلاف سے منسوب کی جاتی تھی۔ اب یہ ایسی زبان ہے جو پاکستان کی مختلف قوموں کی مدد کے بغیر اور ان کے ساتھ کے بغیر قومی رابطے کی زبان نہیں بن سکتی۔

فیض: زبان ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ زبان تو ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ جوں جوں معاشرے کی ضرورتیں بدلتی ہیں زبانیں بھی بدلتی ہیں یا ان کی مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں جو اردو رائج ہے وہ اب اس ملک کی زبان ہے اور اس میں یہاں کی مختلف زبانوں اور بولیوں کا اثر ہے۔ اس وقت کسی زبان دان یا باہر سے آئے ہوئے شخص کو یہ کچھ عجیب سی لگے گی۔ اردو کا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کرے گا۔ ضرورت کے مطابق ذہن میں نقطہ

داخل ہوتے ہیں اور جن کی ضرورت نہیں ہوتی وہ متروک ہو جاتے ہیں۔

اس طرح تو زبان کا یہ اور یہ اصول ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آج دلی میں جو اردو بولی جاتی ہے وہ اردوئے معلّیٰ کہاں ہے؟ وہ غالب کے زمانے کی زبان تو نہیں ہے۔ غالب کے زمانے میں جو اردو تھی وہ غالب سے ۵۰ سو برس پہلے کی زبان تو نہیں تھی۔ اسی طرح یہ تو شروع رہتا ہے اظہار کی ضرورتیں بدلتی ہیں۔

سوال: علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو میں آنے سے کس نے روکا ہے؟

فیض: کسی نے نہیں۔

سوال: ہمیں ان الفاظ کو لانا چاہیے؟

فیض: لانے یا نہ لانے کا سوال نہیں ہے۔ وہ خود بخود آئیں گے۔ اگر آپ پشاور میں بیٹھ کر اردو میں بات کریں گے تو اردو میں کوئی نہ کوئی پشتو کا محاورہ اور مضمون آ ہی جائے گا۔

سوال: ابھی ابھی بات ہو رہی تھی ہماری ثقافت پر بیرونی اثرات کی۔ آج کل ایک نیا فیشن نکلا ہے کہ ہمارے ثقافتی ادارے علاقائی رقص اس انداز سے پیش نہیں کرتے جیسے وہ ثقافتی طور سے ہے۔ وہ اس میں کچھ مغرب کا رنگ بھی ملا دیتے ہیں۔ اس چیز کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

فیض: اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمانے کے ساتھ روایتی اور علاقائی فن میں معاشرے کی تبدیلیوں کی طرح تھوڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ جس زمانے میں یہ فن پیدا ہوا اس وقت اس تجربے کی صورت کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ ان کا سلیقہ، ان کی ترتیب، وضع اور ان کا طریقِ اظہار اس زمانے سے متعلق تھا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اس لیے اس فن کی صورت بھی بدل گئی ہے یا بدل سکتی ہے۔ ایک حد تک یہ قابلِ قبول ہے۔ دوسرا پہلو ہے کسی چیز کو اس کے مزاج کے خلاف مسخ کر کے پیش کرنا۔ جس طرح دوسرے فنون کا منہ چڑاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز بالکل ہونی چاہیے میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ ہر فن کا اپنا مزاج ہوتا ہے اسے مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے اسے بہتر سمجھنے اور ان کو ہمارے ثقافتی ورثے کو سمجھنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے اور وہ کوشش کرنی پڑے گی۔

سوال: یہاں علاقائی زبانوں کو جس طرح ترقی دی جا رہی ہے کیا اس صورت سے اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق ہے؟ کیونکہ موجودہ پاکستان کے کسی علاقے کی زبان اردو نہیں ہے۔

فیض: میرے خیال میں علاقائی زبانوں کو ترقی دینے سے اردو زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے بلکہ اس کے سوا اردو کی ترقی کی کوئی دوسری صورت ہی نہیں۔ اردو ایک مشترک زبان ہے جو کہ سب علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے اردو کو موجودہ صورت سے آگے بڑھنا ہے تو ظاہر ہے اس میں جو بھی نئے عناصر شامل ہوں گے اور اس میں ترقی کی جو بھی نئی صورتیں پیدا ہوں گی وہ اب لکھنؤ اور دہلی سے تو نہیں آئیں گی۔ لکھنؤ، دلی اور حیدرآباد تو وہاں رہ گئے۔ اب اردو کو اگر اس ملک میں ترقی کرنا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ یہاں کی علاقائی زبانوں سے اس کا رشتہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ قریبی طور سے پیدا کیا جائے۔ اور اگر ان زبانوں میں ترقی ہوتی ہے تو لازم ہے کہ ان سب علاقوں میں جو مشترک زبان ہو گی اس میں بھی ترقی ہو گی۔ علاقائی زبانوں کی ترقی تو صرف اردو کے لیے منفی نہیں سمجھتا بلکہ اردو کی ترقی کے لیے ایک شرط لازمی سمجھتا ہوں۔

سوال: (۱) بنگالی اور اردو کو ملا کر ایک تیسری نئی زبان بنانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے کیا وہ پاکستان کی تہذیب پر اثر انداز ہو گی؟
(۲) مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتحاد مذہبی سطح پر ہوتا ہے اگر کہا جائے کہ مذہب انھیں متحد رکھتا ہے تو بجائے تہذیب کے اسلامی ملک

پاکستان سے بہتر تعلق رکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے تو [illegible] اس کی وجہ یہ ہے کہ [illegible] کی تہذیب
ہے اور ان خطوں میں دوسرے [illegible] سے کیوں کر [illegible] کیا جائے؟

فیض: پہلی بات تو یہ ہے کہ [illegible] بنگال [illegible] کی بات یہ ہے کہ بنگال نے [illegible] شاعری [illegible] کے [illegible] بنگال [illegible] ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ [illegible] بات ہے۔ اس [illegible] تہذیب [illegible] ہیں [illegible] دوسرے [illegible] ہے۔ ان کے [illegible] سے [illegible] بنگال [illegible] سے [illegible] ہیں۔ [illegible] پاکستان [illegible] پاکستان [illegible] نہیں ہے۔ [illegible] اگر آپ [illegible] کے [illegible] تو [illegible] بھی نہیں ہے [illegible] بنگال [illegible] آپ [illegible] کے [illegible]۔ اس لیے پہلے [illegible] اگر آپ [illegible]۔ [illegible] یہ بات [illegible] ایک دوسرے کے قریب ہے: [illegible] ہیں [illegible] اس [illegible] ہے۔ [illegible] ہیں [illegible] ان [illegible] کے لیے [illegible] ایک [illegible] ہیں [illegible] اس لیے [illegible] ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں [illegible] ہیں [illegible] سائل [illegible] ہیں۔ ان کا [illegible] سے [illegible] ہے [illegible] ضرورت ہے [illegible] کے [illegible] سب سے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] کیا [illegible] سکتا۔

سوال: مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا اتحاد مذہبی ہے [illegible] کیا آپ [illegible] سے [illegible] "[illegible] مشرقی پاکستان [illegible]"

فیض: [illegible] اعتراف ہے [illegible] ہے [illegible] اگر [illegible] ایک [illegible] اسلامی ممالک سے [illegible] پاکستان [illegible] دوسرے [illegible] سے [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] ہے [illegible] ہم [illegible] ہیں [illegible] ہے [illegible] اسلامی [illegible] دوسرے [illegible] ہم [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] ہے [illegible]
ان کے [illegible] ہیں۔

[illegible] ہے کہ ہم [illegible] ایک ہی [illegible] سے [illegible] ہیں [illegible] آپ [illegible] مشرقی پاکستان [illegible] آپ [illegible] ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible] سے [illegible] ہیں۔ ان [illegible] ہم [illegible] ہیں۔ [illegible] کے علاوہ

تہذیب اُن کے ساتھ ہیں۔ دینی رشتہ تو سب سے بڑا رشتہ ہے لیکن دین کے علاوہ ہمارے اُن سے چند خصوصی رشتے ہیں جو کہ تہذیب اسلامی شکلوں کے ساتھ بھی ہیں۔ ویسے بھی ہم سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک تھے اور مغربی پاکستان و یہاں ایک ملک بھی تھا اور مشرقی پاکستان بدل کر ایک الگ ملک بن گیا۔

عقیلہ منظور: اردو ادب سے عربی اور فارسی ادب کا تعلق کیا ہے؟

فیض: عربی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دورِ جاہلیہ کا ادب اور دوسرا اسلامی عہد کا ادب۔ دورِ جاہلیت کا ادب زیادہ تر شعری ادب ہے۔ اردو ادب میں زیادہ تر اثرات فارسی ادب سے آئے ہیں اور فارسی ادب میں بیشتر اثرات عربی ادب سے۔ اس لیے ہمارے ادب اور عربی ادب میں بالواسطہ تعلق بنتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ادب کی روایات، لغت، اشعار کی بحریں عربی سے۔ بحور ہیں، تمام اصول، بحریں، عروض اور قواعد عربی سے لیے گئے ہیں۔ اس لیے عربی ادب کو بہتر طور پر سمجھے بغیر اردو ادب کی گہرائیوں کو سمجھنا مشکل ہے۔

یہ بحث تو زیادہ تر زبان سے متعلق تھی لیکن عربی ادب کے نقطہ نظر سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ عربی ادب کا وہ حصہ جو دورِ جاہلیت کا ادب کہلاتا ہے وہ بعد کے دوسرے ادب سے مختلف ہے۔ اس ادب میں کئی وہ اقدار ملتی ہیں جن کو عوامی اور جمہوری کہا جا سکتا ہے۔ ان کے شعر یا ہر طبقہ کا ادب، بادشاہ، دربار کا ادب نہیں ہے بلکہ عوام کا ادب ہے جس کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس میں عوامی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ ادب عوام میں پروان چڑھا ہے اس لیے اس ادب میں جمہوری اقدار، عوامی احساسات اور فطری میلانات بہت نمایاں موجود ہیں۔ اگر ہم ان خصوصیات کا تقابلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ادب میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کو آج بھی عصرِ حاضر اور جدید ادب میں اعلیٰ اقدار کے طور پر تسلیم کی جاتی ہیں۔
انگریزی، فارسی اور اردو ادب کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزی ادب کا ہمارے ادب پر بہت اثر ہے جس کا اظہار ہمارے ادب کے طور پر یہاں پہنچا ہے۔ خود انگریزی ادب میں جو چار سو سال کے عرصے میں انگریزی ادب کہلانے کا مستحق ہے وہ یورپی ممالک سے ہو کر آیا ہے۔ اس سے قبل جو ادب تھا اس میں عوامی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور جو ادب ہے وہ ترقی یافتہ اور اردو ادب کی ترقی بھی زیادہ تر ہمارے مزاج کی مرہونِ منت ہے۔

عقیلہ: کس ادب کا مطالعہ کیا جائے؟

فیض: اس سوال کہ مغربی اور مشرقی زبانوں میں کس کو اولیت قرار دیا جائے، آسان اور سیدھا جواب یہ ہے کہ ہر ادیب کا مطالعہ ضروری ہے جس کا تعلق اردو ادب سے ہے۔ اس سلسلے میں کسی ایک زبان کو ترجیح دینا ضروری نہیں۔ سب سے پہلے اردو کا تعلق ہندی سے ہے۔ ہندی سے مراد آج کل کی ہندی نہیں بلکہ وہ عوامی زبان ہے جو تقسیم سے پہلے عوام میں بولی جاتی تھی، جس میں مختلف گیتوں کے ذریعے عوامی ترجمانی کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اردو کا بنیادی تعلق فارسی اور عربی سے ہے۔ انگریزی زبان سے ہمارا ایک سو سال سے تعلق رہا ہے۔ انگریزی ادب کے ذریعے سے اثرات ہمارے ادب میں داخل ہو گئے ہیں۔ انگریزی ادب بھی دوسرے ممالک کے ادب سے متاثر ہوئے بغیر پروان نہیں چڑھا ہے۔ انگریزی ادب نے یونانی، لاطینی اور دوسری زبانوں سے استفادہ کیا ہے اور تقریباً ان تمام زبانوں نے ایک دوسرے سے بالخصوص یونانی ادب سے اثرات قبول کیے ہیں۔ اس لیے سب کی زبانوں میں بہت سی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔

ہمارے ملک میں انگریز جب سے آئے تو ان کے ساتھ ایک نئی طرزِ زندگی آئی جس سے متاثر ہو کر ہمارے ادب پر یہ تمام چیزیں

ہماری روایت کا ایک حصہ ہیں۔ درحقیقت تمام ممالک کے ادب میں بہت سی چیزیں مشترک ہوتی ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں جب کرۂ ارض کا ایک ملک دوسرے سے بہت نزدیک آ گیا ہے تو خیالات، تحریک، نظام، جمہوری جدوجہد اور آزادی کی تحریک ہر ادب میں مشترک ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ ہے۔ لیکن یہ ہے کہ ہر ملک کے ادب میں وہ قدریں نمایاں ہیں جن کو قومی امتیازی اقدار کہا جاتا ہے۔

خلیق صدیقی: آپ کے ہاں سولژے نتسن اور پاسترناک دونوں نے کیوں نوبل انعام لینے سے انکار کیا؟

ایتماتوف: پاسترناک نے اپنے ملک کے ادیبوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے نوبل انعام لینے سے انکار کیا۔ جب نوبل انعام دیا گیا تھا اس وقت تک ستالن بھی زندہ تھا اور کیمونزم کا دور دورہ تھا۔ ان کے علاوہ روس کے اور ادیب بھی تھے جو اعلیٰ معیار پیش کر رہے تھے۔ خود پاسترناک نے جو ایک شاعر ہے بہت سے اچھے شعری مجموعے پیش کیے لیکن ان پر نوبل انعام ان کی ناول کی وجہ سے دیا گیا۔ جہاں تک سولژے نتسن کا تعلق ہے انہوں نے ایک ناول لکھا جس میں سوویت معاشرے کے خلاف بہت کچھ تھا تو اس پر انعام دے دیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انعام کی پیشکش سیاسی مصلحت کی وجہ سے کی گئی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھی گئی کہ سوویت ادیبوں نے ان سے اختلاف کیا۔ پاسترناک نے ان ادیبوں کی رائے کا احترام کیا اور انعام نہیں لیا۔

سولژے نتسن کا معاملہ بالکل مختلف ہے اس نے حکومت کی وجہ سے نہیں بلکہ انعام لینے سے انکار کیا۔ اس کا موقف تھا کہ اس کی ادبی کاوش کسی ایوارڈ کی محتاج نہیں۔ اس میں ان کی Artistic Ego کا اظہار نظر آتا ہے۔

خلیق: روس میں انقلاب کے بعد لکھا جانے والا ادب بہتر ہے یا انقلاب سے پہلے کا ادب زیادہ بہتر ہے؟

ایتماتوف: یہ حقیقت ہے کہ روسی کلاسیکی ادب زیادہ جاندار ہے۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے کہ روس میں انقلاب سے پہلے بہت بڑے بڑے ادیب ہوئے ان میں ٹالسٹائی، دوستوفسکی، گوگول جیسے ادیب شامل ہیں۔ لیکن انقلاب کے بعد بھی روس میں بہت بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے ان میں شولوخوف اور پاسترناک شامل ہیں۔

جہاں تک انقلاب سے پہلے کے روسی ادب کی اپیل کا تعلق ہے تو اپیل ایک ذاتی معاملہ ہے ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی ادب اپیل کرے اور دوسرے کو نہ کرے۔ انقلاب سے پہلے کا ادب زیادہ تر اشرافیہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس زمانے کے ادیب ایک ایسے ماحول کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے جو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارا آج کا ماحول بھی وہی ہے۔ ہمیں اس ماحول کے خلاف آواز بلند کرنے والے ادب میں زیادہ اپیل محسوس ہوتی ہے۔ ہر ادب کو اپنے ماحول کی عکاسی کرنی ہوتی ہے۔ کلاسیکی دور کے ادیب صرف اپنے طبقے کے لیے لکھتے تھے لیکن آج کے روسی ادیب پورے معاشرے کے لیے لکھتے ہیں۔ جن میں تمام لوگ کسان، مزدور بھی شامل ہیں۔ سوویت ادیبوں کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم ہے کہ وہ تمام لوگوں تک اپنی آواز پہنچائیں۔ ان کا یہ بھی ایمان کا حصہ ہے کہ تمام عوام کو اس قابل بنائیں کہ وہ کلاسیکی ادب سے استفادہ کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ایک پڑھنے والا طبقہ پیدا ہو گیا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ایک ادیب کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں ایک پڑھنے والے طبقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس ملک میں بڑی تعداد میں لوگ ادب کو سمجھ سکیں وہاں ادیب اعلیٰ معیار سے لکھیں گے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جو ادب پیدا ہوگا زیادہ مفید ہوگا۔ کیوں کہ پڑھنے والا اس کو پہنچ جانے کی جستجو پیدا کرتے اور ان کے لیے کسی قسم کی ضرورت نہیں۔ جس ملک میں زیادہ پڑھے لکھے ہوں گے تو ان میں سے زیادہ جستجو پیدا ہوں گے۔ روس جیسے ایک ملک میں جہاں پچانوے فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں اور دوسرے ملک جہاں صرف فیصد

والے مُلک میں زیادہ جینئس پیدا ہوں گے۔

حفیظ صدیقی: غیر طبقاتی معاشرے میں ادب کا رول؟

فیض: اس کا بڑا سادہ سا جواب یہی ہے کہ ادب کا رول وہی رہے گا جو اب تک رہا ہے یا جو دراصل ادب کا رول ہے۔ یعنی جو بھی حقیقت ایک وقت میں ہے اُس کی تہ تک پہنچ کر اُس کا اظہار کرنا لیکن ہر معاشرے میں حقیقت بدلتی رہتی ہے۔ ایک معاشرے میں جو حقیقت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے معاشرے میں وہ حقیقت نہ ہو۔ ہمارے معاشرے میں غم ایک مسلمہ حقیقت رہی ہے لیکن اگر ہم ایک ایسا معاشرہ بنالیں جس میں ہر طرف مسرت ہی مسرت ہو تو ہمارا ادب بھی اس کی ترجمانی کرے گا۔

حفیظ صدیقی: اپنی تخلیقات میں کون سی تخلیق سب سے زیادہ پسند ہے؟

فیض: یہ سوال بڑا عجیب ہے اور اس سلسلے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ غزل میں تو نہیں کہہ سکتا ہوں "تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گذری ہے" بہت پسند ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس میں جو بات کہنے کی کوشش کی ہے وہ بھرپور انداز میں ادا ہوئی ہے۔ عام طور پر جو بات ذہن میں ہوتی ہے اور جو ادا ہوتی ہے اُن کے درمیان کئی مراحل ہوتے ہیں، لیکن اس غزل کے تعلق سے جو بات ذہن میں تھی وہ بعینہٖ ادا ہو گئی ہے۔ نظموں سے متعلق ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن پھر بھی مجھے "تنہائی"، "یہ داغ داغ اُجالا"، "زنداں کی ایک صبح"، اور "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" زیادہ پسند ہیں۔

حفیظ صدیقی: کیا ادب میں جمود ہے؟

فیض: ادب میں جمود کا وہم ہوتا ہے۔ ادیبوں میں جس جذبے کی گرمی اور ولولہ ہونا چاہیے اُس کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آج کل ہمارے ادیبوں میں تھوڑی سی کاہلی اکتاہٹ آ گئی ہے۔ ہر دور میں ادبی تخلیقات ہوتی رہتی ہیں۔ جس چیز میں جان ہوتی ہے وہ باقی رہ جاتی ہے، باقی ختم ہو جاتی ہیں۔ اِن سے ہمیں خائف نہیں ہونا چاہیے۔ نوجوان ادیب ہمیشہ تجربات کرتے رہتے ہیں اور انھیں تجربات میں سے سنجیدہ باتوں کی راہیں نکل آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان ادیب اور شاعر بنیادی چیزوں پر لکھنے میں کچھ دقت محسوس کرتے ہیں لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں سے کام کی چیزیں خود ہی کسی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔

نصرت: اُردو ادب میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے اور اس کے علاوہ عالمی ادب پر بھی آپ کی نظر ہے اور اب یہ کم و بیش تسلیم بھی کر لیا گیا ہے کہ روایت اچھے ادب کی اساس ہے، مگر ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا مشرق کی ادبی روایت مغرب کی روایت کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

فیض: مقابلہ تو یقیناً کر سکتی ہے، اس لیے کہ ہر مُلک کی روایت جو ہے، اُس مُلک کے مزاج کے مطابق، حالات کے مطابق، اُس مُلک کے مذہب اور کلچر کے مطابق اُس کا ایکسپریشن ہوتا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اُس مُلک کی روایت بڑھیا ہے اور اس مُلک کی روایت گھٹیا ہے۔ ان میں بہتری یا کمتری کا مقابلہ نہیں ہو سکتا بلکہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کیا چیزیں مشترک ہیں اور کیا مختلف۔ اس بنیاد پر ان میں تقابل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا تو زیادہ تعلق یا زیادہ مطالعہ انگریزی شاعری کا ہے۔ ہماری شاعری اور اُن کی شاعری کا فرق، ہماری تاریخ اور اُن کی تاریخ کا فرق ہے، ہمارے کلچر اور اُن کے کلچر کا فرق ہے۔ ہمارے یہاں صدیوں تک ایک ہی نظام قائم رہا جس کو ہم فیوڈل، شاہی یا جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں اور اس وجہ سے ہمارے طرزِ زندگی میں بہت زیادہ واضح تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ مغلوں کے آنے سے پہلے یا یوں کہیے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے

بادشاہتیں قائم ہوتی رہیں، لوگ آتے رہے اور اپنی تہذیب اپنے ساتھ لاتے رہے۔ ہر کسی کے آنے کے بعد زبان بدلی، شاعری کے علاوہ مختلف علوم پر اثر پڑا، لیکن مغلوں کے آنے کے بعد کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا، جب تک انگریز نہیں آئے۔ اس دوران ایک بڑا فرق یہ آیا یعنی سترھویں اٹھارھویں صدی کے بعد یا اس سے آگے تو تب انگریزوں کے آنے کے بعد انحطاط شروع ہوا۔ ہندوستانی تہذیب کا آخری دور آیا، ادارے بکھر گئے۔ اردو شاعری اس عہد میں اپنے عروج کو پہنچی۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب کسی تہذیب کا عروج ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب اور تمام فنون کا بھی عروج ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی ایک قطعی مختلف حیثیت ہے کہ اس کا عروج اس وقت ہوا جب ملک کی تہذیب کا، ملک کے کلچر کا، ملک کی ثقافت کا اور ملک کی سیاست کا انحطاط ہو رہا تھا، زوال ہو رہا تھا۔

نصرت: اس عہد کے جو شعرا تھے، آپ کے خیال میں ان کا کیا مقام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا ان کی کوئی روایت یا انفرادیت تھی؟

فیض: اس زمانے میں یہ جو میر، سودا کا عہد ہے، اٹھارھویں صدی سے لے کر بلکہ سترھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے نصف تک جو شعرا ہیں وہی اردو کے کلاسیکی شعرا ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے طریقے سے اس زمانے کو جو بھی شعور تھا، اس زمانے کی جو بھی قدریں تھیں، اس زمانے کی جو بھی واردات تھی، اس کو اپنے اپنے انداز سے منعکس کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس وقت کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا اس لیے اس عہد کی شاعری میں ایک طرح کا تسلسل ہے جس میں ایک جیسی کیفیت ہے، حسن کی، غم کی اور دنیا کی بے ثباتی کی۔ ہر شاعر کے ہاں وہی موضوع ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ کیفیت اس عہد کی روایت ہے۔ اب رہا سوال انفرادیت کا تو ہر اچھے شاعر کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔

نصرت: آپ اس عہد کے کس شاعر سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟

فیض: ایک حد تک تو آدمی ہر ایک سے متاثر ہوتا ہے۔

نصرت: جسے ہم اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ آپ کے خیال میں کس شاعر سے شروع ہوئی؟

فیض: جہاں تک اردو شاعری کی روایت کا تعلق ہے وہ روایت شروع ہوئی ولی دکنی سے، گو کہ ان سے پہلے بھی اردو شاعری موجود تھی۔ مگر جس کو ہم اردو کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ ولی سے شروع ہوئی۔ ان کے بعد پہلے بڑے شاعر میر پیدا ہوئے۔ میر کی جو روایت تھی اس میں درد و غم، رنج و الم سے بیزاری کا عالم تھا۔ ان کے مقابلے میں سودا پیدا ہوئے جو کہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند زیادہ جاندار شاعر تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ روایتیں ہیں، زبان کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے کہ میر کی زبان سادہ، شیریں، میٹھی اور دھیمی سی تھی۔ اس کے برعکس سودا کی زبان زیادہ پرشکوہ، پرزور، زوردار اور قدرے بلند تھی۔ خیالات اور مضامین کے اعتبار سے بھی دونوں مختلف تھے۔ سودا جو تھے وہ زیادہ خارجیت پسند تھے، جو لوگوں پر گزر رہی تھی اس کی زیادہ عکاسی کرتے تھے۔ میر زیادہ داخلیت پسند تھے۔ یہ دونوں روایتیں ساتھ ساتھ چلیں۔ اس کے بعد یہ دور ختم ہوتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی دور کے خاتمے پر اس کے تمام پہلوؤں کا جامع شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اس عہد کے خاتمے پر پیدا ہوئے غالب۔ انھوں نے سارے دور کا خلاصہ کر دیا۔ اس روایت کا جو تقریباً دو سو سال سے چلی آ رہی تھی، ایک طرح سے غالب میں اس کا خلاصہ ملتا ہے۔ غالب کی شعری روایت کے تین پہلو ہیں۔ ایک تو ماضی کے بارے میں ماتم کیا جاتا ہے، اس کا حسن، اس کی تہذیب، اس کی شائستگی، وہ تہذیب جس سے وہ واقف تھے اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔ ایک طریقے سے اس کا مرثیہ غالب نے لکھا۔ ان کی شاعری کا دوسرا پہلو ہے حال، اس میں تباہی، بے سروسامانی اور ناداری کا مضمون ہے۔ تیسرا پہلو ہے مستقبل، اس میں تبدیلی کی

ہے اور تو اور قتیل بھی۔ ایک حقیقت ہے کہ جو لفظ اب بے معنی ہو چلے ہیں؟

نصرت: زبان کے بدلنے سے روایت کا تحفظ کس طرح ہوگا؟

فیض: جہاں تک زبان کا تعلق ہے، شعرا تو غالب نے کوشش کی فارسی کے ساتھ جو ہمارا رشتہ تھا اس کو تازہ کرنے کی، اور اس کی تعمیر سے نئے استعارے، نئی تشبیہیں، نئی طرز بیان غالب نے متعارف کروایا۔ اس کے بعد جو عہد ہے انگریزوں کے آنے کا، مدرسے بدل جانے کا، ایک طبقے ہیں اور ایک بدلی ہوئی، اور ان کی مدد سے انھوں نے یہ کوشش کی کہ انگلستان میں بہت سے لوگ جو انگریزی شاعری ہے اس کی تقلید میں، اس کے نمونوں پر شاعری کریں۔ چنانچہ چھوٹے اور آزاد تو یہاں تک کہ وہ کہا کہ ان سے پہلے کے جو پچھلے شاعر لکھتے آئے ہیں، بجز چند لوگوں کی باتیں، عشق کی باتیں لکھیں، ان سب کے بجائے مناظر کی باتیں لکھیں، نیچرل شاعری، سوشل شاعری، مثلاً "برکھا رت"، "برسات کا موسم"، "سردیوں کا موسم" وغیرہ۔ یہ بالکل نئی بات تھی۔ یہ ایک نئی شاعری تھی، جو لوگوں کے دلوں کو بھی بھاتی تھی، اور ادبی طلب سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا، انھیں شاعری سے دلچسپی تھی نہ رہا تھا۔ نتیجے کے طور پر یہ شاعری جو انگریزوں کی تقلید میں شروع کی گئی تھی تھوڑے دنوں میں ختم ہو گئی، لیکن اس شاعری کا ایک پہلو یہ تھا کہ ملک کے معاشی اور سیاسی حالات کی عکاسی بھی شاعری میں آنے لگی اور یہیں سے نئی شاعری کا آغاز ہوا۔

نصرت: اس دور کا سب سے بڑا شاعر آپ کے خیال میں کون ہے، جدید شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟

فیض: اس دور کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں جو اس دور کے آخر میں آتے ہیں۔ انھیں ہم دور میں شاعر بھی ہے اور جو حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے، لیکن ان کی حد تک ایک طبقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ دو طبقے جو سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس طبقے کے خیالات، اس کے معاشی اور سیاسی رجحانات شاعری میں داخل ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے جو طبقہ امرا یا امرا اور نوابین کا طبقہ تھا، اس کے ختم ہونے کی منزل تک آتی ہے، اس کی شاعری جو ہے اقبال تک۔ اس کے بعد متوسط طبقے کی شاعری ہے۔ ان میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔ حریت کا جذبہ، آزادی کا جذبہ۔ اور اس زمانے میں جو انگریزی شاعری کی تقلید ہوئی ہے وہ بھی اس لیے بھی کہ یہ لوگ بیشتر انگریزی سے اچھی طرح واقف تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی، مغرب سے پڑھ کر آئے، انھوں نے تو براہ راست انگریزی اور انگریزوں کے شاعرانہ طریقۂ کار (Methods) کو اپنایا اور تجرباتی شاعری پیدا ہوئی۔

نصرت: اس تجربے کے حوالے سے یہ تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ تجربات کے ساتھ ساتھ ہیئتی تجربے بھی ہوئے۔ حالی اور آزاد سے شروع ہو کر ان تجربوں کی وضاحت کس طرح ہو سکتی ہے؟

فیض: شروع شروع میں تو نظم شامل ہوئی۔ 1935ء کے بعد ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے انگریزی شاعری کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ان میں سے کون سے تجربات ایسے ہیں جو ہماری زبان کی روح میں داخل ہو سکتے ہیں۔ انھیں ہم اپنی شاعری میں لا سکتے ہیں۔ اس دور کے بعد کئی تجربات شروع ہوئے۔ اس سے پہلے کے تجربات محض تقلیدی تھے۔ تجزیہ تجربے کرنے والوں میں نمایاں ن م راشد اور میراجی ہیں۔

نصرت: تصیدہ تجربہ کرنے والوں میں کچھ نام ...؟

فیض: حالی اور آزاد کے علاوہ ان میں شرر بھی ہیں، اسمٰعیل میرٹھی بھی، اور ان کے علاوہ کئی اور......

نصرت: آپ کے خیال میں شاعری میں نئے تجربے ہونے چاہئیں یا پھر صنف کا تعلق روایت کی پاسداری کرتے رہنا چاہیے؟

فیض: کوئی بھی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس میں روایت کا شعور اس کی زندگی میں نہ ہو۔ مجھے تو تجربے کی مثال تو یہ دی جاسکتی ہے جیسے ایک تھا سا پودا ایک قد آور درخت ہے اور اس کے نیچے جو سب زمین ہو اور جس سے تعلق اور اس کی جڑ سے پیوستہ ہو پھر اس کو چھانٹ دیں تو سب مٹ جاتا ہے مثلاً اس میں پانی دستیاب ہو تو کوئی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں جو زندہ ہے یعنی جہاں تک روایت کا تعلق ہے وہ اس وقت تک نہیں پنپتی جب تک وہ اپنے موسموں کا خیال نہ رکھے۔ نئے تو ٹوٹے نئے تجربوں کی جڑیں رہتے ہیں۔ اگر یہ تو ٹوٹے ہوئے ہیں تو وہ بھی شاخ کی طرح جلدی مرجھا جاتا ہے۔

مظفر اقبال: یہ جو نئی شاعری ہے یا سو کالڈ نئی شاعری ہے تو کیا یہ لوگ مغرب کی شاعری سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہو گئے؟

فیض: ظاہر ہے مغربی شاعری کا ہمارے ہاں طرح طرح کا اثر ہے اقبال اور مولانا آزاد کے زمانے سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی شاعری کو چھوڑ کے جو خالص مغربی تقلید میں شاعری کی ہے مثلاً فری ورس اور تجریدی شاعری کا مال اور اسی طرح ..... وغیرہ وغیرہ ..... یہ سب ایسی کارآمد چیزیں ہیں اس لیے کہ اس میں اپنا خون شامل نہیں ہے۔ وہ اوپر سے تو لگتی ہے کوئی چیز پیدا ہوئی نہیں ہے۔ ان طریقے سے ہم سے مراد یہ ہے کہ ہماری شاعری سے ہمیں استفادہ کرنا چاہیے یا وقت اور حالات کے مطابق ہونے چاہئیں تجربات ہیں ان کے لیے تو ساتھ اپنا مواد نہیں کرنا چاہیے اور پھر یہ کہنا چاہیے کہ یہ بتایا ہے کہ اس میں کون سی چیز اپنی ہے یا کون سی مغربی ہے یا کون سی اتنی اہم ہے جس کو ہم نے اپنایا ہے جس کا ہم کو علم نہیں ہے اور کون سی چیز اپنی ہے جو بات کا چہرہ ہو جاتے ہیں ہم کبھی الگ نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بات آتی ہے کہ شاعری جو ہے وہ صرف جذبات کا اور خیالات کے اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ وہ چیز کا نام بھی ہے۔ تو یہ تنقید کا کام بھی آتا ہے کہ وہ تنقید کا کام بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی چیز کون سا شعر اچھا ہوتا ہے کون سا شعر برا ہوتا ہے کہاں کوئی بات خراب ہو جاتا ہے۔ یہ سب نئی ہوتی ہے یہ چیز ہماری چیزیں ہوتی ہیں ہمارے ہاں جو ہیں یہ محض مغرب کی تقلید سے نہیں کہ وہاں یہ فیشن چلا ہے اس لیے ہم نے بھی یہ فیشن چلا دیا ..... تو یہ بات اوپر سے ہوتی ہے اس لیے کہ جو اپنی جڑ ہونی چاہیے۔ اچھی ہو یا بری جو ہو وہ ہم لوگ کیسے سمجھیں گے۔ ہوتا تو یہ ہے کہ ایک طرف تو روایت کی جڑ ہے اور وہ تو ہم رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ ہے کہ جو حالات کا تقاضا ہے اس کی شناخت ہونا ضروری ہے کہ تجربات اور مشاہدات اور روایات کا لحاظ ہے اور اس کے مطابق ہونے چاہئیں تو یہ دونوں چیزیں ہیں۔ اپنی اپنی جگہ پر یہ درست کرنا ہے تو کوئی تعلق اور کوئی رشتہ یہ دونوں میں آتا ہے روایت اور ایک تجربہ ..... ہاں تو اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔ یہ تو ہر شاعر جو ہے وہ اپنا نسخہ خود تلاش کرتا ہے۔ کسی کا نسخہ جو اس کا نسخہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے کسی کا نہیں بیٹھتا تو وہ بات الٹی ہو جاتی ہے۔ تجربہ ہو جاتا ہے اور اس پر بحث ہے تو ہم سے جو نئی شاعری کرنے والے ہیں وہ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی چھوڑ جاتے ہیں اور پھر روایت کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ ہم نے اس قسم کا تجربہ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا ہی نہیں تھوڑا بہت کیا ہے۔ جس حد تک ہم نے سمجھا ہے کہ ہم پرانی روایت کے اندر اس میں رہ کر اس حد تک انحراف کر سکتے ہیں جیسے ذہن میں ایک اختراع ہوتی ہے یا کچھ بات ہوتی ہے تو اچھا ہو تو یہ سب بہت جائز نہیں ہے تو اچھی بات تو صحیح ہے لیکن محض پھیلانا کرنا ..... اس کا کوئی جواز نہیں۔

مظفر اقبال: یہ بڑی اچھی بات کی آپ نے ..... پچھلے ایک دن ایفرو ایشین مسئلے پر کچھ خاص شاعر ہیں جو آپ کی شاعری کے بہت قریب ہیں جیسے جنوبی امریکہ کے کچھ لوگ ہیں تو کیا آپ کہتے ہیں کہ اس طرح کی شاعری سے عالمی حالات پر کچھ اثر پڑ رہا ہے؟ کیا لوگ واقعی متاثر ہو رہے ہیں؟

فیض: بات یہ ہے کہ آج تک ہمارا انگریزی شاعری کے علاوہ کسی اور زبان کی شاعری سے واسطہ نہیں رہا۔ اور ہمارے ملک کے حالات سے بہت کم تعلق ہے انگریزی شاعری کا۔ لیکن دوسرے ملکوں میں تو عام واردات جو ان کے زمانے کی واردات ہے وہی ہمارے ہاں بھی ہے اور ان میں ظاہر ہے بہت سی چیزیں بہت سی آوازیں ہم سے ملتی جلتی ہیں ان ادبیات سے ہم زیادہ آسانی سے اخذ کر سکتے ہیں زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ جو گذشتہ دس بیس برسوں میں ہوا کہ ہم نے بجائے فرانسیسی اور انگریزی اور جرمن شاعری کے... مثلاً ترکی اور روس، ان میں فلسطینی اور عربی شاعری سے رابطہ کیا ہے افریقی شاعری سے، وہاں کے لوگوں پر ویسی ہی واردات گزر رہی ہے جیسی ہم پر گزر رہی ہے تو یہ تو ایک بہت اچھی بات ہے کہ ان سے ہم زیادہ اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے زیادہ بارآور چیز ہے اور اس سے اتنی شاعری براہ راست ہمیں زیادہ ملتا ہے بجائے ان ممالک کے ادب کے جن کے معاشرے کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور یہ مغرب کے ان ادیبوں (یعنی مغربی) اور ان لوگوں کے تجربات کے زیادہ قریب آ گئے ہیں جو ہم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

مظفر اقبال: جی، یہ تو بہت پرانا امر ہے، یعنی خود آپ بھی اب تک... پانچ برس پہلے ہوا تھا... اب وہ ساری کہانی جو گویا آپ کی اپنی کہانی تھی ہے۔ اسی طرح کے تعلقات، اسی طرح کی ساری واردات، اسی طرح کا تجربہ، اسی طرح کی چیزیں جب ترجمہ ہوتی ہیں اور اسی طرح آپ کی شاعری جب ترجمہ ہوتی ان زبانوں میں تو یہ بہت اچھی بات ہے لیکن کیا واقعی اس کا کوئی فائدہ ہوا؟

فیض: کافی ہوا۔ یہ بات تو ... ہے۔ ایک تو ترجمے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے کہ ہمارے ہاں جو عربی سے ترجمہ ہوئی چیزیں ہیں، جو ہم نے ترجمہ کئے ہیں۔ ناظم حکمت ہے یا فلسطینی ادب کے اب ترجمے ہو رہے ہیں اس سے لوگوں کو اپنی حقیقت کا پتا چلتا ہے اور اپنے ماحول، اپنی زندگی کو سمجھنے میں امداد ملتی ہے۔ اس سے اپنی بصیرت جو اپنی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ان کی آنکھوں سے ان کی زندگی دیکھنے کے انداز سے اپنی زندگی دیکھنے میں امداد ملتی ہے۔ اپنی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس بصیرت کی وجہ سے ظاہر ہے ہمارے ادب میں بھی ایک طرح کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔

مظفر اقبال: اب آج کی شاعری کے بارے میں، کیا یہ عام سا جنرل قسم کا سوال ہے لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کے ساتھ کے لوگ ہیں، یا بعد کی نسل کے لوگ......

فیض: ہم سمجھتے ہیں کہ آج کل ظاہر ہے کہ پہلے جیسا خیال تو ہے کچھ زیادہ انتشار بھی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہم سمجھتے ہیں کہ اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کافی پیدا ہو رہے ہیں۔ نئے بھی لوگ ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ اچھے نوجوانوں کے بارے میں حتمی رائے دینا مشکل ہوتا ہے کہ پتا نہیں آگے بھی کچھ لوگ جلدی ہی ہار جاتے ہیں لیکن کم از کم پتہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کر رہے ہیں، محنت کر رہے ہیں۔ وہ لوگ ... لکھنے والے ہیں نثر میں بھی، نظم میں بھی، تنقید میں بھی... بحیثیت مجموعی ادب میں بہت اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں ... تو موجود ہے ... ابھی اس کا کوئی اس قسم کی صورت نہیں ہے ... کہ کسی ایک صورت ہوئی تھی تو ... ابھی پیدا نہیں ہوئی لیکن ... تو موجود ہیں ... ہیں ابھی ... ہمارے ... ادب میں اس طرح سے کوئی پریشانی نہیں ہے ... کو چھوڑ کر اب ... ہے ... ہے۔ ... شاعری پیدا ہو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ ... ادب کا زوال تو نہیں ہو رہا ہے۔

مظفر اقبال: اب شاعری میں یہ بحث ہوتا ہے مسئلہ کہ فلاں نے فلاں کو "ان فوکس" کر دیا مگر آپ جیسا بڑا شاعر...... جو ایک وسیع کیفیت کے ساتھ ادا ہوا اور ایک پوری نسل کو متاثر کر رہا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ "نئی غزل" کا حصہ کیسے ہو سکتا ہے یا کس طرح سے عہد کی ضرورت ہوتی ہے، نئے لوگوں کو سامنے آنے میں، اظہار کا ایک نیا طریقہ بنانے میں......

فیض: ہوتا ہے۔ وہ تو لازمی بات ہے۔ کیونکہ جب کوئی شاعر متاثر کرتا ہے دوسرے شعرا کو، تو ایک یہ ہوتا ہے کہ جماعت بن جاتی ہے ایک خاص قسم کا شاعری کی، ایک خاص قسم کی لغت، ایک خاص قسم کا اسلوب پیدا کرتے ہیں، جس میں کوئی شاعر دوسرا پہلے اس کو بیان کر دیتا ہے۔ اب وہ مروج ہو گیا طریقہ۔ تو اس کا اصل منبع دب جاتا ہے۔ وہ اسے پہلی بار کرتا۔ اس سے ایک دوسرے سے لوگ متاثر ہو کر لیتے ہیں، جو چیزیں ہیں اس میں کہ ہم غالب اور میر سے مل سکتے ہیں تو وہ بھی ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں، ایک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ تو ایک ادبی قدرتی عمل ہے۔ بعض سے ہوتا یا ہمارا اثر کوئی لیتا ہے کہ اب نہیں جو ہیں کے رنگ میں لکھیں گویا وہ کسی کے رنگ میں لکھیں گویا ہمارے رنگ میں۔ تو اس میں تو اس کی خطا ہے ہمارا کوئی قصور نہیں۔ بعض جو اچھا لکھنے والے ہیں وہ اپنا اسلوب پیدا کرتے ہیں۔ اس میں ہم کوئی چیز کسی میں اضافہ ہے جیسے ہم غالب سے لیتے ہیں، کسی نے جو کچھ سب سے لیا تاکہ اس کو صحیح سے سمجھا جائے، فطری بات ہے۔

مظفر اقبال: میری دانست میں ایشیا کی ہر ملک میں الاقوامی ضرورت کا ایک ہم موقع ہے۔ اس سے افریقی، ایشیائی ممالک اور ہماری اپنی زندگی میں ایک نئی روح پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی لڑائی جاری ہے کہ اس قسم کی لڑائی بحث سے ہم اسلامی، افریقی اور ایشیائی ممالک میں ہیں۔ اس تناظر میں آپ اپنی بھی زندگی اور شاعری پر نظر ڈالیں تو کیا یہ بتائیں گے کہ آپ یہ سوچتے ہیں کہ افریقی اور ایشیائی ملکوں کے ادب میں اس وقت کس قسم کی تحریک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ 1937ء، 1938ء سے جب سے ہم آپ کی شاعری پڑھ رہے ہیں اس وقت بھی آپ کا ایک منفرد انداز موجود تھا جو آج تک قائم ہے۔ آپ سے بہت سی نئی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، اب جو زمانہ آ گیا ہے اس میں آپ اردو ادب کے بارے میں اپنی رائے دیں کہ اس کو کون سی نئی جہت عطا کی جا سکتی ہے؟

فیض: بعض لوگ کسی کے کہنے سے ادب کو ڈائریکشن نہیں بخشی، دی جا سکتی ہے۔ ڈائریکشن حالات سے اور حالات کو دیکھنے سے ملتی ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں اور لکھنے والوں میں ان کا شعور پیدا ہوتا ہے اور اس شعور سے جس قسم کا وہ تجزیہ حاصل کرتے ہیں اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور اسی کا اثر ان کے فن اور ادب پر ہوتا ہے۔ افریقہ کو دیکھیے ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ ہم سوائے انگریزی اور امریکی ادب کے دنیا کے دوسرے علاقوں کے ادب سے واقفیت ہی پیدا نہیں کر پائے ہیں۔ ظاہر ہے لاطینی امریکا میں بڑے اچھے لکھنے والے ہیں۔ کینیا، نائجیریا، جنوبی افریقہ، ایتھوپیا، انگولا، موزمبیق اور دوسرے ممالک کے ادب کو سامنے رکھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈائریکشن وہاں کے حالات نے پیدا کی ہے۔ فلسطینیوں ہی کے ادب کو لے لیجیے وہاں کے شاعر اور ادیب، محمود درویش وغیرہ جو ہیں، جو صورت وہاں موجود تھی، ان حالات کے جو تقاضے تھے ان کو سامنے رکھ کر انہوں نے انقلابی قدروں کے ۔ تو انھوں نے پیش کیا ہے۔ اسی صورت دوسرے ممالک کے ادیبوں کے پیش نظر ہونی چاہیے۔ ادب ہی پائی ہوتی ہیں۔ اب ایک متبادل کا طریقہ بھی ہے، اس کو بھی ذرا سا بحث کرنا چاہیے وہ بھی ایک تجربہ ہے، دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ عملی نوعیت کو ادب کے ذریعے سے حاصل نہیں کرنی چاہیے، اس کے اوپر بھی بحث ہو سکتی ہے لیکن ان میں ڈائریکشن ضروری ہے۔

سعادت سعید: ادب میں ڈائریکشن کی بات ہو رہی ہے 1935ء میں بھی ترقی پسند تحریک تھا، ترقی پسندوں نے ان دنوں تمام شاعری اختیار کر

رہی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

فیض: ترقی پسندی کی اصطلاح کی بھی کئی تاویلیں ہیں۔ مختلف لوگوں کے ذہنوں میں اس کے مختلف معانی ہیں۔ ہمارے ذہن میں ترقی پسندی کا تصور یہ ہے کہ اوّل جو زندگی کے حقائق ہیں اور جو گردوپیش کے ماحول کے تقاضے ہیں ادیب اور شاعر کو ان کا تھوڑا بہت شعور اور ادراک ضرور ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بارے میں دو طرح کے فرار کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو بے مقصد خواب سازی سے گریز کرنا چاہیے کہ حالات کو سمجھے بغیر ایسے خواب بیان کرنے شروع کر دیے جائیں کہ اب سحر ہونے والی ہے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، یہ بھی صحیح نہیں۔ جو مشکلات اور مسائل ہیں ان سے گریز کرنا بھی درست نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ چوں کہ مشکلات ہیں، مسائل ہیں اس وجہ سے مفرور ہونا، بھاگ جانا، یہ کہنا کہ اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا، یہ بھی درست نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دو دنیائیں ہیں ایک خارجی دنیا ہے جو آپ کا گردوپیش ہے۔ ایک داخلی دنیا ہے جو آپ کا ذہن ہے۔ آپ دونوں دنیاؤں کے حُسن اور بدصورتیوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں اچھی باتیں بھی ہیں اور وہ باتیں بھی ہیں جو آپ کو ناپسند ہیں۔ ان میں سے کسی سے گریز کرنا درست نہیں ہے۔ ترقی پسندی کے صحیح معانی تو یہ ہیں کہ جو بھی اس وقت آپ کے سامنے حقیقت ہے اُس کی اس قسم کی تاویل نہ کیجیے کہ اُس کی اچھی باتیں سامنے آئیں اور بُری باتیں سامنے نہ آئیں، جو حُسن ہے وہ بھی بیان کرنا چاہیے، جو بدصورتی ہے اُسے بھی جامہ اظہار ملنا چاہیے، جو اُمید ہے وہ اُمید بھی رکھنی چاہیے، جو مایوسی ہے اس کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے، جو غم ہے اُسے بھی بیان میں آنا چاہیے اور جو اُداسی ہے اُس کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ زندگی کی ادب میں اوور سمپلی فیکیشن درست نہیں ہے۔ یہ پیچیدہ چیز ہے۔

سعادت سعید: 1857ء سے 1936ء تک کے ادب میں اظہار پانے والے تصورِ انسان سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

فیض: وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے، کسی طبقے کا فرد ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسانی اور طبقاتی صورتِ حال بدلتی ہے ویسے ویسے انسان کا تصور بھی بدلتا ہے۔ 1857ء سے قبل یا تو ہمارے ادب میں صوفیہ کا تصورِ انسان تھا یا پھر اس میں جاگیردار، رئیس یا امیر کا تصور ابھرتا نظر آتا ہے۔ جنگِ آزادی کے بعد آزادی کی تمناؤں سے معمور انسان کی تصویر بھی نظر آئی۔ 1936ء کی تحریک میں مزدور، کسان اور عام آدمی کے تصور کو ابھارا گیا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی ایک خاص قسم کے انسان کا تصور بھرپور انداز میں سامنے آیا۔

سعادت سعید: جدید شاعری کی تحریک، جیسا کہ کہا جاتا ہے، ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر اُبھری۔ آپ راشد، میراجی اور مختار صدیقی کی شاعری کے تصورِ انسان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

فیض: فرق تصورِ انسان کا نہیں ہے۔ ترقی پسندوں نے عوام کی بات کو ادب میں لانے پر زور دیا، داخلیت پسندوں نے ادب کو ذاتی مسائل، شعور اور لاشعور کے معاملات تک وقف رکھا اور کہا کہ ہمارے لیے یہی دنیا ہے باقی دنیا سے ہمارا کیا واسطہ۔ یہ فرق اس تصور کا ہے کہ آیا انسان کی اپنی انا اکائی ہے یا معاشرہ ایک اکائی ہے۔ بہت سی باتیں دونوں میں مشترک بھی تھیں۔ راشد سیاسی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ میراجی قلندر آدمی تھے انھوں نے داخلی مسائل پر توجہ دی۔ جماعتی اور معاشرتی مسائل ترقی پسندوں کے لیے اہم تھے۔

سعادت سعید: نئے شعرا نے راشد اور میراجی کی جدید اردو نظم کی تحریک سے بھی اختلاف کیا۔ ہم آپ کی رائے نئے شاعروں کے بارے میں بھی جاننا چاہیں گے۔

فیض: ہر شاعری کا واسطہ انسان سے ہوتا ہے۔ شعری ناواقفیت اس کے ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ کسی شاعری کی تحریک بھی حالات ہی کی پیداوار ہے۔ ان کے حالات ایسے تھے کہ کوئی اور تجربہ ان کے ذہن سے نکلیں گے تو شاعری پر کاری ضرب لگاتا ہے کہ ان تک بات پہنچی نہیں پہنچی۔ اگر پہنچی تو اس میں کوئی حسن اور تاثیر نظر آئی یا نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ اس شاعری کو کتنے لوگوں نے قبول کیا یا نہیں قبول کیا۔ اس لحاظ سے قبول نہیں کیا گیا۔ سرکاری شاعری ہی ہے یا اس وجہ سے کہ اس شاعری میں کوئی جھوٹ تھا۔ جب تک شعر میں جذبے کی طرح کوئی کیفیت نہ ہو تو بات واضح نہیں ہوتی ہے۔ اگر شاعری میں جان ہے تو وہ اپنے آپ کو منوا لے گی۔ یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر سے تقاضا کیا جائے کہ یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

سجاد سعید: اس حوالے سے نثری نظم کا بھی ذکر چلا ہے۔ آپ اس صنف کے بارے میں کچھ کہنا پسند فرمائیں گے۔

فیض: یہ چیز ہے شاعری اور غیر شاعری کی۔ بنیادی طور پر نثری نظم یہ اصطلاح ہی اپنی تضاد سے بھری ہے۔ نثر کے معانی لکھنے کے ہیں اور نظم کے معانی تنظیم کے ہیں یہ تضاد کیا کرتے ہیں۔

اشفاق احمد: فیض صاحب! یہ اصطلاح جو کہی ہی اصطلاح ہے جیسے وہ مستحق الاشاعت کی اصطلاح ہے۔

فیض: نثری نظم کوئی نئی چیز نہیں۔ 1920ء اور 1930ء کے درمیانی عرصے میں ٹیگور کے ترجمے ہوئے تھے۔ "ہیٹ لکی" وغیرہ کے اردو شاعر اسے نثر میں لکھتے تھے۔ اس قسم کی نثر کو کبھی "ادب لطیف" کبھی "انشائے لطیف" اور کبھی "نثر لطیف" کہا جاتا تھا۔ اس کی ابتدا غالباً نیاز فتح پوری کے "جمالستان" سے ہوئی۔ نثر شیرانی کے "رومان" میں بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں قاضی صاحب نے بھی اس طرز میں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلا پھر یہ اسے نظم کہنے لگے۔

سعادت سعید: مغرب میں تو نثری نظم کو ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ بادلیئر وغیرہ نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔

فیض: مغرب میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے وہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔

طاہر مسعود: ادیبوں کو اس وقت قومی تعمیر کے سلسلے میں جو کردار ادا کرنا چاہیے تھا کیا انھوں نے وہ کردار ادا کیا؟ یا اس ذمہ داری سے پہلوتہی کی؟

فیض: ادیب کا کردار محدود ہوتا ہے۔ ادیب کا کام کوئی عملی قیادت تو ہوتا نہیں ہے وہ تو محض عوام کا ترجمان ہوتا ہے اور عوام کی ذہنی و جذباتی تربیت کرتا ہے۔ ہر زمانے میں اچھے ادیبوں کے علاوہ بہت کم تھا انھوں نے کیا لیکن ہر دور میں اچھے ادیبوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

طاہر مسعود: جس دور کا تذکرہ ہو رہا ہے اس وقت تک نئے شعرا، ادیبوں اور اہل قلم کے اثرات گہرے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادیبوں پر بحیثیت مجموعی قومی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں الجزائر کی جنگ آزادی کے معاملے میں سارتر نے فرانس سے بغاوت کا ایک موقف اختیار کیا یا جیسا کہ آپ نے لورکا اور نیرودا وغیرہ کے نام لیے انھوں نے شاعر ہونے کے ساتھ بڑا موثر سیاسی کردار ادا کیا۔ ایسا کردار ہمارے ادیبوں میں نظر نہیں آتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: کیوں نہیں نظر آتا؟ اس دور میں ہمارے ادیبوں میں صاحب جن کی جس حد تک تھی اس کے مطابق انھوں نے اپنا کردار ادا کیا اور پھر سارتر اور لورکا جتنے بڑے ادیب بھی تو ہمارے ہاں نہیں تھے اور بڑے ادیب روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ بڑے ادیب پیدا کرنے کا کوئی نسخہ ہے نہیں۔ فرانس میں بھی آپ سارتر وغیرہ کا نام لے لیں گے اس سے زیادہ تو وہاں بھی نہیں ملیں گے اور بعض ملکوں میں تو ایک دو بھی نہیں ملے گا۔ یہ تو محض اتفاق ہے۔

طاہر مسعود: مثال کے طور پر یہ دیکھیے کہ ہمارے ملک کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا۔ ایک ہولناک المیہ ہوا لیکن ادبی سطح پر جمود طاری رہا۔ اسے تقسیم سے لے کر ہمارے ادیبوں کے پاس بھی کوئی ایسی طاقت نہیں ہے۔ سبب کیا ہے کہ کوئی بڑا ناول، کوئی ایسا ادب تخلیق نہیں ہوا جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ اقتدار پرستوں کے ضمیر پر بھی تازیانے ہمارے ادیب برسا رہے ہیں۔

فیض: ایسا ادب لکھنے کہیں؟ اگر ہم دیکھیں تو ادب وہاں پیدا ہونا چاہیے جہاں کے رائٹر ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے ادیبوں کے لیے یہ بات کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تجربہ تو مشرقی پاکستان والوں کے لیے تھا۔ البتہ ہمارے ادب میں بھی تخلیق کرنا چاہیے۔

طاہر مسعود: ہمارے مغربی پاکستان کے ادیبوں کے لیے یہ سانحہ اجتماعی اور جذباتی تجربے کی حیثیت نہیں رکھتا تھا؟

فیض: ان کے لیے یہ جذباتی اور ذہنی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اب یہ کہ دور دراز کی بات تھی۔ یہ براہِ راست تجربہ نہیں تھا۔ بلکہ بعض میں یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہاں کے ادیبوں کا تجربہ ہم سے مختلف قوموں کی نسبت براہِ راست تھا۔ یہاں کے ادیبوں کا تجربہ تو ثانوی تھا۔ بنگالی تو ابھی آئے نہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہاں کے افسانہ نگاروں اور لکھنے والوں نے بہت سی کام کی چیزیں لکھی ہیں۔ مثلاً جیسا انتظار حسین نے لکھا۔ لیکن آپ اسے ذہن کے حق میں قرار نہیں دے سکتے۔ شاعری میں مضمون کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ جس مضمون سے ہمارے شاعر کو براہِ راست واسطہ ہو اور جذباتی سطح پر پہنچے۔ دونوں چیزیں یکجا ہوں تب جا کر اچھی شاعری ہوتی ہے۔ تاہم ... شاعری کی تخلیق نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی نہ ... بہت ہے۔

طاہر مسعود: ہمارے لیے ذہنی اور جذباتی تجربہ تو تھا۔ چنانچہ آپ ہی نے اس تجربے کو وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

فیض: ہم نے تو کوشش کی تھی۔ ہمارے یہاں کسی کو براہِ راست تجربہ نہیں تھا۔ یہ ہمارے لیے ایک ذاتی تجربہ ضرور تھا۔ اس سانحے سے جسمانی طور پر جو لوگ گزرے ہیں وہ زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔ ہمارے ہاں یہ ذاتی اور جذباتی واردات ان سے بھی کہیں کم تھی کہ ہمارے ہاں ایک دوسری آفت پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ یہاں جمہوریت پر حملہ ہو گیا تو لوگ اس میں الجھ گئے اور یوں سانحۂ مشرقی پاکستان کی بات دور ہو گئی۔

طاہر مسعود: کہا جاتا ہے کہ پاکستان نے انتشار کے بڑے بڑے سانحے جھیلے اور ادب میں بھی تجربات کیے؟

فیض: تجربات تو ضرور ہوئے ہیں مگر محض تجربہ کرنا کافی نہیں ہے۔ تجربے کی اہمیت تو اسی وقت ہوتی ہے جب تجربہ کامیاب ہو۔ ایک شاعر کا تجربہ جہاں تک محدود ہو اور شاعر کا حال یہ ہے کہ اسے آگے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تجربے کا کمال یہ ہے کہ اس سے نیا آرٹ پیدا ہو۔

طاہر مسعود: ایلیٹ نے کہا ہے کہ روایت کو توڑنے سے بہتر ہے؟

فیض: تکرار سے تو ہر چیز بہتر ہے۔ آپ اقبال کی مثال لیں، ان سے زیادہ تکرار کسی کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ مگر اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔ تکرار کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ کسی پرانی بات کو دہراتے چلے جائیں، دوسری یہ کہ آپ ایک پرانے مضمون کو اس طرح آگے بڑھائیں کہ اس میں حسن پیدا ہو جائے ورنہ تکرار ادبی تنزل ہے۔

طاہر مسعود: مغرب میں بعض ادیب ایسے ہیں جنھوں نے بیک وقت تخلیق اور تنقید سے اپنا رشتہ قائم رکھا۔ مثلاً ایلیٹ نے شاعری بھی

کی اور تنقید بھی کی۔ لارنس نے بھی فکشن اور تنقید میں وسیع سرمایہ چھوڑا۔ ہمارے ہاں فراق اور حسن عسکری اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ آپ نے بھی شاعری کے ساتھ تنقید کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن "میزان" کے بعد آپ نے تنقید پر سنجیدگی سے توجہ کیوں نہ دی۔ اس کی کیا وجہ ہے خصوصاً اس پس منظر میں کہ ہمارے ہاں مدتوں سے سنجیدہ تنقید کی کمیابی کا رونا رویا جا رہا ہے۔

فیض: توجہ دینی چاہیے تھی لیکن نہیں دی۔ بہت سے کام ایسے تھے جن پر توجہ نہیں کی۔ آخر کیا کیا کرتے، شاعری کرتے، صحافت کرتے، مدرسی کرتے یا تنقید لکھتے۔ زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا لیکن ضروری تو نہیں کہ آدمی جو چاہے وہ پورا ہی ہو۔ آپ کی یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں تنقید کم لکھی گئی ہے۔ تنقید لکھنے کے لیے آدمی کو بہت کمیٹڈ ہونا چاہیے۔ ہمارے بے شمار نقاد تخلیقی صلاحیت سے محروم ہیں اور تخلیقی نقاد تو صرف فراق صاحب ہیں۔

طاہر مسعود: حسن عسکری صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟

فیض: عسکری صاحب سمجھدار نقاد تھے۔ اُن میں حساسیت بھی تھی مگر وہ آخری عمر میں اُس طرف گئے جو اُن کا میدان نہیں تھا۔

طاہر مسعود: اُن کی دو کتابیں "ستارہ یا بادبان" اور "انسان اور آدمی" کے بارے میں آپ کے تاثرات؟

فیض: اچھی کتابیں ہیں مگر سوائے چند ایک مضامین کے انھوں نے کوئی مستقل چیز نہیں چھوڑی۔ ویسے عسکری صاحب بہت ذہین آدمی تھے۔ افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے تنقید کا میدان چھوڑ کر فلسفہ کا میدان اختیار کر لیا جو اُن کا اصل میدان نہیں تھا۔

رحمٰن: ایک ممتاز ادیب اور ماہر تعلیم نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ "فیض ہماری ثقافت کی بہترین روایتوں کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے عزائم کا ترجمان ہے اور علامت ہے"۔ آپ کوئی تبصرہ فرمائیں گے؟

فیض: لوگوں کو مبالغہ آرائی کی عادت ہے۔ اپنی روایتوں پر قائم رہنا اور بنا ثقافت اور وجود کی بقا کے لیے بنیادی شرط ہے۔ ہماری ثقافتی روایتوں کے دو وسیع دھارے ہیں۔ پہلا دھارا تو پنجاب، سندھ، بلوچ اور پشتون کے لوک ورثے ہیں اور دوسرا دھارا ہماری کلاسیکل روایتیں ہیں جو اُردو، فارسی اور عربی کے حوالے سے ہیں اور جب تک ہم ان دو دھاروں سے یکساں طور پر استفادہ نہ کریں ہم انھیں شناخت نہیں کروا پائیں گے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو صرف لوک ورثہ سے مستفید ہوئے اور کلاسیکل ورثہ سے ناواقف ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو کلاسیکی ادب پر گہرا شعور رکھتے ہیں لیکن لوک ورثہ سے بالکل لاتعلق ہیں۔ پہلی صورت میں تو وہ شاونزم کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جو محرومیوں کا نتیجہ ہے اور دوسری صورت میں وہ رویہ جو اپنے علاقے کی مقامی روایتوں کو بالکل حقارت سے نظر انداز کیا ہوا ہے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ آزادی کے بعد انگریزی میڈیم سکولوں کی بھرمار ہو گئی اور ہماری دانست میں اپنی ناآشنائی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ایک ایسی نسل پروان چڑھی ہے جو نہ تو اپنی لوک روایتوں کا ادراک رکھتی ہے اور نہ کلاسیکی ثقافتی ورثہ سے واقف ہے اور اس میں سب سے زیادہ بگاڑ ابلاغ عامہ کے ذرائع نے پیدا کیا ہے۔ ریڈیو نے علاقائی زبانوں کے ادب اور موسیقی کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

رحمٰن: اور جب آپ ثقافت کے محاذ پر مصروف کار ہو گئے تو کیا آپ نے جدید رجحانات کے حوالے سے لوک ثقافت پر زور دیا؟

فیض: آخر وہ تمام منصوبے جو لوک کہانیوں، گیتوں، روایتوں کو محفوظ کرتے تھے، کس لیے تھے!

فاروق خالد: موجودہ دور میں بنگالی ادب وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ نئی نسل کے ادیب بنگالی ادب میں مقید ہو کر رہ گئے ہیں؟

فیض: ادیبوں کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر دور میں قد آور ادیب بھی ہوتے ہیں اور غیر پختہ ادیب بھی۔ یہ درست

ہے کہ اس دور میں بالخصوص بدقسمتی سے چند ادیب بھی یہ جرأت پیدا ہو گئے ہیں لیکن ایسے ادیب جلد ہی وقت کے معیار کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمارے ادب کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ دولت کی بیگانگی ہے۔ جس میں ادیبوں کا بھی کچھ قصور نہیں ہے۔ آج کے دور میں جو ادیب اچھے ہیں وہ اپنے آپ کو ہم عصر سمجھیں گے اور آفاقی قدریں ان کی تحریروں میں جھلکیں گے وہ بہت طویل عرصہ تک زندہ رہیں گے۔

فاروق خالد: آپ کے نزدیک ایک ادیب کی بنیادی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

فیض: ایک ادیب کی ذمہ داریاں وہی ہیں جو ایک انسان کی ہیں جو اپنے معاشرے میں باشعور ہے۔ چونکہ چند مخصوص افراد کے ادیب کو بالخصوص نظر رکھنا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے الفاظ لوگوں تک پہنچتے ہیں اس لیے اس کی ذمہ داری زیادہ ہو جاتی ہے اس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کی تحریر نیکی اور پاکیزگی کی طرف مائل کرے۔ انسان دوستی اور خود شناسی کا درس دے۔

فاروق خالد: بعض ادیبوں کی تحریریں بہت تخلیقی ہوتی ہیں لیکن وہ خود ان اوصاف سے محروم ہوتے ہیں۔ کیوں؟

فیض: اس لیے کہ ادیب بھی اسی معاشرے کے افراد ہیں جس طرح معاشرے میں بسنے والے باقی لوگ بدی کی طرف راغب ہوتے ہیں اسی طرح ایک ادیب بھی گمراہی کے راستے کا شکار ہو سکتا ہے۔

فاروق خالد: نئے ادیب اور نئی نسل کو آپ کیا پیغام دیں گے؟

فیض: میری کوئی ایسی بات اتنی اہم نہیں جتنے کہ انسانیت کے تقاضے ہیں۔ وقت کے جو مسائل درپیش ہیں انہیں حل کرنے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر: فیض صاحب! مرزا غالب کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ دیوان غالب جب بھی پڑھیں اس میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں؟ اور اگر ہے تو غالب کی عظمت اور ان کے کلام میں تازگی اور معنویت کا راز کیا ہے؟

فیض: تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوسکتے۔ لیکن بعض خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز بھی حقائق کا وہ سلسلہ ہے جو آج بھی [illegible] ہے۔

ڈاکٹر: آپ ''حقیقت'' کی کیا تعریف کرتے ہیں؟

فیض: میں حقیقت کو ادبی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ کسی سماج کے کسی خاص دور میں انسانیت کا نچوڑ۔ اسے آپ اس دور کی روح کا نام بھی دے سکتے ہیں سماجی احساس بھی کہہ سکتے ہیں اور حقیقت پسندی کے عنوان سے بھی پکار سکتے ہیں۔ اس کو ایک ہی خیال کا نام کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے کہ ایک بڑا مصنف ایک خاص دور کے حقائق اور انسانیت کا مرقع پیش کرتا ہے۔ اسی لیے ان شعرا کے کلام میں جنھوں نے بھرپور انسانی تجربات کی ترجمانی کی ہے کسی بھی عہد میں اپنے تاثر میں کمی نہیں آتی آج بھی وہی تازگی پائی جاتی ہے جو ان کے اپنے زمانے میں تھی۔ اس لیے کہ انسانی تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اور بڑے قدیم شعرا کے تجربات ہمارے دور کے تجربات سے کتنے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ تجربات کیا ہیں؟ اپنے ساتھیوں کی آس اور یاس، غم اور ملاپ، دوستی اور خوشی جسے ہر فرد آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن کیا ان کی شکل میں ہم خود بھی ان تجربات میں شریک و شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ بات غالب کے سلسلے میں ہمارے لیے تو خاص طور پر صحیح ہے۔ اس کی شاعری اس دور کی ترجمان ہے جب نظام کے مادی اور سیاسی انحطاط کے آخری دور کا اختتام ہوا۔ [illegible] صدی عیسوی کے وسط سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اردو شاعری کے مختلف ادوار میں جو تجربات ہوئے اس کی شاعری میں ان کا نچوڑ موجود ہے۔ وہ ان سے لے کر اس نے اپنے زمانے تک اردو کے تمام بڑے شعرا کا جوہر ''اپنا'' تمام غالب نے اسے جذب کر کے اس پر اضافہ بھی کر دیا

ہے اگر آپ اس تمام "مواد" کو ایک فقرے میں ادا کرنا چاہتے ہیں تو اسے جاگیردارانہ تہذیب کا نام دے سکتے ہیں۔

ڈیمن: تو کیا آپ کے خیال میں اس دور کے شعراء میں غالب بھی شامل ہے جو جاگیردارانہ نظام کے بکھرنے اور اس کے انجام کے خواہاں تھے؟

فیض: نہیں یہ نہیں کہا جا سکتا البتہ ان کے ہاں کسی حد تک اس انتشار کا احساس تھا جو اس پورے نظام زندگی کو منتشر کئے ہوئے تھا جس کے وہ عادی تھے۔ لیکن ان کی نظر ان بنیادی سیاسی اسباب پر نہیں تھی جو اس زوال کے ذمہ دار تھے اور نہ ہی وہ کسی متبادل سماجی نظام کے اشارے کو دیکھ سکتے تھے جو اس نظام کی جگہ لے سکتا جس کے وہ عادی تھے۔ ان کے اس نمونے میں تین اہم خصوصیات نظر آتی ہیں:

1) جاگیردارانہ اقدار سے لگاؤ اور محبت جو ان کی نظروں کے سامنے ختم ہو رہی تھیں اور سماجی اقدار کو بدل رہی تھیں۔ اس صورت حال نے ان کے دل میں سوز و گداز اور درد و ملال کا عنصر پیدا کر دیا۔

2) ملال کے خلاف بے اطمینانی، بیگانگی اور عدم اعتبار جس کا مطلب تھا فرار اور بعضوں کے لیے تصوف کی بدحالی۔ اس سے جو فلسفیانہ عناصر پیدا ہوئے وہ یہ ہیں: ناپائیداری دنیا کی، انسانی زندگی کی بے ثباتی کا خیال، جہان دنیا کی بے کاری اور ناپائیداری کی وجہ سے بے کار محض سمجھنا۔

3) اس عہد میں انیسویں صدی کی خصوصیات سب کا حصہ ہے مگر عام طور پر ان کا تعلق جدید اور سائنسی علوم کے تعلق سے مغرب کی جانب پایا جاتا عام نہ تھا۔ غالب اس عہد میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ اس نے زمانے کے تجربات کو سمجھ کر قبول کیا مگر ساتھ ہی اس نے ایک نئے رنگ کا تعارف بھی کروایا۔ اس لیے کہ قیامت کے غم میں ایک نیا دور ختم ہو رہا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

ڈیمن: کیا آپ غالب کے طرز ادا اور طریقہ بیان پر بھی کوئی تبصرہ کرنا پسند کریں گے؟

فیض: میں نے خود ابھی تک جو کچھ کہا ہے وہ غالب کا جذباتی اور تجرباتی پہلو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو اس کی خاص طرز ادا ہے۔ یعنی اس کی شاعری کی تشکیل اور انداز... شاعروں کو کئی وجوہ سے اشاریت اور پیچیدہ طرز ادا اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اول تو یہ اپنے تجربے کو براہ راست اور صاف سیدھے طریقے سے بیان کرنا بعض اوقات سماجی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے تجربوں کے مقابلے میں پرانے طریقوں کے ذریعے اظہار خیال کرنا زیادہ آسان ہے۔ تیسرے یہ کہ شاعر کے لیے حقیقت داخلی اور جذباتی شے ہوتی ہے لیکن غالب کے یہاں اس داخلی اور ذاتی تجربے میں سماجی احساس کا عنصر بھی شامل ہے۔ اسی لیے اس کا کلام محض تفکر اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ غالب کی طرز ادا کا ذکر کرتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے بیدل، غنی اور ناصر علی کی شاعری کو ابہام اور خود فریبی کے پیچ سے آزاد کروایا۔ اس نے استعارے کا نیا استعمال یعنی Transferred Epithet کا رواج دیا (جیسے بہت گہرا درد یا ...)۔ ... یہی شاعری کی وہ خصوصیت یعنی تشبیہ و استعارے سے مضمون آفرینی غالب کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے۔ ان سب کے علاوہ غالب نے شعر و سخن کی تمام روایات سے شاعری کو نجات دلائی۔ اس نے کہا ہے کہ اس نے جو لفظی بازیگری اور زبان ترک کر دی جو شاعروں کے اس ساتھ میں ان کا ردعمل معلوم و معروف ہے۔ اظہار ذات کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طرح اس نے "طاقت تجدید" کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔ ہم شاعروں میں غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے شعر کا مرتبہ بہ حیثیت ایک "مفکر

سرکاری سماجی قانون ساز" کے پیچھے ان لیا۔ حال آں کہ شاعر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ شاعر محض ایک درباری، مصاحب یا عام تماشاگر کی قسم کا ذرا بہتر نمونہ ہے۔

زمن: غالبؔ کے قصائد کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

فیضؔ: اُن کے قصیدے محض روزی پیدا کرنے کے ذریعے تھے۔ اُس کا تعلق اُس کی عظیم شاعری سے نہیں ہے۔

زمن: فیضؔ صاحب! کیا آپ اکثر غالبؔ کا کلام پڑھتے ہیں؟ اور کیا آپ کی اپنی شاعری پر اس کا کوئی اثر پڑا ہے؟

فیضؔ: دیوانِ غالبؔ کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ مَیں اکثر بلکہ بعض حالت میں روزانہ اُس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالبؔ کا متبع ہو گیا۔ مَیں اپنی شاعری میں اُسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔

سوال: پاکستان بننے سے پہلے ہمارے ہاں تھیٹر کی روایت کم تھی، مصوری کی روایت تھی، کلاسیکی موسیقی بہت بڑی روایت کی صورت میں ورثے میں ملی۔ یہ کیا وجہ ہے کہ تھیٹر کو ترقی ہوئی، مصوری کو ترقی ہوئی مگر موسیقی زد پہ منزل ہے اور یہ بھی کہ ہمارے مصور مغربی انداز کی تصویریں بنانے لگے ہیں۔

فیضؔ: میرا خیال ہے کہ آپ لاہور کی وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں تھیٹر کو ترقی ہوئی۔ تھیٹر کو ترقی نہیں ہوئی ہے۔ آج سے کوئی چالیس پینتالیس برس پہلے ہماری طالب علمی کے زمانے میں لاہور میں ایک بہت ترقی یافتہ تھیٹر موجود تھا لیکن جب ٹاکیز شروع ہوئیں تو اُس کا وجود ختم ہو گیا۔ شوقین نوجوان جو آج کل ڈرامے کرتے رہتے ہیں تو اس کی ابتدا بس کوئی پندرہ سترہ سال پہلے ہوئی اور یہ سلسلہ بھی ہم نے ہی شروع کیا تھا۔ اگر آپ اس نقطۂ نگاہ سے ترقی کہہ رہے ہیں تو پھر مَیں اتفاق کروں گا۔

جہاں تک مصوری کا تعلق ہے آپ فرما رہے ہیں کہ ہماری قدیم مصوری کو فروغ نہیں ہوا، مغربی مصوری کو ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہماری قدیم طرز کی مصوری کے قدر دان ایک خاص طرح کے لوگ تھے اور اُن کی وجہ سے وہی تصویریں بنائی جاتی تھیں یعنی منی ایچر پینٹنگز۔ اُن میں دو طرح کے مضامین ہوتے تھے۔ یا تو مرقعے ہوتے یا پورٹریٹ یعنی شبیہ۔ مذہبی مضامین یا افسانوی مضامین کی تصویر کشی کی جاتی تھی یا نوابوں وغیرہ کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ جب خاص قسم کے قدردان کم ہو گئے یا نوابوں کا طبقہ ختم ہو گیا تو مصوری کی یہ صورت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد لازم تھا کہ کوئی نئی صورت پیدا ہو۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے فنِ مصوری کو ترقی نہیں ہوئی، اس قدر کہ نئی صورت کی خاطر ہمارے نوجوانوں کو مغرب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اگر ہم مصوری کی کوئی اپنی مخصوص روش اختیار نہیں کریں گے تو ہم مغرب ہی کی نقل کرتے رہیں گے۔

رہا موسیقی کا سوال تو بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک خاص طرح کا تعصب پیدا ہوا جس کا تعلق موسیقی سے نہیں تھا بلکہ اُس طبقے سے تھا یا موسیقی کی اُس صورت سے تھا جو خاندانِ مغلیہ کے زوال کے وقت برصغیر میں پیدا ہوئی۔ بالکل آخری دور میں یہ فن، چند ایک بڑے اساتذہ کو چھوڑ کر ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں چلا گیا جو معاشرتی اعتبار سے کوئی موقر طبقہ نہیں تھا۔ اس لیے موسیقی سنجیدہ لوگوں کے لیے زیادہ پسندیدہ نہ رہی۔ اس کے بعد جب انگریز آئے تو انھوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ چناں چہ موسیقی نام ٹھہرا مجرے کا، گھٹیا قسم کی عیاشی کا، دل لگی کا۔ اس کے بارے میں ہمارا نظریہ صحیح ہو جانا چاہیے تھا۔ ہمیں چاہیے تھا کہ ہم یہ سوچیں اور سمجھیں کہ موسیقی ایک نہایت سنجیدہ، شائستہ اور موقر فن ہے۔ اگر اس فن کو بعض پیشہ ور لوگوں نے اور ایسے لوگوں نے جو اس کی خوبی و نفاست سے واقف نہیں تھے بدنام کیا ہے تو طویلے کی بلا بندر کے سر نہیں جانی چاہیے۔

سوال: آپ نے فنونِ جمیلہ کا ذکر کیا مگر ان کے معیار کے بارے میں کچھ نہیں کہا کہ ہماری فلم، ٹیلی ویژن، شاعری اور ادب کا معیار

بلند ہو رہا ہے یا نہیں؟

فیض: معیار کی بابت کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ اگر ایک اچھا شاعر پیدا ہو رہا ہے تو دس خراب شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ آپ کس طرح فیصلہ کریں گے کہ ترقی ہوئی یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ ایک اچھا شاعر پیدا کر لیں تو اس سے تلافی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مصوری ہے دو اچھے مصور پیدا ہوئے تو بیس گھٹیا۔ مجموعی طور سے دیکھیں تو انحطاط بھی ہوا ہے اور ترقی بھی۔ کلاسیکی موسیقی کو لے لیجیے، ہمارے پانچ دس اچھے استاد رخصت ہو گئے اور اُن کی جگہ لینے والے پیدا نہیں ہوئے جو ایک لحاظ سے تنزل ہے لیکن اس کے مقابلے میں یہ دیکھیے کہ آج سے تیس سال پہلے سننے اور سمجھنے والوں کی جو تعداد تھی آج اُس سے بہت زیادہ ہے اور اس اعتبار سے ترقی ہوئی ہے۔ سامعین میں ترقی ہوئی اور موسیقاروں میں کمی۔

سوال: کیا ہم پاکستانی تہذیب کو اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے؟

فیض: اسلامی کلچر میں کچھ تو عقائد ایسے ہیں جن کی نوعیت بامعنی ہے اور کچھ اُن کی ظاہری صورتیں ہیں کہ تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کے مطابق قومی ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ الگ الگ ہیں، بل کہ یہ دونوں اجزا مل کے قومی تہذیب کہلاتے ہیں۔ چناں چہ پاکستانی تہذیب تو پاکستان تک محدود ہے اور اسلام قومیت پر محدود نہیں، کسی ایک ملک یا ایک قوم پر محدود نہیں بل کہ عالم گیر ہے، اور پاکستانی تہذیب صرف پاکستان تک محدود ہے، چناں چہ جو پاکستانی تہذیب ہوگی وہ اسلامی تہذیب ہوگی، غیر اسلامی نہیں ہوگی۔ بل کہ آپ اس کو پاکستانی اسلامی تہذیب کہہ لیجیے۔ آپ صرف اسلامی تہذیب اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ آپ کا اجارہ اسلام پر نہیں ہے۔ اس پر دیگر اسلامی ممالک کا بھی حق ہے۔ اس وقت جو میں نے تہذیب کی عام تعریف کی ہے، میں چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی سوال کیا جائے۔

سوال: دینِ اسلام عالم گیر حقیقت ہے اور قومیت کا قائل نہیں ہے اس لیے اگر ہر اسلامی ملک کی تہذیب اپنے جغرافیائی حالات کے تحت پیدا ہوتی ہے اور وہ تہذیب اسلامی نہیں ہو سکتی تو اس کا مطلب ہے کہ اسلامی تہذیب نام کی کوئی تہذیب موجود نہیں ہے۔

فیض: اسلام چوں کہ عالم گیر مذہب ہے اس لیے ہر مسلمان قوم کا کلچر اسلامی کلچر ہے۔ ہر مسلمان قوم کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہر اسلامی ملک کی ایک قومی تہذیب بھی ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مثلاً ایران ایک مسلمان ملک ہے، اس لیے ایرانی تہذیب اسلامی بھی ہے اور ایرانی بھی۔ انڈونیشیا کی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہے اور انڈونیشیائی بھی۔ اسی طریقے سے پاکستانی تہذیب اسلامی تہذیب بھی ہوگی اور پاکستانی تہذیب بھی۔ لیکن آپ کسی قوم کی تہذیب کو اس طریقے سے اسلامی نہیں کہہ سکتے کہ وہ ساری دنیا کے اسلام کی تہذیب ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلامی تہذیب کوئی چیز نہیں بل کہ یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر اسلامی ملک کی تہذیب اسلامی ہے۔

سوال: کیا اسلام کسی تہذیب پر اثر انداز نہیں ہوتا؟

فیض: یہ میں نے کب کہا ہے کہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ تاریخی لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عرب کے خطے سے نکل کر جہاں بھی پہنچا اس نے اسلامی تہذیب کو جامعیت سے جنم دیا۔ میں نے تہذیب کا جو پہلا حصہ مقرر کیا یعنی باطنی حصہ اُس میں مذہب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ چناں چہ یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ دینِ اسلام کا قومی تہذیبوں پر اثر نہیں ہوا۔ جہاں بھی ہمارا دین پہنچا ہے اس نے وہاں کے معاشرے میں انقلاب پیدا کیا ہے، اور اس انقلاب کی وجہ سے مختلف اسلامی ممالک کی قومی تہذیبوں میں ایک نہایت بنیادی فرق پیدا ہوا۔

سوال: اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ کیا نظریاتی حدود میں رہ کر ثقافت کو پہنچنے میں شعر کامیاب ہو سکتے ہیں؟

فیض: میں نے ابھی یہی عرض کیا ہے کہ اسلام ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جس کا کسی خاص یا ایک قوم کے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ اس لیے آپ اس کو کسی قومی حدود میں مقید نہیں کر سکتے۔ جتنے مسلمان ہیں وہ ان قوموں کے اپنے وطن میں اسلام کے علاوہ ان کی اپنی ثقافتی روایات بھی ہیں۔ جیسے اس کے اعتبار سے وہ سب بھی غور کرتا ہے جو تہذیب کے اندر ہی ایک گروہ کا ہے جس کے بارے میں ہم نے اس وقت گفتگو کی۔

سوال: کیا یہ صحیح نہیں کہ ہم اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہیں؟

فیض: جس ملک میں اسلام پہنچا اسلام کی وجہ سے وہاں ایک باتیں وہیں تک محدود رہیں بہ مطابق......

سوال: اگر ہم اپنی تہذیب کو پاکستانی تہذیب کہیں تو کیا یہ اسلام سے تضاد کا باعث نہیں ہوگا؟

فیض: کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسلام کے ساتھ کوئی قومی تہذیب متصادم نہیں ہے جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ دینی عقائد آپ کے عقائد اور اخلاق اور ایک حد تک آپ کے آداب کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی زبان، آپ کا لباس اور رہن سہن کے طریقے کیسے ہوں گے اور خاص طور پر یہ اسلام کے حلال و حرام کے کسی تصور کی وضاحت نہیں کرتا کہ آپ دال کھائیں یا مرغی کھائیں یا کس قسم کے ظروف استعمال کریں یا آپ کے ادب کی کیا صورت ہوگی؟ یا یہ کہ آپ کی تعمیر کی کیا صورت ہوگی۔ تو میں نے جو تہذیب کی تعریف کی تھی اس میں عرض کیا تھا کہ عقائد کے علاوہ اور علاوہ ان اخلاق کے جو براہ راست دین سے متعلق ہیں، زندگی کے مختلف روز مرہ کے امور ہوتے ہیں اور وہ روز مرہ کے حالات سے متعلق ہوتے ہیں جو تاریخی اور جغرافیائی حالات کے مطابق کسی اور طریقے سے متعین نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ عام مغالطہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو قومی تہذیب بنایا جا سکتا ہے یا اس میں ضم کیا جا سکتا۔

سوالات: (1) قیام پاکستان کی تحریک کی کامیابی سے پہلے کے لیے اسلامی تہذیب کو بچانے کی کوشش کی گئی اور اسی پر پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ کیا اس بات میں حقیقت نہیں ہے؟ "پاکستانی تہذیب" کا قائل کون ہے؟

(2)

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است

کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

تہذیب کو اس رنگ میں پیش کرنے کی جس میں علامہ اقبال نے پیش کیا ہے؟

فیض: میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اسلام، اسلامی تہذیب اور قومی تہذیب میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہر قومی تہذیب اسلامی تہذیب ہے۔ بشرطیکہ اس کے اخلاق و عقائد وہی ہوں جن کی تعلیم اسلام کرتا ہے۔ چنانچہ جب سے اسلام پیدا ہوا ہے۔ ہر مسلمان ملک کا ایران، توران، سوڈان اور مصر وغیرہ سارے ملکوں کی تہذیب ان کی تہذیب ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب کے علاوہ ہر ملک کی اپنی تہذیب بھی ہے ان کی قومی اور اسلامی تہذیب کے میل سے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے اس کو ہم مجموعی طور پر ان کی تہذیب سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح پاکستانی تہذیب اپنے حصے کی ثقافت، رسم و رواج کی بنا پر ہے۔ یہ تمدن اور مقامی اجزا کو شامل ہے۔ اس کے بعد اگر آپ اپنے عقائد اور اپنے اخلاق اسلامی رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان باقی اجزا کو آپ قومی تہذیب نہ سمجھیں یا ان کو قومی تہذیب قرار دیں اور اس طریقے سے جو پاکستانی تہذیب بنے گی موجود ہے وہ پاکستانی بھی ہے اور اسلامی بھی ہے اگر ہم اپنی قومیت کو مانتے ہیں (اور اگر اس سے انکار ہے تو دوسری بات ہے۔) تو

ورنہ ہماری تہذیب کے دو عناصر ہوں گے: ایک اسلام اور ایک پاکستانیت۔ میں جس چیز کی وضاحت کر رہا تھا وہ پاکستانیت کا منفرد تھا اس لیے کہ اسلام کے بارے میں تو کسی بحث کی ضرورت ہے اور نہ ہی وضاحت کی۔ وضاحت جس چیز کے کرنے کی تھی وہ اقبال اور مقامی خصوصیت ہیں کہ پاکستانیت سے کیا مراد ہے۔ جب علامہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ [illegible] کہ یہ دور [illegible] ابھرتا اور اس لیے وطنیت کی کئی بحث تجزیہ کرنی ضروری ہے اس کی مراد یہ تھی کہ مغربی اقوام جیسے اسلامی ممالک اپنی تہذیب سے کٹ کر بیگانہ ہو کر اپنی تہذیب کو منقسم کر دیں یا سب کے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ جو ہمارے علاقے اخلاق اور دستور ہیں ان میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہیں اور ان کا فیصلہ یہ ہے مسلم اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اقبال کی مراد یہ نہیں تھی کہ تمام علاقائی عرب ہو جائیں یا ترک ہو جائیں۔ یہ اتحاد دینی و ملی اتحاد تھا۔ یہ عجب بات ہے کہ ایک قوم جدا ہو کی تقسیم نہیں کرتے۔ یوں کہ اگر آپ اس کی کوئی تاریخ تلاش کریں تو [illegible] کئی قسم کے جھگڑے پیدا ہوں گے جیسے کہ پہلے زمانے میں عربوں اور ترکوں میں پیدا ہوئے۔ جب تمام عرب ملکوں میں اسلامی جذبہ کا غلبہ رہا اس وقت تمام عالم اسلام نے انھیں مانا لیکن اس کے بعد جیسے کہ آپ جانتے ہیں ترکوں نے بغاوت کی، کئی علاقوں نے بغاوت کی کیوں کہ کوئی قوم کبھی اپنے قومی تشخص کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب کریں گے یا تسلط قائم کریں گے تو بجائے اس کے کہ اس سے اتحاد پیدا ہو اس سے انتشار و افتراق پیدا ہوگا۔ اتحاد اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کو اپنے طور پر اپنی تہذیب اپنے مزاج اور دستور کے مطابق بسر کرنے کی آزادی ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ جو چیزیں ہیں اور [illegible] دوسرے ممالک کے ساتھ ہیں ان رشتوں کو استوار کرنے کے لیے ان میں اتحاد کریں۔

سوال: مختلف ثقافتی مظاہر جو آج کل وقتاً فوقتاً جاری ہیں، ہماری اسلامی تہذیب کا حصہ ہیں؟

فیض: میں سمجھتا ہوں کہ فن ہمیشہ ہی ہوتا ہے، دنیا بھی اور ہر ملک کی بھی [illegible] جو اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ایسے فنون بھی ہیں جو کہ اسلامی تہذیب یا دینی تہذیب کے مطابق ہیں۔ [illegible] ان کا تعلق اسلام سے صرف تصادم ہے۔ مثلاً موسیقی کو لے لیجیے، اسلامی تاریخ کے ہر دور میں چاہے وہ اموی یا عباسی ہوں سبھی موسیقی کے سرپرست ملتے ہیں۔ اکثر مغل اور خلیفہ المعتصم باللہ اور ایسے کئی بڑے بڑے نام ہیں جو اسلامی روایت کا حصہ ہیں۔ لیکن اس زمانے میں گانا اور رقص، موسیقار بھی ہوں گے ان کا نام آج ہم نہیں جانتے۔ جہاں تک ہماری تہذیب کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں جو فن پاکیزہ، شائستہ اور بلند اخلاق کی طرف ترغیب دینے والا ہے وہ اسلامی ہے۔ جو فن فحش ہے اور جس سے لوگوں کا اخلاق بگڑتا ہے، وہ اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔

سوال: اسلام کو دائمی دین تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو تمام زمانوں کے لیے ایک ہی نظام نہیں ہے، اس کی تبدیلی لازم ہے تو یہ بات سب الہامی مذاہب کے لیے ہے تو پھر اسلام کی خصوصیت کیا ہوئی؟

فیض: یہ سوال ایسا ہے کہ کسی عالم دین سے کرنا چاہیے کیونکہ میں اس کا جواب دینے کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن یہ ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ ہر مذہب میں چند بنیادی اصول دائمی ہوتے ہیں اور ان اصولوں کا اطلاق ہر زمانے کے حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی حالات بدلتے رہے۔ لیکن دین تو تبدیل نہیں ہوا۔ دین وہی رہا۔ دین کے احکامات و تعلیمات بھی وہی رہے۔ لیکن حالات کے مطابق نئے مسائل پیدا ہوئے۔ ان مسائل سے نپٹنے کے لیے تاویل کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی اصولوں کے [illegible] کی ضرورت ہے۔ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے مختلف اصولوں کے اطلاق

مختلف طریقوں سے ملتے رہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب اخلاقی زوال کا باعث ہے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستانی معاشرہ مغربی تہذیب کو اپنانے کے لیے تیزی سے کام کر رہا ہے تو آپ کے نزدیک اسلامی تہذیب کا کیا انجام ہوگا؟

فیض: اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں تو مغربی تہذیب کے دو حصے ہیں: ایک علم و فن اور دوسرے وہاں کا معاشرہ اور معاشرے کے اخلاق۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس وقت جو مغربی یورپ ہے فرانس، انگلستان اور جرمنی، ان ملکوں کے اخلاقی مسائل [illegible] ہے اور وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں [illegible] اخلاقی [illegible] ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے علم میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔ ان کے ہاں سائنس میں ترقی ہو رہی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ [illegible] مغربی تہذیب [illegible] کی کوئی ضرورت نہیں ہے [illegible] اپنی تہذیب [illegible] مغربی تہذیب کے [illegible] وہاں کی سائنس ہے، [illegible] جو اپنی چیزیں ہم اپنا سکتے ہیں۔ اس لیے [illegible] ہے۔ سائنس کسی ایک قوم کی [illegible] نہیں ہے۔ اسی طرح [illegible] ہم کو مغربی تہذیب [illegible] کی ضرورت [illegible] ہے۔ اس کے لیے [illegible] بھی کوئی بات لے کر [illegible] اسلامی تہذیب کا انجام اچھا ہوگا۔

سوال: اشتراکی نظام میں [illegible] اسلامی نظام میں [illegible] کیا طالب علموں کے [illegible]؟

فیض: [illegible] آپ کا [illegible] لیکن پہلے [illegible] کرنا [illegible] اس بات [illegible] کہ مسلمان ملک [illegible] مختلف قسم کے نظام [illegible] ہیں۔ مصر ہے، شام ہے، سعودی عرب ہے، پاکستان ہے، [illegible] ہے۔ ان میں سے آپ کس کو اسلامی نظام کہتے ہیں؟ [illegible] آپ کے سامنے کوئی [illegible] موجود [illegible] جب [illegible] ہے [illegible] آپ مجھے بتائیے کہ اس وقت کون سا اسلامی ملک ہے جس کی [illegible] اس ملک کا نظام [illegible] اس وقت [illegible] زمانے میں [illegible] اسلامی [illegible] اسلامی نظام [illegible] اس وقت جو اسلامی [illegible] ہیں ان میں [illegible] آپ سے [illegible] ہم نے [illegible]۔

سوال: [illegible] پاکستان کی [illegible]؟

فیض: [illegible] آپ نے [illegible] پوچھنے [illegible] تہذیب کے

ایسے نہیں ہوتا کہ دو باتیں۔ چین میں جو ثقافتی انقلاب آیا ہے ظاہری طور پر وہ وہاں کے حالات کے مطابق کامیاب ہے۔ ہر ملک کے اپنے حالات ہوتے ہیں اور انھیں حالات کے مطابق اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ ہم جو بھی نسخہ تجویز کریں وہ ہمارے حالات کے مطابق اور ہمارے فکر کے مطابق ہو۔ اسی قسم کا حل ہمارے لیے کامیاب بھی ہوگا اور مفید بھی۔ جو چیزیں دوسروں نے کی ہیں، اُن میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے کام آسکتی ہیں ہم اُن سے سبق سیکھ سکتے ہیں، اُن کو اپنا بھی سکتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہم اپنی طرف سے اپنے نقطۂ نظر سے اور اپنے روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اخذ کرسکتے ہیں۔

طاہر: کیا ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم نہیں؟ اس مسئلے کو نظر انداز کرکے کلچر کے مسئلے پر زور دینا کیا رجعت پسند لوگوں کے مخصوص مفاد کو تحفظ دینے کے مترادف نہیں؟

فیض: کلچر کا مسئلہ بنیادی طور پر ایسا ہے جیسے باقی معاملات ہیں، یہ بھی دیگر مسائل کا ایک حصہ ہے۔ اس کو معاشرے کے باقی ڈھانچے سے الگ کرکے سوچنا غلط بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میدان میں اس وقت جو بھی کام ممکن ہو وہ کرنا بھی ضروری ہے یعنی کہ کوئی یہ کام معاشی کام سے وابستہ ہے۔ بعض عناصر تو چاہتے ہیں کہ اس کلچر کا سوال یہاں پیدا ہی نہ ہو کیوں کہ اس سے کئی اور مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کلچر بھی تو زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے۔ جو لوگ نہیں چاہتے کہ زندگی میں انقلاب آئے وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کی بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اس مسئلے کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو پہلے ہی طے ہو جانا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مختلف لوگ اپنے اپنے طریقے سے اس کی تعبیر کرتے ہیں۔

تبسم: کیا کلچر اور معاشی بہبود کے مسئلے کو ایک ہی سطح پر رکھا جاسکتا ہے؟

فیض: نہیں، ایک سطح پر نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ معاشی انصاف کی اہمیت زیادہ ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ معاشی انقلاب اور ذہنی انقلاب دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ذہنی انقلاب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ مادی تبدیلی ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب تک معاشی اور معاشرتی مسئلے طے نہ ہوں، باقی مسائل طے نہیں ہوسکتے۔ لیکن یہی وقت ہے کہ موجودہ حالات میں ان امکانات کو استعمال میں لانا بھی لازمی ہے جس کی وجہ سے وہ ذہنی فضا ہموار ہو سکتی ہے جو معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے میں مفید ثابت ہو۔

تبسم: ہمارے یہاں کلچر کے موضوع پر بہت سی بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ حضرات ہمارے کلچر کی جڑیں وادیٔ سندھ تک لے جاتے ہیں تو کچھ ایران و عرب میں۔ اس مسئلے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

فیض: کلچر تو بہت سی چیزوں کا مرکب ہوتا ہے۔ کلچر کا ہر جز شروع سے موجود رہے۔ کلچر کی حد ایسے مقرر نہیں کی جاسکتی جیسے کسی علاقے کی مقرر کرتے ہیں۔ کلچر اور ثقافت مختلف راستوں سے داخل ہوتے ہیں اور کبھی اور نکل جاتے ہیں جو چیزیں کسی معاشرے میں جذب ہو جاتی ہیں وہ اس کا حصہ بن جاتی ہیں جو چیزیں مشترک ہو جاتی ہیں وہ کچھ نمایاں ہو جاتی ہیں۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں ہمارا قومی کلچر ہوتا ہے؟ یا صرف علاقائی کلچر ہی کلچر ہے؟

فیض: کلچر کے مسئلے کو بے حد الجھا دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک ملک بنا اس کا نام پاکستان ہے۔ پاکستانی جس طریقے سے رہتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہیں، زندگی کے مختلف امور سے جو رشتہ استوار کرتے ہیں وہ ان سب کا مطلب یہاں کا کلچر ہے۔ اس کی مختلف شکلیں اس کے مختلف علاقوں میں بہت سے علاقائی کلچر ہوتے ہیں لیکن بنیادی فرق نہیں ہے اور یہی ہر ملک میں ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ مختلف تہذیبی اثرات کی ہے، یہاں مختلف علاقوں سے مختلف لوگ آئے مثلاً آریا، یونانی، ترک، افغان وغیرہ۔ اس لیے یہاں مختلف تہذیبی اثرات پڑے۔ ان کی جو چیز جذب ہو گئی وہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ جو چیز کسی وجہ سے جذب نہیں ہوئی وہ یہاں کے کلچر کا حصہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے ظاہر ہے جو اثرات اسلامی عقائد اور روایات کی وجہ سے یہاں پہنچے ہیں انھیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جو دوسرے مذاہب سے مختلف ہیں ہمارے ہاں بھی ہیں جو مشترک نہیں ہیں ان ہی سے کلچر کی اصل بنیاد ہیں۔ جہاں تک آزادی کو حاصل ہوئے تقریباً 27 سال گزرے ہیں اور تقریباً آدھی صدی بیرونی حکمرانوں کی غلامی میں گزری ہے اس لیے ایک مخلوط اور مخصوص قسم کی طرزِ زندگی پیدا نہیں ہوئی۔ کلچر کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ آپ بیٹھ کر ہم ملا جلا کر کہیں کہ یہ کلچر ہے۔ کلچر کوئی جامد چیز بھی نہیں ہے۔ کلچر وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ آزادی کے بعد بھی مخصوص حالات پیدا ہوئے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو ظہور میں آرہی ہیں ختم ہو جائیں گی اور بہت سی نئی چیزیں جو ابھی زیرِ ظہور ہیں اور آپ انھیں خالص پاکستانی کہہ سکیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف اقسام کی معاشی اور تہذیبی سطحوں کے لوگ ہیں جیسے کہ اقدار مختلف ہوتے ہیں چناں چہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں مختلف کلچر ہیں۔ اونچے طبقے کا کلچر الگ ہے، نچلے طبقے کا الگ، امیر اور طرح رہتے ہیں اور غریب اور طرح۔ جب معاشرے کی صورت بدلے گی تو کلچر کی صورت بھی بدلے گی۔

سوال: آپ نے فرمایا ہے کہ ہمیں وطن کے کلچر کو فروغ دینا چاہیے۔ وطن کے کلچر میں ایسے عناصر شامل ہو گئے ہیں جن کو بیرونی کہا جاتا ہے اور ان کا تعلق سرمایہ دارانہ نظام سے ہے۔ یہ چیزیں ہیں انھیں خاص طور پر اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ مغربی ملکوں کے لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ یہ عنصر ناپسندیدہ ہے کیا اس بیرونی کلچر کے اثر کو روکا جا سکتا ہے؟

فیض: مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے اور آپ نے جو بات کہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بیرونی اثرات کا تجزیہ کیسے کیا جا رہا ہے؟ اس سے ہوتا یہ ہے کہ ہم نے اپنی ثقافت اور فن کو کوئی مقام نہیں دیا۔ اگر ہم نے پہلے ہی کہا ہوتا کہ یہ ہمارا فن ہے، یہ ہماری ثقافت ہے اور اسے ہم نے مؤثر طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہوتا تو لازمی طور پر ان بیرونی اثرات کا زور کم ہو جاتا۔ اگر آپ سوچتے ہیں کہ یہ جو خلا ہے جو دراصل ایک قسم کا خلا ہے اس طرح کا خلا ہے اس کو بھر دیا جائے تو ہم کوئی متبادل صورت پیدا کریں۔

سوال: کلچر کسی قوم کا روپ ہوتا ہے اور ایک مسلسل عمل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اسی طرح ثقافت بنتی جاتی ہے۔ کلچر کو فروغ دینا مجھے ایک متضاد بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے ابھی کوئی ثقافت تخلیق ہی نہیں کی اور ہم نے ابھی تک کوئی چیز دریافت کر لی ہے۔ کیا آپ کے نزدیک یہ کہنا درست ہے کہ ہم اپنے کلچر کو فروغ دیں یا یہ کہ جو کلچر ہمارا تھا اس کی ہم کسی طرح نشاندہی کریں اور کہیں کہ اس کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر فروغ دینے سے یہی مطلب ہے تو میرا سوال بے کار ہے اور اگر فروغ دینے سے یہ مطلب ہے کہ ہم شعوری کوشش کریں اور کوئی کلچر اپنا بنائیں تو یہ بات مجھے کچھ غلط لگتی ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

فیض: میں نے کلچر کے بارے جو بیان دیا تھا وہ یہ تھا کہ آپ بہت سے عناصر یا اثرات کہتے ہیں۔ یہ ایک چیز ہے جسے ہم فروغ دے سکتے ہیں۔ دوسرا اثر زندگی کا ہے جو نئی چیزیں پیدا کرتا ہے، اگر اسے فروغ دیا جائے تو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو عناصر ہیں ان میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کلچر کا ایک ضروری حصہ ہے اسے روکنا چاہیے جو زندگی کو روکتا ہے۔ فروغ کے لیے یہ بھی ضروری ہے

وضع کرنا پڑیں گی اور موجودہ صورتوں میں ترمیم بھی کرنا پڑے گی۔ ممکن ہے بعض پرانی صورتیں دوبارہ رائج بھی کرنی پڑیں۔
کلچر کا دوسرا حصہ وہ ہے جسے آپ رویّہ کہتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں طرزِ زندگی، جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ طرز یا رویّہ تو معاشرے کی پوری اجتماعی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جیسے جیسے معاشرے کی زندگی بدلے گی ویسے ویسے اس کی صورت بھی بدلے گی۔ اس کو آپ بدلنا چاہیں تو آپ کو معاشرے کی صورت بدلنی ہوگی۔ آپ کسی اور طریقے سے تبدیلی نہیں لا سکتے اور ترمیم یا تنسیخ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہمیں اپنے کلچر کو فروغ دینا ہے تو اس کے لیے تو آپ کو اپنے معاشرے کو فروغ دینا ہوگا۔ معاشرے میں جو خرابیاں ہیں اُنھیں دور کیجیے اس کے بعد وہ پریشان خیالی جو کلچر کے تعلق سے ہے خود بخود دور ہو جائے گی۔ البتہ فنون کا مسئلہ مختلف ہے۔ اسے آپ شعوری طور پر بھی فروغ دے سکتے ہیں اور اس کی صورتیں تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔

سوال: ہمارے ہاں تہذیب اور ثقافت کو کلچر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کے ایک مضمون کا عنوان بھی ایسا ہی تھا اور آج کا موضوع بھی ایسا ہی ہے۔ یہ کہاں تک ٹھیک ہے؟

فیض: میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب اور کلچر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ تہذیب کلچر کی ظاہری صورت ہے۔ زندگی کا روزمرہ، مختلف صورتوں میں اس کا اظہار، جیسے فنونِ لطیفہ، مختلف علوم وغیرہ تو ان سب کی متشکل صورت کو میں تہذیب کہتا اور سمجھتا ہوں۔ میں تہذیب کو کلچر ہی کے معنوں میں استعمال کرتا ہوں کیوں کہ دونوں میں مجھے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ کلچر کو اگر طرزِ زندگی کے معنوں میں استعمال کیا جائے تو تمدن کہنا چاہیے، لیکن یہ تو محض الفاظ کی بحث ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اگر ہم کلچر اور تہذیب کو الگ کرنا چاہیں تو سمجھ لیجیے کلچر طرزِ زندگی کا نام ہے اور اس کی جو متشکل صورتیں ہیں اُن کو ہم تہذیب کہیں گے۔

سوال: آپ نے حکومت کی یہ کوتاہی بیان کی ہے کہ اس نے ثقافت کو وہ درجہ نہیں دیا جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر نصاب میں ثقافت پر کوئی مضمون شامل نہیں یا ثقافت کی وزارت الگ سے نہیں یا افسر ثقافت مقرر نہیں کیے جاتے۔ آپ کے خیال میں حکومت کو کہاں تک مداخلت کرنی چاہیے، کیوں کہ حکومت تو بالآخر کسی نہ کسی سیاسی جماعت ہی کی ہوتی ہے اور حکومتیں بدلتی رہتی ہیں؟

فیض: اگر آپ تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ جب یورپ میں جاگیرداری نظام کو زوال ہوا تو جو لوگ کلچر کے مربی اور سرپرست تھے ان کا بھی زوال ہوا۔ اُن کی جگہ ایک اور طبقے نے لی جس کو سرمایہ دار طبقہ کہتے ہیں۔ سرمایہ داروں نے فن کی قدردانی شروع کی اور اسی لیے یورپ کی حکومتوں کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک سے ایک صاحبِ ثروت پیدا ہوا۔ اُن لوگوں نے تصویر بنائے، گیلریاں بنوائیں، آرٹسٹوں کے مال کو مالِ تجارت بنا دیا اور بیچنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ جاگیرداری کے آرٹ کی جگہ ایک نیا آرٹ پیدا ہوا اور اس نئے آرٹ کے ساتھ نئے قدردان بھی۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کا پرانا طبقہ یعنی جاگیردار، قدردان اور مربی وہ جب ختم ہوئے تو اُن کی جگہ سرمایہ دار پیدا نہیں ہوئے، انگریز پیدا ہوئے، میرا مطلب ہے انگریزوں کی حکمرانی سے۔ انگریزوں نے کہا کہ یہ تمھارا آرٹ کلچر سب بکواس ہے۔ سارا آرٹ اور کلچر تو ہمارے پاس ہے۔ اس لیے اپنا سب کچھ بھول جاؤ اور ہمارا کلچر سیکھو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوڈیڑھ سو سال میں ہمارے پاس جو کچھ تھا ضائع ہو گیا یا بالکل تباہ۔ جب پاکستان بنا ہم انگریز کی حکمرانی سے آزاد ہوئے تو ایسا کوئی طبقہ ہمارے پاس موجود نہیں تھا۔ یہ فرض یہ ذمہ داری لازماً حکومتوں کی ہوگی۔ مختلف حکومتیں ان ذمہ داریوں سے کس حد تک عہدہ برآ ہوئیں اس کا فیصلہ آپ خود کریں لیکن

موجودہ صورت حال میں جب تک ہمارے عوام کے پاس آرٹ اور کلچر کو فروغ دینے اور اسے پرورش دینے کے ذرائع اور وسائل نہیں ہیں اس وقت تک لازماً انہیں حکومت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا اگر کوئی چارۂ کار ہے تو مجھے بتایئے؟

سوال: عوامی سطح پر بھی کام ہو سکتا ہے۔

فیض: عوامی سطح پر ایک خاص حد تک ہی کام ہو سکتا ہے۔ اگر آپ ڈراما کرنا چاہیں تو تھیٹر کی ضرورت ہو گی۔ تھیٹر بنانے کے لیے پیسے کون دے گا؟ اگر عوام پیسے دینے کو تیار ہیں تو ظاہر ہے حکومت کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن آپ، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ابھی تک عوام میں کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے جو اس کی کفالت کر سکے، یہ ایک عبوری دور ہے۔ تھوڑے عرصے بعد جب وسائل مہیا ہو جائیں گے تو عوام میں خود بخود ایسا طبقہ پیدا ہو جائے گا جو حکومت کی سرپرستی یا کفالت کے بغیر ایسے کام کر سکے۔ ترقی یافتہ ممالک کو دیکھیے، انگلستان، وہاں تھیٹر بھی موجود ہے اور پبلک بھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے برٹش آرٹ کونسل کا بجٹ کوئی دو کروڑ پاؤنڈ ہے، اس کے علاوہ انہیں حکومت سے امداد لینی پڑتی ہے۔ ایسے ثقافتی اداروں کو جو خود کفیل نہیں ہوتے حکومت سے مدد لینی ہی پڑتی ہے اور حکومت کو اپنی ذمہ داری سنبھالنی ہی پڑتی ہے۔ رہا حکومت کا پیسا تو وہ بھی ہمارا ہی پیسا ہے، اُن کا کہاں سے ہوا۔ اس لیے ہم یہ تفریق کیوں کرتے ہیں کہ پیسا حکومت سے آیا یا ہم نے جمع کیا ہے۔

سوال: آپ نے اس اُلجھن کا ذکر کیا ہے کہ ہم ثقافت کا صحیح تشخص نہیں کر سکے۔ کیا اس کا سبب یہ تو نہیں کہ مختلف حکومتوں نے مختلف نظریات سے پیش نظر ثقافت کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا پرچار کیا۔ مثال کے طور پر ایک حکومت نے کہا کہ اگر سندھی، بلوچی ثقافت کو آپ فروغ دیں گے تو چار قومیتیں بن جائیں گی۔ دوسری حکومت نے کہا کہ نہیں ضرور فروغ دینا چاہیے۔ اس تمام اُلجھن کا سبب آپ کی رائے میں یہ تو نہیں ہے کہ اس معاملے میں حکومتوں کا راست عمل دخل رہا ہے؟

فیض: میں سمجھتا ہوں کہ کسی حکومت کو اس طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی۔ بس سطحی باتیں رہیں، الف سے لے کر ی تک سارے مسئلے پر غور کرنے اور اس کے لیے کوئی طریقۂ کار وضع کرنے کے لیے پچھلی حکومتوں نے وقت ہی نہیں نکالا۔ پھر حکومتیں جلد از جلد بدلتی رہیں، افراتفری کا عالم رہا اس لیے قومی سطح پر کوئی ایسی پالیسی وضع نہیں ہوئی جس سے ہم تفصیلی طور پر کوئی راستہ متعین کر سکتے۔ میرے خیال میں بڑا سبب حکومت کے دخل کا نہیں بلکہ عدم توجہ کا ہے۔

سوال: پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ ہماری بحیثیت القوم خواہش ہے کہ ہمارا فن ہمارے نصب العین کو حاصل کرنے میں مدد دے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا فنی کوششوں کو اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے یا دیا جانا چاہیے کہ وہ ہمیں اپنے نظریے اور نصب العین کی طرف لے جائیں یا آپ کے خیال میں ہماری فنی کوششوں کو اس پر زور نہیں دینا چاہیے۔

فیض: میں سمجھتا ہوں کہ جو بھی نظریات یا نصب العین ہوتے ہیں اُن پر تو فن اور ثقافت کو زور دینا اور اس کا اظہار کرنا ہی چاہیے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں نصب العین کو اتنا محدود نہیں کرنا چاہیے کہ بہت سی چیزیں اس سے خارج ہو جائیں۔ اگر ہم کوئی بہت تنگ محدود شکل اپنے سامنے رکھ لیں کہ یہ ہمارا نصب العین ہے اور ہر چیز پر وہ حدود عائد کرنے کی کوشش کریں تو وہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی، لیکن اگر ہم اسے پھیلا کر پوری زندگی کا نصب العین بنا لیں تو یقینی طور پر اس کا عکس ہمارے فن اور ثقافت میں ملے گا، اور ملنا چاہیے۔

سوال: ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اپنے آرٹ کے ذریعے ایسی چیزیں پیدا کریں جنھیں قوم اچھا سمجھنے لگے۔ اور کن چیزوں کو اچھا سمجھے اس کے لیے ہمارے پاس گائیڈ لائن موجود ہے قرآن کی گائیڈ لائن۔

فیض: ٹھیک ہے۔ مجھے اتفاق ہے۔

سوال: میری ایک بھتیجی ہے۔ ہم پیار سے اسے گڑیا کہتے ہیں۔ برسوں کی بات ہے، وہ مجھ سے پوچھنے لگی، نہیں جب بھی چھینک آتی ہے تو لوگ کیوں اتنی کیوں کی کبھی نہیں ادیہ یا یا الحمد للہ کہتے ہیں۔ ان میں سے کون سی بات اچھی ہے۔ ان دنوں تو سر و پیدا ہوا ایک نئے کلچر کی وجہ سے انہیں کبھی بلایا جاتا ہے ہم الحمد للہ کو ان سے کھاتے ہیں؟ نہیں۔ اب بھی اس فقرہ کو محسوس کرتے رہتے ہیں یا ان کی کوئی پہچان نہیں کریں گے؟ کیا خیال ہے آپ کا؟

فیض: ہم نے اپنے بچپن میں کبھی کسی کو ہنسی نہیں دیکھا تھا۔ الحمد للہ تو کہتے تھے۔ یہ تو اب پندرہ بیس برس سے شروع ہوا ہے اس وقت سے جب سے ایک نئی چیز پیدا ہوئی ہے "انگلش میڈیم سکول" کہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہ چیز نہیں ہوتی تھی۔ ایک سکول تھا، سبھی اس میں ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ سب جو تھے محلے کے سکول میں پڑھتے تھے۔

سوال: میرا مطلب ہے غلط تو نہیں ہوا؟

فیض: غلط تو ظاہر ہے نہیں لیکن کوئی نئی چیز جگہ پر کرنے کے لیے آتی ہے۔ ہم نے اپنے بچے کو پوری طرح سمجھ نہیں ہے۔ جو کسی شے کی ورثہ ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہوگئی ہیں۔ اگر ہم نے اپنا ثقافتی ورثہ کو اپنا لیا ہوتا تو دوسری چیزوں کی ذہن میں گنجائش کم ہوتی۔ مغرب کی بعض چیزیں آپ کو اختیار کرنی پڑیں گی۔ ہمارے دوست انتظار حسین نے رونا رویا تھا کہ لوگ آنکھوں سے اور ضرورتوں کی جگہ انگریزی استعمال کرتے ہیں۔ اس حد تک اس کا کوئی علاج نہیں۔ اسی طرح رواج ہے۔ ٹی وی ہے۔ یہ سب تو ہمیں قبول کرنا ہوگا لیکن جو ہمارا طرزِ فکر ہے، احساس ہے وہاں ہمیں ان کے اثرات کو قبول کرنا ضروری نہیں ہے کہ ان سے بچنا ہے، کیونکہ اس طریقے سے ہماری اپنی شخصیت اور انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے ذہن میں، ہماری تہذیب میں ایسے عناصر شامل ہو گئے ہیں جو کسی طرح بھی ہماری قومی زندگی کے لیے مفید نہیں ہیں۔ اب یہی ہے کہ الحمد للہ کو رائج کیا جائے یا کسی اور صورت کو اور انہیں کیوں ہی سے ختم کا احساس کیا جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ ہمارے انگلش میڈیم سکول بند کر دیجیے۔ آپ اپنے طریقۂ تعلیم میں اس طرح ترمیم کیجیے کہ آپ کی روایتی ثقافتی چیزوں کا دخل زیادہ ہو۔

سوال: آپ نے اپنی تقریر میں چار ثقافتوں کا یا چار کلچر کا ذکر کیا ہے؟

فیض: میں نے چار کلچر کہا ہے، چار تہذیبیں تو نہیں کہا۔

سوال: تو یہ جو چار کلچر ہیں ان کی بنیاد آپ نے جغرافیائی حد بندی کو بنایا ہے یا کچھ اور۔ کیونکہ رنگ، بولی اور کھانا ہے مگر لباس، مذہب وغیرہ تو ہر جگہ چاروں کے لیے ایک ہی ہیں۔

فیض: ہاں ٹھیک ہے، میں نے چار کا نام مثال کے طور پر لیا ہے۔ جب آپ کو دیکھیے اب سے پہلے پنجاب میں چلا جاتا ہے لوگوں نے علاقائی تہذیب کی بات شروع کر دی۔ اس وقت سے سرائیکی والے کہتے ہیں ہم تو پنجابی نہیں ہیں، ہمارا سرائیکی کلچر ہے۔ پوٹھوہاری کہتے ہیں ہمارا کلچر الگ ہے۔ یہ سب تو درست ہیں جو اپنے علاقائی مفاد کے لیے ایسی باتیں کہتے ہیں۔ مجھے اتفاق ہے کہ کلچر کی بہت سی شکلیں ہیں لیکن ایک مشترک صورت بھی ہے۔ پنجاب کی جو شکلیں ہیں ان کی ایک صورت کو ہم پنجابی کہتے ہیں۔ اسی طرح سے سرحد، بلوچستان اور سندھ میں جو مختلف صورتیں موجود ہیں ان کو ...... جسے میں نے مشترک نام دیا ہے۔ پٹھان بلوچ یا سندھی کہتے ہیں۔ اور ان چاروں سے مل کر جو صورت پیدا ہوتی ہے اسے ہم پاکستانی کہتے ہیں۔ یہ میں کہہ سکتا ہوں

جاتی ہیں۔ عراقی ہیں، ان کا بعض معاشی اور لسانی سب سے ایک حد تک الگ ہے۔ اسی طرح بلوچ ہیں۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ان سب کو قبول کرتے ہوئے انھیں تسلیم کرتے ہوئے ان کے مجموعے اور ان کے تمدن کو ہم آہنگ اور منضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔

سوال: تجربے کی حد تک تو ٹھیک ہے کہ لوگوں کو کسی نصب العین کی طرف رہنمائی کی ضرورت ہے۔ لیکن کیا نصب العین کا ہم نے کوئی واضح خاکہ مرتب کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں کشمکش اور اختلافات ہیں۔ مختلف قوموں کے درمیان بھی اور عوام کے اذہان میں بھی الجھنیں ہیں۔ ہماری آزادی کا حصہ نہ ہمیں ان کے ذہن کی زمین ہمارا مقصود بنا سکیں ہے۔ تمام تر تگ و دو کی حفاظت کے سے عمل کر سکے کیوں آئی؟

فیض: میں نے ابھی کہا تھا کہ ان اجزا کو واضح کیے بغیر کوئی حل نہیں۔ یہ سوال نصب العین کا تو کسی ملک میں بھی قوم میں سب لوگوں کو متفق الخیال ہونا تو مشکل ہوتا ہے۔ مختلف آرا ہوتی ہیں۔ مختلف مکاتب فکر ہوتے ہیں۔ البتہ اس بات پر ضرور اتفاق ہونا چاہیے کہ ملک کی سالمیت اور بقا لازم ہیں۔ جس حد تک اتفاق ہوتا ہے اور اس میں توازن قائم رہتا ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔ یہ بات کہ عوام کے ذہنوں میں کشمکش ہے خواص میں اختلاف ہے کہ ہمارا نصب العین کیا ہے تو اس سلسلے میں پھر ایک جو اختلافات ہیں انھیں ان کو تسلیم کرنا چاہیے۔ ان کے بارے میں لوگ بحث کریں، ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کریں، جو اکثریت کو منوا سکے گا وہ اقتدار میں آ جائے گا اور جس کی بات نہیں مانی جائے گی وہ اپنی بات کہتا رہے گا۔ اسے کہنے دیجیے۔

سوال: جہاں عقائد کی بنیاد پر اختلاف ہو وہاں اتفاق ضروری ہے اور اس کی بنیاد پانا بھی مشکل ہے۔

فیض: میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں بنیادی عقائد میں اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف اگر ہیں تو وہ عملی مسائل سے متعلق ہیں اور وہ سیاست، معیشت یا معاشرے سے متعلق ہیں۔ بنیادی عقائد پر اختلاف نہیں ہے۔

سوال: آپ نے کلچر کے ضمن میں زبان کا ذکر نہیں کیا۔

فیض: میں نے زبان کا ذکر اس لیے نہیں کیا ہے۔ ہمارے ملک میں مختلف زبانیں ہیں۔ سب ہماری زبانیں ہیں۔ ان میں کوئی بولی زبان نہیں۔ لیکن ان مختلف زبانوں کی موجودگی میں بھی ہمیں ایک زبان کی ضرورت ہے جو رابطے کا کام دے اور کاروباری زندگی میں سب کا یکساں وسیلہ ہو۔ وہ ایک ہی زبان ہے اور وہ ہے اردو۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں دوسری زبانوں کے بولنے والے حصہ بھی لے سکتے ہیں اور خیالات اور اظہار خیال بھی کر سکتے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں لسانی جھگڑے ہوئے ہیں ان کی بنیاد یہ تھی کہ علاقائی زبانوں کی نمو اور قومی زبان کی آمیزش کیسے کی جائے، اس کا کوئی طریقہ ڈھونڈا نہیں گیا۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ جو بھی زبانیں یہاں بولی جاتی ہیں ان کا فروغ لازمی ہے۔ انھیں تسلیم کرنا لازم ہے۔ ان کے ساتھ ایک مشترکہ زبان کو تسلیم کرنا اور اسے فروغ دینا بھی لازم ہے۔ ہم نے اچھے ادیبوں میں اتحاد پیدا کر رکھا ہے اس کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

سوال: ہماری ثقافت میں جو چیزیں اپنی بنیادی ہیں، انھیں محفوظ کرنے کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے قدیم ثقافتی سرمایے کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے لیے کوئی بڑا ادارہ قائم کیا جائے۔ کیا اس کے قیام کا کوئی امکان ہے؟

فیض: آپ نے بجا فرمایا کہ ایسا کوئی ادارہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام آباد میں ہم نے ایک

ایسا ادارہ قائم کیا ہے لوک ورثے کی حفاظت کے لیے۔ اس کا ایک چھوٹا سا شعبہ لاہور میں بھی ہے جس کا تعلق لوک موسیقی سے ہے۔ مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ بدقسمتی سے ایسی بہت سی سکیمیں بہت ہو گئی ہیں جس سے ثقافتی محنت اور پیسے کا زیاں ہوتا ہے۔ ریڈیو بھی یہی کام کر رہا ہے جو پہلے ریڈیو کر رہا ہے۔ وزارت اطلاعات اور وزارت تعلیم میں بھی ایک ہی قسم کا کام ہے۔ تمام چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کو یکجا کر کے بہترین نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں اور یکجا کرنے سے وسائل کی بچت بھی ہو سکتی ہے۔ اگر صاحب ثروت اشتراک کریں تو یہ ادارہ بہتر طریقے اور سہولت سے ہو سکتا ہے۔

سوال: نقی صاحب نے یہی خود ہی پوچھ لیا ہے ہم پوچھنا چاہ رہے تھے کہ ثقافتی ورثے اور تہذیبی روایت کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ اب ہم اس سلسلے میں کس منزل پر کھڑے ہیں؟

فیض: بنیادی سوال یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی اور سیاسی مسائل اور بنیادی گتھیوں کا حل کیسے تلاش کیا جائے؟ لیکن ابھی تک کوئی بھی اس قوم کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا انحصار تو سب ہی پر نہیں ہے۔ سیدھی بات ہے ہمارے کلچر کی پوری تاریخ کا معاملہ ہے۔ جیسا پہلے کہا جاتا ہے کہ ہمارے کلچر اور ثقافت کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ لیکن آپ جہاں سے بھی شروع کریں۔ ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہماری قومی تاریخ کا بھی حصہ ہے اور ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہماری تاریخ سے الگ ہے۔ یہی بات ادبی روایت کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

لوک ورثے تاریخ اور جغرافیے سے متعلق ہوتے ہیں اور وہی تہذیبی ضابطے ہیں جو علاقائی حدود سے بالاتر ہیں لیکن تاریخ کی حدود کے اندر سے خود اپنی قومی اور علاقائی سے بنتی ہیں۔ ہمارے علاقائی کلچر میں ہے کہ ہماری تاریخ پوری طرح سامنے نہیں آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی ثقافتی اور تاریخی تحقیق سے متعلق ان تمام حقائق کا ایک کیٹلاگ مرتب کرنا چاہیے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جو محمد بن قاسم سے لے کر اکبر اعظم تک، حسرت سے اقبال تک، جن میں ابوالفضل، فیضی، میر اور غالب بھی شامل ہیں اور ان کی روشنی تو جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے لوگوں کو دل سے محسوس کرنا اور عظیم شخصیتوں کو یاد رکھنا چاہیے جنھوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا۔

ظفر یوسف: کمیونزم کے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے گئے تھے؟

فیض: جب 1939ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی اس وقت ہمارے جو سیاسی دوست تھے انھوں نے کہا یہ سامراجی جنگ ہے۔ ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلا رکھی تھی اور جتنے ایسے لوگ تھے وہ جیل میں تھے۔ کمیونسٹ اور جلسے ان سب کو انگریزوں نے دیولی کیمپ میں نظر بند کر دیا تھا۔ ہمارے ایک دو دوست جیسے ملک فوج میں پہلے ہی سے لیفٹیننٹ بھرتی ہو چکے تھے تو انھوں نے کہا ہم فوج میں چلے جائیں مگر ہم نے انکار کر دیا کہ یہ ابھی سامراجی جنگ ہے۔ ہم اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

اسی دوران میں بی بی سی نے اس سلسلے کے بارے میں پروگرام شروع کیے۔ انقلاب (مرحوم)، بخاری صاحب (مرحوم)، امتیاز علی تاج، بی بی سی سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو کی ملازمت بڑی اچھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ بی بی سی میں آجاؤ۔ ہمیں ان دنوں امرتسر میں کالج کے طور پر ایک ملازمت ملی ہوئی تھی۔ تھوڑا سا دل لگا ہوا تھا۔ انگلستان جانے سے لندن بھی نہیں۔ ہم نے انگلستان کا نہیں سوچا تھا۔ ہم ان کی انگریز خاتون سے شادی کر چکے تھے۔ انگریز خاتون سے شادی کرنے کے لیے انگلستان جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا ارادہ بھی نہیں تھا۔ خود بھی نہیں تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ ممکن ہو تو کسی وقت باہر نکل جائیں گے لیکن بہت

سوچ بچار کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم اس جنگ میں انگریز کا ساتھ نہیں دیں گے۔ پھر جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف جاپانی ہندوستان کی سرحدوں تک آ گئے۔ ہمارے دوستوں نے کہا کہ اب تو یہ ملک کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ یہ عوامی جنگ ہے۔ یہ فاشزم کے خلاف جنگ ہے تو لڑنا چاہیے۔ فوج میں ہم اس طرح گئے کہ ہم کو عوامی رابطہ پر تقرر کرنے کے لیے لے گئے تھے کہ وہاں سے دلی سے گورنمنٹ کا فون آیا کہ کل دلی آ جاؤ تم سے بات کرنا ہے۔ میں نے پوچھا تو گیا۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو سب نے اجازت دے دی۔

دلی میں انگریز بریگیڈیئر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا: "تمہاری سی آئی ڈی کی فائل میرے سامنے میز پر پڑی ہے اور یہ لکھا ہے: "You are advanced communist" (تم ایک ایڈوانسڈ کمیونسٹ ہو)۔ میں نے پوچھا: "What is a retarded communist?" (پسماندہ کمیونسٹ کیا ہوتا ہے؟) کہنے لگے فکر مت کرو، اس رپورٹ کی پروا نہیں، تم کام کرو گے؟ میں نے کہا ہاں کروں گا ..... تب ہم اس طرح فوج میں آ گئے۔

کرشن: شاعری کے علاوہ آپ پروفیسر بھی رہے اور اخبار کے ایڈیٹر بھی۔ آپ فوج میں بھی رہے۔ ان سب کے باوجود آپ کی شاعری نے اپنا رنگ برقرار رکھا۔ یہ بتائیے کہ شاعر ہوتے ہوئے مختلف شعبوں میں آپ کیسے چلے گئے۔ مثلاً فوج میں آپ کیوں اور کیسے گئے؟

فیض: جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور جاپانی ہندوستان تک پہنچ گئے تو ہم نے سوچا کہ اب تو فاشزم کا سوال ہے۔ یہ انگریزوں کی حکومت کا سوال نہیں ہے۔ وہ ایک عالمی جنگ تھی: فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں۔ تب ہم نے سوچا کہ ہمیں فوج میں شامل ہونا چاہیے اور جمہوری قدروں کی بحالی کے لیے ہمیں بھی ہاتھ بٹانا چاہیے۔

رشید: جیل یاترا نے آپ کو لوگوں سے دور رکھا تو کیسا لگا؟

فیض: اس کے برخلاف ایک نیا رشتہ استوار ہوا۔ عوام سے وابستگی میں ایک نئی گہرائی کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس سے پہلے سیاستدان تو جیل جاتے رہتے تھے لیکن ایک شاعر کا جیل جانا ایک نئی بات تھی۔ پھر جیل کا ماحول بھی مختلف تھا۔ میرے لیے جیل کا تجربہ ایسے ہی تھا جیسا جوانی کے آغاز میں پہلا عشق۔ جیل میں سوچنے کا خوب موقع ملا۔

رشید: آپ کی گرفتاری اور پھر 1955ء میں رہائی کے بعد آپ کی شخصیت پر ایک ایسی سیاست کی چھاپ لگ گئی ہے جو فرعون، مجلسوں اور محفلوں کے خلاف کی نمائندہ ہے اور پھر آپ ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کے فعال رکن ہونے کی وجہ سے اور بعد میں ایک مخصوص شناخت بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے جیل سے رہائی کے بعد سیاست کے میدان میں کھل کر جمہوری قدروں کے ترجمان کی حیثیت سے کیوں کام نہیں کیا؟

فیض: جب ہم جیل سے باہر آئے تو پاکستان کا خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔ اسے لوٹانے کے لیے کسی ایک خواب کو لے کر آگے بڑھنا بھی تو بہت مشکل تھا۔ اس وقت ملک کا جو نظام تھا اس کی وجہ سے ہر ترقی پسند کو دبا دیا گیا۔ مزدور یونینوں کو کچل دیا گیا۔ اس کے بعد ملک میں ایک جمہوری اور منظم تحریک کے طور پر کبھی ابھرنے کا موقع ملا۔ 1970ء کی دہائی کے آغاز میں جب کہ ہم لوگوں نے ان خوابوں پر ایک اور کاری ضرب لگائی اور اس کے بعد آزاد صحافت بھی ختم ہو گئی۔ وہ تمام ذرائع جن سے آپ عوام کے ساتھ منسلک ہونے کے لیے ضروری ہیں، سب ختم کیے جا رہے تھے۔ ایسے میں اظہار کا طریقہ یہی سمجھ میں آیا کہ سماجی تبدیلیوں کی آواز شاعری میں ہی سمویا جائے۔

رشید: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ زندگی کے دور ابتلا میں انقلابی شعرا جیسے مجاز اور مخدوم محی الدین کی طرح اختیار کر چکے تھے؟

فیض: آپ ان کے عظیم انقلابی شعر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ تمام لوگ بہت عظیم اور وسیع ساز جدوجہد میں شریک تھے۔ آج کل کے حالات میں آپ دوسروں کو خیال رکھیں..... ایک فرض کے طور پر ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتے ہیں اور ضروری ان مواقع اور امکانات کو نقصان جو ایک جدوجہد کرنے والے کو ہیں۔ میں نے بہر حال بہر صورت اور بہر طور اپنے آپ کو نظام کا ایک حصہ سمجھا ہے اور اپنے طور پر جو ہے سمجھا اسی کی کوشش کی ہے کہ اس مجموعی عمل میں شریک ہوں جو کسی شاعر کی حیثیت آزادی کے لیے ضروری ہے۔ یہ کام کافی شروع ہے کے دوران جب نوجوان کے ساتھ تھا یہ جب جنگ میں نازی ازم کے خلاف تھا یہ بہر حال جاری رہا ہے۔

رحمن: بحیرہ 1920 کی دہائی کے اختتام اور 1960 کی دہائی شروع ہوا؟

فیض: جب ہم واپس گئے، جب ملکی سیاست میں جمہور کے راستے بند ہو گئے تو ہم نے ادب اور ثقافت کے محاذ سے جنگ کی۔ خیال کہ میرے خیال میں عوام کی اپنی ثقافت، اپنی ثقافتی اقدار کے تحفظ سے جنگ ضروری ہے۔ اس کے بغیر آزاد قوم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس ثقافت کا اور اپنی آزادی کی جدوجہد کا بنیادی جذبہ محرک ہے۔ اس میدان میں اظہار کے معنی یہ ہیں کہ ایک قوم اور ریاست کا استبدادی طبقہ نو آبادیاتی تصورات میں کسی قسم کی بھی مداخلت برداشت نہیں کرتا اور دوسرے وہ جو قوم کا کردار ہیں۔ اس میدان میں بھی آزادی ... استعماری نظام آگے بڑھنے کا اور تہذیبی اور ثقافتی۔

رحمن: اور پھر آپ تھک گئے؟

فیض: جی نہیں۔ اس میدان تیسری دنیا کے محاذ نے جنم لیا۔ یہ ایک ایسا محاذ تھا جہاں اپنے منزلوں کے تحفظ کی جدوجہد کے لیے وسیع میدان تھے۔ وہ جدوجہد جو اب ملک ... بالعموم میں منسلک ہوئی۔ اس جدوجہد میں بھی ایک طرف ... ہے اور دوسری طرف ... لوگ۔ مجھے بھی اظہار کے لیے ... میدان ... انتظار کے ... سے آزادی کی جدوجہد جاری ہے۔

رحمن: اس کے معنی یہ ہیں کہ قومی آزادی کی جدوجہد کو عالمی ... زیادہ مؤثر ... جا سکتا ہے ... جدوجہد ... دانشوروں اور فنکاروں کو ... ہیں؟"

فیض: یقینی طور پر آپ کی بات صحیح ہے جیسا کہ ہم نے ... پہلے کہا تھا "کوئی نجات ... نجات سے پہلے" تیسری دنیا کے ممالک کے قوم ... کو ایک مربوط جدوجہد میں ... کی ضرورت ہے ... تضادات ...۔ میرا خیال ہے کہ آپ میرے اس دور کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جب میں وطن سے دور تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ پاکستان کے عوام کی جدوجہد سے ہٹ کر فلسطینی عوام کی جدوجہد سے منسلک ہو گیا ہوں۔ پھر تیسری دنیا کی مجموعی جدوجہد کوئی الگ جدوجہد ہے نہیں۔ اس پاکستانی نوجوان کے جذبات ... دوسرے لوگوں کی جدوجہد میں شریک ہوں ... اس سے ... کر۔

رحمن: بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک ... دوسرے سے منقطع کر لیا ہے اور جدوجہد سے کنارہ کشی کر لی ہے؟

فیض: اس لیے کہ میں بنیادی طور پر صرف چند ... ہوں ... جہاں بات تحریرات کی ... آزادی ... ہے۔ میں نے اسی سے اپنے آپ کو کسی جدوجہد سے الگ کر لیا ہے کہ میں ...۔

ڈینی: آپ تنہائی پسند کب سے ہیں؟

فیض: یہ تو میرے بچپن کے ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ میرے ابا کے گھر بچپن میں بہت سی عورتیں ہوتی تھیں۔ آپا اور بہت ساری عورتیں اور بچے۔ ہم تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے بھائی عمر کے چھوٹے تھے جب سب نے مجھ سے تعلق زیادہ رکھا تو مجھ کو ضرورت ہی نہیں پڑی کی۔ میں مجھ کو سب کی قدر سب کی تا آمد تھی کہ میں ایک شریف انسان بن کر رہوں گا کیونکہ میں نے بچپن سے شرمیلا بنا۔ وہ تمام کھیل جو بچے کھیلتے ہیں میرے لیے حرام تھے۔ آپ یقین کریں کہ میں نے بچپن میں کبھی پتنگ اڑائی نہ لٹو چلایا۔

مہ جبیں مسعود: راولپنڈی سازش کیس کا تجربہ بہ ظاہر ایک انوکھی بات ہوگی۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتا کہ کس طرح آپ کی شخصیت اور شاعری میں یہ تضاد ہے جو آپ کے چاہنے والوں کو حیرت زدہ کرتی ہے کہ بھلا آپ کا کسی سازش، بغاوت یا حکومت کا تختہ الٹنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اب جب کہ اس واقعے کو اتنا عرصہ بیت چکا ہے کیا آپ اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں گے؟

فیض: اصل قصہ یہ ہے کہ سارا پنڈی سازش کیس جو ہے وہ ایک بات کا بتنگڑ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ چوں کہ ہم لوگ فوج میں رہ چکے تھے اس لیے بہت سے فوجی افسر ہمارے دوست تھے۔ ان سے ہمارے ذاتی مراسم تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہمارے سیاسی نظریات ہم آہنگ تھے۔ مثلاً جنرل اکبر خان کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہونا چاہیے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں؟ چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہاں آئینی جمہوریت کوئی ڈھانچہ ٹھیک طریقے سے مقرر نہ ہوا تھا۔ ملک کی بڑی بڑی اسامیاں خالی تھیں۔ قوم کے سربراہ لیاقت علی خان تھے۔ کشمیر کا قصہ بھی تھا۔ فوج کے ساتھی تھے جن پر کچھ الزام تھا۔ چونکہ ان دوستوں سے میرے ذاتی مراسم تھے اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے خود ہی ساری منصوبہ بندی کی اور ہم سے کہا کہ ہماری بات سنیے۔ ہم نے ان کی بات سنی اور پھر انھوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے۔ انگریزوں نے سازش کا ایک قانون وضع کیا تھا جس کے تحت اگر تین آدمی ایک جگہ موجود ہوں اور ان میں سے دو آدمی کسی بات پر آپس میں متفق ہو جائیں اور تیسرا آدمی کوئی رائے نہ دے تو وہ بھی اس بات پر متفق ہو گئے تھے تو سازش ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی قسم کی کوئی کارروائی کی جائے۔ ہمارے معاملے میں اسی قانون کے تحت نیا قانون بنایا گیا تاکہ فوری طور پر سزا دی جا سکے اور ملزمان کو دفاع کا پورا موقع نہ مل سکے۔ یہ قانون بھی بڑا عجیب تھا۔ اس میں یہ تھا کہ اس کے تحت جو منظور ہو گا وہ آخری ہوگا۔ یہ قانون سازا اسمبلی نے وضع کیا تھا اور قانون ساز اسمبلی کا فیصلہ کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کہا یہ گیا کہ ہم نے بتایا ہماری میٹنگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے اور کسی نے اوپر جا کر مخبری کر دی کہ ہم لوگوں نے حکومت الٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن پھر فیصلہ کیا ہے کہ منصوبے پر عمل درآمد کیا جائے۔ لیکن ہم پر مقدمہ اسی کے تحت چلایا گیا۔ دوسری طرف استغاثہ کے جو گواہ تھے انھوں نے ہمیں بتایا کہ آپ لوگوں کی ساری باتیں ٹھیک تھیں لیکن یہ کہ آپ لوگ مانے تھے کہ آپ نے گفتگو کی تھی۔ آپ نے طے کیا تھا کہ حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے۔ ہم نے حقیقت اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا تھا کہ آپ نے حکومت الٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مخبر بھی کہاں ان لوگوں نے یہ سارا پلان بنایا تھا۔

مہ جبیں: سجاد ظہیر آپ کو کہاں ملے؟

فیض: جی ہاں انھوں نے ساری بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد کچھ نہیں کرنا ہے جو کاغذات اس سلسلے میں تیار کیے تھے وہ تلف نہیں کیے تھے، وہ اُن کے پاس موجود تھے اور جب کسی نے مخبری کی تو سارے کاغذات نکل آئے۔ اور پھر بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حکومت ہمارے دوست فوجی افسروں سے خفا تھی۔ دوسرے حکومت کا یہ خیال بھی تھا کہ شاید یہ لوگ پوری طرح سے فرماں بردار نہیں ہیں، وہ اُن سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے، اس طرح انھیں ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہم تو بیچ میں یونہی آ گئے۔

طاہر مسعود: اس واقعے نے تو آپ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہوں گے؟

فیض: ہم چار سال تک جیل میں رہے۔ بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ پڑھے، لکھے، دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا، ہمارا ضمیر مطمئن تھا کیوں کہ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں تھا، ہم بے گناہ تھے۔

طاہر مسعود: ایسی سزا جو بے گناہ اور بے قصور ہونے کے باوجود ملے، کیا شدید غم و غصہ اور جھنجلاہٹ کو جنم نہیں دیتی؟

فیض: غصہ تو آتا ہے، لیکن اس سے حوصلہ بلند رہتا ہے، ہمت بلند رہتی ہے۔

طاہر مسعود: کوئی ایسا مرحلہ درمیان میں آیا جب معافی نامہ وغیرہ لکھ کر رہائی پا لینے کی پیشکش ہوئی ہو؟

فیض: سازش کیس میں معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے ایسا کوئی موقع نہیں آیا۔ ہاں البتہ ایوب خاں کے دور میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے تھے، اس میں پیشکش ہوئی کہ معافی مانگ لو اور رہا ہو جاؤ، لیکن ظاہر ہے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اظہر: عوام کی تائید کے بغیر فوج کی مدد سے انقلاب برپا کرنا، کیا مارکسزم اور لینن ازم کی تعلیمات سے انحراف نہیں ہے؟

فیض: آپ جس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، اس سلسلے میں محض قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں۔ اوّل تو سرے سے کوئی سازش تھی ہی نہیں، چند فوجی افسروں نے دیکھا کہ ملکی حالات ابتر ہو رہے ہیں، انھوں نے سوچا کہ حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ زیادہ جمہوری اور اصلاح پسند راستہ اختیار کرے، لیکن کہانی یہ بنائی گئی کہ انھوں نے فوجی انقلاب برپا کرنا چاہا ہے، چوں کہ فوجی افسروں کا معاملہ تھا، اس لیے حکومت نے ایک قدم اٹھا لیا اور اشتہار دے دیا، ورنہ بات کچھ نہیں تھی۔

اظہر: راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں سابق میجر جنرل اکبر خان نے جو لکھا ہے، اس سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

فیض: جنرل اکبر خان کی تحریر میری نظر سے نہیں گزری، اس قصے کے بارے میں بہ شرطِ زندگی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے۔

رحمن: فیض صاحب! آپ بنیادی طور پر کچلے ہوئے محروم طبقات کی آواز کے طور پر پہچانے جاتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ عوام کے تمام طبقات میں یکساں مقبول ہیں۔ کہیں اس کی وجہ وہ مخصوص ذہنی اور نفسیاتی کیفیت تو نہیں جو دوسری جنگِ عظیم سے پہلے شدید بحران کی وجہ سے پیدا ہوئی اور جس نے مغربی یورپ کے ممالک کے ساتھ ہندوستان کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تھا؟

فیض: نہیں۔ ایسی صورتِ حال ہماری شاعری کے آغاز کے بہت بعد پیدا ہوئی۔ ہم نے جب شعر کہنا شروع کیا تو ہندوستان عجب رومان پسندی کی گرفت میں تھا۔ یہ پہلی عالم گیر جنگ کے خاتمے کے بعد کا زمانہ ہے۔ ہندوستان کی معیشت قدرے مستحکم تھی۔ سوویت یونین کا عظیم اکتوبر انقلاب دنیا بھر کے لوگوں کے لیے امید افزا ثابت ہوا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ابلاغِ عامہ کے نئے نئے اور انتہائی موثر ذرائع سامنے آ رہے تھے، فاصلوں کی طنابیں سمٹ گئی تھیں اور اسی وجہ سے بین الاقوامی رسل و رسائل میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس گہما گہمی میں نئے نئے خیالات اور نئے نظامِ فکر سے لوگ روشناس ہو رہے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم

نے تو جنگ کے بعد یورپ اور مغربی آقاؤں کے لحاظ سے ماضی کے بعد آنے والے ہیرو تھے اپنے لوگوں سے نئی دنیا کی بات کرتے
تھے۔ ہندوستان میں بیداری کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف تحریک کی طرح سارے ہندوستان میں تھی۔ کیا ہندو کیا مسلمان
ادیبوں کو خطرے کے مقدم ہندوستانی بدیشی قیادتوں کے خلاف صف آرا تھے۔ کانگریس ایک مؤثر جماعت بن کر ابھری تھی اور یہ
ساری تحریک کی جڑیں سیاست کے میدان تک محدود نہ تھیں۔ ادب اور ثقافت میں بھی نئے رجحانات اور خیالات کا اظہار ہو رہا
تھا۔ بیداری کی لہر نے لوگوں کو اپنی شناخت کے لیے اپنی موسیقی اپنے ثقافتی ورثے کی طرف مائل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ
ہندوستان کے لوگ مغربی ادب سے آشنا ہو گئے تھے ذہن کے دریچے کھلے ہوئے تھے ادب میں نمایاں ہو کر سامنے آ رہے تھے۔ حسرت
موہانی اور اختر شیرانی روایتی شاعری میں بھی نئے رنگ بھر رہے تھے۔ لیکن ادبی اور ثقافتی پس منظر میں ہم جیسے نوجوانوں کو کسی چونکا
دینے والے عناصر اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور جب ہم نے شاعری کی ابتدا کی تو ہمارا واسطہ اپنے معاصر شعرا جیسے
ن۔م۔راشد اور میرا جی سے بھی تھا اور نئے رنگ ڈھنگ اور جب ادب میں ڈاکٹر تاثیر، صوفی تبسم، سالک، حسرت اور مجید ملک
سے بھی نزدیکی ہم آہنگی تھی۔

مسعود: ترقی پسندی تو اب دو قسم کی ہو گئی ہے۔ ایک 1936ء والے ترقی پسند اور دوسرے نئے ترقی پسند نسل کے بعض ادیب
بھی اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں۔

فیض: یہ بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ ترقی پسندی جب شروع ہوئی تو دنیا کا نقشہ کیا تھا۔ یہ سب آپ کے سامنے ہے۔ اس طرح رہا اور اس
کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پہلے اس میں انتہا پسندی آ گئی۔ اسی طرح پاکستان بننے کے بعد جب ترقی پسند تنظیم تھی تو اس میں
بھی ایسی انتہا پسندی پیدا ہوئی حالانکہ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کو دس بارہ سال ہو چکے تھے اور بہت سے لوگ اس
زمانے کی تھوڑی بہت غیر ضروری باتوں سے گریز کر چکے تھے۔ اب آپ کہہ رہے تھے کہ آج کل ایسی قسم کے نوجوان پائے جاتے
ہیں تو ان میں بھی اس چیز کا کوئی خدشہ نہیں اس لیے کہ ہر وقت ہر آدمی سطحی بات کرے۔

مسعود: روس میں کچھ عرصہ سے حقیقت نگاری کا نام لیا جاتا تھا، آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

فیض: اس بارے میں ایک قصہ سن لیجیے۔ غالباً 1963ء کی بات ہے میں ماسکو میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں گیا ہوا تھا۔ وہاں
بہت سے غیر معروف ترقی پسند یا غیر ترقی پسند ادیب بھی آئے ہوئے تھے اس میں سب شامل تھے۔ وہاں یورپ کے بعض ادیبوں نے کہا کہ
آپ کے ہاں جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ ادب کہاں ہے محض پروپیگنڈا ہے۔ اس پر الیا ایہرن برگ نے جواب دیا: "یہ ٹھیک ہے ہم
نے بہت سی ادبی چیزیں پیدا نہیں کیں لیکن ہم نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے جو تم لوگ ہزار سال میں بھی پیدا نہیں کر سکے۔ ہم نے
پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ تم نے جتنی کتابیں چھاپی ہیں ہم ایک سال میں اتنی چھاپ دیتے ہیں اور ایک وقت تھا کہ میرے
سامنے جب انقلاب برپا ہوا تو ہم نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ عوام ادب کو سمجھیں تاکہ انقلاب کو تقویت ملے۔ تنظیم کیسی ہوگی۔ ہم نے یہ
ضرورت محسوس کی کہ عوام اچھی چیزیں پڑھیں۔" انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ جب سوشلسٹ حکومت کا قیام ہوا تو ایک ادیب
میرے ساتھ ایک کارخانے میں گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ لوگوں سے پوچھیں اب کیسا لگتا ہے جو ان کی سمجھ میں آئے تو
قریب سے نئے لکھنے والوں کو کیا؟ انھوں نے کہا یہ بہت سے لوگ نہیں جانتے ان کے معیار کے مطابق نہیں ہو سکتا۔
پھر پچھلے سال میں انھیں پھر ایک کارخانے میں لے گیا اور میں نے وہاں لوگوں سے پوچھا کہ تم ان کی کتابیں پڑھتے ہو تو
کہنے لگے کہ ہم کیوں نہیں پڑھتے، یہ ادب سے معیاری کتابیں ہیں۔

تخلیق ہو رہا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا تعلیم اس کی وجہ ہے یا اس کا تعلق اقتصادی تنگی سے ہے۔

فیض: دونوں ہی باتیں ہیں۔ لوگوں کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ آپ لکھنا شروع کرتے ہیں ایک قسم کے لوگوں کے لیے۔ پھر ان کا معیار بدل جاتا ہے۔ ان کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔ لازمی بات ہے کہ آپ جتنی بھی کوشش کریں اچھے لکھنے والوں کی آپ کے ذہن میں پڑھنے والے یا کوئی نہ کوئی ایسا تصور ہوتا ہے اور آپ لاشعوری طور پر یا شعوری طور سے ان کے ساتھ ایک نشست ضرور کر لیتے ہیں۔ جب پڑھنے والا بدلتا ہے تو اس کے لکھنے والے کی تحریر پر بھی اثر پڑتا ہے۔ چونکہ ہم ان حالات سے نکلے ہیں جو صورت حال آج سے بیس برس پہلے تھی وہ اب نہیں ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ ایک زمانے میں جو شدت قنوطیت پسندی کا جو تصور تھا وہ بدل گیا ہے۔ پروپیگنڈا اور ادب میں اب یہ فرق ہو گیا ہے کہ اگر کسی تحریر میں وہ جہت موجود ہے جسے ہم aesthetic کہتے ہیں تو وہ ادب ہے اگر وہ نہیں ہے تو پروپیگنڈا ہے۔

مسعود: فیض صاحب! آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ اگر کوئی حزن اور کوئی غم سامنے ہو تو اچھا ادب پیدا ہوتا ہے تو مایوسی، محرومی despair اور تشکیک کے ادب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

فیض: اس بارے میں بھی دو باتیں ہیں۔ تشکیک بھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک منفی اور ایک مثبت۔ ایک تو منفی تشکیک ہے جس کے نتیجے آپ منفی ادب پیدا کرتے ہیں اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ایک مثبت تشکیک ہوتی ہے جس میں آپ کسی چیز کو question کرتے ہیں اس کے بارے میں تجسس، تجزیہ اور تحقیق کرتے ہیں اسے حقیقت اور واقعہ سے آگے بھی کرتے ہیں کہ یہ کیوں ہے تو وہ بھی ایک طرح کا احتجاج ہے صورت حال کے خلاف۔ اگر احتجاج زندگی پر ہوتا ہے اور اس میں خلوص اور جذبہ ہے تو وہ ٹھیک ہے لیکن اگر وہ محض منفی چیز ہے تو اس میں کوئی بات کوئی جان نہیں ہو گی۔

مسعود: ایک طبقہ ادب کی مقصدیت کی بات کرتا ہے کہ ہم کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہبی اقدار کو شعوری طور پر پیش کیا جائے۔

فیض: بات وہی ہے اگر آپ اپنے کلچر، اپنی تہذیب یا اپنے مذہب کے ساتھ ذہنی اور جذباتی طور پر وابستہ ہیں تو وہ خود بخود ادب میں آ جائے گا۔ اگر نہیں اور آپ محض ثواب کے لیے مقصد بے چین تو ادب کیسے بنے گا۔ اگر دل سے بات نکلی ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر کسی کے کہنے سے لکھا ہے تو وہ ادب کیسے بنے گا۔

مظفر اقبال: ہماری تاریخ، ہماری ادبی اور سیاسی اعتبار سے ہنگامی اور جذباتی تحریکوں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ تحریکیں ایک بے حد شدید تنظیم سے شروع ہوتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ادبی منظر پر اس جذبے اور قوت سے چھا جاتی ہیں کہ پھر اور کچھ ان کے سامنے ٹھہرتا نہیں۔ لیکن ذرا سا وقت گزر جانے کے بعد ابتدائی جوش ختم ہونے کے بعد سب کچھ زوال پذیر ہو جاتا ہے اور ایک بہت شدید رد عمل پیچھے رہ جاتا ہے۔ تحریک خلافت، تحریک علی گڑھ... اردو ادب میں اسی طرح کی ایک بہت زبردست تحریک ترقی پسند تحریک رہی ہے۔ 1936ء میں جب ہندوستان میں اس تحریک کا آغاز ہوا تو اس کے بانی اراکین میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک اردو ادب میں ایک نہایت طاقتور تحریک بن گئی۔ کتنے ہی نام اس سے وابستہ ہیں جو ہمارے ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ "ادب لطیف" اور "ادبی دنیا" جیسے جید رسائل تحریک کی ترجمانی کرتے رہے اور وہ بحث مباحثے ہوئے کہ لگتا تھا سب کچھ ہندوستان کے کروڑوں عوام کا مستقبل اس ادبی تحریک کی بدولت تعلیم کرنے میں پورا کروانے میں مضمر ہے۔ لیکن ایک دہائی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ تحریک میں اختلاف پیدا ہونے شروع ہو گئے حتیٰ کہ 1949ء کے آتے آتے آپ تحریک سے الگ ہو گئے۔ ایک بہت بڑی انجمن میں چھوٹے چھوٹے گروپ بن گئے۔ تو یہ سب کیا ہے؟ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد آپ اس تحریک

کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟ اور اس کی اردو ادب میں کیا تاریخی حیثیت ہے؟

فیض: پہلے تو تھوڑا سا فرق کرنا چاہیے کسی تحریک اور تنظیم میں..... جو آپ کہتے ہیں کہ تحریک بہت سی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں ... تو وہ تحریک نہیں، تنظیم جو تھی اس کو ترقی پسند تنظیم کہا جاتا ہے یا ترقی پسند مصنفین کی انجمن کہا جاتا تھا۔ وہ تو ظاہر ہے کہ جب تک اس کے پاس ایک خاص موقع پر اور ایک خاص مرحلے پر ایک مقام متعین تھا اس وقت تک اس میں ایک طرح سے اتحاد بھی تھا۔ اب اس میں دو طرح کی باتیں ہیں۔ ایک تو تنظیم اور تحریک اس وقت پیدا ہوئی جب کہ سارے برصغیر میں قومی اور ملکی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ اس لیے ایک سوال لازمی تھا یعنی قومی اور ملکی آزادی کی منزل جس سے سب لوگ متفق تھے۔ دوسرا زمانہ اس کا یہ تھا کہ وہ طبقہ جو کہ محروم ہے مسائل سے اور جس کو ہمیشہ طرح طرح کی بیماریاں اور مختلف مظالم اور مختلف مصائب کا سامنا رہا ہے اس طبقے کو ان حقائق کی شاعری کا ایک مستقل موضوع بننا ہے۔ کام کرنے والے مزدور، کسان ان کا نام اور ان کی زندگی کا عکس جس سے پہلے ہمارے ادب میں نہیں آیا تھا ان کی زندگی کی عکاسی کی جائے۔ اس پر بھی سب لوگ متفق تھے اور اس پر بھی ایک حد تک اتفاق تھا کہ آزادی کے بعد جو نیا معاشرہ قائم ہوگا اس میں اس وقت جو معاشی ناانصافیاں ہیں ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ دوسری بات تھی۔

تیسری بات یہ تھی کہ یہ کہ شعر و ادب میں محض خیالی تصویر کشی نہ کی جائے بلکہ اس میں حقیقت پسندی سے، جو زندگی کے حقائق ہیں، جو آس پاس کی روزمرہ کا ماحول ہے اس کی صحیح تصویر کشی کی جائے۔ یہ تین باتیں تھیں جن پر اتفاق رائے تھا۔ اس وجہ سے تحریک بھی اور تحریک میں ایک اتحاد بھی تھا اور تنظیم بھی تھی۔ جب ملک آزاد ہو گیا تو پہلی منزل تو سر ہو گئی لیکن دیکھا کہ اس پہلی منزل پر پہنچ جانے کے بعد آگے بہت سی منزلیں باقی ہیں۔ ان تک پہنچنے کے جو راستے تھے اب ان کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ کوئی کسی طریقے سے پہنچنا چاہتا تھا کوئی کسی۔ اس اگلی منزل کو بعض بہت قریب سمجھے یا بعض نے دور سمجھے۔ ان تک پہنچنے کے جو راستے تھے ان میں لوگوں نے اپنے اپنے راستے تجویز کر لیے۔ اس وجہ سے کم از کم تنظیم میں رخنے پیدا ہو گئے۔

جہاں تک تیسری بات تھی کہ زندگی کا عکس اور حقیقت پسندی سے اس کی عکاسی کرنا..... اس کے بارے میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب نئے معاشرے میں ذاتی پراگندگی اور ذہنی پریشانی اور پریشان خیالی پیدا ہوئی ہے تو بہت سے طرح کے دھارے چلے ہیں۔ ایک اندر کی طرف جانے کا اور دوسرا باہر کی طرف دیکھنے کا۔ کچھ لوگ جب حال سے اس قدر گھبرا گئے کہ انھوں نے کہا کہ اس سب پریشانی کا علاج اور مخرج یہ ہے کہ اندر کی طرف سے اپنے شعور میں یا لاشعور میں جایا جائے۔ اس سے خاص طرح کی اور انفرادیت کی تحریکیں پیدا ہوئیں جن کی انتہا یہ کہ کوئی معنی نہیں ہے، نہ کوئی منطق ہے۔ اس سے ایک خاص طرح کے انتشار اور "نئی تعمیر" اور "لایعنیت" پیدا ہوئی ہے۔ اب اس کی نمائندگی تو جو تحریک ہے یہ تنظیم پر ہے۔ وہ تو حالات اس طرح کے پیدا ہو گئے کہ اس میں یہ شورشیں پیدا ہوئیں۔ لیکن اس نے ادب میں یہ کہتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کوئی ترقی پسندوں کی اجارہ داری نہیں۔ وہ تو کبھی سے، جب سے ادب پیدا ہوا ہے، اس میں ہمیشہ سے یہ ہوا ہے کہ آگے کی طرف دیکھتے رہے ہیں یا پیچھے کی طرف دیکھتے رہے۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ ساری ذات جو ہے وہ مرکز کائنات ہے۔ دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ دوسرے مکتب فکر نے کہا کہ نہیں ہم ذات تو مرکز کائنات نہیں ہے بلکہ کائنات اور معاشرے کے تجربات ہم سے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے..... تو یہ بحث سے چلا آ رہا ہے اور یہ صورت آج بھی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سب لوگ جو یہ تھا ادب پیدا ہو رہا ہے، اب بھی جدید وسیع اور تخلیقی طور پر بھی جاری ہیں، ان کا بنیادی تعریف یہ ہے کہ ترقی پسند لوگوں کا تھا۔ ان سے پہلے جو ان کے ترقی پسند تھے ان کا تھا۔

شیخ سعدی سے لے کر علامہ اقبال تک...... تو یہ کوئی نئی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ جتنی حالت ان کی وجہ سے کہیں کہ ہم نے اپنے تجربے کا کوئی ادعا اب تک طے نہیں کیا ہے۔ بس اتنی بات ہم نے کہی ہے کہ ہم نے منزل کو چاہا اور ہم نے جیسے دیکھا ہے اس پر...... اور ذریعے سے جس کے اثرات ادب پر بھی پڑے لیکن ان کے بارے ہم سمجھتے ہیں کہ اب بھی جو قدیم معیار ہیں یعنی ہیں یا رہتی ہیں وہ بھی بنیادی طور پر حقیقت پسندانہ ہیں...... ترقی پسند ہیں، جو روایت کے حوالے سے جو کہ مسائل ہیں ان کے تجزیے پیچیدہ اور نئے حل کے حصول کی کوشش کرنے میں مصروف رہیں۔

مظفر اقبال: لیکن یہ دیکھیں نا کہ جب تحریک شروع ہوئی تو ایک بہت واضح تصور ان کے سامنے آتا ہے۔ کم از کم بنیادی باتوں کے بارے میں، ادب کس طرح کا ہونا چاہیے، کس طرح سے حقیقت پسندی اس میں ہونی چاہیے، وغیرہ۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اختلافات ہوئے، منٹو، عصمت وغیرہ کے بارے میں کہ ترقی پسند ہیں کہ نہیں، یا پھر علامہ اقبال کے بارے میں کیا رویہ ہو...... آپ سے تو کئی صاحب سے اختلافات بھی اس سلسلے میں پیدا ہوئے تو یہ تنظیمی نوعیت کے اختلافات ہیں یا ترقی پسند تحریک کے بنیادی نظریات سے اختلاف کا مسئلہ تھا؟

فیض: کسی تحریک کے اندر جب آپ تحریک کو ذرا تنظیمی شکل دیتے ہیں تو اس میں تنظیمی طور پر بعض ایسے فیصلے کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں اختلاف رائے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد جب نئے مسائل سامنے آئے جو کہ پہلے پیش نظر نہیں تھے تو اس میں ظاہر ہے اختلافات پیدا ہوئے اور اس میں تنظیمی طور پر بعض فیصلے کیے گئے، اس قسم کے، جو ہم سے بعض لوگوں کی رائے میں غلط تھے۔ پہلے بھی ہوا کہ بعض لوگ ذرا جذباتی ہو جاتے ہیں اور بجائے حقائق کی طرف دیکھنے کے وہ تجریدی طریقے سے چیزوں کو دیکھنے لگتے ہیں، مسائل کو...... جس سے ایک طرح کی نظریاتی اور ذہنی کج روی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ پہلے بھی ہوا تھا منٹو اور عصمت کے بارے میں پہلے بھی کچھ اختلاف سا پیدا ہوا تھا کہ جب لوگوں نے کہا...... پھر اس میں کچھ اس قسم کے بھی تھے کہ بعض نے کہا یہ ترقی پسند جو ہیں یہ محض فحاشی اور عریانی کرتے ہیں، حالانکہ ترقی پسندی کا فحاشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اور بنیادی طور سے منٹو ترقی پسند تھے، عصمت بھی۔ البتہ ان کے لکھنے کے طریقے سے اور جس طرح کے موضوع انھوں نے اختیار کیے، اس سے اس طرح کے مغالطے کی گنجائش پیدا ہوتی تھی۔ اس سے ہمیں بھی اختلاف تھا لیکن وہ تو ان کی دیانت داری پر یا ان کی حقیقت نگاری پر محض الزام آتا تھا۔ لیکن اس میں وہ "ادب فحش" کا فرق آ جاتا تھا۔ اور پھر یوں کہ اس تعصب سے ترقی پسندی پر فحاشی اور عریانی کی مہر لگانے کی کوشش کی گئی اور الزام لگانے کی کوشش کی گئی۔ اب یہ اس سے بچنے کے لیے ...... ہاں کچھ لوگوں نے ذرا انتہا پسندی اختیار کی کہ ان لوگوں کا ترقی پسندی سے واسطہ نہیں ہے۔ جو بات صحیح نہیں تھی۔ اور ہم نے جب بھی اختلاف کیا تھا، ہمیں اب بھی اختلاف ہے لیکن اس قسم کے اختلافات تنظیمی طور سے پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جس کی حیثیت ایک تحریک کے معنی حقیقت پسندی اور راست بازی اور دیانت داری اور جو بھی کوئی حقیقت ہے اس کو سمجھنا اور صحیح طریقے سے اس کی تعبیر کرنے کی جو کوشش ہے، اس کے بارے میں تو کبھی اختلاف نہیں تھا، نہ اب ہے۔ لیکن جیسے حالات کے مطابق کچھ لوگ متاثر ہو جاتے ہیں کسی وقتی مصلحت سے یا کسی خوف سے حال سے ...... اور جو بنیادی حقیقت ہوتی ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں تو وہ ایک قدرتی اور کبھی مختصر سی بات ہے۔ کچھ عرصے کے بعد زیادہ اچھے لکھنے والے جو ہیں وہ ان الجھنوں سے نکل جاتے ہیں، جو ان میں گرفتار رہتے ہیں ان کو کوئی فرق نہیں ہے۔

مظفر اقبال: نہیں، اب دیکھیں کہ 1949ء میں آپ علیحدہ تو ہو گئے، لیکن آپ کا جو......

فیض: نہیں، ہم علیحدہ اس طریقے سے نہیں ہوئے۔ صرف یہ ہے کہ دو تین چیزوں سے ہمیں اتفاق نہیں تھا اُن کے بارے میں ہم نے خاموشی اختیار کر لی کہ ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔ اُس زمانے میں یہ ہوا تھا کہ پہلے علامہ اقبالؒ کے متعلق کچھ غلط تفسیریں کی گئیں، یا منٹو، قرۃ العین حیدر، عصمت اور ن۔م۔راشد کے متعلق ہماری رائے میں غلط رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے ہم نے علیحدگی تو اختیار نہیں کی تھی کہ بنیادی طور پر تحریک صحیح ہے، یہ فروعات ہیں۔ جس حد تک اختلاف تھا اُس حد تک ہم نے اس میں شریک ہونے سے انکار کیا، لیکن تحریک سے تو ہم نے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔

طاہر مسعود: آپ نے ایک انٹرویو میں ترقی پسند تحریک سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا ہے، جس میں آپ نے ترقی پسندوں کی جانب سے تنظیمی سطح پر قرۃ العین حیدر، منٹو یا عصمت وغیرہ کے خلاف جو موقف اختیار کیا گیا اور علامہ اقبال کی جو غلط تفسیریں پیش کی گئیں، اُسے آپ نے ترقی پسند تحریک سے اپنے اختلاف کا سبب بتایا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کے خیال میں اُردو ادب کی سب سے بڑی تحریک کے رُو بہ زوال ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ ہمارے بعض بزرگ نقادوں کا خیال ہے کہ پاکستان کے واقعے نے اس تحریک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، کیوں کہ پاکستان کا قیام ترقی پسند تحریک کی توقع اور خواہش کے بالکل برخلاف تھا اور یہیں سے تحریک کو فکری اور عملی طور پر گہرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔

فیض: قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں آزادی کی جو تحریک چلی تھی وہ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کے درمیان ایک متحدہ محاذ کے قیام کا نتیجہ تھی۔ اس متحدہ محاذ میں جو لوگ شامل تھے، اُن کے سیاسی نظریات بھی طور سے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ چند ایک باتوں پر سبھی کا اتفاق تھا، یعنی یہ کہ انگریزوں سے آزادی ملنی چاہیے۔ عام آدمی کی زندگی میں آسائش اور سکون کا اضافہ ہونا چاہیے۔ اس محاذ میں دیگر معاملات بھی اس حد تک اختلافی نہیں تھے، لیکن پاکستان بننے کے بعد ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا کہ آزادی تو حاصل ہو گئی، لیکن اب اس کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ اس پر ترقی پسند تحریک میں شامل ہمارے دوستوں نے ذرا زیادہ ہی انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا کہ ہمیں اس کے بعد فوراً انقلابی ہو جانا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ پورے طور پر جو لوگ انقلابی رویہ اختیار نہیں کرتے، وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے، یہ رویہ اختیار کر کے ایک طریقے سے اُنھوں نے حالات کا غلط اندازہ لگایا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ ترقی پسند تنظیم میں جو نوجوان شامل ہوئے، اُن کا ذہن پورے طور پر صاف نہ تھا اور نہ سیاسی اعتبار سے وہ تجربہ کار تھے اور نہ ہی اُنھیں حالات سے اچھی طرح سے واقفیت تھی۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے اُن سے غلطیاں سرزد ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی تعجب انگیز بات نہیں ہے، ملک بننے کے بعد ایک بالکل نئی صورت حال پیش آئی جس کا ہمیں پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ آزادی کا ایک بہت مبہم سا تصور تو تھا لیکن آزادی کے بعد واقعی صورت کیا بنتی ہے، اس کے بارے میں ذہن صاف نہیں تھا، جس کے نتیجے میں بعض لوگ جذباتی ہو کر انتہا پسندی کی طرف چلے گئے اور ہُوا یہ کہ جو لوگ ہمارے ساتھ تھے، جن کو ہمارے ساتھ رہنا چاہیے تھا، اُن کو ساتھ رکھ کر تحریک کو آگے بڑھانے کے بجائے ہم نے اپنا دائرہ یا حلقہ محدود کر لیا جو ظاہر ہے صحیح نہیں تھا۔ اُصولاً ہمیں ادیبوں اور شاعروں کے نظریات تک محدود رہنا چاہیے تھا، اور ہمیں ان کی تخلیقات کا احاطہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ تخلیقات کا احاطہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ منٹو، عصمت اور قرۃ العین حیدر جیسے ادیبوں کو اپنے دائرے سے خارج کرنا پڑا، جس کا میں مخالف تھا۔

طاہر مسعود: آپ نے اس غلط فیصلے کے خلاف سٹینڈ کیوں نہ لیا۔ اس فیصلے میں جو حضرات آپ دیکھ رہے تھے اگر اُس کے خلاف آپ آواز

اٹھے تو کیا شاید ترقی پسند تنظیم کو آگے لے کر چلیں تو جو نقصانات اٹھانے پڑے وہ ان سے بچ سکتی؟

فیض: نقصان تو یقیناً پہنچا اور بعض ترقی پسندی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکی کہ ہماری جو دوسری تنظیمیں تھیں مثلاً مزدوروں اور دوسرے طبقوں میں، ان سب کو نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ سارا کام پڑا رہ گیا جس کی وجہ سے خواب شاید آزادی کے بعد جو ایک تصور بنا تھا وہ ذہن میں ہو سب پہلو کوئی نہیں دیکھتے یا نہیں سمجھے کا اثر تھا۔ انھوں نے اس طرح سے سوچا کہ آزادی مل گئی ہے تو بعض انقلاب ہو جانا چاہیے۔ خیر! یہ جوانی کی غلطیاں۔

طاہر مسعود: فیض صاحب! ترقی پسند تحریک تو تحریکِ پاکستان کی حمایت میں پیش پیش تھی۔ ایسے میں قیامِ پاکستان کے نتیجے میں جو آزادی ہمیں میسر آئی، اس کی یہ شکل و صورت تو یقیناً ترقی پسند تحریک کے ارکان کی نظروں میں نہیں ہوگی؟

فیض: جی ہاں، یہ صورت تو یقیناً نہیں تھی۔ صورت یہ تھی اور ہم نے سمجھا بھی یہی تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے آپس میں جو اختلافات تھے اور جس کی وجہ سے انگریزوں کا جو یہ سلسلہ قائم ہے وہ انقلاب آزادی ملنے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ تو کسی نے نہیں سوچا تھا کہ پنجاب تقسیم ہو جائے گا اور اس قدر قتل و خون اور لوٹ مار ہوگی۔ یہ تصور ذہن میں بالکل نہیں تھا۔ مقصد تو یہ تھا کہ جو جھگڑے ہو رہے ہیں آزادی کے بعد ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پاکستان بن گیا اور ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ ان معنوں میں ہماری خواہش تو پوری ہو گئی لیکن دوسرا مطلب یہ ہے کہ اختلافات کے خاتمے کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ الٹی غلطیاں ہوئیں۔ انگریزوں کی پالیسی تو رہی، کچھ اپنی مرضی، کچھ خود غرض طبقوں کے مفادات سب مل ملا کر یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ سامنے پاکستان میں جو مقصد تھا وہ ادھورا اور قصہ نامکمل رہ گیا۔ اسی وجہ سے ہمیں آج تک یہ صدمہ ملتا ہے کہ ہم نے کہا تھا: "یہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں"۔ انھوں نے وہ صبح نہیں دیکھی جو ہم نے دیکھی ہے کہ آزادی ہم کو کس طرح ملی۔ اس وقت تو ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس آزادی کے نتیجے میں ہمیں اس قدر قربانی دینی پڑے گی اور اتنی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ تعاون کے بجائے قتل و غارت گری کے ہنگامے دیکھنے پڑیں گے۔

طاہر مسعود: مجنوں گورکھپوری صاحب نے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ ترقی پسند تحریک اس لیے ختم ہو گئی کہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ آپ ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں؟"

فیض: مگر ترقی پسند تحریک ختم کب ہوئی ہے؟

طاہر مسعود: ظاہر ہے 1936ء والی صورتِ حال تو نہیں رہی ہوگی۔ اب تو نئی تحریکات اور نئے رجحانات ابھر آئے ہیں۔

فیض: ترقی پسندی کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تنظیم ختم ہو گئی ہے۔ تنظیمیں تو ختم ہوتی اور بنتی رہتی ہیں لیکن تحریکیں ختم نہیں ہوتیں۔ ترقی پسندی اس سے پہلے بھی تھی اور انگریزوں کے دور سے بھی آ رہی ہے۔ حالات کے تقاضے سے ایک تنظیم کی تشکیل ہوئی اور پھر حالات بدلنے کی بنا پر تنظیم ختم بھی ہو گئی مگر تحریک ختم کہاں ہوئی ہے۔ ترقی پسند تحریک اس زمانے میں ضرور ابھری تھی جب ترقی پسند تحریکیں چل رہی تھیں۔ یورپ میں رجعت پسندی، فاشزم اور غیر جمہوری تحریکات کا مقابلہ کرنے والے موجود تھے۔ اس وقت بھی دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور بعد میں جو نئی تحریکیں پیدا ہوئیں تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ادب میں تحریکیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں تک ترقی پسندی کا تعلق ہے تو اس نقطۂ نظر کا عوام کے مصائب اور آلام کو ادب میں منتقل کرنا ہوتا ہے تو اس میں کوئی فرق نہیں، یہاں ایک ہے کوئی تقسیم نہیں ہوئی۔

طاہر مسعود: فیض صاحب! تنظیم تو ختم ہوئی لیکن ساتھ ہی تحریک کی شدت میں بھی کمی آئی۔ کیا اس نقطۂ نظر کی شدت اب پہلے کے مقابلے

یک رنگا اور یک رُخا ادب لکھا گیا تھا۔

فیض: یعنی یہ بات صرف ترقی پسندی تک تو محدود نہیں ہے۔ پاکستان و ہندوستان بننے کے بعد جو ایک متفقہ تحریک حصولِ آزادی کے لیے چل رہی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ اس لیے کہ آزادی مل گئی۔ آزادی کے بعد اگلی منزل کون سی ہے، یا اس سے آگے کیسے جانا ہے؟ اس کے بارے میں صرف ترقی پسندوں ہی میں نہیں زندگی کی ہر سطح پر مختلف خیالات و نظریات پیدا ہوئے۔ اس سے ساری سیاسی زندگی متاثر ہوئی۔ یہ بالکل غلط بات ہے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے تحریک ختم ہو گئی۔ اگر پاکستان نہیں بنتا اور ہندوستان میں آزادی کے بعد اسی قسم کے مسائل پیدا ہو جاتے تو؟ آزادی تو ایک مجرد چیز ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ملک آزاد ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا سیاسی نقشہ کیا ہو گا؟ اقتصادی نظام کیسا ہو گا؟ معاشرے کا کاروبار کیسے چلے گا؟ ان ساری چیزوں کے بارے میں نئے طریقے سے سوچنا، تجاویز و منصوبے بنانا، تشریح کی صورتیں پیدا کرنا، ظاہر ہے ان تمام مسائل پر ہم متفق نہیں تھے۔ آزادی کے بعد اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی نظام کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے عمل کے بارے میں کسی کا ذہن بھی صاف نہیں تھا۔

طاہر مسعود: آپ کے سیاسی نظریات کی وجہ سے ملک میں ایک حلقہ آپ کا شدید مخالف رہا ہے۔ اُس نے آپ کی سیاسی اور نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر آپ کو ہمیشہ اپنی تنقید اور طعنہ زنی کا نشانہ بنایا، لیکن آپ میں ایک خوبی جسے میں نے ہمیشہ مستقل مزاجی کے ساتھ آپ کے اندر موجود پایا، اور وہ یہ کہ آپ نے اُن عناصر کو پلٹ کر جواب کبھی نہیں دیا، اور نہ ہی اُن کی سطح پر اترے۔ یہ خوبی اتفاق سے میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اندر بھی پائی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی اس نوع کی مخالفتوں کے پیشِ نظر دل گرفتہ، مایوس یا تلخ ہوئے۔

فیض: ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اُصول یا نظریے کی بات ہو تو اُس پر بحث کی جا سکتی ہے، کیوں کہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے، لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اُس کا اُسی جہت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ معترضین کی سطح پر اتر گئے ہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کی ذات پر اعتراضات آپ کی ذات کی وجہ سے نہیں بل کہ آپ کے معتقدہ نظریات کی وجہ سے کیے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو اتنی اہمیت کیوں دے؟ اپنی شخصیت کے حوالے سے بات کرنا محض تضیعِ اوقات ہے؟

طاہر مسعود: اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں فرمائیں کہ کیا کسی ادیب کو کسی سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کرنی چاہیے یا نہیں۔

فیض: اس کا کوئی لگا بندھا اُصول یا قاعدہ قانون نہیں ہے، جس کا مزاج سیاست سے ہم آہنگ ہو وہ بے شک سیاست میں حصہ لے اور جو مزاجاً سیاست سے الگ تھلگ ہو، ظاہر ہے اُسے سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ سیاست زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی طرح سیاست سے وابستہ ہے، سیاست سے عملاً علیحدہ رہتے ہوئے اس سے ذہنی اور جذباتی تعلق رکھنا ایک بات ہے اور سیاست میں عملی طور پر شامل ہونا یعنی کسی سیاسی جماعت میں داخل ہو کر اُس کا ضابطہ اور قاعدہ اختیار کرنا بالکل دوسری بات۔ اس کا تعلق اپنے مزاج سے ہے، لہٰذا جو سیاست کر سکتے ہیں انھیں کرنا چاہیے اور جو نہیں کر سکتے انھیں نہیں کرنا چاہیے۔ ادب اور شاعری کا قاعدہ تو صرف اس حد تک ہے کہ زندگی کی چند بنیادی قدریں ہیں جن کی حفاظت کرنی چاہیے۔ نیکی، انسان دوستی، صداقت کا تحفظ ادیبوں اور شاعروں کا اوّلین فریضہ ہے اور جن سیاسی کارروائیوں پر ان کا اطلاق ہوتا ہے اُس حد

تک جدوجہد بھی کرنی چاہیے۔ جہاں تک کسی پارٹی یا جماعت میں شامل ہو کر ان کے قواعد کی پابندی کا تعلق ہے تو شاعر و ادیب
پر اس کی پابندی لازم نہیں۔

رضی: پھر یہ تنظیم کیوں اور کن لوگوں کا شکار ہو گئی۔ بعض ادیب جو اس تنظیم کے ابتدائی رکن تھے "ترقی پسند" عصبیت کا الزام لگاتے ہیں؟

فیض: ابتدا میں جیسے میں نے کہا تھا: اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ بہت سے ادیب جو مختلف نظریات رکھتے تھے اور ان میں مختلف لوگ پریم چند، حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق جیسے ممتاز ادیب بھی تھے۔ لیکن بعد میں اس تنظیم نے کسی پارٹی کے نظریات کے حامل ادیبوں کو شامل ہونے میں مدد دی۔

رضی: اور ان ایک پارٹی کے نظریات کے حامل ادیبوں کی قبولیت کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا؟

فیض: ابتدا میں اس تنظیم سے اکثریت کو شکایت جماعت کی بنیاد پر ادب پیدا کرنے والوں نے کیا۔ ان حضرات کا اختلاف بھی ترقی پسند ادیبوں کے اسلوب اور طریقہ اظہار پر تھا جن کو عام طور پر تمام لوگ اس تنظیم کے بنیادی مقاصد سے متفق تھے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ اس تنظیم نے خود ادیبوں کے درمیان ایک حد فاصل کھینچ دی تھی..... یہ کہنا مشکل ہے۔ نوجوان ادب میں جدید نظریات کے حامل ادیبوں کی شمولیت نے تنظیم میں ایک خلفشار پیدا کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض ادیب جو تنظیم کے اہم اراکین تھے ادب کی جگہ انگریزی ادب کی قدروں کی بنیاد پر رکھتے تھے اور پھر ایسے نوجوان بھی تھے جو مارکسی نظریات سے ناواقف تھے لیکن وہ سیاسی ادب پیش کرتے تھے۔

رضی: کیا وہ لوگ جو شعر و شاعری کی ہیئت میں تبدیلی کے خلاف تھے انھوں نے اس تنظیم کے مقاصد کو قبول نہیں کیا ہوگا؟

فیض: ہاں ایسے ادیب بھی تھے جو روایات کے خول میں بند تھے لیکن ادیبوں کی صفوں میں اس وقت شگاف پڑا جب ہندوستان تقسیم ہوا اور سیاسی نظریات کی بنیاد پر دو صفیں ہندو اور مسلمان ہو گئیں۔ ایک صف ہندی کی حمایتی اور ترقی پسند اردو مصنف تھے اور پھر دوسری جگہ تنظیم کے ساتھ وہ مختلف نظریات کے حامی ہو گئے..... ایک تو یہ کہ یہ جنگ فاشزم کے خلاف ہے اور اس جنگ کے نتیجے پر ہندوستان کی آزادی کا انحصار ہے لیکن ایک گروہ تھا جو جنگ میں دونوں طاقتوں سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ تعصب ہو جن ایسے لوگوں کی مثال اس کبوتر کی سی تھی جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ عافیت ہے۔

رضی: آپ نے شعوری طور پر اپنی نظموں میں سمت کب متعین کی؟

فیض: میں اسی طرف آ رہا تھا۔ 1920 کی دہائی کے اواخر میں پوری دنیا ایک عالمگیر اقتصادی بحران کا شکار ہو گئی اور ہندوستان میں بھی صورت حال یکایک بدل گئی۔ میرے ذاتی طور پر بھی حالات بدل گئے اور معروضی حالات میں بھی تبدیلی آ گئی۔

ذاتی طور پر یوں کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میرے خاندان کی مالی حالت یکایک نامساعد حالات کا شکار ہو گئی۔ میں نے کسی بھی طرح اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد نوکری کے حصول کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور معروضی طور پر وہ عالم تھا جس نے یورپی ممالک کی طرح ہندوستان کو بھی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک نئے تجربے سے دوچار ہو رہے تھے۔ قومی آزادی کی تحریکیں بظاہر دم توڑ رہی تھیں اور ان کے بطن سے مذہبی منافرت کی تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ لیکن ایک عجیب پہلو یہ تھا کہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی جدوجہد میں مزدور طبقہ بھی پہلی مرتبہ ایک مؤثر طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ انھی حالات میں ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کے خیال نے جنم لیا۔

رضی: اور آپ کی تنظیم کے احساس نے پرانے اور نئے لکھنے والوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہوگی۔

فیض: فطری طور پر تو بعض بڑے لکھنے والے بھی ذہنی طور پر مختلف رجحانات کے حامل تھے۔ ایک مکتب فکر وہ جو آرٹ برائے آرٹ کا قائل اور اس پر یقین رکھتا تھا کہ جو فن پاروں میں کچھ ہے سب باہر تھا اور ادب و فن میں سیاسی یا سماجی رجحانات کی روایات تو پہلے سے تھیں، اہم بات یہ تھی کہ ادب پر سے یہ رجحانات پیش کرتے تھے۔ ایسے لکھنے والے ہم سے نظریاتی طور پر اختلافات کے باوجود ہم سے الگ نہیں تھے۔ پھر جب 1935ء میں ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی تو ظاہر ہے یہاں نذیر احمد اور صوفی تبسم بھی تھے۔ اس وقت ترقی پسندی پر کسی مخصوص سیاسی جماعت کی چھاپ نہیں تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ وقت کی ضرورت کو تسلیم کیا جائے اور ایک حقیقت پسندانہ ادب پر قائم ہو، لوگوں کو آزادی کے مفہوم سے آشنا کروایا جائے اور ایسے معاشرے کے لیے تگ و دو کی جائے جہاں معاشی ناانصافی نہ ہو اور جہاں معاشرے میں فرد اور اس کے نظریات کا احترام بھی کیا جائے۔

طاہر: ترقی پسند تحریک کے پاکستان میں روبہ زوال ہو جانے کی وجہ کیا ہے؟

فیض: ترقی پسند تنظیم پاکستان میں جب ختم ہوئی ہے، تحریک ختم نہیں ہوئی ہے۔ پہلے ایک متحدہ محاذ تھا انگریزوں کے خلاف آزادی کے قومی مسائل میں ہر مکتبۂ فکر کی گنجائش تھی۔ اس وجہ سے تنظیم بنا لینا بہت آسان تھا۔ ورنہ سب لوگ یہ تنظیم برداشت نہیں کر سکے اور آزادی اور جمہوریت، مساوات، یہ تمام قدریں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اپنی مساعی لیے ہیں جن میں رائے مختلف ہو سکتے ہیں۔

طاہر: کیا تنظیم کے ختم ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ ترقی پسند تنظیم کے حلقوں میں انتشار کا پیدا ہو جانا سبب بن گیا ہے؟

فیض: ہر تنظیم میں کمزور افراد بھی ہوتے ہیں اور بہت مضبوط قدم بھی۔ زیادہ دباؤ ہو جاتا ہے تو ہر کسی کے قدم تو مضبوط نہیں رہتے۔ آخر کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ دوسری بات کمزوری ہے معاشی تنگی اور روزگار کا مسئلہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ہم افراد کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

طاہر: نہیں ترتیب سے زیادہ میں تحریک کی بات کر رہا ہوں۔ دوسرا یہ کہ اس پر سیاست کا غلبہ بھی آ گیا، یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے بہت سے ادیب اپنی راہ سے بھٹک گئے۔

فیض: یہ تو ہمیشہ ہی کہا جاتا ہے کہ تحریک میں ادب اور ادیب سب باتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، کچھ لوگ کسی نہ کسی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ لالچ سے بھٹک جاتے ہیں۔ کسی کی ذاتی کمزوری ہے، کسی کی ادبی، یہ کوئی تحریک نہیں تھا۔

طاہر: آپ نے چند سال پہلے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی۔ اس میں بہت سے پرانے ترقی پسند ادیبوں کو آپ نے شامل نہیں کیا، اس کی وجہ کیا تھی؟

فیض: میں نے کوئی ادبی انجمن قائم نہیں کی تھی۔ البتہ کراچی میں چند احباب نے عوامی ادبی انجمن کے نام سے ایک تنظیم ضرور قائم کی تھی جس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ مجھے ان احباب کے طریق کار سے کچھ اختلاف تھا، اس لیے میں نے اس میں زیادہ وقت نہیں لیا۔

طاہر: آپ نے کراچی میں ادارۂ یادگار غالب قائم کیا، اس کے قیام کا مقصد کیا تھا؟

فیض: ادارۂ یادگار غالب مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں قائم کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ادارہ غالبیات اور ادب کے مطالعے کے لیے مخصوص ہو۔ غالبیات کے مطالعے کے لیے ایک مستقل مرکز بن جائے جہاں ... اس مقصد کے حصول کے لیے ناظم آباد کراچی میں حکومت اور حبیب بینک کے تعاون سے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کی گئی جہاں اس ادارے کا دفتر بھی

ہے اور غالب لائبریری بھی۔ بڑی لائبریری میں اب تک کئی ہزار کتب جمع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ معاصر عربی ادبی رسائل کا
قابل ذکر ذخیرہ بھی موجود ہے۔ ان رسائل میں ترقی پسند اور تمام مصنفین کے افکار کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔
لائبریری سے ملحق پائیں باغ میں ایک مختصر سا تھیٹر بھی ہے جس میں ادبی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ تاحال عربی سے نئی جاپانی ہیں، ترجمہ کرانا
بھی ہمارا سب سے مرکزی ادبی مرکز ہے۔

آصف فرخی: فیض صاحب آپ بیروت کے محاصرے سے باہر نکلنے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔

فیض: سفارت خانے والوں نے ہمیں پہلے خبردار کر دیا تھا۔ بیروت دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہم اس وقت نکلے جب وہاں سے کہا گیا کہ شہر خالی کر دیں۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ یہ ایک شہر ہے کسی حد کی بات نہیں ہے کہ کسی کے پاس پناہ لینے کے لیے جائیں تو ہم نہیں گئے۔ اس کے بعد تمام راستے بند ہو گئے۔ جولائی ۱۴ یا ۱۵ تاریخ کو ہمارے ایک دوست جو اقوام متحدہ میں کام کرتے ہیں انھوں نے ہمیں رات کے وقت یہ پیغام بھجوایا کہ وہ اگلے دن اپنے گھر والوں کے ساتھ جا رہے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ہم ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ ہم اس وقت تیار ہو گئے۔ وہ کے لوگوں کے ساتھ دو ہی تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ہم بھی جائیں کیونکہ اب ہماری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے تھے۔ چنانچہ ہم اقوام متحدہ کے لوگوں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ راستے میں ہمیں روکا بھی گیا اور چیکنگ بھی ہوئی اسرائیلیوں نے بھی اور Palangists نے کئی مرتبہ چیکنگ کی مگر ہمارے دوست کے پاس چونکہ اقوام متحدہ کا پرمٹ یا پاسپورٹ تھا اور انھوں نے کہہ دیا کہ ان کی فیملی ساتھ سفر کر رہی ہے۔ ہمارے پاسپورٹ کسی نے چیک نہیں کیے۔

ہم دو گاڑیوں میں سفر کر رہے تھے۔ اگلی گاڑی میں ہمارے دوست تھے اور پچھلی گاڑی میں ان کے بچے تھے۔ کسی گاڑی میں ہم بھی تھے۔ تو ان لوگوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ یہ ان کا خاندان ہے۔ حالانکہ ہماری شکل صورت چونکہ مختلف ہے مگر ظاہر ہے ہمیں کسی نے ایک مرتبہ بھی کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم بھی ان کے اہل خاندان میں سے ہیں۔ اس طرح ہم بیروت سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر اب باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے پہلے شمالی لبنان کا رخ کیا طرابلس گئے۔ وہاں سے ہم حمص گئے جو شام کا پہلا شہر ہے۔ حمص سے ہم دمشق پہنچے۔ وہاں سے لندن آ گئے۔ تو اس طرح ہم باہر نکلے مگر ہم تھوڑے چار دن تک جو ہم نے بیروت میں گزارے وہ بہت وحشت ناک اور دہشت ناک تھے۔ مستقل بمباری ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارا دفتر مکمل طور پر تباہ ہو گیا تو ہم اپنے ایک دوست کے گھر آ گئے۔ ہمارے ایک دوست ہیں معین بسیسو، فلسطینی شاعر ہیں۔ ہم تینوں ان کے گھر رہے۔ پھر دمشق سے لندن گئے۔ لندن سے ہم پہنچے مگر وہاں جانے کے لیے ہمیں ماسکو میں ٹھہرنا پڑا۔ کوئی فوری کنکشن یا فلائٹ ہی نہیں تھی۔ واپسی میں ہم ماسکو میں ٹھہرے۔ بریژنیف کا انتقال ہو گیا تھا تو ہمیں ماسکو رکنا پڑا۔

آصف فرخی: فیض صاحب آپ کا کیا منصوبہ ہے؟ کیا آپ یہیں مستقل قیام کریں گے؟

فیض: ہاں ابھی یہی ارادہ ہے۔

آصف فرخی: تو کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ کی جلاوطنی کا دور ختم ہو گیا؟

فیض: کوئی جلاوطنی نہیں تھی۔ پاکستان کسی نے جلاوطن کیا تھا نہ کسی نے ہمیں مجبور کیا تھا۔ ہم اپنی مرضی سے گئے تھے۔

آصف فرخی: تو پھر ان برسوں کا کیا مقصد تھا جو آپ نے ملک سے دور گزارے میں ... ذہن میں تجربہ، مسافرت اور وطن سے دوری کا

ذکر تھا اور جس میں شاعر نے اپنے دل سے کہا ہے کہ اب پھر خود کو سمیٹ لے اور فرصت کے لیے تیار ہو جائے۔ یعنی ایک طرح سے ان کی
نظم کے الفاظ میں پوچھتا ہوں) تو پھر آپ کا دل فرصت پر کیسے مائل ہو گیا تھا۔

فیض: یعنی ہمارا یہ خیال تھا... ہمارے پاس یہاں کوئی کام تو تھا نہیں اور ہمارا سفر ہو چکا تھا۔ بارہ روز یہاں رہے اور ہم چلے گئے
فرصت سے ہم تو کچھ کی ہوئی تھی کسی نہ کسی چیز کے لیے فرصت رہتی ہے اور ہمارا ایک کام تھا ہم اسے کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات ہوئی۔

آصف فرخی: یعنی آپ کا باہر چلا جانا مقصد تھا۔ یہ ہمارے لیے واقعہ یہ آپ کا ارادہ کیا نہیں تھا؟

فیض: نہیں یہ بات نہیں۔ ہم اپنی مرضی سے باہر گئے تھے۔

آصف فرخی: اب آپ یہاں رہیں گے اور شعر کہیں گے تو یہ تو نہیں ہے کہ آپ... یہ شعر گوئی کی زندگی کہیں نہ ہے وہ ملک
جس سمت میں سفر کر رہا ہے اور تھا اسے لکھنے میں کچھ مشکلات پیش آ سکتی ہیں؟

فیض: دیکھا جائے گا۔ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔

آصف فرخی: ان مشکلات کے حوالے سے یہ آپ کے خیال سے آپ کو کوئی الجھن تو نہیں ہے؟

فیض: یعنی ہمارا کام تو شعر لکھنا ہے۔ ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تو ہیں نہیں۔ شعر کے کام کو کوئی روک نہیں سکتا۔ جو ہمارا کام ہے اس
میں زیادہ دقت تو پیش نہیں آئے گی۔ ہم سیاست تو کرتے نہیں۔

آصف فرخی: مگر سیاسی شاعری تو کرتے ہیں۔

فیض: وہ تو ہم کرتے ہیں۔

صفدر میر: فیض صاحب آپ اپنے حالیہ تجربات کے بارے میں کچھ بتائیں۔ لبنان پر امریکی جارحیت کے دوران آپ بھی تو بیروت
میں تھے۔

فیض: لبنان کے بارے میں تفصیلات اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے آپ تک پہنچ چکی ہیں۔ میں ان میں زیادہ اضافہ نہیں کر سکتا۔
اسرائیلی جارحیت تو پہلے سے متوقع تھی۔ لیکن جس طریقے سے ہوئی، جب ہوئی؟ اس کے بارے میں کسی کو ٹھیک سے اندازہ نہیں
تھی۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ اسرائیلی پیش قدمی جنوبی لبنان تک محدود رہے گی۔ اس سے آگے نہیں آئیں گے۔ اس کی ایک وجہ تو
غالباً یہ تھی کہ امریکہ کا وعدہ تھا اور دوسری یہ کہ لبنان کی حکومت کے تعلقات فلسطینیوں کے ساتھ بھی ہیں اور مغربی ملکوں کے ساتھ
بھی۔ یہ خیال تھا کہ امریکہ ان باتوں کا خیال رکھے گا۔ پھر یہ خیال تھا کہ عالمی رائے عامہ جو ہے وہ اسرائیل کو بھی اس کی
اجازت نہیں دے گی کہ اس نیا ملک بری طرح برباد ہو۔

صفدر میر: اس حملے کی کوئی فوری وجہ بھی تھی؟

فیض: جب پہلے دن بیروت پر ہوائی حملہ ہوا تو جو وجہ اس کی بتائی گئی اس میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یہ کارروائی انھوں نے بدلے
میں کی ہے کیونکہ اسرائیل کے سفیر مقیم لندن پر حملہ ہوا اور ان کا جو آدمی تھا وہ بری طرح زخمی ہوا اور یہ الزام تھا اور یہ کہ جو لوگ ان کے
ایک سفیر پر لندن میں حملہ کرنے والے تھے ان کا تعلق پی ایل او سے ہے۔ اسی وجہ سے وہ فلسطینیوں کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اس
ہوائی حملے سے پہلے بین الاقوامی سطح پر جنگ بندی کا معاہدہ جو موجود تھا۔ اس حملے کے بعد لگے ہاتھوں انھوں نے اسرائیلی حملہ بھی شروع کر
دیا۔ گویا جنگ بندی کا خاتمہ بھی انھوں نے ہی کیا ہے۔ اس حملے کا فائدہ وہ اٹھانا چاہتے تھے۔ پی ایل او نے اس کی تردید کی
تھی۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ اسرائیلیوں نے لندن میں اپنی سازش کی تھی اور اس کے بعد بیروت پر مسلسل بمباری کے بعد بھی جنگ جاری رہی۔

اسرائیل کی طرف سے فضائی حملے ہوتے رہے۔ بم باری ہوتی رہی اور شہر تباہ ہوتا رہا۔ وہ صرف پی۔ ایل۔ او کے دفاتر پر ہی حملے نہیں کر رہے تھے اُن کے علاوہ شہری آبادی پر بھی بم پھینکتے تھے۔ یہ اُن کی دہشت اور ہراس پھیلانے کی حکمتِ عملی تھی۔ اُن کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ پی۔ ایل۔ او ہتھیار ڈال دے تو ہم کارروائی بند کر دیں گے۔ پی۔ ایل۔ او کا جواب تھا: "ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے آخری دم تک لڑیں گے"۔ جنوبی لبنان میں جہاں فلسطینیوں کے کیمپ تھے وہاں کچھ دیہات تھے اسرائیلیوں کو اُن دیہات میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انھوں نے ان کیمپوں اور دیہات کا چاروں طرف سے محاصرہ کر کے ان پر مسلسل بم باری کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں پر جتنے لوگ ہیں بھاگ جائیں یا مر جائیں یا وہاں کوئی نہ رہے اس وقت وہ وہاں داخل ہوں۔ یہی انھوں نے کیا۔ دو ہفتے تک مسلسل فلسطینیوں کی طرف سے مقابلہ ہوتا رہا۔ شام نے تو تیسرے دن ہی فائربندی کر لی تھی۔ فلسطینیوں کا حوصلہ اور شجاعت قابلِ داد تھی۔ اسرائیلیوں کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا۔ مطلب اسرائیلی بم باری کی زد میں رہے۔ فلسطینیوں کے ٹھکانے، دفاتر، مرکز بھی اسی طرح بم باری سے متاثر ہوئے جہاں فلسطینی قیادت کے لوگ تھے خصوصاً یاسر عرفات ایک گلی سے دوسری گلی، ایک مکان سے دوسرے مکان تک اپنے ٹھکانے بدلتے رہے مگر بم باری اُن کا تعاقب کرتی رہی۔

عبادت سعید: فیض صاحب! اس دوران میں فلسطینیوں کا کیا حال تھا؟

فیض: اُن کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اس دوران میں کھانے پینے کی اشیا، پانی، بجلی، ضروریاتِ زندگی اور ادویات کی قلت پیدا ہو گئی رہی۔ اُن حالات میں جس قسم کا بحران پیدا ہوتا ہے وہ اس کا تصور بھی نہیں تھا۔ دو ہفتے کے بعد حبیب اور دیگر سفیر ثالث بن کر وہاں پہنچے۔ انھوں نے دباؤ ڈالا اور فلسطینیوں سے کہا کہ آپ شہر خالی کریں اور شہر چھوڑ دیں کہ پہلے ہتھیار ڈال دیں اور اس کے بعد انھیں شہر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے گی۔ یاسر عرفات نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ایک ہفتے تک یہ معاملہ چلتا رہا، پھر طے پایا کہ کسی طرح وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا تو نکال لیں گے، اس وقت تک یہ معاملہ خراب ہو چکا تھا۔

عقیل عباس: آپ کے ٹھکانے پر بھی بم باری ہوئی؟

فیض: ہمارے دفتر پر تو تیسرے دن ہی قبضہ ہو گیا تھا لیکن میں ایک دن پہلے ہی وہاں سے نکل کر منتقل ہو گیا تھا۔

حسن رضوی: فیض صاحب! یہ فرمائیے اس سارے عرصے میں مسلم ممالک کا کیا ردِ عمل رہا؟

فیض: ان کا کوئی کردار نہیں رہا۔ انھوں نے تو اس سارے عرصے میں قراردادیں پیش کر کے مذمت کا اظہار کیا۔

شفق احمد: اسرائیل سے عربوں کی جنگوں کے نتیجے میں فلسطینی عوام کا کتنا جانی نقصان ہوا تھا؟

فیض: پی ایل او کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ اسرائیل کے ساتھ چوتھا معرکہ تھا۔ پہلی لڑائی 1948ء میں ہوئی جب اسرائیل کا اس وقت تین ممالک اردن، شام اور مصر کی فوجیں اُن کے خلاف صف آرا تھیں مگر شکست کھا گئے۔ وطن کے بجائے ... کو شکست اٹھانا پڑی۔ دوسری لڑائی 1967ء میں ہوئی وہ کوئی سات دن چلی، پھر 1973ء میں لڑائی ہوئی، یہ سب جنگیں فوجوں اور ملکوں کے ساتھ تھیں۔ موجودہ تنازع صرف فلسطینی رضاکاروں نے لڑا جن کے پاس نہ حکومت تھی، نہ باقاعدہ فوج۔ اس کے باوجود تین جنگوں میں اسرائیلیوں کو اتنا جانی نقصان نہیں ہوا جتنا اس جنگ کے تین ہفتوں میں ہوا۔

فارغ بخاری: اس جنگ کے ضمن میں ہم آپ کے تاثرات بھی جاننا چاہیں گے۔

فیض: جی ہاں۔ نئے مسائل تھے، وہ تھی کھل کر سامنے آگئیں۔ ایک تو یہ کہ امریکہ کا رول ہوا ہے آپ کو علم ہے کہ پہلے اور تمام عالم عرب کے لوگ
سمجھتے تھے کہ ان کی دوستی سے تمام مسائل کا حل ہو جائے گا۔ مگر یہ خوش فہمی اس وقت دور ہو گئی جب عربوں میں تسلیم کرنے والا فریق امریکہ تھا اس کی
دورُخی پالیسی بھی سامنے آئی۔ تیسری بات یہ ہے کہ عرب ممالک کی بے عملی اور بے حسی بھی سب پر عیاں ہوئی۔

کمال حقانی: ایران کا اس جنگ میں کیا کردار رہا؟

فیض: ایرانی تو براہِ راست مداخلت اسی طرح سے کر سکتے تھے کہ شام کے راستے لبنان آتے لیکن ان کا راستہ بند کر دیا گیا۔ عوامی
سطح پر مختلف ممالک سے رضاکار وہاں پہنچے۔ پاکستان سے بھی گئے، بنگلہ دیش سے بھی گئے، کئی لوگ وہاں شہید بھی ہوئے۔

مقصود زاہدی: یعنی حکومتوں کی طرف سے کوئی نہیں گئے؟

فیض: عوام کی طرف سے گئے، عرب ممالک میں مظاہرے بھی ہوئے اور لوگوں نے حکومتوں سے مطالبہ بھی کیا۔

حسن رضوی: ایران میں تو بلکہ تمام فلسطینیوں کی امداد کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔

فیض: جی ہاں، وہ حکومت کی طرف سے تھا۔

نیاز ق کامران: فلسطینیوں نے بڑی بہادری اور عظمت کا ثبوت دیا ہے۔

فیض: چونکہ بیروت جیسے حملے میں واضح طور پر سامنے آئی وہ فلسطینیوں کا عزم اور ان کی شجاعت اور ان کا قابلِ تحسین ہونا۔

اجمل نیازی: جنگ تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب جو صورتِ حال ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

فیض: فلسطینی مجاہدین معاہدے پر دستخط کر کے جب وہاں سے نکلے تو ان سے یہی کہا گیا کہ ان کی پیچھے رہ جانے والی آبادی کو کوئی نقصان
نہیں پہنچے گا لیکن تحریری اور زبانی ضمانتوں پر عمل کرنے کے بعد وہ وہاں سے علاحدہ ہوئے تو اس کے بعد آپ نے اخبارات میں دیکھا ہو
گا کہ جب یاسر عرفات کے ساتھ جہاز کنارے سے نکلا تو کسی امریکن نے یاسر عرفات سے یہ سوال پوچھا کہ آپ یہاں سے نکل کر
کہاں جا رہے ہیں تو انہوں نے کہا: "ہم فلسطین جائیں گے"۔ ایک بہت بہترین جملہ تھا کہ اب ہمارے راستے میں ایک
دن بھی المسلمین کا ریڈیو بند نہیں ہوا، ایک دن بھی اخبار بند نہیں ہوا۔ فلسطینیوں کے اجتماعات اور انتظامی جو ادارے تھے نہیں
رکے، یہ سب ان کی عظمت کی علامت تھے۔ ان کے ساتھ فلسطین کے مشہور شاعر محمود درویش بھی رہتے تھے اور جب وہ نکلے تو ان کے ساتھ
یہاں ان کی جو چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں ان پر حملہ ہوا جو ہمسایہ بستیاں تھیں ان پر وحشیانہ بمباری کی گئی، سب کچھ تباہ ہو گیا۔ ہسپتال میں جل گئی تھیں۔ جیسے
چھوٹے چھوٹے بچے ان بستیوں میں رہ گئے تھے وہ سب شہادت پا گئے تھے، ہمارے بھی فلسطینی طالب علم جنگ میں حصہ لینے کے
لیے وہاں پہنچ گئے تھے اور ہمارے وطن سے اسی طرح آئے کہ روس سے، افغانستان سے بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ عرب ممالک جو صہیونی اور
امریکی سامراج کے خلاف تھے، ان کا رابطہ بھی منقطع ہو گیا تھا اس کے بعد کیسے ہی بنے، امدادی کارروائیاں بھی شروع ہوئیں اور بہت سی باتیں
بھی پیچھے رہ گئیں۔ فلسطینیوں کے انخلا کے نتیجے میں کوئی فرق آیا، ان کی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی میں کوئی رکاوٹ
پیش آئی۔

قدرت اللہ شہاب: فیض صاحب! فلسطینیوں کے ساتھ اردن نے شاید سب سے زیادہ بدسلوکی کا جو سلوک کیا ہے اس کے بارے میں کچھ
کہیے؟

فیض: اس میں کچھ شک نہیں ہے اور اسے کبھی بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو اس کے متعلق کہا جاتا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ ان کے ساتھ
ایک زمانے میں اردن نے بہت ظلم کیا۔ ان کے ساتھ شامیوں نے بھی ظلم کیا۔ ان کو اور لوگوں نے بھی دبایا، مگر یہ بات

میں ایک لفظ ہے جو جنگی اور عوامی دونوں اعتبار سے نگلیکس ...... قوم و لیڈر بنی انسانی شخصیتیں جو آپ کے سامنے ہیں ان پر فخر کرنا چاہیے۔ جہاں تک اطوار و حرکت عمل کا تقاضا ہے اس میں چاہے کیسی حالت ہو اور صورتِ حال کیسا ہی تقاضا ہو اس کے مطابق آزادی کی جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔ فلسطینی ایک بات پر تو قائم ہیں کہ انھیں فلسطین اپنا گھر ہر قیمت پر چاہیے۔ آخری دم تک جب تک ایک بھی فلسطینی زندہ ہے اس وقت تک انھیں زندہ رہنا ہے اس لڑائی میں آج حریف کون ہے اور کل حلیف کون ہو اس کے مطابق انھیں عمل کرنا ہے۔

[illegible]: موجودہ صورتحال تو یہ ہے کہ فلسطینی بیروت سے چلے گئے ہیں اور ایک طرح سے بکھر گئے ہیں اور لبنان میں اسرائیلی فوجیں داخل ہو گئی ہیں اور وہاں ہیں۔ مسلمانوں کی جانب سے لبنان میں اسرائیل والے پر کوئی مؤثر احتجاج نہیں ہوا اور کسی مسلم ملک نے انھیں روکا نہیں۔ اس طرح ایک خطرناک رجحان پیدا ہوا ہے کہ ایک بین الاقوامی اصول قائم ہو گیا ہے کہ کسی بھی ملک میں کسی بھی وقت کسی دوسرے ملک کی فوجیں داخل ہو سکتی ہیں۔ ہم اس زمانے میں رہ رہے ہیں جہاں پہلے ایسی صورت پیش آئی حالات سے دوچار ہے اور جس طرح کے سیاسی منظر نامے قائم ہو چکے ہیں ان میں بے شمار مثالیں ہیں کہ اس اصول کی روشنی میں کسی دوسری جگہ بھی ایسا تجربہ ہو سکتا ہے اس صورتِ حال میں کمزور اور پسماندہ اقوام اور عوام کے لیے آپ کیا تجویز کرتے ہیں کہ وہ کس قسم کی پالیسی پر عمل کریں کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکیں؟"

فیض: اس کی مثال تو فلسطینیوں نے خود قائم کر دی ہے کہ فلسطینی جن کے پاس نہ کوئی گھر نہ حکومت ہے۔ لڑائی کمزور اور پسماندہ ممالک بڑی طاقتوں کو روک سکتا؟ کا جواب ہم دے سکتے ہیں۔ الجزائر نے فرانس کو ہرا دیا، ویت نام نے امریکا کو شکست دی، ان کا تو اپنا گھر تھا، وطن تھا تھے۔ فلسطینیوں کے پاس ان کا گھر بھی نہیں ہے اور حکومت بھی نہیں۔ پھر بھی انھوں نے دکھا دیا ہے۔

[illegible]: فلسطینی غیر علاقوں میں رہ کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ فیصلہ تو جنگ کسی بڑی طاقت کے ہاتھ میں آ جاتا ہے جب تک بڑی طاقتوں کا رویہ موجود ہے تب تک تو ان کی مرضی سے چلیں گے اور یہ کمزور قومیں صرف اپنا خون ہی دے سکتی ہیں اور دنیا بھر کی ایسے فیصلے ہوئے ہیں جو پاکستان پر ... ہو گئے ہیں۔

فیض: دیکھیے نا امریکا سے بڑی سپر پاور اور کون سی ہے ویت نام سے اس کو بھی نکلنا پڑا۔

اشفاق احمد: اس کے علاوہ ایک یہ بھی تو ہے کہ افغانستان سے بھی روس کی فوجیں نکل جائیں۔

فیض: ظاہر ہے یہ تو ہے کہ لڑائی میں لڑنے والا انسان ہے جیسے کہ فلسطینی کہتے ہیں: 'Palestine is no longer a state. it is a state in mind' جب تک ایک بھی فلسطینی باقی ہے فلسطین زندہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آزادی کی جنگ میں بہت سی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اور ہماری تو مشہور بھی ہوتی ہیں اور ان کا نام رہ جاتا ہے اس نام کی وجہ سے اور ایک سیاسی ہے اور ان کو اس سے تقویت ملتی ہے۔

[illegible]: فیض صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا سے سپر پاورز کی بالادستی ختم ہو جائے اور تیسری دنیا کے غریب ممالک خوشحال ہو جائیں۔

فیض: جس کو ہم تیسری دنیا کہتے ہیں اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سپر پاورز کی دست نگر ہے اور ان سے قرضے بھی لیتے اور ان سے چھٹکارا بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ غریب اور ملک کی تحریک میں شامل ہوں اور سپر پاورز پر انحصار نہ کریں۔ اسی طور پر ایسے نظام تشکیل دیں جس میں سپر پاورز کی مداخلت نہ ہو سکے۔ یہ بہت ہے کہ تنظیم اور نظام کی تبدیلی سے ممکن ہے۔ ایسا جلد ہو تنظیم اور نظام اور ان کی ... کر سکتے۔

حسن رضوی: فلسطین کی جدوجہد کے بارے میں پاکستانی ادیبوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک طرف تو فلسطین کی صورتِ حال پر ادیبوں نے زور دیا ہے اور دوسری طرف گذشتہ کئی سال سے افغانستان کی صورتِ حال پر کچھ ادیب چپ سادھے ہوئے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

فیض: میں تو نہیں سمجھتا کہ چپ سادھے ہوئے ہیں۔ فلسطین اور افغانستان کی صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ افغانستان میں ایک حکومت ہے اس کا طبقہ ہے اور ایک اُن کے مخالف۔ دونوں طبقوں کے حامی موجود ہیں، دونوں طبقوں نے اپنے اپنے حامیوں سے امداد طلب کی، نتیجہ یہ ہے بے چارے عام افغانی جنگ کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ اس مسئلے کا سیاسی تصفیہ ہو تا کہ کسی طریقے سے افغانستان کے عوام کو دونوں طرف سے جو کشت و خون ہو رہا ہے اُس سے نجات دلائی جائے۔

اشفاق احمد: روس میں بھی کسی طبقے میں ایسا احساس موجود ہے کہ افغانستان کے مسئلے کا سیاسی تصفیہ ہونا چاہیے۔

فیض: سب یہی کہتے ہیں۔ روسی بھی کہتے ہیں، ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن اب تصفیہ کیسے ہو؟

اجمل نیازی: پچھلے دنوں ہمارے ہاں افغانستان کی صورتِ حال پر نظمیں اور افسانے لکھے گئے ہیں کیا یہ ادب آپ کی نظر سے گزرا ہے؟

فیض: ضرور گزرا ہوگا۔ یقینی طور پر لوگوں نے اس مسئلے کو جس طریقے سے محسوس کیا ہوگا اُس کا اظہار ہوا ہوگا۔ فلسطینی مسئلہ تو افغانستان سے مختلف ہے۔ افغانستان بطور مُلک موجود ہے اور اُس کے عوام بھی۔ فلسطینی بے گھر ہیں بے یار و مددگار۔ اُن کی صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ ٹھیک ہے افغانستان میں روسی فوجیں موجود ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ جن کو مجاہدین کہتے ہیں وہ یہاں ہیں اور ایران میں ہیں۔ اُن کے حامی بھی موجود ہیں۔ تصفیے کی کیا صورت ہو، یہ تصفیہ طلب رہا ہے۔

جیلانی کامران: روس کی فوجوں کے افغانستان میں آ جانے سے روسی اثر گرم سمندروں کے قریب تر آ گیا ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ روس اب نظریاتی ریاست نہیں رہا امپیریلسٹ ہو گیا ہے اور وہ اپنی سرحدوں کی توسیع چاہتا ہے، کیا ہمیں یہ سوچنا چاہیے؟

فیض: اس میں مشکل یہ آ جاتی ہے کہ لوگ پہلے سے جس طرح سوچ رہے ہوتے ہیں اُس کی تصدیق چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ کسی قسم کی ترمیم کریں۔ امپیریلزم کا قصہ یہ ہے کہ امپیریلزم یہ نہیں ہوتا کہ محض کسی مُلک کو فتح کیا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مُلک کے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ سامراجی ممالک نے نہ صرف دوسرے ممالک پر قبضہ کیا بلکہ اُن مُلکوں کی معیشت، وسائل پیداوار اور دوسری چیزوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، اُن کا استحصال کیا۔ اب سوویت یونین کا جہاں جہاں بھی اثر ہے، مثال کے طور پر یورپ ہے یا ویت نام اور انگولا ہے، وہ بجائے اس کے کہ وہاں کے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے اُس نے انھیں امداد پہنچانے کی کوشش کی۔ کسی مُلک میں اندرونی داخلی انقلاب کی وجہ سے اگر سوشلسٹ حکومت قائم ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہ اُن مُلکوں سے کچھ حاصل کرے انھیں کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس کو تو امپیریلزم نہیں کہتے۔ افغانستان کا مسئلہ ذرا مختلف ہے، وہ اس وجہ سے کہ وہ اُن کا ہمسایہ مُلک ہے اور جو بھی دُنیا کی اس وقت صورتِ حال ہے کہ امریکا نے اور ریگن نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ہم سوشلزم کو ختم کر دیں گے۔ We will throw them into a dustbin of a street. اس صورتِ حال میں کچھ مصلحتیں بھی ہوتی ہیں جو بعض اوقات اصول سے بالاتر ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ہر مُلک کے لیے اپنے تحفظ کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی مُلک یہ نہیں چاہتا کہ اُن کے دروازے پر اُن کی مخالف کوئی اس قسم کی حکومت قائم ہو جائے جس سے انھیں خطرہ ہو۔ امریکا نے پانچ ہزار میل دور جا کر بھی ویت نام سے ٹکر لی تھی

آمریت ہے۔ افغانستان پر جو روس کے دباؤ سے ہوئی ہے۔ تو افغانستان سے ہمارے قومی تعلقات کبھی بھی دوستی کے نہیں رہے تھے بلکہ ان
کے مقابلے میں ہمارا ایران سے ہمیشہ تعلق رہا ہے اور اب بھی ہے۔ افغان عوام کی ہمدردی پہلی دفعہ ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ..: فیض صاحب: آپ افغانستان کے عوام کی خواہش کے حوالے سے انقلاب کو کیا محسوس کرتے ہیں؟

فیض: افغانستان سے ہمیں خاص دلچسپی رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارا افغانستان سے اب تک سب سے قریبی تعلق ہے۔ اس میں
جمہوریت آئی ہے۔ جس نے اپنا سارا نظام بدل دیا ہے۔ ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں آپس میں بہت زیادہ جھگڑے
ہیں۔ ایک تو اگر انقلاب ہوا ہے تو اس کے ساتھ اس کے مسائل ہیں اور اس کے نتیجے میں سب سے زیادہ تکلیف عوام کو
ملتی ہے۔ اور ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر روس کی فوج ہے تو اب یہ مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بنا ہوا ہے اور ان کے ہاتھ
میں اب کی تقدیر نہیں رہی۔ اب حکومت کا معاملہ صرف ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام ہونا چاہیے۔ ہمارا
ملک سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں جو حالات ہیں وہ بہت خراب ہیں۔ اس وقت وہاں جو ہو رہا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ
ان کا فائدہ ہونا چاہیے۔ دونوں طرف سے فوج اور ہتھیار ہیں اور صورت یہ ہے کہ عام لوگ پریشان ہیں اور ان کے
ساتھ ہمدردی کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جب تک انقلاب نے اپنی جڑیں مضبوط نہ کر لی ہوں اس
وقت ان کی مدد کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہاں امن قائم ہو۔ اس وقت بہت پریشانی ہے
دوسرا پہلو انقلاب کا ہے اور وہاں کے لوگوں کی زندگی میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے لیے ہمیں غور کرنا چاہیے
کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا انقلاب ہمارے لیے بھی ہے؟ آج کل پاکستان میں بھی وقت ہے کہ انقلاب کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ اقتدار
اور اقتصادی آزادی کی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔

شمیم ... : کیا یہ اسلام اور انقلاب کی حمایت کرنے کا مطلب بتائیں گے؟ اور اس بارے میں کچھ بتائیں۔

اجمل نیازی: فیض صاحب اسلام کے نفاذ کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے۔ مذہب کے بارے میں آپ کے خیالات کا اظہار
فرمائیں گے؟

فیض: ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں انقلاب ہی کے لیے آیا ہے۔ جیسا کہ اسلام سے پہلے زمانے سے یہ بات
رہی ہے کہ ہر سچا مذہب ایک پیغام ہے جو غریبوں کے حق میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی بنیاد ظلم کے خلاف جدوجہد کے
جذبات سے بنی ہے اور مذہب تو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انسان کی بہتری کے لیے کوشش کرنا ہی عبادت
کے لیے آیا ہے۔ یہ بات کہ ہمارا نظام ایسا ہو کہ اس میں ظلم نہ ہو اور جو ہماری معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہی
سب کچھ اسلام کا بنیادی مقصد ہے کہ انسانیت کی بہتری کے لیے ہو۔

اجمل نیازی: آپ کے بارے میں ایک تاثر ہے کہ آپ کے بارے میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے دور میں
کتاب ان کی طرف سے لکھی ہے ان کا خیال ہے کہ ایسا کیا گیا تھا۔

فیض: دراصل ہم لوگ مسلمان تھے اور ہمیشہ ان کی ولادت کے لیے ہم نے ہمیشہ مذہب کے حق میں سے بات کی ہے۔ اسلام کا
اپنا ایک مقصد ہے کہ اس کی تعلیمات کے مطابق ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنی مرضی سے دوسروں کے ساتھ
ظلم کیا کرتے تھے۔ اب آج سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مذہب اسلام کے خلاف جو کارروائی کی گئی
اس کا جواب ہم نے دیا ہے اور اس کی بنیاد پر ہماری آزادی ہے۔

قتیل شفائی: 1967ء میں جب میں سوویت یونین گیا تو ایک اتفاق ہوا، وہاں ایک تاشقند میں گیا، اب عبادت ہو رہی تھی، جمعہ کا دن تھا جب میں لشکر گیا تو وہاں ایک مسجد میں پچاس سے زائد مسلمان جمعہ کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اُن سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں مذہب اور کلیسا کو سرکاری سرپرستی حاصل نہیں، لیکن اگر ہم اپنے مذہبی فرائض ادا کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی روک ٹوک نہیں۔

نیر کامران: انقلاب کے بعد جو انسان سامنے آیا فیض صاحب اب فرمائیے کہ اس کی داخلی زندگی میں کوئی بحران ہے یا نہیں؟

فیض: اس انقلاب سے پہلے سوویت یونین کی ریاستوں میں روحانی، ذہنی اور تعلیمی شعبے میں خاصی محرومی تھی۔ اب ان ساری جمہوریتوں میں 90 سے لے کر 99 فیصد تک لوگ خواندہ ہیں۔ ان کی بھی یادداشت اور داخلی زندگی کے لئے بڑی رسائی ہوئی ہے۔ وہاں آپ کسی علاقے میں چلے جائیں، خواہ وہ کسان ہو، دست کار ہو یا مزدور، ہر ایک کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ علم سے، اعلیٰ تہذیبی اور ثقافتی مسائل سے اپنے رابطے قائم کر سکیں۔ وہاں ہر ریاست میں تھیٹر ہیں، سینما ہیں، موسیقی ہے، ادب اور ثقافتی ادارے ہیں۔ 1958ء میں جب ہم تاجکستان گئے اس کے صدر مقام کو دوشنبے کہتے ہیں، اس قصبے کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں پہلے کچھ نہیں تھا۔ وہاں ہمارے میزبان نے بتایا کہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں کوئی مدرسہ، کوئی ہسپتال، کچھ نہیں تھا۔ یہاں کے رہنے والوں کے اکثر بچے کھیل کود کے وقت کام کیا کرتے تھے۔ اب یہاں زندگی کی ہر سہولت موجود ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں تک داخلی زندگی کا تعلق ہے، اس کے بعد یہ ہے کہ کسی طبقے کی داخلی زندگی سے پہلے اعلیٰ ذہنی تربیت کسی خاص طبقے کے لیے وقف تھی۔ یہ محروم ہے کسی خاص طبقے کو ذکر … کیوں کہ اُن کو وہ مراعات اب حاصل نہیں رہیں۔ جہاں تک عام لوگوں کی ذہنی اور داخلی زندگی کو نشو و نما دینے کا موقع ملا ہے اس میں کسی بحران کا سوال ہی نہیں ہے۔ … اس طبقے کو کبھی کبھار یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنی ذہنی حیثیت کا اظہار کر سکیں، یعنی ریاست سے الگ ہو کر اپنا انفرادی … ہے۔

قتیل شفائی: انقلاب روس سے پہلے روس کا ادب خاصا اونچا ادب تھا۔ انقلاب کے بعد جو مقصدی ادب آیا اور ساری قدریں وہاں کی ختم ہو گئیں، کیا اس کے بعد روسی ادب میں عام انسانی جذبات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے؟

فیض: 1963ء میں ہم ماسکو میں جب … تھے … یہ سارے سوالات وہاں پوچھے گئے۔ انقلاب سے پہلے ٹالسٹائی اور چیخوف جیسے بڑے ادیب موجود تھے، ان کا سلسلہ کیوں رک گیا۔ آپ نے اُن کے بعد کیا تیر مارا۔ ہم وہاں موجود تھے۔ اس کا جواب ایلیا اہرن برگ نے دیا تھا کہ ٹھیک ہے ہم نے انقلاب کے بعد ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور شیکسپیر پیدا نہیں کیے۔ لیکن وہ چیز ضرور پیدا کی ہے جو ٹالسٹائی اور شیکسپیر پیدا نہیں کر سکے۔ شیکسپیر کا سارا انحصار … تھا لیکن … شیکسپیر کے پیدا ہونے سے لے کر آج تک … جتنے ایڈیشن چھاپے ہیں ہم اس سے زیادہ ایک سال میں چھاپتے ہیں۔ … 1934-35ء میں … جب … اور جب یہ پوچھا گیا تھا کہ … کے بارے میں لکھا ہے … ایک … ادیب … اپنے ساتھی سے پوچھا کہ … کے لیے … [illegible] … ادیب … ایک کارخانے میں گئے … نے ایک مزدور سے سوال کیا کہ … ادیب … پڑھتے ہو … کہ ہمارے معیار کی

سکتی ہیں۔

تحسین فراقی: سوال یہ ہے کہ مقصدیت کے ساتھ کیا ادب بنایا جاسکتا ہے، سیاست کے دل کی بات بھی کرتے ہیں یا نہیں؟

فیض: سٹالن کے زمانے میں ادیبوں پر حاکمیت تھی کہ بحیثیت مقصدی ادب ہونا چاہیے لیکن وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ اب وہاں نئے شاعر اور افسانہ نگار زندگی اور انسان کے داخلی معاملات کو بھی زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ چنگیز اعتماتوف، رسول حمزہ توف، سیمانوف اور دوسرے بڑے پڑھے اور لکھے جانے والے رائٹرز ہیں۔

سعادت سعید: آپ کا فرض میں یہ سوال بھی تھا کیا گیا تھا کہ روس کی رائٹرز یونین کے ممبر جو ہیں وہ آخر کیوں نہیں ہیں اور ان کے پاس چھپنے والی بہتر سہولتیں بالکل ہوتی ہیں۔

فیض: الیا ایرن برگ نے اس کا جواب بڑا اچھا دیا تھا۔ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تو ہم نے یہ طے کیا تھا کہ یہاں کے مزدوروں اور کسانوں کا استحصال نہیں ہوگا: کسی طاقت سے یہ بات دلائی جائے گی۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ہم بڑے سے بڑا رائٹر پیدا کریں گے اور ہم نے یہ طے کیا تھا کہ رائٹرز یونین پر کسی اور یونین کا قبضہ نہیں ہوگا۔

احسن رضوی: سوویت یونین کے انقلاب سے پہلے اور بعد کی شاعری میں آپ کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟ پہلے روس کی شاعری کا تجزیہ اور تجزیہ اسباب کیا ہے؟

فیض: یہ فرق جو ہے روس ہی کے حوالے سے نہیں ہوگا خود اپنے ہاں دیکھیے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے کی شاعری اور بعد کی شاعری میں کتنا فرق ہے۔ حالات کے مطابق شاعری اور ادب میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔

اشفاق احمد: میں تو عام قاری کی حیثیت سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کی شاعری کا طرۂ امتیاز محبت اور شفقت ہے، مہربانی، رنگ، وہ اس کی آواز اور اس میں موسموں کا تذکرہ ہے جو بچے ماں کے ساتھ دودھ پینے کے بعد جیسے تجربہ کرتا ہے۔ کیسے یہ بات عام آدمی کو حیران کرتی ہے؟

فیض: جو کچھ ہم نے پڑھا لکھا، سیکھا اور دیکھا اس کا تعلق دوستوں کی ذات سے کچھ نہیں ہے۔ دوستی کی ذات تو زندگی کے جہاں بہت سے امیر ادارے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ انھوں نے ہم سے دوستی کی، ہم نے بھی ان سے دوستی کی۔ ہم کی دوستی تو کی۔ آگے دیکھنے والوں نے بنا بھی ہو جاتی ہے۔

اطہر: روس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہاں ترمیم پسندی جنم لے رہی ہے۔ ترمیم پسندی کا رجحان پیدا ہو چکا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

فیض: روس کے بارے میں ترمیم پسندی کی جو بات کی جاتی ہے وہ ایک الزام ہی ہے۔ جس ترمیم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مارکس نے خود کئی امور میں ترمیم کی ہے۔ جسے ہم مارکسزم یا لینن ازم کہتے ہیں اس میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ مادی اور معاشی حالات کے مطابق تبدیلی ہونا کوئی نئی بات نہیں بشرطیکہ اس کے بنیادی اصول کو قائم رکھا جائے کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے خارجیت کی حیثیت ہوں۔ اس بنیادی اصول کو قائم رکھ کر حالات کے مطابق تبدیلی لازمی ہو جاتی ہے۔ روس میں مارکسزم کا تجزیہ ہی مکتب ہے تحقیق دولت کی ذاتی ملکیت کا اس میں کوئی فرق نہیں آیا ہے جسے ہم بنیادی نکتے کہتے ہیں۔ اس میں انھوں نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے۔ چین میں نظریاتی دولت کی تقسیم اور نظم و نسق کے طریقے مختلف ہیں۔ سیاست کے بیشتر تقاضے اور حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ روس اور چین دونوں میں معیشت اور سیاست کے اصول ایک سے ہیں۔ عملی تقاضے دونوں کے الگ ہیں۔ اسی طرح

ننگا سمجھا ہے میں بھی اور ہیں۔ جیسے چھوٹے ملکوں کی آزادی و ترقی / امارت کے معاملے میں اپنی مصلحت کے مطابق عمل کرتی ہیں۔ روسی دونوں محفوظ ہیں اور دونوں جنگوں کی حمایت کرتے ہیں۔ افریقی ممالک کی آزادی کا معاملہ ہے، فلسطین کا مسئلہ ہے۔ یہاں دونوں نے اپنے دوستوں کا ساتھ دیا ہے۔ ملکوں میں تھوڑا بہت فرق ہو تو ہو ورنہ کوئی فرق نہیں ہے۔

افتخار: کشمیر کے معاملے میں روس نے یہ پوزیشن کیوں اختیار نہیں کی؟

فیض: کشمیر کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ جب تک سارے حالات سامنے نہ ہوں، کچھ کہنا مشکل ہے۔ بڑے ملکوں کی اپنی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں روس والے خود اپنے مفاد کا خیال کریں گے کہ ضرورت ہے کہ ان کی مداخلت کریں؟

شکریہ

فیض کی تقریظیں......تخلیق و تنقید کی وحدت

فیض فہمی کے لیے صرف مستقل مضامین اور منظوم کلام کافی نہیں بلکہ تخلیقی ذہن کے اُن مطالب اور مضامین کی بھی ضرورت ہے جسے عام طور سے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ اضافی اور غیر ضروری تحریریں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مختلف معاصر تخلیق کاروں پر فقرہ تبصرے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ فیض نے ہر ایک تقریظ یا مختصر و جامع تحریر میں بڑی پتے کی بات کی ہے۔ تحریر کا ہر ایک لفظ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اُن پراگندہ تقریظوں اور بکھری ہوئی تحریروں کو موتی کی طرح سلکِ تحریر میں پرو دیا ہے۔ کچھ پیش لفظ یا تعارفی نوٹ فیض نے خود اپنی کتابوں پر لکھے تھے جنھیں اگلے ایڈیشن میں جگہ نہ مل سکی وہ تحریریں بھی اس مضمون میں جمع کی گئی ہیں تاکہ قاری اُس دور کے حال و احوال سے واقف ہو سکے۔ اُن تقریظوں اور تحریروں کی مذکورہ تاریخی حوالوں سے ترتیب دی گئی ہے۔ شاید یہ تقریظیں آج کے تقریظ نگاروں کے لیے مشعلِ راہ ہوں جو ہر شاعر یا افسانہ نگار کے مجموعۂ تخلیق پر صرف نام و نشان بدل کر تقریباً پورا متن دوسرے جملوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ فیض کی ان تمام تحریروں میں جو کتاب مطالعہ اور غور و خوض کے مرحلے سے گزرنے کے بعد خود ساختہ طور پر صفحۂ قرطاس پر بکھر گئی ہیں، سطور سے زیادہ بین السطور مطالب اور مفاہیم کی روشنی ہے اور یہی تخلیق اور تنقید کی وحدت ہے جو کثرت میں پھیلی ہوئی ہے۔

نقشِ فریادی

1941ء میں "نقشِ فریادی" کی اشاعتِ اوّل پر فیض کی تحریر:

اس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعترافِ شکست ہے۔ شاید اس میں دو چار نظمیں قابلِ برداشت ہوں، لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں۔ افسوس مجھے جب تک انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں۔ لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا ہے۔ شعر کہنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر کہتے رہنا ایسی دانشمندی بھی نہیں۔ آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبے کے زیرِ اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے۔ لیکن اب مضامین کے لیے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں اُن نوجوانی کے تجربات کی جزئیات بہت گہری نہیں ہوتیں۔ ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ اس منفرد اور معین تجربے کے لیے کوئی موزوں پیرایۂ بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے۔ لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بیکار بھی۔ اوّل تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انھیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ پھر اُن کی پیچیدگی کو دیانت داری سے ادا کرنے کے لیے کوئی تسلی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں شاعر کے ذہن کا عجز ہے۔ ایک کامل اور قادرالکلام شاعر کی طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے۔ اُسے یا تو اظہار کے

سے نئے اسلوب یا تو آ جاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو تخلیق یا ان کو اپنے مطالب پر موزوں کر لیتے ہیں لیکن ایسے شعرا کی تعداد بہت محدود ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی تحریک کی مرہون ہوتی ہے اور اگر ان تحریکات میں شدت کی کمی ہو جائے یا ان کے اظہار کے لیے کوئی سہل راستہ میسر نہ ہو یا تجربات کو بیان کرنے کا طریق ناکافی ہو تو سلیقہ اور سلطنت کا تقاضا یہی ہے کہ اتنی خوبصورت بات ہیں جو ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے۔ شعر محض کا شعر یا اس سے آگے جانا چاہیے۔

اس مجموعے میں نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے جس میں وہ لکھی گئی ہیں۔ پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں جنہیں محض تذکرے کے لیے بیاض سے نکال کر شامل کر لیا گیا ہے۔ تفصیل کی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی جگہ کے باوجود تجربہ ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی کبھی نہ کبھی محسوس کرتا ہے اور اس اعتبار سے سوچیے تو یہ تجربے عام ہیں سے ان تجربات کا خلوص تو محض ہوتا نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد آسانی سے اپنی ذات کو ترک کر دینا ممکن نہیں چھوڑ دیتا ہے اور نئے عالم فکر اور ہر تصادم کے پیش نظر اپنی انفرادی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی ترکیب اور اظہار کے نئے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور یہی وہ وقفہ ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

بہرحال یہ ابتدائیہ کرنے کے بعد معذرت بیکار سی چیز ہے اور ہر مصنف کا حق ہے کہ جو وہ چاہے تو اسے مطلق نظر انداز کر دے۔

ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے کچھ ضروری انحراف مناسب سمجھا ہے۔ کہیں کہیں نئے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور قوافی میں ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی بحث پر ترجیح دی گئی ہے اور بس۔ میں اپنے احباب صوفی تبسم، مجید ملک اور عبدالرحمٰن کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مسودات دیکھے اور ترتیب میں امداد کی۔ مقدمے کے لیے میں ن۔ م۔ راشد اور سرورق کے لیے مشفق مکرم خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

دست صبا

1952ء میں فیض نے "دست صبا" پر مقدمہ لکھا:

ایک زمانہ ہوا جب غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہم عصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی نقاد ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے یا یہ کہ غالب ادب میں پروپیگنڈا کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریحاً پروپیگنڈا ہے۔ اس کی آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدرو کا، شاعر کو اس سے کیا سروکار؟ یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیموں، فلسفیوں یا سیاست دانوں کا کام ہوگا شعرا کا کام نہیں ہے۔

اگر ان حضرات کی یہ بحث محض جمالیاتی یا ادبی بحث تک محدود رہتی تو طے ہو جاتا لیکن حسن کی پرستش (یا کوئی اور فن) بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے تو غالب کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں۔ اس لیے کوئی کامل شاعر یا ادیب قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر غالب کے قطرے سے زندگی اور معمورات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلے کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ادیب ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے بہاؤ، اس کی سمت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔

یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلے کا

منحصر اس کی بینائی پر ہے، اُسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنّی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر، اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔

نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز، اوجھل، دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے اُبلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں، اور پھر یہ پانی کٹتا، بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں ہم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے، اُس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نگاہ اُن گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی، لیکن اُن کی منظر کشی میں تخیل و لب نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جاں جہد و طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے۔

غالباً اس طویل و عریض استعارے کو روزمرہ الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں، اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہرطور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔

یہ چند صفحات بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہیں۔ ممکن ہے کہ فن کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے مظاہرے میں بھی نمائش یا تعلّی اور خودپسندی کا ایک پہلو نکلتا ہو، لیکن کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔

میزان

فیض نے 1962ء میں اپنے مضامین کے مجموعہ "میزان" پر مقدمہ لکھا:

ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کے لیے نہ کبھی فرصت میسر تھی، نہ دماغ۔ ریڈیو پر اور مختلف محفلوں میں اُن مسائل پر باتیں کرنے کے مواقع البتہ ملتے رہے۔ یہ مضامین انھیں باتوں کا مجموعہ ہیں، اس لیے ان میں بڑے سخن فہموں سے نہیں عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اب سے پچیس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔ بہت سی باتیں جو اس وقت بالکل نئی تھیں اب پامال نظر آتی ہیں، اور بہت سے مسائل جو اُن دنوں بالکل سادہ معلوم ہوتے تھے اب کافی پیچیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اب جو دیکھتا ہوں تو اُن تحریروں میں جگہ جگہ ترمیم و وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، لیکن میں نے یہ ردّ و بدل مناسب نہیں سمجھا۔ اوّل اس لیے کہ بنیادی طور سے ان تنقیدی عقائد سے مجھے اب بھی اتفاق ہے اور دوم اس لیے کہ ہمارے ادب کے ایک خاص دور اور اس دور کے ایک مکتبِ فکر کی عکاسی کے لیے ان مضامین کی موجودہ صورت شاید زیادہ موزوں ہو۔

ان پریشان اوراق کی تلاش اور شیرازہ بندی بہت سے احباب اور خاص طور سے جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب ڈاکٹر وحید قریشی کی امداد و اعانت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اُن کے خلوص اور کرم فرمائی کا ممنون ہوں۔

دستِ تہِ سنگ

فیض نے 1965ء میں "دستِ تہِ سنگ" پر مقدمہ لکھا:

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب مشغلہ یہی ہے۔ اس تمہید کے لانے کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مستقل آداب و رسوم بھی ٹھیر گئے ہیں؛ اعتبار میں آنے لگے ہیں اس لیے اب اسے ادب و رسوم میں شامل سمجھنا چاہیے۔ کوشش یہ رہی کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ کہنا نہ پڑے؛ اقبال مرحوم کی بات لیں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا اور "میں" کے بجائے ہمیشہ "ہم" لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی مؤرخ یا رسالوں کے حضرات مجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو، کیسے کہتے ہو، اور کس لیے کہتے ہو، بات کہاں سے لاتے ہو، کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ شاید کبھی کبھی جیسے بھی کہتا ہوں وہ ذہن پر ہے کیونکہ ہم شعر میں سے خود ڈھونڈ لیا کریں تو اس کی کیا ضرورت ہے، لیکن ان میں سے بیشتر قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی تشفی کی ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے جو یہ لکھا گیا ہے۔

شعر گوئی کا کوئی واحد عذرِ گناہ تو مجھے معلوم نہیں۔ اس میں بچپن کی فضا، گرد و پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ "نقشِ فریادی" کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں 1928-29ء سے 1934-35ء تک کی تحریریں شامل ہیں جو ہماری طالب علمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے، لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ 1920ء سے 1930ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست تھی۔ افسانے میں یلدرم اور تنقید میں "حسن برائے حسن" اور "ادب برائے ادب" کا چرچا تھا۔ "نقشِ فریادی" کی ابتدائی نظمیں "خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو"، "میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو"، "تہِ نجوم"، "کہیں چاندنی کے دامن میں" وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیرِ اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہمارے اس دور کا ایک حصہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ صحبتِ یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے اور کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے۔ اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو "نقشِ فریادی" کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے جسے میں نے "یاس" کا نام دیا تھا۔ وہ نظم یوں ہے:

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے

ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل

بس گئے تصورہائے فکر و عمل:
بزم ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیف کوثر و تسنیم

زحمت گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بخت نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے باب قبول
بے نیاز دعا ہے رب کریم

بجھ گئی شمع آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل

انتظار فضول رہنے دے
راز الفت نباہنے والے
بار غم سے کراہنے والے
کاوش بے حصول رہنے دے

1934ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور 1935ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم رشیدہ جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سودمند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اسی نئے احساس کی ابتدا نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو مرے محبوب نہ مانگ۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا!

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا!
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیسرا حصہ "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے اور [illegible] صحافت اور ریڈیو [illegible] وغیرہ کرنے کے بعد پھر چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے۔ [illegible] قید کے عرصے کی دو کتابیں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" اسی [illegible] کی یادگار ہیں۔ [illegible] تو یہ تحریریں انہی ذاتی محسوسات اور معاملات سے متعلق ہیں جن کا سرنامہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوتا تھا۔ [illegible] کی طرح خود ایک [illegible] تجربہ ہے جس میں [illegible] کا ایک [illegible] خود بخود کھل جاتا ہے۔ [illegible] ہے کہ [illegible] شباب کی طرح تمام [illegible] Obsessions [illegible] ہو جاتی ہیں [illegible] شام کے [illegible] آسمان کی [illegible] کے [illegible] کے بارے میں [illegible] ہے [illegible] دونوں باطل ہو جاتے ہیں۔

خارجیت کی تحریریں بھی بہت زوردار ہو جاتی ہیں اور ان کی تحریک اور لب و لہجہ کو تحریف کر کے اس طور سے ہٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ زنداں میں فکر و نظر کو مطالعے کے ... سخن کے تاریخی بادشاہ ... پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ اس جیل خانے کے دو دور تھے۔ ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے آگے بہت اور تحسین کا زمانہ تھا۔ ان دونوں زمانوں کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ پہلی "دستِ صبا" میں اور دوسری "زنداں نامہ" میں ہے۔

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے !
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل !
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم !
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی بڑھتی اٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت، بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر، اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج میرا دل فکر میں ہے اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ نفسا نفسی اور افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھوڑا، ایک بار پھر جیل جانا پڑا۔ شہر لاہور چھوڑا اور وطنی اور گرد و پیش کی فضا میں بکھرتے ہوئے مسلسل اور ہمہ گیر ماحول کی صبا کا احساس پیدا ہوا۔ اس کیفیت اور اظہار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار جب لکھے گا دور سے دل میں بات اپنی ہو گئی۔

صلیبیں میرے دریچے میں

فیض نے 1971ء میں اپنے خطوط کے مجموعے "صلیبیں میرے دریچے میں" پر مقدمہ لکھا:

اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ میں نے ہی لکھے تھے لیکن یہ کتاب میں نے لکھی ہے نہ چھپوائی ہے۔ اسے لکھوانے اور چھپوانے کے ذمہ دار ہمارے دیرینہ یار کتاب والے مرزا ظفر الحسن ہیں۔

بہت دن ہوئے پہلے مرزا صاحب نے تقاضا شروع کیا کہ ہم اپنی سرگزشت یا تجربات زندگی وغیرہ کے بارے میں کچھ لکھیں، وہ اصرار کرتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ آخر پیچھا چھڑوانے کی خاطر کہا کہ یہ خطوط ہیں انہیں لے جائیے ان کے ذریعے لکھیے کہ ان میں کیا قابل اشاعت ہے، چھانٹ خود ہی کر لیجیے۔ اس کے بعد سے وہ صرف ان خطوں کی اشاعت کے درپے ہو گئے تا کہ ان کے ترجمے پر بھی مجھ ہی کو مامور کر دیا۔ بہت کہا کہ اتنی فرصت نہیں تو تقاضا بڑھ گیا، اس لیے کہ انہیں کام چھوڑنے کے بہت سے گر یاد ہیں۔ لیکن یہ حضرت کاغذ قلم سنبھال سر پر سوار ہو گئے کہ آپ ترجمہ لکھواتے جائیے میں لکھتا جاؤں، نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ نجی خطوط ہیں جو کسی ادبی مقصد سے نہیں لکھے گئے ہیں، یہ کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی متحمل نہیں ہے کار ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں دل و ذہن کے چند معمولات ان میں سے ایک ذریعہ تھا بات کرنے کا ہے۔ اس لیے کوئی شکایت نہ ہو

ہوائی حملوں سے خوف، بچوں اور اقربا سے کوئی خبر نہیں ہے۔ موسم کی بات ہو، کسی کتاب کا ذکر ہو یا ذاتی محسوسات کا بیان ہر جگہ یہ سب قصے تحمل، تفکر و تجزیے کے بغیر بے ساختگی سے اس انداز میں لکھے جاتے ہیں جن سے لکھنے والے کی آزادی طبع کے بارے میں شاید بہتر واقفیت حاصل ہو سکے جتنی ان کی منظومات سے کہیں زیادہ بصیرت بہم پہنچ سکتی۔

اس کے علاوہ ان خطوط میں تسلسل کا جو سوال ابھی پیدا نہیں ہوا لیکن ہر خط کے معمے کی طرح کئی بار دہرائی جاتی ہیں، ترجمے کی صورت میں یہ کتاب شائع ہوئی جس کے اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ خطوط اصل میں انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بہرحال ایک مشکل کام ہے۔ اس مفہوم کی ادائی میں بھی کوئی خاص دقت پیش نہیں آتی لیکن انگریزی کا روزمرہ اور محاورہ اور ہر زبان کی طرح انگریزی کے روزمرہ محاورے، تشبیہات، ضرب الامثال، کنایات وغیرہ وغیرہ کسی زبان سے مختلف ہیں اور ہندوستانی ادب اور علامات سے بھرپور انہیں اردو میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن مترجم نے محنت اور تلاش کی مہلت ہی کب دی ہے کلام ہو یا تحریر، خطوط لکھے گئے تھے، ایسے میں "Fair Lady" اس کا ترجمہ کیا گیا ہے اور زبان و بیان کی ان کوتاہیوں کی ذمہ داری بھی مترجم صاحب ہی کے سر ہے۔

مجھے ان خطوط کی اشاعت کا ایک ہی جواز نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ ہمارے ہاں پڑھنے والوں کے لیے تو یہ چند کوئی غیر معمولی سی نئی بات ہو، تاہم نئی صورت میں بھی بالکل ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ہمارے مختصر ادبیات میں "حیات" ہمارے خود ایک موضوع تحقیق ہے۔ اس صورت میں شاید خطوط فیض احمد فیض کے تفتیشی تجربے کا ایک آدھ پہلو نمایاں کر سکیں۔

آہنگ

1938ء: مجاز کے کلام "آہنگ" پر فیض کا تبصرہ:

""آہنگ" کا پہلا ایڈیشن اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

شمشیر، ساز اور جام، مجاز کی شاعری انہی تینوں اجزا سے مرکب ہے۔ تیسرا اس وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول بھی ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا نے ان عناصر میں ایک فرضی تضاد کی روایت قائم کر رکھی ہے۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا ذہنی لیکن مجاز مہذب شاعر ہے (اپنے عہد کے زمانے میں) شمشیر کی صلاحیت اور ساز و جام کا ذوق دونوں ضروری ہیں ع

دلبری با قاہری پیغمبری است

مجاز کے شعر میں یہ مجموعی موجود ہے مگر اس امتزاج میں ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لیے ایک خاص قسم کے ذہنی زہد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مجاز کی طبیعت میں زہد کم ہے۔ لذتیت زیادہ ہے۔ شمشیر زنی کو میں تخیلی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ ذہنی زہد سے میری مراد ہے ایک مخصوص تخیلی مقصد کے شعر و اظہار میں ذہنی اور جذباتی یکسوئی، تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ یہ سخت اور محنت طلب عمل ہے۔ مجاز ہم میں سے اکثر کی طرح ابھی اپنا ذہن مکمل انکار نہیں کر سکے ہیں، چنانچہ جب بھی انہیں دل پسند رنگینی یا آسودگی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔

مجاز کے شعر کی ترتیب بھی ہمارے بیشتر شعرا سے مختلف ہے۔ عام طور سے ہمارے یہاں شعر و شاعری کا ارتقائی عمل یہ صورت

اختیار کرتے ہیں جیسے ساغر و جام، ساز و رباب، شمشیر و تیغ۔ مجاز کے شعر میں اس قبیل کی علامت یہ ہے کہ ساز و جام، شمشیر، ساز و رباب، شمشیر اور شب، گلستاں وغیرہ کے یہ علامت کبھی نہیں بدلتی ہے۔ ان کے کلام کی یہ خوبی ہے کہ شاعر کے مضمون اور تجربے میں مطابقت اور ہم آہنگی زیادہ گہری ہوتی ہوتی ہے۔ شاعر کی شخصیت خارجی اور داخلی تقاضوں کے ما تحت شعر پڑھتے جانے میں وہ لذت محسوس کرنے لگتی ہے۔
مجاز بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کی نزاکت بھی ہے جو ان کی آواز کو انفرادیت دینے لگتا ہے۔ یہی رومان مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور ان کے شعروں کا معیار بڑی حد تک اسی رنگ کے پیکر سے اور کے طور پر مجاز ہمیشہ سے کامیاب رہے۔ ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی لیکن ان کے آہنگ میں فرق نہیں آیا۔ کبھی ان کے آنکھ حقیقت کی تلخیوں سے الگ خواب محبت کے گیت گاتے۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ
اور بھی غیر ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حد نظر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانی سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
وہ تبسم پہ تبسم کا جنوں پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہاتے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجے ہم صورت جاناں بھول گئے

کبھی اس عالم گریزی اور مجبوری پر احتجاج کا انداز بھی جو سماج کے مصنوعی ہر قدم کا شکار اور بے جا جذباتی بھی ہوتا ہے:

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں؟
بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا گلستاں پھونک دوں

تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطانی الٹ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں؟

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کا تجزیہ کیا جس کے مطلق جواب غور و فکر کے بعد کوئی دیتے تھے ہیں

[illegible]
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی، پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ فنی معیار پر قریب ہے جس زمانے میں کہی گئی ہو ترنم سے آہنگ؛ اس کی ذہنی پختگی یا اس کے [illegible] ہونے کا ثبوت [illegible] کلام میں روایتی شعوری سطح پر اظہار ہے جس میں ان کی جذباتی تحریک اور محدود خیالی نہیں، بلکہ شعوری نزاکت کا احساس ہے ان کی [illegible] تخیلاتی اور لفظی [illegible] ان کے ترنم میں [illegible] ہے جس کے پیچھے [illegible] روشنی [illegible] نمایاں [illegible] ایک گہرا [illegible] ہے جس سے معنوی ربط میں الفاظ عجیب [illegible] اور معنی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ [illegible] سادہ پانی [illegible] کا اثر سے بے رنگ [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] کی مثال [illegible] ہے۔

ہم سے کہتا ہے زمانہ [illegible] خوش خرام
گزرے ہیں کچھ یاد ہی [illegible] سے ہم

....

[illegible] شب ماہتاب شباب
چشمِ مخمور [illegible] شب حجاب لیے
نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا
جسمِ ذوق [illegible] احساس [illegible] لیے

....

[illegible]
[illegible]
یہ [illegible] ہے [illegible] کی
یہ منزل بھی ہے [illegible] بھی

نئی شاعریت مجاز کی دوسرے انقلابی اور رومانی شعرا سے ممیز کرتی ہے۔

مجاز کی رومانیت عام رومانی شعرا سے مختلف ہے۔ عام رومانی شعرا محض تخیلاتِ شباب کے دائرے میں محدود انہی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن تھوڑے عرصے بعد ان میں ان تجربات کی تحریک، ان کی شدت اور قوت ختم ہو جاتی ہے۔ تمام رومانی شعرا کی شاعرانہ عمر بہت کم ہے۔ ان کا ایسا موڑ پر پہنچ کر ان کے اسباب جستجو ختم ہو جاتے ہیں۔ بعد میں وہ عمر بھر انہی پانچ دس نظموں کو دہراتے رہتے ہیں یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجاز کی رومانیت ان سے زیادہ گہری اور زیادہ مستقل ہے کیونکہ اس کا تعلق شباب سے ہے۔ مجاز کی ابھی تک اس دور میں ہے جہاں اس کے بچنے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ شباب کا تصور محض جسمانی نہیں۔ عام رومانی شعرا کی رومانیت زندگی سے فرار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں، موت کے سکون کی ہوس ہے۔ مجاز کی رومانیت زندگی کے نشے سے چُور اور موت کے سرد ہاتھ سے سراسر بیزار ہے۔

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تشنگی کی کیا کمی نہیں ہو سکتی، اس کی کمی بھی سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شعرا سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق ان کے ذہن میں آمرِ انقلاب کا تصور طوفانی برق و رعد سے مرکب ہے۔ خونریزی اور تباہی سے عبارت نہیں۔ وہ انقلاب کی صداقت کو دیکھتے ہیں، اس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ مجاز انقلاب کو محبوب کی طرح چاہتا ہے۔ برق و رعد کا دور مجاز پر بھی گزر چکا ہے، لیکن اب مجاز کی انقلابیت سے اپنا کھیل ہے۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

... ...

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا، ادھر بھی آ

برق و رعد والی نظموں اور ان کے بعد کی نظموں میں ..... ان میں انقلاب کی کا جبر نہیں ہے، بلکہ دلبری ہے... یہی وجہ ہے کہ مجاز کی "خوابِ سحر" اور "نوجوان خاتون سے" جیسی نظمیں اس کا ایک سب سے اچھی چند نظموں میں سے ہیں۔ مجاز ہنگامی انقلاب کا اعتدال پسندی انقلاب کا مطلب ہے۔ یہ سادگی یا مجاز کی ان مختصر نظموں کے متعلق ہے جو ابھی تک کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ مجاز کے مجموعے کی بندش نے قدر اور سلیقہ بھی دیا ہے، لیکن میں نے انہیں یہاں نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ یہ رائے میں نے مجاز کے مضامین کا جائزہ لیتے وقت جب اس کی آخری نظمیں سامنے آئی تھیں۔

خمِ کاکُل

1953ء میں فیض نے سیف الدین سیف کے مجموعۂ کلام "خمِ کاکُل" پر یہ مختصر تقریظ لکھی:

سیف نے اپنا مجموعۂ کلام غالب کے اس بلیغ شعر سے شروع کیا ہے:

تُو اور آرائشِ خمِ کاکُل

میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

یہ حرفِ آغاز نہایت موزوں ہے۔ غالب کا یہ شعر سیف کے دل پسند مضامین کا خلاصہ بھی ہے اور سیف کی دلپذیر طرزِ ادا کا آئینہ بھی۔

خمِ کاکُل کا حُسن اور اس حُسن کے پیدا کردہ "اندیشہ ہائے دُور دراز"..... سیف کا موضوعِ سخن بیشتر یہی ہے۔ حُسنِ خمِ کاکُل کم اور اندیشہ ہائے دُور دراز زیادہ۔ "اندیشہ ہائے دُور دراز" میں یہ اشارہ بالکل واضح ہے کہ دامِ اندیشہ، دامِ کاکُل سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا سلسلہ خمِ کاکُل سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن وہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ آشوبِ دہر، گردشِ روزگار، حُبِّ وطن اور دردِ غربت، جورِ اغیار اور مہرِ احباب، غرض غمِ دل اور فکرِ جہاں کی اَن گنت کیفیتیں ایسی ہیں جن سے اس کے رشتے ہیں۔ یوں کہیے کہ خمِ کاکُل تو محض ایک تجلّی کا بہانہ ہے، اس سے خیال کے جو شعلے روشن ہوتے ہیں اُن کا نور حلقۂ کاکُل میں مقید نہیں۔ اس نور سے شاعر کے عالمِ گرد و پیش کی بے شمار موجودات پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کا حُسن و صفائی، اُن کی تعمیر و خرابی، اُن کا نمو اور اضمحلال دکھائی دیتا ہے۔ اس عمل سے شاعر کی انسانی برادری کا ذہن جلا پاتا ہے، اور اس برادری کا دل رقّتِ احساس۔

مولانا حالی کی قیادت میں جب ہماری شاعری نے گُل و بلبل اور زلف و رخسار سے بغاوت کی (اور یہ بغاوت نہ صرف واجبی بلکہ لازمی تھی) تو ہم نے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیا کہ ان تجربات اور مضامین میں بجائے خود کوئی ایسی خرابی ہے جس کے سبب شاعر کوئی کام کی بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ ہم سمجھنے لگے کہ ایسے شاعر کو محض اپنے دردِ دل سے غرض ہوتی ہے۔ وہ ہمارے دل کا درد کیا جانے۔ اُسے اپنی شبِ فراق کی محویت میں یہ دیکھنے کی فرصت کہاں کہ یہاں صبحِ محشر کے آثار ہویدا ہیں۔ یہ مفروضہ صحیح نہیں، اگرچہ اس کا جواز آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ شاعری آپ بیتی بھی جگ بیتی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگر اس کا آئینہ شفاف ہے تو اس میں خمِ کاکُل کے ساتھ باقی عالم کا عکس بھی جھلکے گا۔ اگر اس کا اندیشہ رسا ہے تو اس کی حدیثِ دل میں ہمارے غمِ حیات کا باب بھی شامل ہوگا۔ غنائیہ شاعری کی قدر و قیمت جانچتے وقت ہم اس کے حُسن کے علاوہ اس خلوص اور مشاہدہ کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حدیثِ غمِ دل کہنے والا شاعر اجتماعی زندگی سے بے نیاز اور باقی انسانیت سے بے تعلق ہوتا ہے۔

دیکھنے کی بات یہ نہیں کہ اندیشہ ہائے دُور دراز کا رشتہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ رشتہ ہمارے دل تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور یہ بات محض الفاظ کی تراش خراش کی بات نہیں۔ انسانوں کے اجتماعی دُکھ درد کے شعور اور احساس کی بات ہے۔ سچی اور مؤثر غنائی شاعری میں اسی شعور اور احساس کا لازماً پرتو ہوتا ہے۔ یوں تو ہر داخلی واردات بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ اور اس کا اظہار بجائے خود تخلیقِ حُسن۔ لیکن اس حقیقت کی اہمیت اور اس حُسن کی قیمت ہم اپنی زندگی اور تجربے سے الگ ہو کر نہیں جانچ سکتے۔ نہ عام طور سے یہ بات ممکن ہے کہ ایک حسّاس شاعر اپنے دل کی ہر نازک دھڑکن سُن سکے۔ لیکن ہمسایے کے گھر کا کہرام اور واویلا اُسے سُنائی نہ دے۔

تجربے میں یہ دونوں آوازیں گھل مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا یہ ارتباط تدریجاً ہوتا ہے۔ شاعر کے فن اور ذہن کی تربیت کے ساتھ ساتھ شاعر اور اس کی انسانی برادری کے رشتے بھی زیادہ گہرے اور اُستوار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب سیف کے یہ اشعار دیکھیے:

اللہ اللہ وہ جشن کہ کبھی کیسا ہے
ہم سے بے درد کے مارے کہاں دیکھے ہوئے
رنگیاں رنگ کے تھے جن کے پیمانوں کی
ان سے بے دل بھی ہمارے نہیں دیکھے ہوئے

....

فرقت میں جن کو ہم نے ہم ہم کے ہاں گزارے
وہ جب سے جل گئے ہیں بیگانے ہو گئے ہیں
کہتے ہیں تھنہ غم ہر انجمن میں جا کر
ہم اہلِ دل بھی کتنے رسوا ہو گئے ہیں

....

اب عشق ہے آوارہ و رسوا سر بازار
وہ حسن سر بام بڑی دیر سے چپ ہے
وہ بزم کہ تھی باعثِ ہنگامۂ محفل
ہاتھوں میں لیے جام بڑی دیر سے چپ ہے

کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار میں ذاتی تجربے کے خلوص کے علاوہ ہمارے دور کے کسی مسائل و مصائب کا احساس شامل نہیں، اور حفیظ کے کلام میں یہ رنگ بتدریج زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے کہ وہ خود کہتے ہیں:

چھوڑا نہیں اب غم زمانہ
ہم فکر کریں کہاں دل کا

یہ صحیح ہے کہ اب تک وہ بیشتر دل ہی کی بات کہتے ہیں لیکن اب یہ کبھی دل اس خلوص اور درد سے کہتے ہیں کہ یہ بھی سب کو اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اب غمِ کاکل کے ساتھ آغاز یہ ایک احساس نظر آتا ہے:

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

یوں تو اس شعر میں کئی لفظی و معنوی محاسن موجود ہیں جنھیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان لفظی محاسن پر بہت کم ہے۔ اس کا انحصار اس اضطراری جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل جل کر پیدا کرتے ہیں۔ اس فضا میں تصورات کے کئی ٹکڑے بکھرے ہوئے ابھرے اُدھر تیر جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے۔ کئی جانے کئی کٹتے کئی رنگ بکھرے و بیچ بیچ نظر کے سامنے ابھرتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی تجلی ترتیب اور نکھار پیدا ہے دوسری طرف معانی کی دقیق اشارات۔ یہ حالت یا استغراق ہمارے کلام میں نادر ہے لیکن غزل کا اختصار اور وسعت اس کی مدعا کے متقاضی ہے۔ ہر چند سعدی سے حسرت موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ ہے، اپنے اپنے مضامین، اپنا اپنا طرزِ اظہار ہے لیکن ان کی غزلوں کے بالعموم یہ کم محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کے کلام کا مضمون ایک ہی اور ایک ہی خوبی ہے جو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لی ہے۔

حسرتؔ موہانی کے بعد یہ غم جاناں بنتے ہوئے کسی بھی غزل گو کے مزاج سے اتنی ہم آہنگ نہیں جتنی 'خم کاکل' میں ملتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ حسرتؔ کے بعد سیفؔ اتنا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے یا سیفؔ سے بہتر غزل کہی نہیں گئی۔ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ 'خم کاکل' کے دور میں غزلیات کا کوئی مجموعہ مشکل ہی سے نظر آئے گا جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا مسلسل اور ہموار انجذاب ہو جیسا سیفؔ کے کلام میں ہے۔

مجموعی طور سے اس کلام میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ صرف سیفؔ کی بیشتر غزلیں منظومات یا نظموں کے بجائے اپنی جگہ کسی مسلسل اور مرتب کیفیت کی عکاس ہیں یعنی کہ یہ تمام غزلیں مل کر بھی ایک ہی واحد کیفیت، غم دوری کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ کیفیت محرومی اور اداسی لیکن محبت کی کیفیت ہے۔ اس اداسی میں ناامیدی یا نا آسودگی کا احساس اور آشوب ہجر کا ایسا ہے کہ بھی ہو جو تاب کی اداسی میں ہے۔ لیکن جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں سیفؔ کی شاعری ایک احساس محرومی کی نہیں اور جب بھی وہ اس کا احساس کرتے ہیں سوز اور خلوص میں ڈوب کر کرتے ہیں۔ سیفؔ کی محبت میں حسرتؔ موہانی کا سا ولولہ زیست کی آسودگی بھی شامل ہے۔ اس لیے میں نے کہا تھا کہ ان کی شاعری میں حسن کا گلہ کم ہے اور اندیشہ ہائے دور دراز زیادہ لیکن جب بھی ان کی خم کاکل پہ نظر پڑتی ہے بھر پور پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

رنگ دیکھا نہ جوانی کا
زلف بھیگی ہوئی پسینے میں

سیفؔ کی مدح محبت میں بیشتر ایک ملائم انداز ہے۔ ایک پُرخلوص آرزو مندی جو کبھی بے دلی ہے اور خوش دلی بھی۔

خم کاکل کی دوسری خصوصیت اس کا شعرانہ اور صاف طریقۂ اظہار ہے جس سے ہماری موجودہ شاعری بہت دور ہوتی جا رہی ہے۔ اپنے مبہم خیالات میں کبھی تجھی تہہ دار تخیلی معانی پر چسپاں کرنے کے لیے صحیح پالینی کی ضرورت اور آہنگی قدرے نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان سے کئی ہی اپنے اشعار لکھنے میں آ جاتے ہیں:

وہ جفاؤں کو اگر جان گئے ہم
تم یہ سمجھا کہ بُرا مان گئے ہم
اب اور ہی عالم ہے جہاں کا دل ناداں
اب ہوش میں آئے تو مری جان گئے ہم
ہم اور ترے حسن تغافل سے بگڑتے
جب تم نے کہا مان گئے مان گئے ہم

ترفع فرحت عمل ہوتی ہے۔

ان مشترک خوبیوں کے علاوہ خم کاکل کے اشعار میں متفرق محاسن کئی نوع کے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن کا حسن اس موسیقیت، روحانیت اشاریت کا مرکب ہے جو غالب کے خم کاکل والے شعر میں ہے۔

وہ گریزاں نگاہ بھی نہ رہی
دل کی حالت تباہ بھی نہ رہی

....

صبح سے شام کے آثار نظر آنے لگے
سب سہارے مجھے بیکار نظر آنے لگے

کچھ ایسے اشعار ہیں جنھیں ذاتی تجربات کی صداقت اور خلوص نے منفرد کر دیا ہے۔

سیف اتنا بھی نہ کر ضبط کہ پھر ان کے حضور
خامشی درد کا اظہار نظر آنے لگے

....

شاید تمھارے ساتھ بھی واپس نہ آ سکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمھارے چلے گئے

..

تمھارے بعد خدا جانے کیا ہوا دل کو
کسی سے ربط بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا

....

بچے ہیں سیف دو ہی ہم علاجِ غم کے لیے
بلاؤں کو درد کی لذت جہاں سے ملتی ہے

اور بعض اشعار خاص صناعت کے نمونے ہیں جن کا شگفتہ اسلوب کام و دہن تک پہنچتے ہیں۔

کبھی جگر پہ کبھی دل پہ چوٹ پڑتی ہے
تری نظر کے نشانے بدلتے رہتے ہیں

ان کے جوہر بھی کھلے اپنی حقیقت بھی کھلی
ہم سے کھنچتے ہی وہ تلوار نظر آنے لگے

سیف میں یہ کمزوری ضرور ہے کہ بعض سے غزل گو شعرا کی طرح وہ بھی کبھی کبھی اور محض رعایت میں تعبیریں ایسی کرتے ہیں کہ رعایت الفاظ و معانی کا روایتی مقبوضہ انھیں کھو لیتا ہے۔ ایسے نمونے مجھے مشاعرے میں خوب چمکتے ہیں لیکن ان کی آب تھوڑے ہی دنوں میں ماند پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

آئے تھے ان کے ساتھ نظارے چلے گئے
وہ شب، وہ چاندنی، وہ ستارے چلے گئے

کیسے مر مر کے گزاری ہے تمھیں کیا معلوم
رات بھر تاروں بھری رات پہ رونا آیا

کتنے حباب تھے بزمِ جم میں نقش کے لگی
آئی برسات تو برسات پہ رونا آیا

بظاہر یہ سب نظر فریب اشعار ہیں لیکن یہ فریب ایسا نہیں جو چھپا رہ سکے۔ ایسی ترکیبات سے وابستہ شعرا زبان و بیان کی ذات ہے اور شعور و احساس کی طرح یہ بات بھی قدرت کو حاصل ہوتی ہے۔

پچھلے دس پندرہ برس میں ہمارے ملک میں ادب کی جو داستان رہی ہے، مجھے جو پختہ تر جانے ثابت ہوئے۔ ہر ایک چھاپ کسی نئے شاعر کے متعلق خوش آئند پیش گوئی کرنا بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے پختہ تر شعرا کی تحریریں کلاسیکی ہیں جن کے ان کے اولین مجموعوں میں سے ہے۔ حسن سیف کے کلام میں بھی ان کے مستقبل کا تعین کچھ ایسا مشکل نہیں۔ جدید شاعری میں کئی نئی تکنیکی نظریں سادگی اور اوائل شباب کے موہوم جذباتی تجربات پر ہے۔ اس سادگی کی میعاد اور ان جذبات کی ارزانی دونوں محدود اور عارضی چیزیں ہیں۔ آگے جس تجربہ اور ریاضت کو بھی نہ کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ اب ان کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ جوانی کی اولین واردات کچھ بھی اہم کیوں نہ ہو مگر محض ان کی آمد کوئی کمی پوری نہیں کر سکتی۔ تو محض اپنا خیال ہے اسے بہتر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ضرورت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی جذباتی اور ذہنی کائنات اظہار میں وسعت ہو سکے اور انھیں پہنچانے والے جذبات اور تجربات کی جو تہہ مختلف نہ ہونے پائے۔ حسن سیف کے کلام میں اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ شاعری کی ان بنیادی حقیقتوں کو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے توقع ہے کہ کسی طرح یہ کلام ان کے کمال فن کا اولین قدم ہے، آخری منزل نہیں ہے۔

برگ ریز

فیض نے 1971ء میں عرفان عزیز کے کلام "برگ ریز" پر یہ تقریظ لکھی:

"برگ ریز" کے مطالعے کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ عرفان عزیز ہر اعتبار سے ہمارے جدید شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ایک عاقل، بالغ، اجتماعی تجربہ اور حساس شخصیت کی تخلیق ہے جس کی تحت فکر و نظر اور خوبی اظہار کا اندازہ آپ اس کتاب کے مطالعے سے بھی پہلے ان کے حرف آغاز اور فہرست عنوانات پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے کر سکتے ہیں۔

شعر کے محاسن کے لیے ہمارے ہاں جو پرانی اور نئی اصطلاحات رائج ہیں مثلاً سوز و گداز، سلاست و روانی، مضمون آفرینی، قدرت کلام، زور بیان، خلوص، بلند، صداقت، جدت، پختگی فکر، خلوص، حقیقت، رنگ، اثر، وغیرہ وغیرہ اس کتاب میں آپ کو ان سب کی مثالیں جا بجا ملیں گی لیکن یہ سب روایتی الفاظ کتاب کے بارے میں کوئی متعین تاثر نہیں بنانے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ان کی شاعرانہ جوہر کے بعض اچھے نمونے ہیں جن سے غزل سادہ اور ان کا رنگ معتبر ہوتا ہے اور جس پر عام طور پر نے موقع ملتی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام کی سادگی اور گداز بے ساختہ خود اپنی آواز اور معنویت جتلا دیتے ہیں۔ ان کی خیالات اور تخلیقی اسلوب کا خلوص، تعلّی اور بے جا نمود سے پاک ہے۔ ان کی زبان اور لہجہ غزل کی کلاسیکی روایت کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے مزاج کا ہے کہ بہت سے ان کے یہ نثر بھی مجروح نہیں ہوتا۔

[illegible]

فیض نے ماسکو سے 1978ء میں ... کے منتخب کلام "آرزو ..." پر پیش لفظ لکھا:

اس مختصر مجموعے میں ... نے گزشتہ ... برس کا منتخب کلام شامل کیا ہے جسے ایک طرح سے ان کا ... ایڈیشن ہے۔ پڑھنے والوں کو شاید سب سے پہلے تو اس مجموعے کے اختصار سے شکایت ہوگی اور یہ تجسس بھی کہ ان کی چیزیں اس سے باہر رہ گئی ہیں اور کیوں؟ اس کا جواب تو ... کے پاس ہوگا لیکن اس انتخاب سے ان کے ... کا عام طور پر پتہ چل جاتا

چاہیے اس لیے کہ ان کے فکر و جذبہ اور اسلوب اظہار کے سبھی پہلو اس اشاعت میں موجود ہیں۔

پچیس برس یعنی ربع صدی کا عرصہ کافی طویل عرصہ ہے جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ان منظومات کا ایک خاصہ تو یہی ہے کہ ان میں وقت کی پرچھائیں کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ لہجے کی کھنک، الفاظ کا بانکپن، رعنائی خیال اور وفور جذب و شوق جس پہلو سے دیکھیے آج کے کیفی وہی کیفی ہیں جنھیں ہم اور آپ پچیس برس سے جانتے ہیں۔ اپنے شاعرانہ مقام کے اعتبار سے اب وہ جوان اور نوجوان شعرا کی صف سے نکل کر بزرگانِ فن کے دائرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن بزرگی کے ساتھ مشغول ہو گئے تو قول ہے غالب کا جو تصوّر وابستہ ہے اُس کا کوئی شائبہ کیفی کے کلام میں کہیں نہیں ملتا، صرف اتنا ہے کہ اب اس میں آرائش خم کاکل، کا بیان کم ہے اور اندیشہ ہائے دور و دراز سے رغبت زیادہ۔

بنیادی طور سے کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے لیکن غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ غم جاناں کا ذکر ہو کہ غم دوراں کا .... بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی، کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔ جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے اُسی کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلک شعر ہے۔ نہ تلخ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخ کلام سے گریز کرتے ہیں، نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن نکھرے ہوئے، دردمند، فکر انگیز اور حساس نظریہ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے، جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔

طول کلام کے نہ کیفی قائل ہیں نہ میں ہوں۔ تعارف کے وہ محتاج نہیں اور تنقید کے لیے دفتر درکار ہے۔ یہ چند حروف تو محض اظہار خلوص کے لیے لکھ رہا ہوں، اس لیے کہ میری نظر میں کیفی ایک عزیز دوست ہونے کے علاوہ ہمارے دور کے نمائندہ اور باکمال شاعرانہ معتبروں میں سے ہیں۔

☆

فیض احمد فیض نے امجد اسلام امجد کے کلام پر مختصر تقریظ لکھی:

امجد اسلام امجد صاحب اب اتنے کم عمر بھی نہیں ہیں کہ انھیں ہونہار نوجوان ادیبوں میں شمار کیا جائے اور اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں ہیں کہ کہا جا سکے کہ اب انھیں اپنا مقام آ گیا ہے اور اپنی خوبیوں (اور خامیوں) میں پختہ ہو چکے ہیں۔ وہ فی الحال فکر و فن کی ان منازل میں ہیں جو جہد و تلاش کی منزلیں ہیں اور عام طور پر ہر ادیب کی تخلیقی عمر میں سب سے اہم دور یہی ہوا کرتا ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے باوجود امجد اسلام امجد صاحب کی طبع شاید نظم ہی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ غزل تو ایک طرح سے کشیدہ کاری کا کام ہے جس میں ایک دیے ہوئے ڈیزائن کی چوکھٹ میں شاعر کے جذبہ و خیال کی مدد سے ہزار رنگ کے پھول پتیاں اور نقش و نگار اُبھرتے ہیں، لیکن اس بنیادی ڈیزائن میں ایجاد و اختراع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور امجد صاحب چونکہ طبعاً جدت پسند واقع ہوئے ہیں اس لیے انھیں نظم کی صورت میں آہنگ و اظہار کے نئے پیرایے ڈھونڈنے کا راستہ نکالنے میں زیادہ کامیابی ہوتی ہے، چنانچہ:

بھٹک رہے ہیں تُو بدن میں تجلی بن کر رات

یا   چُن لو اپنے اپنے خواب، دو آنے بھی دو آنے

یا   قریہ قریہ پوچھ رہی ہے خلقت ایک سوال

اور ایسی دیگر تحسیں بہت خلوص اور سہولت سے لکھی گئی ہیں۔

پیش لفظ

فیض احمد فیضؔ نے افتخار عارف کی شعری تصنیف "مہرِ دونیم" پر پُر مغز تقریظ رقم کی:

آج کل ادبی حلقوں میں دو چار سوال اکثر سُننے میں آتے ہیں:

کیا ہمارے شعر و ادب پر جمود طاری ہے؟

کیا وہ شاعری جسے جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے، نثری نظم، آزاد نظم، تغزل سے عاری غزل وغیرہ وغیرہ۔ اس جمود کا توڑ نہیں ہے؟

کیا نئے لکھنے والوں میں کوئی ہونہار بِروا ایسا نہیں ہے جس کے چکنے پاتوں سے کچھ اُمید وابستہ کی جا سکے؟

افتخار عارف کا پہلا دیوان دوبار پڑھنے کے بعد مجھے یہی محسوس ہوا کہ اس کے اوراق میں کُلی طور سے نہیں تو جزوی طور سے ان سوالات کا جواب موجود ہے۔ اور یہ غالب کی طرفداری اس لیے نہیں ہے کہ افتخار عارف سے یوں تو کافی دنوں سے یاد اللہ ہے، لیکن اب تک ہم صرف اُن کے ٹی وی کمالات سے واقف تھے، اُن کے کلام سے محظوظ ہونے کا پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔

تو پہلے جمود اور حرکت کے مسئلے پر غور فرمائیے:

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ محض روایات کی لکیر پیٹتے رہنے سے شعر و ادب کی گاڑی آگے نہیں چلتی، لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اگر باکمال سخن ور اس سے ذرا ہٹ کر کسی پُرانے ڈیزائن پر نئے نئے بیل بوٹے بناتے رہیں یا کسی ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھتے رہیں تو ان کاوشوں سے اچھا ادب ضرور تخلیق ہو سکتا ہے لیکن آنے والوں کے لیے کوئی نیا رستہ نہیں کھلتا۔ اس کے برعکس یوں بھی ہے کہ جیسے ڈیڑھ اینٹ سے کوئی مسجد نہیں بنتی، اسی طرح کسی ایسے ڈیڑھ ادب سے کوئی تحریک بھی نہیں چلتی جس کا کلام وہ خود یا اُن کے دو چار احباب سمجھیں، جو ادب کے عام شائقین سے مخاطب کرنے کے بجائے اپنی اپنی ٹولی میں "من ترا حاجی بگویم" کی گردان کرتے ہیں۔ جنگل میں کتنے ہی مور ناچا کریں، تماشائیوں کو اس سے کیا مطلب۔

دُوسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی ایک ہی مضمون کی مکھی پر مکھی مارنے کو مضمون آفرینی نہیں کہتے، اسی طرح بھینس کے انڈے سے رو غن گُل نکالنا بھی کسی بدعت یا جدّت کا ثبوت نہیں ہے۔ اس نوع کی جدّت اور تنقی یا تخلیقی ایجاد و اختراع میں وہی فرق ہے جو موسیقی کی اصطلاح میں اُپج اور بے سُرے پن میں فرق ہے، یا دینی اصطلاح میں اجتہاد اور بدعت میں فرق ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ جیسے قانونی قاعدہ ہے کہ حقیقی انصاف کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف منصفانہ ہو بلکہ منصفانہ نظر بھی آئے۔ اسی طور سے کسی بھی شاعرانہ تجربے کے لیے لازم ہے کہ وہ نہ صرف شاعرانہ ہو بلکہ اس کی شعریت اُجاگر بھی دکھائی دے۔

اور آخری بات یہ ہے کہ اپنے من میں ڈوب کر صوفی کو تو شاید زندگی کا سُراغ مل سکے لیکن ادیب یا شاعر کو یہ سُراغ لگانے کے لیے اپنے من ہی میں نہیں، اپنے ہم عصر انسانی برادری کے مَن میں بھی ڈوبنا پڑتا ہے۔ اُسے یہ جوہرِ ودیعت ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ کم از کم اُس کی آنکھوں سے ٹھیک دید کو پہچان سکیں، اور کم سخن زبان اُس کی زبان سے اپنے درد و کرب، غیظ و غضب یا اُمید و طرب کا اظہار کر سکیں۔ ان بیان کردہ نکات میں آپ کسی کو بھی کسوٹی ٹھہرا لیں، افتخار عارف کی بہت سی تحریریں اس پر پوری اُتریں گی۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت اپنے الفاظ میں یوں ہے کہ ایک پرندے کے چہچہانے سے آمدِ بہار کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اپنی جگہ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ گلزارِ سخن کو کوئی نیا خوش نوا کسی نئے دبستان کے کھل جانے کا امکان بھی بہم پہنچا دیتا ہے اور اس کی

سمجھ میں بھی آتا ہے کہ اس کے تخلیق کرنے والے شعر کے ہر بڑے شاعر کی نظیریں بھی آہنگ منتخب ہے (Diction) اور لفظیات (Imagination) تخیل، مضمون ربط سب میں نئی زندگی ڈالنے کی صلاحیت پیدا کی ہے یا انہیں بھی اس کے معاصرین کو منتخب اور محسوس کر سکے...... کوئی بھی لفظ یا لفظان، جسے شاعر وا ہے جل کر ڈالے نہیں، اچھا لگتا ہے۔ افتخار عارف کے کلام میں بھی یہ خوبیاں موجود ہیں۔

اب یہ کہا گیا تھا کہ زیادہ کوئی لازمی نہیں ہے۔ جو نظم میں آزاد نظم کہنے والے اس کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ نظم کی آزادی پابند نظم کے کسی شاعر کی آہنگ یا کسی وزن کی پابندی ترک نہیں ہے۔ حالانکہ ان کو قریب یا شعری کوئی آہنگ کے ساتھ ہی ہے یا نہ دکھا سکتے ہیں اور افاعیل ادا کی ہیں..... یعنی موزوں شعر کے لیے مروجہ عروضی وزن کا ایک پیمانہ نہیں ہے وزن برقرار رکھنے کی انفرادیت بھی ہیں ساتھ ہی ایک دقت یہ بھی ہے کہ اگر ہم نے وزن کا پیمانہ اردو کی بحر کا بنا ہے جو عربی عروض کا ہے لیکن یہ تو عربی زبان کی ساخت کی خوش موزوں طریقے سے ادا کر سکتے ہیں تو ہماری بلکہ مروجہ بحروں کا عربی عروض میں کوئی ذکر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے فارسی والوں نے اپنے مزاج کے مطابق عربی بحور میں تحریف کر کے ان تمام کو زحافات کا نام دے کر ختم ہوئے اور پھر قلی قطب شاہ سے لے کر میر صاحب اور غالب اور اکبر آبادی تک ہمارے ہاں بھی ان میں تھوڑی کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ بہرحال ترکی شاعر ناظم حکمت نے ایک گفتگو میں ہم سے کہا تھا کہ روزمرہ بول چال میں بھی ایک آہنگ یا Rhythm ہوتا ہے لیکن اسے دریافت کرنے اور تحریر میں لانے کے لیے بہت حساس کان چاہییں۔

بہرصورت یہ بنیادی اولی بات ہے کہ لے یا تال یا آہنگ ہر شخص میں بنیادی طور سے فطرت کے ساتھ ہیں۔ اصوات سے بے ترتیب لیے کہ ہر ایک شخص کو کان اور فطرت کی صوتی ترتیب اور تکرار وغیرہ کے سبب موزوں اور مترنم لگ رہا ہے تقطیع کے مقررہ پیمانوں میں بانٹ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ افتخار عارف نے پہلی تو کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے یہاں کسی عروض کی پوری پابندی کی ہے ... جیسے 'میلا' 'ہم زمان بکھر ان' وغیرہ میں وہ نظمیں اس سے بہت الگ ہیں:

گھونگھٹ کی تاریکی میں روتی ہوئی راتیں
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی راتیں
جلتے ہوئے خیموں میں آئی ہوئی راتیں
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں

یا..... جیتنے والوں کو یہ معلوم کہاں کہ یا تحفہ کا مجھا کیا تھا اور کس کی زد پہلی تھی لیکن کہیں کسی نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ اس نے کسی بھی نظم پر شعری فکر کا نمونہ نہیں ہوتا کہ نظم شعری سطح پر تقطیع سے انحراف کے سبب بھی ان میں آ گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مختصر نظموں میں ان کا مضمون لگتا ہے تو پہنچ بھی جاتا ہے اور نہیں بھی آتا ہے۔

افتخار عارف کے کلام میں میر و غالب سے لے کر فراق اور اختر تک کئی کی جھلکیاں موجود ہیں لیکن آپ نے ان کو اپنی نئے لہجے اور لہجے کی سی کے ساتھ ہی ہوتے نہیں کی۔ لے کر نے اور آہنگ کی طرح نہ تو نیا ان کو ذاتی بات سے اور لفظ اور محاورے میں بھی کی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے کہیں کہیں اردو اور زبان کے شعرا سے کام لیا ہے تو کہیں روزمرہ کی بول چال کی تشعیریت سے پیدا کیا ہے۔ شخصی کردار نگاری کا فریضہ بھی انجام دیا کی صفت کی ہے۔ آج کی غزل سے جو دو استعارات کی یاد ہیں ان پر توجہ دینے کے بجائے غزل کے کئی علامتیں بدل کر رکھ دیے ہیں۔ لیکن سے زیادہ مانوس تعبیر کو سہارا لیا ہے اور روایتی زمینوں پر شعر کہا ہے لفظ چند روپ سے اردو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بدلے میں مستعمل تعبیریں استعمال کی ہیں اور نئے مطالب کو کافی پیدا کرتے

نے بجائے خود صبح اور بجلی جیسے سے شعر کا حصہ کا دیا ہے:

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا
اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
بیچ آئے سر قریۂ زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

....

جب شب ہو تو اجالے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو خواب بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
بات تو جب ہے کہ اے گریۂ جاں خوشبوئے حرف
مدح قاتل میں مثالیں بھی ترے شہر سے آئیں

پھر جدید مضامین و مطالب کی ادائی میں روایت کے خزینے سے یوں کسب فیض کیا ہے کہ تیغ کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و کنایہ کا نیا سامان پیدا کیا ہے۔ اس فن میں اب سے پہلے عشق و غضب ابرار و جاں فروشی۔ جبر و تعدی کا مضمون صرف منصور، قیس اور فرہاد و جم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب کربلا میں وارد ہوئی کی بات چلی تو شیخ و خطیب کے حوالے بھی آ گئے یعنی الحیدر، کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر محض سلام اور مرثیے تک محدود رہا۔ جبکہ علامہ اقبال کی فکر تک یہ بات پہنچی:

خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را

یا

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

لیکن فراز نے کربلا کے احوال واقعی کے لیے اس مقدمے سے بڑھ کر اثر انگیزی اور جمالیاتی کام لیا ہے۔

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

....

میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پہ اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا میرا قبیلہ بریدہ و بے بدن سروں کی گواہیاں لے کے آئے گا
پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے

گزارش احوال واقعی کے سلسلے میں ظلم و تعدی، جبر و زباں بندی کی شرح یوں کی ہے:

مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سربریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولتِ غنیم بانٹ دی گئی
طنابِ خیمۂ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے

....

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر
بین کرتی رہیں اور ہوا چپ رہی

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

....

کھلا جو روزنِ زنداں تو تیر آنے لگے
اب ان فضاؤں میں تازہ ہوا نہ مانگے کوئی

دوسرا مضمون تنہا فرد کی بے کسی اور بے بسی کا بھی ہے اور حریف سے نبرد آزما ہونے کی طلب اور تمنا کا بھی:

چھوٹے چھوٹے فرعونوں کا اک لشکر
اور اکیلا میں، میرے ہاتھ عصا سے خالی

....

میں اکیلا آدمی کیسے لڑوں
میں تنہا آدمی کیسے لڑوں

....

میں لاکھوں دل سی کر میں اسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کبھی آپ ہی چولی دامن سی اپنی......
اور اب مجھے میرے شہ سواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو گھر سے نکل آیا ہوں

....

تمھیں زیرِ حد سر خوشنیز خطابات
رزق کی مصلحت کا اسیر آدمی
ریگزار وں پاسون نے پا دیا
جسم میں سب ان کا اثر ہے تو پھر رہا Dr کیوں نہیں

تیسرا مضمون رزق کی مصلحت کے اسیروں کی منافقت اور ان آسائش کو بھی ہے اور اس سے تو کل سے ہر کوئی کو بھی۔

ابھی آنکھ بھی لگی نہ تھی کسی کا دست کرم
کہ سارا شہر لیے کاسہ طلب نکلا

.... .

ملیں تمہیں آپ رزاق کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو نیا رزق بانٹ دو شاید نہ آئے

....

رزق اک نادر تحفہ ہے کسی مطلوب کے ساتھ
بندگی کی بے سی قیمت نہیں ہوگی ہم سے

....

خنجر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے
ہاتھوں میں خنجر لے کر دکھانے والے دیکھے

اور آخر میں بظاہر غیر منظم انتخاب ہوت:

ہم اہل انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
غمِ جہاں کو طرح سو کرنے والے کیا ہوئے
وہ ساری عمر انتظار کرنے والے کیا ہوئے
کہاں ہیں وہ جو دشت آرزو میں خاک ہو گئے
وہ صحرا ابر انتظار کرنے والے کیا ہوئے

یہ سوال شریف جو ان کا ہے جس کا تجزیہ مقصود نہیں۔ میری نظر سے یہ بھی تو اتفاق نامہ ہے کہ نتیجہ بھی اکل کھری ہے۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ یہ حقیقت حال کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ اس میں اعتراف شکست زیادہ ہے، جذبۂ عمل، حسن مبارزت کم، اضمحلال زیادہ ہے، اشتعال کم، حزن و یاس کی پرچھائیاں زیادہ ہیں، امید و رجا کی جھلکیاں کم ہیں۔ انکی کی نشاندہی کی ہے۔ ہمدردی کا موضوع بھی غالباً درست ہے۔ ہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ تصویر کا یہ رخ بھی حقیقت حال کا ہی ایک رخ ہے اور اس کو یوں بیان کرنا خود ادیب ہی کا حق ہے۔

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد آخری سوال کا جواب ضروری نہیں ہے جو مستقبل کے بارے میں اٹھایا گیا تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی مصنف کا مقام یا اس کی تصنیف کی قدر و قیمت مستقبل سے قطع نظر اسی وقت متعین ہو جانی چاہیے جب وہ ظہور میں آئے، چنانچہ الطاف و رفعت سے ہونے کا امکان ہے کہ نہیں کہ یہ موسیقی کی اصطلاح میں ان کے ہاں ہے۔ اگر کچھ نہیں کہیں تو کم از کم یہ بیان کی صلاحیت ہوتی ہے جس میں وہ نئی ہیں تو اتنی کہ یہ کتاب جدید ادب میں ایک معتبر مقام پانے کے لیے پوری طرح کافی ہے۔

چند روز اور

1954ء میں فیض نے خدیجہ مستور کے افسانوں کے مجموعے "چند روز اور" پر یہ تقریظ لکھی:

"چند روز اور" خدیجہ مستور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ آج سے کوئی چار برس پہلے ان کا دوسرا مجموعہ "بوچھاڑ" کے نام سے شائع ہوا تھا اور تب سے سنجیدہ ادب کے طالب ان کو ایک صحت مند افسانہ نگار کے متعلق توقع سے پہچانا کرتے ہیں۔ "چند روز اور" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنفہ نے دو برس کے مجموعے سے کچھ نہایت دلکش باتوں میں تکلف بے وجہ فن کو ترک کر دیا ہے۔ یہ بات میں محض تعریف کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے خدیجہ مستور کے پہلے افسانوں کی تعریف مقصود نہیں۔ ہمارے ہاں آج کل عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ نوجوان لکھنے والے اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک آدھ کتاب لکھ چکنے کے بعد عمر بھر اپنی ہی نقل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک خاص مرحلے کے بعد ان کی تخلیقات میں نمو اور ارتقا کا عمل رک جاتا ہے۔ "چند روز اور" اس بات کا ثبوت ہے کہ خدیجہ مستور نے ابھی تک اپنے پرانے اور تنگ دائرے سے نکلنے کی سعی نہیں چھوڑی اور اپنے تجربات اور مشاہدات کی وسعت سے اپنی تحریر کو اتنا وسیع کر لیا ہے کہ ان کی کہانیوں میں وسعت اور گہرائی کی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔

خدیجہ مستور کے ابتدائی افسانوں میں دو تین خوبیاں بہت زیادہ واضح ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ ان میں تصنع بہت کم ہوتا ہے۔ تقریباً سبھی افسانوں میں خصوصیت کو جزئیات نگاری یا واقعیت نگاری کہتے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہوں گے جن کو پڑھ کر حقیقت کی تلاش کرتے ہوئے کسی نئی چیز کی دریافت ہوتی ہے۔ ایسے لکھنے والے واقعات کے بیان سے آگے نہیں بڑھ پاتے ہیں۔ مگر مصنفہ حقیقت کی روشنی میں ان کا تجزیہ بھی کر لیتی ہیں کہ پڑھنے والے کی تحریر کا تجزیہ ضروری نہ سمجھے کے اثر کو قبول کرے۔ چنانچہ تشدد اور تعصب سے وہ بہت کم متاثر ہوتی ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں ان کی بہت عمدہ اور سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے لیے بعض نئی ایسی باتیں کہیں جن کے متعلق ہم ہمیشہ سے خاموش رہے ہیں یعنی عورت مرد کے جنسی تعلقات اور محسوسات۔ اس معاشرے میں وہ ... عورت کی زندگی ... ایک دوسرے سے کٹ کر چلے آئے ہیں ... عورت کی زندگی میں اب تک ... ہے۔ ... اس بارے میں ... سے کام لیا ہے جس کے لیے ... عورت کی زندگی ... کی ...

چیزیں اور انسانی زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں قریب قریب آ جاتی ہیں۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ خدیجہ مستور کی ناول نگاری حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ "آنگن" اور "چند روز اور" کے تمام افسانے ایک خاص ماحول کے معاشرتی فضا کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ مستور کے کرداروں کی زندگی ہماری دیکھی بھالی ہے۔ یہی معاملات کی منظر کشی میں بھی ان کی تحریر وقت کے کسی پہلو کے بیان میں جذبات کے کسی پہلو چھپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تخلیقی افسانے واقعیت کے ساتھ گہرے ہیں اور ان کا مقصد حتمی انداز سے مکمل طور سے ہم آہنگ ہے ان کا احترام کیا ہے۔

اس معاشرے کی ہمدردی کا اظہار مصنفہ بڑی خوبی سے واضح کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات ہے کہ خدیجہ کے افسانوں کا منظر عام طور سے نچلے درجے یا متوسط طبقے کے گھٹے ہوئے ماحول سے متعلق ہوتا ہے اور انھیں طبقوں سے ان کے بیشتر کردار تعلق رکھتے ہیں۔ غربت، بے بسی، نادانی اور بے مروتی ان کا مستقل پس منظر ہے۔ انسانی اقدار کی پامالی اور افعال و اعمال میں اسی طرح جھلکتا رہتا ہے کہ ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے ہمدردی کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنفہ ان کرداروں کے قالب میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کرتیں [illegible] ان سے کسی قربت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور سے وہ عورت مرد کے جنسی اخلاق کا [illegible] مخصوص کرتی ہیں [illegible] یہ اقدار کی پامالی ایک حد تک کم ہو جاتی ہے۔

خدیجہ مستور کے ناولوں کی ایک بڑی خصوصیت جذبات سے ان کا شغف ہے۔ وہ معمولی کم کرتی ہیں اور [illegible] زیادہ شاید اسی وجہ سے ان کی ابتدائی کہانیوں کا تعارف بھی موجود ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے ذہن سے کسی تیز منظر کو ملانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ذہن سے ایک تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس لیے کہ یہ طریقہ افسانہ نگار کے موضوع کے لیے بہت زیادہ موزوں ہے۔ خامی اس لیے کہ اس سے پڑھنے والے کو کہانی پن اور روانی کا احساس نہیں ہوتا [illegible] سب سے بڑی [illegible] روایت بنا کرتی ہے۔ جذبات نگاری بیشتر زبان و بیان کی چابک دستی پر انحصار رکھتی ہے اور اس میدان میں خدیجہ مستور اچھا کمال رکھتی ہیں۔ ان میں ہمارے چند اور معروف لکھنے والوں کی سی چمک اور تیکھا پن تو ہے ان کی یک رنگی اور استقامت نہیں ہے۔

ان میں سے بیشتر افسانے خدیجہ مستور کے [illegible] معاشرے سے متعلق ہیں۔ واقعیت [illegible] یوں کہیے کہ یہ دور [illegible] انھیں پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ ان کے افراد اب بھی [illegible] اسی طبقے سے ہیں جو پہلے تھے۔ خیالات اور جذبات کو اجاگر کرنے میں اب بھی ان کی [illegible] ہے [illegible] اب ان کے [illegible] تحریروں میں پہلے سے نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اب انھیں [illegible] تجربہ [illegible] غریب اور [illegible] کے علاوہ [illegible] حقائق سے بھی آگاہی ہو گئی ہے جن کی وجہ سے [illegible] نفسیاتی اور [illegible] پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسباب [illegible] کرداروں [illegible] اور بے رونق [illegible] بنا دیتے ہیں [illegible] کے تجربے اور مطالعے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش [illegible] سکتے۔ اس لیے [illegible] کی نظام اور طبقاتی ترتیب سے وابستہ ہوتی ہیں۔

"چند روز اور" میں مصنفہ نے [illegible] کی طرف رجوع کیا ہے جو یقیناً ارتقا کی اگلی منزل ہے۔ طبقاتی تفاوت اور اس کے [illegible] فسادات [illegible] بغاوت اور [illegible] افراد و واقعات کو کسی [illegible] تبدیلی میں [illegible] کرتے ہیں۔ "چند روز اور" کا بیشتر حصہ [illegible] ضرور ہے کہ [illegible] میں ابھی اتنا [illegible] نہیں ہوا جتنا انھیں اپنے ابتدائی [illegible] ہوتا ہے۔ اسی لیے انھیں کہیں کہیں واقعات سے ہٹ کر [illegible] سے کام لینا پڑتا

ہے۔ مثال کے طور پر خدیجہ مستور کا افسانہ "بینتیں بے چھے ماؤں" میں افسانوی واقعات بغیر کسی تمہید کے نہایت خوش اسلوبی سے واضح ہوتے ہیں لیکن ناول "آنگن" میں ہمیں یہ سمجھانے کے لیے طویل مکالموں سے کام لینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے فلم کی تکنیک کی نسبت کہانی کی حرکت اور رفتار سست ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان افسانوں میں فلاحت اور نتیجے کی خوبصورتی کا امتزاج زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے لیکن اس چیز کا جو مظہر ہے وہ جملہ کی تحقیق نمایاں رہتا۔ ان افسانوی مسائل سے مختلف تھی اور جن کو ادا کرنے کے لیے طویل وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ "ٹوٹی ہوئی" میں جو بظاہر موجود ہے (کون کی پانی منزل تک پہنچنے کے لیے کا حربہ بنائی جاتی ہے۔ اس بے اندازہ ادب کے شاعرانہ بعض افسانوں کے ایک مجموعے سے آپ ہر نئے افسانے کی تکنیک پائیں گے جن کے ذریعہ مستور نے نئے مجموعے کا اور بھی حسن سے اتفاق کر لیا ہے۔

وہ لوگ

فیض نے ۱۹۶۲ء میں ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ "وہ لوگ" پر تبصرہ لکھا:

ہم سب نے ہجوم کا عنوان "ڈرامہ" بنا لیا ہے۔ کچھ قواب سے ہم سب پہلی صورت میں کا ہے۔ اسے ادارے لکھنے والوں کی جدت نے بہت حد تک لے لیا یا تجدید پسند کر لیا ہے جب کچھ لکھے جاتے ہیں اور ادب بھی لکھے ہوتے ہیں۔ اس صنف ادب میں ضرور کوئی تجربہ علی تجسس نہیں ہوا کرتے ہے متعلق لکھنے والے اہل ادب دونوں کی جدید واقف سے بہت کم بھی کم ان کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیشتر اداکار ریڈیو کے لیے لکھے ہوتے ہیں یا مغربی مقبول سے ڈرامہ مغربی ادب سے ترجمہ کیے جاتے ہیں۔ ان کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ریڈیو موجود ہے جس لیے ریڈیو ڈرامے کی مانگ بھی موجود ہے۔ مغربی ترجم کا یہ ہے کہ اصل کی خوبی کے باعث نقل کی تعریف کے امکانات قریبی ہو جاتے ہیں۔

ریڈیو ڈراما اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل صنف تحریر ہے، جسے سٹیج ڈرامے کا بدل نہیں سمجھنا چاہیے۔ ریڈیو ڈرامائی چیز ہے جس لیے ریڈیو ڈرامے پر کسی قسم کی بندش نہیں۔ ڈرامہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں جا سکتا ہے، اس میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیجیے۔ مگر ایسے ڈرامے کو سٹیج پر منتقل کرنا مشکل ہے۔ ریڈیو کی اپنی مخصوص حدود اور خصوصیات ہیں لیکن ان کی نوعیت سٹیج کے تقاضوں سے مختلف ہے۔

رہے مغربی ڈراموں کے ترجمے، تو ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ بیشتر ڈراموں پر کسی مخصوص تجربے اور زمان و مقام کی چھاپ ہوتی ہے، جسے آپ آسانی سے بدل نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ اپنے عہد اور زمانے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن زمانے کے آگے بڑھنے میں ان تصویروں کے خدوخال اور کئی خوبیاں دھندلی رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی اجنبی معاشرے کے بارے میں لکھا ہوا ڈرامہ کیسا ہی عمدہ ہو، ہمارے ہاں پڑھا جائے تو اس کی ڈرامائیت کا کچھ نہ کچھ حصہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

ہاجرہ مسرور افسانہ نگاری کی حیثیت سے ہمارے ہاں ایک زمانے سے معروف ہیں۔ تخلیقی نگاری کے میدان میں یہ مجموعہ ان کی پہلی کاوش ہے۔ لیکن ان تحریروں میں بھی ان کی بعض مخصوص اوصاف نمایاں ہیں۔ مثلاً یک رنگی اور نفیس مزاجی سے ڈرامے بنائے گئے ہیں۔ یہ مغربی تکنیک کے چربے نہیں ہیں۔ ان کے موضوعات، واقعات اور کردار سب دیسی ہیں اور کسی کردار میں اجنبیت کی جھلک نظر نہیں آتی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں ہم اپنے گرد و پیش اٹھتے بیٹھتے روزانہ دیکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی شخصیت اور ان کے مسائل میں عام الٹ پھیر نہیں ہے۔ خیال اور احساسات سب ہمارے جانے پہچانے ہیں۔ ان میں وہ مسائل بیان کیے گئے ہیں جو ہر روز ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ معاشرتی مسائل کا تجزیہ ہے۔ چند سماجی برائیاں ہیں جو ہر روز ہمارے آگے آ جاتا ہے۔ چنانچہ ان ڈراموں میں سچائی اور

خلوص موجود ہے جو کسی تحریر میں دیدہ بینا اور دلِ دردمند کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

ہاجرہ مسرور کی تربیت جدید افسانہ نگاری کے مکتب میں ہوئی ہے اس لیے انھیں خارجی واقعات کی نسبت اپنے کرداروں کے داخلی اور جذباتی ارتقا سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان ڈراموں میں جو مرکزی مسائل یا مضامین بیان ہوئے ہیں اُن کی رعایت سے مناسب یہی تھا۔ ہمارے سفید پوش طبقے میں مرد اور عورت کے جذباتی کاروبار کے خسارے اور نا آسودگیاں اُس کاروبار کی رنگینی اور بے رونقی، اُس کے جھوٹ اور ریاکاریاں، اُس کی معصومیت اور نادانیاں۔۔ ان ڈراموں کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسانی تجربے کی طرح ان تجربات کی تشکیل میں بھی خارجی عوامل اور داخلی کیفیات دونوں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ جن کے عمل اور ردِعمل سے کسی کردار کی ذہنی اور جذباتی شخصیت پیہم بدلتی رہتی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے انسانی شخصیت کی شکست و ریخت میں ان داخلی محسوسات کی گرفت اور دخل اندازی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اور خارجی واقعات بیشتر اشارتاً بیان کیے ہیں۔ مثلاً ”نوری خالہ“ میں رضا ماموں کی برسوں پہلے کی جذباتی شکست ایک نوبیاہتے جوڑے کے لیے عذابِ جان بن جاتی ہے۔ ”دستک“ میں اک نوعمر گھریلو لڑکی دلہن بنتے ہی اپنے پرانے محبوب سے یکسر نا آشنا اور اپنے نئے دولھا کے لیے سراپا انتظار ہو جاتی ہے۔ ”کھلی کھڑکیاں“ میں ڈاکٹر نور اور اُس کی بیوی نسرین ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں جھٹکارا بھی پانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ رہنے کی عادت اور اجنبی دُنیا کے خوف نے دونوں دلوں میں ایسی زنجیریں ڈال رکھی ہیں جن سے نجات ممکن نہیں۔

”وہ لوگ“ اس مجموعے کے باقی ڈراموں سے مختلف رنگ میں ہے اور تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے شاید سب میں موقر۔ اس کے کردار زیادہ حقیقی ہیں جن کی ہولناک جُہدِ حیات میں خیالیت اور جذباتیت کو دخل نہیں۔ ان کی جُہد و کشاکش کو ڈرامائی وضاحت کے لیے وقت اور پچوایشن کا مرکزی نقطہ بہت صحت سے چنا گیا ہے۔ اس کشاکش کے تمام پہلو اس مرکز کے اندر گرد بہت خوبی سے مرتب ہو گئے ہیں۔

کردار اور موثر مکالمہ نگاری پر ہاجرہ مسرور کی قدرت ان سب ڈراموں میں یکساں نمایاں ہیں۔ ان کی مخلوق میں بچے، بوڑھے، امیر، غریب، ملازم، آقا، نئے فیشن کی دوشیزائیں اور پرانی وضع کی بیگمات سبھی شامل ہیں۔ اور یہ بھی مخلوق دلچسپ اور جیتی جاگتی مخلوق ہے۔ حتیٰ کہ ”نوری خالہ“ جیسے کردار بھی جو بالکل سامنے ہی نہیں آتے مانوس اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ ڈرامے کے اصل جوہر تو سٹیج پر ہی جا کر کھلتے ہیں۔ ان تحریروں کے بارے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان محاسن کے علاوہ ان میں سٹیج کا امتحان پاس کرنے کی بھی صلاحیتیں اور لوازم موجود ہیں۔ یہ مجموعہ ہمارے ادب میں بہت ہی قابلِ قدر اضافہ ہے۔

سات ڈرامے

فیض نے 1973ء میں آغا ناصر کے ”سات ڈرامے“ پر تقریظ لکھی:

سائنس کے علم کی طرح ڈراما یا ناٹک کا ہنر بھی دریاؤ ہے جس میں مختلف کمالات کا یکجا اظہار ہوتا ہے۔ اس میدان میں آغا ناصر کچھ ہرفن مولا قسم کے آدمی ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیلی ویژن ڈراما کے فروغ میں اُن کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ وہ اداکار بھی ہیں، ہدایت کار بھی ہیں، حتیٰ کہ ادیب اور ڈراما نگار بھی ہیں۔ پرانے روایتی تھیٹر کے زوال کے بعد ہمارے ادب میں کامیاب ڈراموں کا سرمایہ بہت کم ہے۔ یوں ڈرامے لکھے ضرور جاتے رہے لیکن ان میں محض ”کتابی“ قسم کی چیزیں ہیں جو ایسے ادیبوں نے لکھی ہیں جنھیں سٹیج کی ضروریات سے واقفیت نہ تھی یا حال میں کچھ ایسے شوقین لوگوں نے، جو ناٹک بازی تو جانتے تھے لیکن اُن کا ”مبلغِ ادب“ محدود تھا، ریڈیو

کے لیے کچھ اچھے ڈرامے ضرور لکھے۔ لیکن ریڈیو تو ماڈرن ڈراما کے حق میں ہے۔ One emotion یا کسی تاثر کی جھلک ہوتی ہے جس کے تقاضے تکنیکی طور سے مختلف ہیں۔ کئی ایسے ڈرامے اور سٹیج ڈرامے میں بھی فنی اعتبار سے یکسانی اس طرح کا تقاضا نہیں۔ آغا ناصر کے ایسے کئی ڈرامے اس کا ثبوت ہیں۔

ان کی پہلی خوبی تو یہی ہے کہ ان میں ادبی اور تخلیقی رچاؤ نمایاں طور پر موجود ہیں۔ وہ بڑے چاؤ سے لکھتے ہیں۔ کرداروں کی صورت گری کفایت اور صفائی سے کی ہے۔ ڈرامائی عمل کی رفتار اور حرکت تیز اور سہل ہے اور موضوعات کا انتخاب بے لچک اور سنجیدگی سے ہوا ہے۔ ان میں طرح طرح کے کھیل بھی ہیں اور ایسے بھی جن میں بہت گہرائی ہے۔ ان کے ذکر میں طنز و مزاح ہے لیکن تلخی نہیں، ہر جگہ شگفتگی ہے۔ دوسری خوبی کے ڈراموں میں درد اور سوز بھی ہے جو انسانی اور جذباتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ جذبہ اور درد مندی ان کھیلوں کی اندرونی خوبی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ آغا ناصر نے جس تجربے یا واردات کو موضوع ٹھہرایا ہے وہ محض تخیلی یا تجریدی نہیں بلکہ سچی اور حقیقی ہے۔ آپ نے آس پاس کی زندگی سے معاصر تعلقات اور مسائل کا انتخاب کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ذہن میں بڑا اور آفاقی انسانی جذبات کی جھلک بھی موجود ہے۔ نہ ڈرامہ لکھا ہے خالص ذہن سوزی سے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہل ذوق اس مجموعے کا خیر مقدم کریں گے۔

☆☆☆

1971ء میں فیض نے ڈراموں کے مجموعے "عشق حیات" پر مظفر علی سید کی تقریب پر یہ خط لکھا:

ہمارے ہاں تھیٹر اور سٹیج کی باقاعدہ اور مستقل روایت نہیں ہے اس سبب سے ہمارا ڈرامائی ادب بہت ہی مختصر ہے۔ اسی سبب سے ہمارے ادب کے اس شعبے میں جو مقبول اضافہ ہوا ایک احسان ہے جس کی مناسب قدر ہونی چاہیے۔ علی مظفر رضوی صاحب کے ڈراموں کا مجموعہ "عشق حیات" بھی ایسا ہی ایک احسان ہے۔ اس مجموعے میں اول تو وہ سب ڈرامے خوبیاں موجود ہیں جنھیں اچھے اور کامیاب ڈرامے کے لوازمات تصور کیا جاتا ہے۔ یعنی چست اور برجستہ مکالمے، مقاصد اور جاندار کردار، مربوط اور واقعات کی دلچسپ اور مربوط بنت وغیرہ وغیرہ۔ لیکن کسی تحریر کی صحیح قدر و قیمت محض ان تکنیکی اوصاف سے متعین نہیں ہوتی۔ اس کا صحیح اندازہ کسی معاشرے کے حقائق و تعلق کے بارے میں لکھنے والے کی بصیرت اور ادراک کی وسعت ہی سے لگایا جاتا ہے۔ ان ڈراموں میں مظفر صاحب نے ہمارے معاصر معاشرے کے جن گوشوں کو اجاگر کیا ہے وہ ان کی پہلی کتاب "عکاسی" اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کے مشاہدے کی وسعت اور خلوص کا ثبوت بھی ہے اور ایک دانش اور دردمندی کی شہادت بھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ اول ہمارے ڈرامائی ادب میں اور بھی معتبر و ذہنوں کا قیمتی اضافہ ثابت ہوگا۔

میرا جی کا فن

اکادمی پنجاب لاہور نے 1958ء میں میرا جی کے مضامین "مشرق و مغرب کے نغمے" شائع کیے جس کی تقریب فیض نے لکھی:

میرا جی کے مضامین کی تالیف و اشاعت کئی اعتبار سے ایک اہم ادبی واردات ہے۔ پہلی تو ابھی تک میرا جی کی منظومات کا ذخیرہ بھی منتشر پڑا ہے اور ان کے کلام کو جو کوئی مستند مجموعہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا۔ ان کی زندگی میں جو مجموعے شائع ہوئے وہ بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن نئے شعر میں میرا جی کا نام تو معروف ہے ایک حد تک ان کی اہمیت مسلم ہو چکی ہے۔ اب اقل تو یہ ہے کہ ان کا منظوم کلام بھی علاوہ تنقیدی طور سے پڑھا جائے کہ ان کی ہمعصر ادبی ذوق کی آگہی ہے جو دیکھا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئے سے ادبی

تنقیدی اور تجزیاتی تحریروں میں ان کی شاعری سے متعلق تفصیلی اور سیر حاصل بحث و تبصرہ ہو چکا ہے۔ مگر یہ ہے کہ تلاش و تجسّس ہی سے ان کے مجموعۂ خیال کے الگ الگ اوراق یکجا بھی کیے جا سکتے ہیں۔ اسی سبب سے میرا جی کے منظوم کلام کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جس سے ان کے نقاد غافل یا ان کے مداح ناآشنا ہوں۔

میرا جی کے مضامین کی نوعیت اور ہے۔ یہ مضامین آج سے کوئی تیس برس پہلے لکھے گئے۔ اور اسی زمانے میں بیشتر ایک ہی رسالے یعنی "ادبی دنیا" میں شائع ہوئے۔ میں بھی ان دنوں اس ادارے میں شریک تھا۔ اب سے پہلے انھیں کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی کسی نے تدبیر نہیں کی۔ نتیجہ یہ کہ جو لوگ اس دور کے بعد ادبی بلوغت کو پہنچے یا جن کو "ادبی دنیا" کے پرانے پرچے حاصل نہیں تھے بجائے ان مضامین سے مستفید ہونے کے ان کے وجود سے بھی ناواقف ہیں۔ شاید میرا جی کی ادبی تخلیقات کے سلسلے میں ایک آدھ نقاد نے ضمنی طور پر ان کی نثر نگاری کا بھی تذکرہ کر دیا ہو۔ لیکن اس سے ان مضامین کی نوعیت اور قدر و قیمت کا قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جدید اردو ادب کے بہت سے طالب علم تو یہ جانتے ہیں کہ میرا جی نثر بھی لکھا کرتے تھے لیکن اس نثر کی صحیح پہچان اب تک کسی طور ممکن نہ تھی۔ اسی سبب سے میرا جی مرحوم شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے اہلِ نظر حلقوں میں بھی پورے متعارف نہیں۔ چنانچہ اس مجموعے کی اہمیت کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ اس کی اشاعت سے میرا جی کی ادبی شخصیت کی یہ ادھوری تصویر ایک حد تک مکمل ہو جائے گی۔ اس شخصیت کے بارے میں بعض بیہودہ اور بے سروپا معلومات کی تصحیح ہو سکے گی اور مرحوم کی تخلیقی کاوشوں اور صلاحیتوں کی وسعت اور تنوع کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔

لیکن بات محض اتنی نہیں ہے کہ میرا جی محض شاعر ہی نہیں نثار بھی تھے یا نظم کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ ان کی نثر کی ماہیت اور مقصد ان کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میرا جی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی ہے۔ ان مضامین میں کہیں فکری ابہام، منطقی پیچیدگی یا کسی مبہم اور غیر مفہوم پیچیدگی کا کوئی نشان نہیں ملتا جو ان کے شعری تجربات کی کیفیات ہیں۔ ان کی تخلیق کو یہ صفت ترتیب و توازن یا منطقی عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے جسے وہ بغیر کسی شعری ترکیب کے سمجھتے رہے۔ ایک حد تک تو شعر اور نثر کے مزاج میں یہ فرق ناگزیر بھی ہے لیکن میرا جی کی تحریروں سے یہ صاف عیاں ہے کہ انھوں نے تنقید کی ہوشمندی کے لیے جذب و وجدان کے بجائے عقل و شعور کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے کا شعوری ارادہ کیا ہے۔ مختلف ادوار، اقسام اور طبقات کے ادب کی تفسیر، تفہیم اور تنقید میں وہ خالص عقلی اور منطقی دلائل و شواہد سے کام لیتے ہیں۔ موہوم جذباتی تاثرات وغیرہ کا کہیں سہارا نہیں لیتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشاہیر شعرا کے متعلق ان کی تنقیدی آرا سے اختلاف کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔ مگر ان مشاہیر کے کلام کی، ان کے عہد، ان کے ماحول اور ان کے حالات کی وضاحت اور تفہیم میں مرحوم کی کاوش اور تحقیق ہمیشہ قابلِ داد رہی ہے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ اگر ان مضامین کے تنقیدی مسلک اور عقائد کی روشنی میں میرا جی کی شاعری کا مکرر مطالعہ کیا جائے تو شاید ان کے بعض پیچیدہ اور مبہم مضمرات سے متعلق نظر آئیں۔

یہ سب مضامین ان دنوں کی یادگار ہیں جب میرا جی پہلے دلی پھر لاہور میں مقیم تھے۔ ان کے لیے یہ کچھ آسائش اور فراغت کے دن تھے۔ جب بھی ان کی ادبی زندگی کا غالباً سب سے منظم اور پُرسکون دور بھی تھا۔ زندگی بھی ان کی جب بھی تھی لیکن اس میں جو کچھ آشفتگی، پراگندگی اور بے ڈھنگی کی کیفیت نہ تھی۔ ان مضامین کے تجزیے کی صلاحیت، بیان کی سلاست اور خیال کی سلامت روی میں ان دنوں کا فراغ بھی جھلکتا ہے۔ یہ یاد دہانی بھی حاصل ہوتی ہے کہ اگر ہمارے ادیبوں کی زندگیوں میں داخلی اور خارجی سکون کے علاوہ جسم و جان کے تقاضے پورے کرنے کا کچھ اطمینان حاصل ہوتا تو ہمارے جدید ادب کی تاریخ کس قدر مختلف ہوتی اور اس کے بعض درخشاں ابواب

گئے تھے اور اکثر ترجمہ ہو چکے تھے۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ تحریریں اہم علمی، تحقیقی اور تجزیاتی دستاویزات ہیں جن میں ایک گہری فکر اور تخلیقی کاوش بھی شامل ہے۔ ان کے مطالعے سے تحریری حسن اور مزاج سے ادب میں فیض کے تحسین و تنقید کے منصب کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ ادب میں دلچسپی رکھنے والے معروف اور غیر معروف شعرا و ادبا کی کتابوں پر فیض کی رائے سامنے لاتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے فیض کے تنقیدی شعور کی ایک نئی جہت بھی سامنے آتی ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت سے قارئین اور ادب کے لیے اس عمل کو ایک اہم اضافہ ہونا چاہیے:

راگ رنگ

1964ء میں فیض نے محمد عطا اللہ ملک کی کتاب "راگ رنگ" پر یہ تحریر لکھی:

فنونِ لطیفہ میں جس طرح موسیقی ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ دنیا بھر کی قومیں اس کے رموز اپنے ذوق اور معیار کے مطابق اس سے حظ حاصل کرتے ہیں، لیکن اردو زبان میں علمِ موسیقی کی کتابوں کی فہرست کم ہے اور اس موضوع پر محمد عطا اللہ ملک نے قلم اٹھایا ہے۔ اس سے پہلے اس انداز میں کوئی کتاب شائع ہوئی تھی یا نہیں۔ یہ مختصر کتاب بھی ہماری اس کمی کو کسی حد تک پورا کر سکتی ہے۔ اگر یہ کتاب پڑھنے والوں کے دلوں میں علمِ موسیقی سے دلچسپی پیدا کر دے اور اسے سمجھنے کا احساس پیدا کر سکے تو یہ کتاب موجودہ حالت میں یہ بھی موسیقی کی (اور بالواسطہ طور سے اردو زبان کی بھی) کوئی معمولی خدمت نہیں ہے۔

مصنف نے "راگ رنگ" میں علمِ موسیقی کا کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا ہے نہ تحقیق کے سخت تقاضے پورے کیے ہیں اور نہ ہی فن کے ماہر گانے والوں کا کوئی معیار قائم کیا ہے۔ انھوں نے جو لب لباب اتنا ہے کہ آسان زبان میں روانی اور فصاحت کے ساتھ موسیقی میں گزشتہ کئی صدیوں کی روایات و تجربات کا جائزہ لیا ہے اور اس امر کا التزام رکھا ہے کہ یہ جائزہ ہر لحاظ سے غیر جانبدارانہ ہو۔ اس کے علاوہ چند ایک مقامات میں موسیقی کے ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے [illegible] اجتہاد کر کے اپنے لیے ایک حد مقرر کر لی۔ بحیثیت مجموعی یہ مختصر کتاب ان موسیقی کے شوقین عوام کے لیے مباحث کو سمجھنے کے لیے [illegible] کتاب پڑھنے سے کہیں زیادہ الجھ جاتے۔

یہاں یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ فیض نے یہ کتاب [illegible] کے بڑے بڑے مختصر تبصرے لکھے گئے۔ اس کتاب کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ فیض کے قاری کو ہمارے ملک کی موسیقی کے بارے میں مختصر معلومات حاصل ہوں گی اور اسے معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں فیض نے کہاں تک ترقی کر لی تھی۔ اس میں [illegible] تجربات ہو رہے تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے گانے والوں سے تھے جن کو انھوں نے اپنی فنی کاوش اور اسلوب سے کس کس انداز سے متاثر کیا۔

مصور دیوانِ غالب

فیض نے 1969ء میں صادقین کے "مصور دیوانِ غالب" پر دیباچہ لکھا:

غالب کے کلام کی معنوی تہہ داری کا طلسم تو جس کے ہاتھ لگا ہے [illegible] گزشتہ ایک صدی میں [illegible] ہے جو اس کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے [illegible] اس طلسم کا [illegible] غالب کی ایک اصطلاح میں پوشیدہ ہے جو اردو اصطلاح ہے "معنی" [illegible] ہے جو اس [illegible] غالب کی [illegible] مصور دیوان کی یاد بھی ہے۔ [illegible]

خیالی کا تور عطا ہوتا ہے۔

اس اعتبار کے طلسم سے غالب نے تاریخ کا ایک ایسا لمحہ اسیر کیا جب یارا ئیاں وہ وقت آ پہنچا تھا "لاؤ" تو قلم زکر نے کی خاطر ایک جہاں منتظر کی ہریالی کے در پے تھے۔ یہ عصر غالب کی ولادت سے قریب قریب ایک صدی پیشتر شروع ہوا اور اس کی وفات کے ایک صدی بعد ختم ہو رہی ہے۔

غالب کے شعور میں اس خلوت و جلوت، صحبت و تنہائی کے وہ سب نقش منعکس ہوئے جو اسے کبھی اپنے وحشت کدہ فکر میں نظر آئے، کبھی بیابان وحشت میں۔ دامن میں ایک صدی پہلے کا دور استحصال بھی تھا، ایک صدی بعد کا جشن اور خورشید بھی۔ انسانی عظمت کا یہ دور نفرت بھی تھا، حیات انسانی کے دوام کا جشن بھی۔ حقیقت میں یہی ملاپ بھی تھی، تماشا، ہجوم کا کلمہ کے اندیشہ ہائے دور دراز بھی۔ غالب کا شعور اسی طرح کی بن کر اس غم تک پہنچا جہاں فرد اور کائنات کا فرق مٹ جاتا ہے۔

اسی طرح غالب نے شعور کے اس آئینے کو جھاڑ کر الفاظ کے ساغر میں انڈیلا "آیا ہوں لاؤ تو شراب پینے ہم نے"۔ اسی طرح صد قطرہ لے اندوختہ آئینے کو جہاد کر کے بہ شکل دیگر کے ساغر میں ڈالا ہے۔ ہم ان سطروں سے ختم کرتے ہیں کہ وہ ان کے:

"ہر حرف زبان میں ہے غزل جو کی تمنا"

تعلیم الکتاب

فیض نے 1972ء میں سید محمد اویس کی کتاب "تعلیم الکتاب" کی اہمیت پر تحریر رقم کی۔

آج سے چند ماہ پیشتر شان الحق حقی صاحب کے ہاں ایک محفل میں سید محمد اویس صاحب سے تعارف اور ملاقات کا اتفاق ہوا۔ اسی محفل میں آپ کے ترجمہ قرآن کا ذکر آیا تو میں نے بھی دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اویس صاحب کی عنایت ہے کہ آپ نے میری درخواست پر یہ تحفہ عنایت فرمایا اور ان کی بدولت مجھے اس مسودہ مقدمے کے مطالعے سے کسب سعادت کا موقع ملا۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی کسی تشریح و ترجمہ پر تبصرہ کرنا مجھ جیسے کم علم کا منصب نہیں اور ان حضرات کا یہ مقام ہے جنھیں ملک کے مقتدر علماء [illegible] اویس صاحب کے ترجمے اور تشریحات کی تحسین و خوبی کا اعتراف کر چکے ہیں۔ لیکن دیگر محاسن و معائب کے علاوہ اس کتاب کے مقدمے میں ادب عالیہ کی بھی ایک اہم بحث ہے [illegible] اور قبولیت عام کے سبب مختلف زبانوں کے فروغ اور ترقی میں ان کتب کا کردار [illegible] بحث کرتے ہیں۔ مثلاً اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عربی زبان کا بنیادی آہنگ آج بھی وہی ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے قرآن مجید نے متعین کیا تھا۔ اسی طرح اردو نثر کے ارتقا میں ترجمہ قرآن کی اہمیت اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ گو ہمارے نقادوں نے اب تک اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ اس ضمن میں اویس صاحب نے اپنے مقدمے میں اصولی طور سے اور اپنے تراجم میں عملی مثال سے زبان کے بارے میں جو بحث کی ہے اس میں اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا دینی حلقوں کے علاوہ ادبی اور لسانی حلقوں میں بھی خیر مقدم ہونا چاہیے۔

ان میں سے ایک اہم نکتہ تو زبان سے متعلق ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں امام بخش ناسخ اور بعض دوسرے علمائے زبان اردو کو صاف کرنے اٹھے اور عربی و فارسی الفاظ و تراکیب میں متروک اور مروج کی تفریق کی۔ یہ کی تو بدقسمتی سے انھوں نے اس زبان کے مزاج، اس کی روزمرہ، اس کے محاورات و امکانات سے پوری واقفیت نہیں رکھی اور اپنی ذاتی ادبی پسند یا ناپسند کو زبان کا معیار ٹھہرایا۔ اس کے نتیجے میں زبان کی نفاست اور آرائش میں تو ضرور اضافہ ہوا لیکن [illegible] سے اظہار کی سادگی، [illegible] اور آہنگ کے تنوع کا دائرہ سمٹ

شیخ مرشی کے لفظ سے "آہستہ سے" ہو رہے ہے "جس میں صوت اور معنی دونوں کا ایک ایسا ڈھب پیدا ہوا ہے جو آتا ہے" [illegible] موجود نہیں۔ اولی صاحب نے اپنے ترجمے میں جو ہنر انہیں آیا ہے کا استعمال کیا ہے جس کی ان کے صوت و معنی کی پوشیدہ خوبیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترجمے کے ذیل میں بعض شعراء بھی حرکات کی وجہ سے دامن بچھوا ہے اور اپنی تعبیرات شعری طور سے غزل میں ان کی بعض خوبیوں کو بہت سلیقے سے استعمال کرتے گئے ہیں۔ یہیں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اولی صاحب کی [illegible] قدر و قیمت کے منظر عام پر آنے کے بعد شاید علمی اور ادبی حلقوں میں تحریکات کے [illegible] سلسلے پر نظر ثانی کی ترغیب پیدا ہو جو نہایت مفید ثابت ہوگی۔

دوسری بات یہ کہ اردو زبان کے اس پہلو سے متعلق ہے جب اردو زبان پچھلے زمانے سے اردو اور فارسی سے [illegible] تھی تو اس کی [illegible] وہ الفاظ جو اردو نے عام اور مقامی زبانوں سے لیے تھے [illegible] بعد میں ترک کیے گئے اور زبان سے خارج ہو گئے اور دہلی کے شعراء نے ان الفاظ کو ترک کر دیا۔ اس صدی میں جب اردو زبان کو اپنی [illegible] کے علاوہ علمی اور سائنسی مطالب ادا کرنے پڑے تو اس کی [illegible] اور ہمارے اہل علم حضرات نے بہت سے [illegible] (Concept) کے لیے اپنی بولیوں میں سے کوئی موزوں لفظ تلاش کرنے کے بجائے عربی اور فارسی کتب لغت پر انحصار شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ادبی زبان بول چال کی زبان سے الگ ہوتی گئی اور دوسری طرف وہ بہت سے الفاظ جو [illegible] زبانوں میں مشترک تھے اور [illegible] علاقوں میں بولے جاتے تھے ان ہندی الفاظ کی جگہ [illegible] جو صرف ایک محدود [illegible] اور محدود طبقے کے لیے کار آمد تھے۔ اولی صاحب نے اس [illegible] بھی [illegible] کیا ہے [illegible] الفاظ سے استفادہ کیا ہے جو اردو، سندھی، پنجابی، سرائیکی [illegible] بلکہ میں بھی آسانی سے سمجھے جاتے ہیں [illegible] اپنے ذہنوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ ان الفاظ سے بھی پاکستان کی موجودہ لسانی [illegible] کو سلجھانے کے لیے ایک راستے کی نشان دہی ہوتی ہے جس کی جانب ہمارے ارباب علم و دانش کی توجہ مبذول ہونی چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح کسی نئی زبان کی پیدائش ایک [illegible] پیدائش [illegible] ہے جیسے اردو، فارسی اور [illegible] مختلف زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی، اسی طرح کسی زبان کا ارتقا اور اس کے اظہار کا [illegible] بھی ایک [illegible] عمل ہے اور جب کسی زبان کو [illegible] ہے تو پھر مستقل [illegible] الفاظ اور [illegible] کی تحقیق کرنے کے لیے [illegible] تلاش کرنا [illegible] مطالب [illegible] زبان و ادب کے وسیلے سے [illegible] کیا جا سکتا ہے [illegible] کامیاب کوشش کی ہے۔

غرض یہ کہ [illegible] کے ترجمے کے [illegible] کتاب کی سب سے [illegible] ہوئی ہے اور [illegible] صاحب کے ترجمے [illegible] اس کتاب میں [illegible] کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر اس کے [illegible] کا صحیح جائزہ لیا جائے اور اس جائزے کی روشنی میں [illegible] سے ہر [illegible] اپنے [illegible] اردو زبان سے [illegible] خدمت ہوگی۔ اگر [illegible] تو اس کا سہرا [illegible] صاحب کے سر رہے گا۔

روح القدس کا ذوقِ جمال

فیض نے 1973ء میں صادقین کی نمائش "روح القدس کا ذوقِ جمال" پر تحریر لکھی:

یوں تو صادقین کی ہر نمائش کسی نہ کسی اعتبار سے انوکھی ہوتی ہے لیکن گذشتہ دو تین برس میں آپ نے جمال و جلال کو جو مرقع خطاطی کی صورت میں تخلیق کیا ہے ان کے تجربات میں یقیناً ایک نادر اضافہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ مصوری کو جو صادقین کے خیال و قلم کی گنج جولانی کا دیرینہ موضوع رہا ہے اس کے ساتھ ہی اب سے قریب صدی پیشتر روایت کے موضوعات سے انکار کر چکے تھے لیکن خطاطی کو بوجوہ عقیدت کی کوتاہی کے سبب مسلمان ماہروں کا سب سے معتبر اور مستقل پیشہ ہونے سے کوئی ایسا صاحب نظر بہتر نہ سکا کہ ان کے مروجہ قاعدے ضوابط کو نباہتے ہوئے اس کی صوری اور جمالیاتی صلاحیتوں میں نئے امکانات کا کھوج لگا سکے۔ یہ منصب شاید صادقین کے حصے میں یوں آیا کہ ان کی فنی تربیت کا ماخذ دوسرا تھا اور انھوں نے مصوری کے بنیادی اجزا کی ماہیت اور ترتیب و ترکیب پر قدرت حاصل کرنے کے بعد اسے بروئے کار کیا۔ خطاطی کے قدیم اسلوب کو نئے طور پر انھوں اور نقطہ دائرے کے ساتھ جو تشکیلیں کی ہیں اور صورت گری کا سہارا لیے بغیر الفاظ و حروف کے ہاتھ و پاؤں میں جو حسن و چستی اور انداز دلکش کیے ہیں آج تک اہل نظر کے لیے تحیر و انبساط کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی بڑی بات بعد میں آنے والوں کے لیے شاید یہ ہو کہ ان کی ایجادات کو ان کے شاگردوں نے قاعدہ قانون میں بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ صدی دو صدی میں ہمارے ہاں جو بہت اچھے قلم کار خطاط تو ضرور پیدا ہوتے رہے اور خوش نویسی سے آج بھی موجود ہیں لیکن ایسا زمانہ ہمارے عہد سے قریب نہیں کوئی نیا طور پیدا نہ کر سکے۔ خود شیوہ ہی چلا تو کہ تحریر و جدید حالت میں بیٹھ کر نیا اسلوب جو داستانوں کی طرح مختلف دو تین دفعہ تحدید سکھے۔ صادقین نے قلم اٹھایا۔ سب سے پہلے مروجہ خطاطی کے قاعدے ضوابط پر الفقر فخری کے بجائے حرف و تحریر کی اکائی قرار دیا۔ اس کے بعد حروف کو باہم یکجا کر کے اور الفاظ کو یکجا اس سے ہم آہنگ بنا کر جملہ ارکان کی جو نئی صورتیں ایجاد کی ہیں ان سے الفاظ رعنائی میں اب تک ان کا۔ الغرض اس نئی تشکیل میں ایک نئے امتحان کا در کھلا ہے اس لیے کہ روایت حرف ایجاد ان کے لیے تشدد کی ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

اور صادقین اپنے فن میں صاحبِ افکارِ تازہ بھی ہیں۔

باتوں کے خربوزے

1973ء میں فیض نے مختار زمن کے مجموعہ تحریر "باتوں کے خربوزے" پر تبصرہ کیا:

اخبار نویسی اور ادبی دنیا میں مختار زمن صاحب کراچی سے لندن تک معتبر ہیں لیکن یہ بات شاید بہتوں کے علم میں نہ ہو کہ وہ ہاتھ کی صحافت کے کھلے چہرے کے علاوہ آستین میں طنز کا ایک پوشیدہ پہلو بھی رکھتے ہیں یعنی ادیب۔ خیال رہا کہ یہ بات بھی ہے کہ زمن صاحب جو ان کے شگفتہ صحافیوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے قلم (ٹائپ رائٹر) کا مصرف تحریر و تحقیق تک محدود کیا ہے اور اسے ادب و تحریب کے طور پر بھی استعمال نہیں کیا۔ شاید یہ منصب ان کی تحریر کے خلاف زمن صاحب کا رد عمل ہے اور اب جو مہربان ہو دو روز چلا جاتا ہے آپ نے کوئی نہیں دکھایا ہے۔ شاید اسی سبب سے ان کی تحریروں میں مزاح کی یہ چاشنی پر طنز کی تلخی غالب ہے لیکن ایک حد تک

کہنا بات قریب قریب جنجھلاہٹ کی بنا پر لکھی ہوئی تحریروں میں نظر آتی ہے کی جو بہلا پا احساس کو شکل تخلیق پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب تو اس میدان شعر میں شہرت کے واسطے سے آئے ہیں اور بہ حیثیت شاعر تجربات اور مشاہدات کا عکس ہیں ان سے ایک شعور اور معاشرتی معانی ہر روز مرہ چلا ہے اور یہ سب کچھ جاتا ہے۔ مثال چند شعر کی ان کے کلام سے شامل پڑ ہوگا۔ شعر

کل رات کی بات اس نے شکایت ضرور کی

لیکن اس کا کیا علاج کہ بعض اشعار مزاج کے بجائے تشریح کے محتاج ہوتے ہیں اور شعر کا لطف کبھی نہیں آتا بلکہ کبھی چیستاں لگتا ہے؟ شاید بعض لوگ یہ شکایت کریں کہ کسی ایک شکل کی بیکراری کے سبب ڈاکٹر قریشی نے ان کے پورے کتاب کو مطعون کیا ہے۔ لیکن یہ شکایت کچھ بجا بھی نہیں۔ شکایت ہو کی بلکہ ان کی کئی باتیں نکلی ہیں ان کے احترام میں فرق آتا ہے۔ بہر صورت ایک عام پڑھنے والے کو ان باتوں سے زیادہ سروکار نہیں۔ اسے غرض ہے تو صرف وحید قریشی کی خوبی صداقت سے۔ اس اعتبار سے ان کی مجموعہ تحریر تنقیدات اور تحقیقات اور ان کے تجربے کے ثمرات ہیں جو مصنف کی جرأت مندانہ اور درد مند نظر شاعری ادب کے لیے قیمتی اضافہ ثابت ہوگی۔

ذکرِ یار چلے

فیض نے مرزا ظفر الحسن کی کتاب "ذکر یار چلے" پر تبصرہ لکھا:-

اگر عجیب زبان کے مقابلے میں "عجیب نگار" یا اس کے متبادل کوئی اور اصطلاح آپ کے ذہن میں ہے تو مرزا ظفر الحسن ہیں۔ اس سے مراد یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عجیب نگاری میں وہ ظرافت کسی سے کم ہیں۔ زبان جاننے میں سب کا یہ عالم ہے کہ:

عدو کی آج اتنی بھی نہ دیکھی کیا کیا
چلے گی کیا کوئی تیغ مری زبان کی طرح

لیکن عجیب نگاری کو غیر سنجیدہ شکل کرنا ایک الگ فن ہے اور ظفر نے اس میں جو ملکہ پیدا کیا ہے اس کی نظیر ہم سے ادب میں بالمشافہ سے ہی ملے گی۔ چنانچہ "ذکر یار چلے" کا مطالعہ کیجیے تو شاید آپ بھی محسوس کریں کہ ظفر نے اپنی ملاقات کے لیے بلکہ مناسب جانا تھا جس کی یاد میں وقت کے تقش میں کچھ ہوگی۔ سو دو سو برس پیچھے پیدا ہوتے تو کسی دربار میں داستان گوئی کے جوہر دکھاتے اور انعام پاتے۔ اب داستان گوئی کا فن باقی ہے جو ان کے سر پرست۔ آج کل کے دور میں تو بچہ داستان کو جنگل کے مور کی طرح سمجھتا ہے۔ داستان گوئی ناول نویسی یا افسانہ نگاری سے بالکل مختلف ہے۔ ناول یا افسانے میں جو عیب گنا جاتا ہے وہی داستان گوئی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے یعنی اس میں داستان کا حصہ کم اور زیب داستان کا زیادہ۔ یہی ظفر کی داستان گوئی کی امتیازی صفت ہے۔ داستان لکھنے کے بجائے داستان گوئی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ ظفر کی کتاب پڑھیے تو یوں لگتا ہے کہ یہ کتاب نہیں ٹیپ ریکارڈ ہے اور آپ اسے پڑھ نہیں رہے بلکہ سن رہے ہیں۔

داستان اور زیب داستان کی بات چلی ہے کہ ان ساری تصنیف میں تو کوئی معرکہ آرا، حیرت انگیز، ہلا انگیز واقعہ آپ کی نظر سے گزرے گا جو آپ کو چونکا دے، نہ مقدم کے علاوہ کوئی غیر معمولی شخصیت یا کردار آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جیسے شہر اور قصبے، گلی کوچے، مکتب اور کالج آپ نے بچپن یا نوجوانی میں دیکھے ہیں، جیسے یار دوست، استاد، عزیز رشتے دار، نوکر یا اہم غیر اہم مخلوق آپ سے آشنا رہی ہے، اسی کتاب میں بھی ان ہی کا بیان ہوا ہے۔ لیکن بیان کی خوبی یہ ہے کہ آپ

چھپے" اور کسی صداقت، شگفتگی، صفائی اور سچائی سے کسی نوع کا بھی ناول یا افسانہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے، غالباً ایک ساتھ سراپا ملیں گے اور پھر بلکہ آپ کی نظر کا پرواز ادھر جاتا ہے یا ادھر اور یہ حسن و جمال محض اتفاقی یا بے مقصد بھی نہیں۔ ماضی کے کسی دور کو حال کے زمانے میں زمانہ حال کی کسی معاشرے کے کلچر کو سراپا الفاظ میں منتقل کرنا ادب نگاری کا کمال جوہر ہی ہے۔ اس اعتبار سے "آخر پانچ چھپے" ایک بہت شگفتہ داستان ہی نہیں ایک نہایت دلچسپ دستاویز بھی ہے اور ناول کے علاوہ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس دیس سے جڑے رہنے والے اپنے دور کی ایک نسل جس میں خود میں اور میرے ہم عصر بھی ہیں محمد اسلم کی اپنی تصنیف قریب سے دیکھتے ہیں کہ "آخر پانچ چھپے" نہایت ہی دلچسپ اور نہایت ہی شستہ کتاب ہے۔ اگر آپ کتاب پڑھنے کا ذوق رکھتے ہیں تو اس کتاب سے محروم نہ رہیے۔

گرد راہ

فیض نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی مشہور خود نوشت "گرد راہ" پر تحریر لکھی:

"جب سے اردو دنیا میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام پہچانا گیا علمی و ادبی حلقوں میں قریب قریب نصف صدی سے آشنا ہے۔ آپ ہندوستانی ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں میں اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا اور اس تحریک کے سرگرم رہنماؤں میں شامل رہے۔ مشرق و مغرب کے مختلف علوم و السنہ میں دسترس، چونکہ آپ کو مختلف ادیان کی تعلیم و تدریس سے منسلک رہے۔ بعد ازاں بین الاقوامی اور ثقافتی تنظیم یونیسکو کے عہدے دار کی حیثیت سے مختلف ممالک میں مصروف کار رہے اور دنیا بھر کے ادبی مشاہیر سے روابط قائم کیا۔ گزشتہ نصف صدی سے مشاہدہ کیا۔ اب گوشہ نشینی اور فراغت کے بعد آپ نے اس بھرپور زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی یادداشت رقم کی ہیں۔ "گرد راہ" کے صفحات میں ہمارے عصری دور کا یہ منظر نامہ پڑھنے والوں کے لیے یقیناً دلکش اور بصیرت افروز ثابت ہوگا۔

فیض احمد فیض (کراچی)

لوک ورثہ

فیض نے جنوبی کے اخبار "لوک ورثہ" کے عنوان تبصرہ پر یوں لکھا:

یہ مسرت کی بات ہے کہ پاکستان کے معروف اخبار "لوک ورثہ" کی جانب سے "عمرانی تحریر" کی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس صورت سے "لوک ورثہ" کے قارئین کو اپنے وطن کے نہایت دلچسپ مگر کم جانے ہوئے علاقوں اور مقامات کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچیں گی۔ اور یہ بات ہے کہ ہمارے وطن کے ثقافتی اور تاریخی آثار کو ہمیشہ کے حکمرانوں نے عوام کی نظر سے پوشیدہ کر رکھا تھا۔ ان پر تحقیق ہوئی نہ غفلت کے سبب سے ترقی کے پردے میں ہمارے آثار ہیں اور اب وقت نے ان مقامات کی خوب کھدائی میں خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ ان میں سے بیشتر کا ذکر ہوا ہے۔ ہماری قدیم تاریخ میں اور ثقافتی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں ان علاقوں کا جو اہمیت رہی ہے اہل علم اور صاحب نظر حضرات سے پوشیدہ نہیں لیکن ان کے علاوہ ہمارے ملک اور ہمارے قومی ادارے نے اہل وطن کو عوام کے تہذیبی، ذہنی اور جغرافیائی مقدمات سے روشناس کروانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے امید ہے کہ "لوک ورثہ" کے "عمرانی تحریر" سے ایک حد تک ان خلاؤں کی تلافی ہو جائے گی اور اس عمران کے عمدہ وہ قاری اور ہر شخص بھی ان معلومات سے مستفید ہو سکیں گے۔

ہمارے مختلف علاقوں کے قدیم تہذیبی اور ثقافتی روایات ان کی زبانوں، رسم و رواج، مسالک حیات، روایات اور فنون کو جمع اور ان کے تحفظ و آثار دینے کی سعی کے بے شمار ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ "لوک ورثہ" کا عمرانی تحریر اس سلسلے میں ایک اہم کڑی کا کام انجام دے گا۔

فیض نے 1970ء میں ماہنامہ "افکار" کے مصطفیٰ زیدی ایڈیشن میں لکھتے ہیں:

ماہنامہ "افکار"

مصطفیٰ زیدی: بچے تھے تو شعر میں ذرا کرب ناک سی ایک باضابطہ پابندی محسوس کرتے رہے۔ تاہم کبھی خاص تجربہ، سوز اور تغزل بھی رہے ہوں گے۔ اگرچہ شروع شروع میں جھجک محسوس ہوتی ہو کہ اپنی جذبات سے احساس نہیں تھا۔ شاید ان کے زمانے میں ایسی شعر کی روایت ہی نہیں تھی۔ اب علاوہ کی بات وہی احساس ہے جو خود ترسی، خوش دلی، کلام اور شکار، انگلیوں والوں کا متقدر انداز ہے جیسے شعر میں پتا لگ جاتا ہے کہ جنون طلب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اس وقت تک جب کہ ایسی ناک رعونت سے اپنے شعر مکمل ہو جائیں، ذہن میں متاثر اثر جلد کھل جاتی ہیں۔ تکلیف دہ لہجے کی تعبیر ہے۔

صہبا (دوماہی) فیض نمبر

بزم ادب اردو کالج کی جانب سے "صہبا" دوماہی کے فیض نمبر پر فیض کی تحریر:

نوجوانو میں چند احباب ہمارے نام پر ایک محفل برپا کرنے والے ہیں۔ اول تو اچھا ہی ہے کہ آج ہم پہ جو گزرے ہے مجھے بتانا ہے کہ اس محفل میں ہے۔ پھر اس بات سے مسرت ہوئی کہ دیار فرنگ میں ہمارے لوگ ایسے بھی ہیں جو "کوئے بنگالاں" سے دور رہ کے بھی اپنے شعر کی کشش سے بزم چراغاں کرنے پر مصر ہیں۔ مجھے زبان کی نفاست کا احساس بھی ہے اور اس کی عظمت کا احساس بھی ہے۔ اس لیے اگر آپ لوگوں نے اپنی محفل میں شمع میرے سامنے رکھی ہے تو آپ کا شکریہ لیکن مجھے زیادہ مسرت اس بات سے ہے کہ آپ لوگ اس ورثہ کا عرفان ہے جو ہمارے تخلیقی سرمایہ کا جوہر ہے۔ یہاں ہمارے قومی و لسانی ادب کے کئی لوگ اب ایسے ہیں جنھیں نئی نسل میں نہیں دیکھا اور بارہا یہیں سے اہل مغرب نے اچھے ادبی ورثے کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تمام روایت اچھی نہیں پائی۔ پھر یہ بھی ایک عام مغالطہ ہے کہ شعر و ادب سے صرف ان لوگوں کو واسطہ رکھنا چاہیے جو اس فن سے کسی نہ کسی طرح متعلق ہیں۔ دوسرے شعبوں کے طلبہ کو شعر و سخن کی تحصیل میں الجھانے سے ضیاع اوقات کا اندیشہ ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں۔ دراصل اچھے شعر و ادب کا ادراک فطرت و ذات کے احساس (لطیفی) (Sensibility) کا ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر کسی بھی علم کی خاطر خواہ تحصیل نہیں ہو سکتی اور نہ اپنے کسی توفیق اور قوت جو اکتساب علم سے پیدا ہونی چاہیے ہاتھ آ سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی محفل کامیاب رہے گی۔

☆

فیض کا منظوم ترجمہ ''پیامِ مشرق''

(تحقیقی مطالعہ)

فیض احمد فیض کا شمار اُردو کے اُن معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے دُوسرے شعرا کے کلام کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ فیض نے علامہ اقبال کے ''پیامِ مشرق'' کے اِنتخاب کا منظوم اُردو ترجمہ کرنے کے علاوہ داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ توف کی کے معروف شاعر ناظم حکمت اور قازقستان کے ممتاز شاعر اولجز عمر علی سلیمان کی بعض نظموں کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا جو ''شامِ شہرِ یاراں'' اور ''مرے دل مرے مسافر'' میں موجود ہیں۔ فیض نے علامہ اقبال کے فارسی مجموعہ ''پیامِ مشرق'' کے قطعات، غزلیات اور نظموں سے اِنتخاب کر کے منظوم اُردو ترجمہ کیا جو 1977ء میں نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال کی زیرِ نگرانی اقبال اکادمی لاہور نے ریبن پرنٹنگ پریس لمیٹڈ لیک روڈ لاہور سے گیارہ سو کی تعداد میں شائع کیا۔ یہ کتاب اب کمیاب ہے۔ فیض نے پیامِ مشرق کا انتخاب خود کیا اور اِس انتخاب میں پیامِ مشرق کے چار حصوں سے قطعات، غزلیات، نظموں کو چن کر ترجمہ کیا۔ اور اُن میں کوئی خاص موضوعاتی یا نظریاتی التزام نہ رکھا بلکہ عموماً اُن اشعار کو منتخب کیا جو آسانی سے اُن کی گرفت میں آ سکتے تھے ورنہ فیض بہت سے ایسے مضامین کو نظر انداز کر گئے جو پیامِ مشرق میں موجود ہیں اور ساری عمر اُن کی دلچسپی کا مرکز بنے رہے۔ اِس کا ثبوت خود فیض کا پیش لفظ ہے جو انھوں نے اِس منظوم ترجمہ میں لکھا ہے: ''آج سے چند ماہ پیشتر جب مجھ سے پیامِ مشرق کا منظوم ترجمہ کرنے کی فرمائش کی گئی تھی تو کافی پس و پیش کے بعد میں نے اس کی تعمیل اِس لیے قبول کر لی کہ اوّل تو اِس بہانے سے کافی زمانے کے بعد پیامِ مشرق جیسے مجموعۂ حسن و خوبی کے بالاستیعاب مطالعہ کی سعادت حاصل ہو سکے گی اور دوم ترجمہ اچھا بُرا جیسا بھی ہو اُن پرستارانِ اقبال کی جو فارسی زبان سے نا آشنا ہیں، اِس کتاب کے افکار و معانی تک کچھ نہ کچھ رسائی ضرور ہو سکے گی۔ اُردو اور فارسی میں قربت کے باوجود اظہار و آہنگ کے پیرایے کافی مختلف ہیں۔ فارسی زبان کو تراکیب اور مشتقات کی وجہ سے اجمال و اختصار کی جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اُردو میں موجود نہیں، اِس لیے اگر ترجمہ میں مفہوم اور معانی کے علاوہ اوزان و قوافی اور اصوات و آہنگ میں بھی اصل سے تطابق کی سعی کی جائے تو کافی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اِس لیے میں نے اِس انتخاب میں انھیں منظومات پر اکتفا کی ہے جن میں یہ التزام کسی حد تک ممکن تھا بلکہ اِن میں بھی جو اشعار میری گرفت میں نہیں آ سکے میں نے حذف کر دیے ہیں۔ اِس کے باوجود مجھے بہت سے تراجم سے تشفی نہیں ہے اِس لیے اِن صفحات میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ علامہ کی دین ہے اور جو نقائص ہیں وہ میرا عجزِ کلام۔ اِس تالیف کو میں نے اشاعت کے لیے پیش کرنے کی جسارت اِس اُمید میں کی ہے کہ شاید آنے والے دنوں میں مجھ سے بہتر سخن ور اِس میں اصلاح و اضافہ کر سکیں۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

مسودے کی تیاری میں جناب محمد صوفی تبسم کی ہدایت و راہنمائی اور اپنے رفقا شیر محمد حمید اور اعجاز حسین بٹالوی کی امداد و معاونت کے بے حد احسان مند ہوں۔"

فیض نے "پیامِ مشرق" کے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے اور اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ فیض نے "پیامِ مشرق" کی تمہید کا انتخاب نہیں کیا جو فرماں روائے افغانستان امان اللہ خان کو بطور ڈیڈیکیشن مثنوی بحروں میں لکھی گئی تھی۔ "پیامِ مشرق" کے پہلے حصے موسوم بہ "لالۂ طور" کے 163 قطعات سے 56 منتخب کیے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال مرحوم کی شارح اور علمائے اقبالیات نے ان کو رباعیات درج کیا ہے جب کہ یہ قطعات رباعی کے چوبیس اوزان میں شامل نہیں اور انھیں رباعی کہنا غلط ہے۔ "پیامِ مشرق" کے دوسرے حصے "افکار" سے جس میں 51 نظمیں شامل ہیں صرف 22 انتخاب چھوٹی اور مختصر نظموں کو چنا گیا۔ تیسرے حصے "مے باقی" جس میں 45 غزلیں ہیں صرف 21 غزلوں کا انتخاب کیا گیا جو غالباً ایسی تھیں جن میں فیض کے موضوع اور نظریے کی مماثلت تھی لیکن چوتھے حصے چار نظمیں یعنی نقشِ فرنگ، خطاب بہ انگلستان اور نوائے مزدور کا ترجمہ کیا گیا۔ فیض نے پانچویں حصے "خردہ" سے کوئی ترجمہ نہیں کیا۔

آغا ناصر نے اپنی تصنیف کتاب "ہم جیتے جی مصروف رہے" میں اس ترجمے کی تفصیل پر لکھا ہے "1976ء میں پاکستان بھر میں علامہ اقبال کی ولادت کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی سننے میں آیا کہ فیض صاحب اُن کی منتخب فارسی غزلوں کا اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔

ایک روز راولپنڈی کلب میں احمد فراز اور میں فیض صاحب کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ فیض صاحب جیسا کہ خود اتنے بڑے شاعر ہیں، دوسرے ایسے ہی طرح اقبال کے ہم پلہ ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو ترجمہ کے کام میں ضائع کریں۔ پہلے تو فیض صاحب ہنسی مذاق میں ٹالتے رہے اور کہتے رہے "بھئی آپ لوگ یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کا اندازہ نہیں، یہ کتنا بڑا کام ہے۔" مگر جب ہماری بحث جاری رہی اور ہم نے اصرار کیا کہ یہ ترجمے کا کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے، آپ جیسے بلند مرتبہ شاعر کو یہ زیب نہیں دیتا تو وہ سنجیدہ ہو گئے اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "آپ ترجمے کو تو بہت گھٹیا قسم کا کام سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ تخلیق کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔" ہم ان کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ آخر میں انھوں نے کہا: "بھئی اقبال کی اصل شاعری تو فارسی زبان میں ہے۔ پھر "پیامِ مشرق" تو ہمارے مطلب کی شاعری کی کتاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے۔" پھر کچھ اور باتیں ہونے لگیں اور "پیامِ مشرق" کے ترجمے کی بات ختم ہو گئی۔

مگر قصہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ دو تین مہینوں کے بعد جب ہمیں کسی کام سے بیروت جانا ہوا تو وہاں فیض صاحب کا یہ پیغام ملا کہ شام کو ان سے ملیں۔ میں فیض صاحب سے ملنے ان کے ہائیڈ پارک والے گھر گیا۔ وہ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس گھر کے باہر ٹہل رہے تھے۔ بڑی شفقت سے ملے اور مجھے اپنی اسٹڈی میں لے گئے جہاں پہلے سے ایک سنگل میز اور آمنے سامنے دو کرسیاں رکھی تھیں۔ انھوں نے کہا "بھئی آپ نے ایک روز ہم سے "پیامِ مشرق" کے ترجمے کی بات کی تھی نا...... تو اب یہ مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے صوفی تبسم سے اس کی ایک ایک سطر کی تصدیق کروالی ہے۔ تو بھئی اب جب یہ کام ہو ہی گیا ہے تو ہم نے سوچا کہ سب سے پہلے آپ ہی کو ترجمے سنائے جائیں۔" اس کے بعد وہ لطف لے لے کر اقبال کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ سناتے رہے۔"

آغا ناصر کی تحریر کے مطابق فیض نے یہ کہا کہ "پیامِ مشرق تو ہمارے مطلب کی کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے۔"
ہم یہ موزوں سمجھتے ہیں کہ "پیامِ مشرق" کا مختصر سا جائزہ پیش کریں تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ علامہ اقبال کی اس شاہکار اور مشکل تصنیف

جو دو سال کے بعد "پیام مشرق" ہے۔ اقبال نے اپنی صرف دو تصنیفات یعنی "اسرار خودی" اور "پیام مشرق" پر دیباچہ لکھا۔ "پیام مشرق" کی تصنیف کا 1918ء میں شروع ہوئی اور 1923ء میں تکمیل کو پہنچی۔ اقبال کے دیباچے کا مقدمہ سے چند مختصر اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اس شاہکار تصنیف کے متن سے تعارف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"پیام مشرق" کے متعلق جو مغربی دیوان سے سو برس بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ ان سو سال قبل کے جرمنی کی حالت اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنی علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں اور سنیور نٹی (سابق وزیر اعظم اٹلی) سے "انحطاط فرنگ" کی دلخراش داستان بھی سن لی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبر اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو اس وقت انسانی ضمیر میں واقع ہو رہا ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے ناموافق ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ، سست رو اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آ جائے جو جذبات قلب کو افکار دماغ سے تمیز نہیں کر سکتی۔ البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے۔"

"پیام مشرق" مشہور جرمن شاعر اور مفکر گوئٹے کی شاہکار تصنیف "مغربی دیوان" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ حکیم گوئٹے کی تصنیف "مغربی دیوان" کے بارے میں جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائنے لکھتا ہے: "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے..... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔" اقبال نے پیام مشرق میں ان حقائق اور معارف کو بیان کیا ہے جن کا تعلق فرد اور قوم کی باطنی تربیت سے ہے۔ "پیام مشرق" پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ موسوم بہ لالۂ طور 163 قطعات پر مشتمل ہے جس میں فلسفہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر مختصر

منظومات شامل ہیں۔ دوسرا حصہ جس کا نام "افکار" ہے جس میں اکاون نظمیں ہیں۔ اس حصے میں اقبال کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق واضح ہوتا ہے۔ اقبال اس حصے میں خدا، انسان اور کائنات کے متعلق اور اجتماعی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ تیسرے حصے "مے باقی" جو چھیالیس غزلوں پر مشتمل ہے زندگی کے فلسفے پر مبنی اشعار ہیں۔ ان اشعار میں حافظ کے شعروں کی روانی اور غالب و بیدل کی گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔ "پیام مشرق" کا چوتھا حصہ "نقش فرنگ" سے موسوم ہے۔ یہ حصہ فیض کی دلچسپی کا حصہ ہو سکتا تھا جس میں کارل مارکس، ٹالسٹائی، ہیگل، نطشے، ٹالسٹائی اور مزدک کا مکالمہ، رومی، موسولینی، قیصر ولیم، سرمایہ دار اور مزدور کے علاوہ شعرا اور فلسفیوں پر مختصر مگر اچھی نظمیں ہیں لیکن فیض نے ان تمام عنوانات سے کسی نظم کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ "نقش فرنگ" سے صرف پیٹوفی، خیالات فرنگ، انقلاب، انگلستان یورپ سے ایک خط، کا منظوم جامہ پہنایا۔ "پیام مشرق" کے آخری حصے "خردہ" کی چوبیس اشعار ہیں لیکن یہ اردو ترجمے میں شامل نہیں۔ منظوم ترجمے کا سب سے دلچسپ حصہ قطعات کا ترجمہ ہے۔ فیض نے تقریباً ایک تہائی قطعات کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا۔ ترجمے کی خوبی وہی رنگینی جو اقبال کی خوبی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ یہ جو رباعی کے بجائے قطعات کی اصطلاح کی وجہ سے جو رباعی نہیں۔ ایران کے نامور ادیب اور عروض دان پروفیسر شمس خانلری نے رباعی کی دو بحریں اور اوزان کو علیحدہ کر کے رباعی کے زمرے سے خارج کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کو یہ معلوم تھا لیکن عدالت کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے جس میں انھوں نے بغیر کسی منظور حوالے کے لکھا کہ "ہم رباعی کی دو بحروں کو ایران میں رباعیات کہتے ہیں"۔ راقم کی رائے بہت محققین نے کوئی قدیم اور جدید تحقیق تک نہیں کی۔ بہرحال مصرعوں کی تقطیع اور بعض قطعات کے مصرع اول ایم سے واضح ہے کہ یہ رباعیات نہیں قطعات ہیں۔ فیض نے اس منظوم ترجمے میں کہیں رباعی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ ان قطعات کے ترجمے میں نسبتاً تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں۔ بعض قطعات میں ایک دو الفاظ ترک کر دینے سے قطعہ کو عام فہم بنا دیا جس کی وجہ سے اصل قطعے کے معانی ترجمے کی وجہ سے متاثر نہ ہوئے۔ ذیل کے چند قطعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔ ہم قطعات فارسی اور اردو ترجمہ ایک ساتھ بطور نمونہ مزید تشریح و توضیح کے پیش کر رہے ہیں:

(اردو)		(فارسی)
اس گلشن میں پریشاں مثل بو ہوں نہ جانے کیا ہوں؟ کیا ڈھونڈ رہا ہوں بر آئے آرزو یا نہ آئے شہید سوز و ساز آرزو ہوں	(1)	دریں گلشن پریشاں مثل بویم نمی دانم چہ می خواہم، چہ جویم بر آید آرزو یا بر نیاید شہید سوز و ساز آرزویم
سحر کہتی تھی بلبل باغباں سے یہاں بس غم کا بوٹا پائدار ہے پہنچ جاتی ہے پیری خار بیاباں حیات گل نہایت مختصر ہے	(2)	سحر می گفت بلبل باغباں را دریں گل جز نہال غم نگیرد بہ پیری می رسد خار بیاباں ولے گل چوں جواں گردد بمیرد
برہمن نے کہا محشر میں رب سے یہ جینا تو فقط تاب شرر تھا	(3)	بہ یزداں روز محشر برہمن گفت فروغ زندگی تاب شرر بود

[illegible] ترکی با تو گویم
سخن از آدمی پاکیزہ تر گو

نہیں [illegible] سے اس : [illegible] خدا کے
کرے جو بات سے آدمی پاکیزہ تر بھی

(4)

تہی از ہای و ہو میخانہ بودے
گلِ ما از شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق و این ہنگامۂ عشق
اگر دل چون خرد فرزانہ بودے

تہی از ہاؤ ہو میخانہ ہوتا
گلب سے تن مرا بیگانہ ہوتا
نہ ہوتا عشق اور ہنگامۂ عشق
جو دل بھی خرد فرزانہ ہوتا

(5)

شنیدم در عدم پروانہ می گفت
دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشان کن سحر خاکسترم را
ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش

یہ پروانہ عدم میں کہہ رہا تھا
مجھے بھی زندگی کا راز دے دے
بکھر جائے سحر کو راکھ میری
مگر شب بھر کا سوز و ساز دے دے

(6)

سحر در شاخسار بوستانے
چہ خوش می گفت مرغ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

سحر دم ایک شاخِ بوستاں پر
یہ کہتا تھا کوئی مرغِ نواگر
کوئی نغمہ ہو یا آہ و فغاں ہو
نکالو جو بھی ہے سینے کے اندر

(7)

تو اے شیخ حرم شاید ندانی
جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزان ندارد
نہ او را مسلمے نے کافرے ہست

تو اے شیخ حرم شاید نہ جانے
جہانِ عشق کا اپنا ہے محشر
یہاں اعمال نامہ ہے نہ میزاں
یہاں کوئی مسلماں ہے نہ کافر

(8)

ز انجم تا بہ انجم صد جہان بود
خرد ہر جا کہ پر زد آسمان بود
ولیکن چون بخود نگریستم من
کرانِ بیکران در من نہان بود

زِ انجم تا بہ انجم سو جہاں تھا
خرد پہنچی جہاں بھی آسماں تھا
مگر جب میں نے اپنے دل میں جھانکا
کراں بے کراں مجھ میں نہاں تھا

(9)

تو خورشیدی و من سیارۂ تو
سراپا نورم از نظارۂ تو

تو خورشید اور میں سیارہ تیرا
مجھے روشن کرے نظارہ تیرا

ز آغوشِ تو دورم ناتمامم
تو قرآنی و من سیپارۂ تو

میں تجھ سے دور رہ کر نا مکمل
کہ تُو قرآں ہے میں سیپارہ تیرا

(10)

ندانم بادہ ام یا ساغرم من
گہر در دامنم یا گوہرم من
چنان بینم چو بر دل دیدہ بندم
کہ جانم دیگر است و دیگرم من

نہ جانے میں ہوں بادہ یا کہ ساغر
گہر دامن میں ہے یا خود ہوں گوہر
نگہ ڈالوں جو دل پہ یوں نظر آئے
کہ میری جاں دگر ہے میں ہوں دیگر

(11)

مرنج از برہمن اے واعظِ شہر
گر از ما سجدۂ پیشِ بتاں خواست
خدائے ما کہ خود صورت گری کرد
بتے را سجدہ از قدسیاں خواست

بُرا مت مانیو واعظ ، جو مجھ سے
مُصر ہے برہمن بت کو ہو سجدہ
خدا خود بھی تو صورت گر ہے جس نے
کرایا قدسیوں سے بت کو سجدہ

فیض کے منظوم ترجمے میں بعض مقامات پر مطالب پوری طرح سے روشن نہیں ہوسکے اور ایک دو مقامات پر شعر کے اصلی معنی بدل گئے جس طرح ذیل کے قطعہ میں اقبالؔ یہ کہہ رہے ہیں کہ رازی سے قرآن کے معنی کیوں پوچھتے ہو چوں کہ ہمارا ضمیر اور ہماری ذات خُود قرآن کی آیات پر دلیل ہے، عقل شعلے بھڑکاتی ہے اور دل جلا دیتی ہے اور یہی قصہ نمرود اور خلیل کی تفسیر ہے۔ اس قطعہ میں وجدان یا ضمیر کو قرآن کے معانی درک کرنے کا وسیلہ بتایا گیا ہے اور عقل سے چوں کہ دل جل کر راکھ ہو جاتا ہے، یہ کام حل نہیں ہوسکتا۔ فیض نے تیسرے مصرع میں دل بسوزد کا ترجمہ دل سلگتے ہیں، کیا کہ جس کے معنی دل جو عشق و وجدان کا منبع ہے روشن ہو جاتا ہے۔ جو اقبال کا نقطۂ نظر نہیں۔

ز رازی معنیِ قرآن چہ پرسی
ضمیر ما بآیاتش دلیل است
خرد آتش فروزد ، دل بسوزد
ہمیں تفسیرِ نمرود و خلیلؑ است

نہ پوچھ حضرت رازی سے معنیِ قرآں
کہ میری ذات ہے خود اس کی آیتوں پہ دلیل
خرد سے آگ بھڑکتی ہے ، دل سلگتے ہیں
یہی ہے قصۂ نمرود اور حدیثِ خلیلؑ

فیض نے مقدمہ میں مسودے کی تیاری میں اُستاد صوفی تبسم کی ہدایت اور رہنمائی کا ذکر کیا ہے۔ جن افراد نے صوفی صاحب کا غالب کی فارسی غزلوں کا ترجمہ دیکھا ہے، اُن کو اس منظوم ترجمہ میں اُن کی گہری چھاپ بھی نظر آئے گی۔ مزید کسی تشریح اور تفسیر کے "پیامِ مشرق" کے دوسرے حصوں افکار، مے باقی اور نقشِ فرنگ سے نمونے کے طور پر کچھ نظمیں اور ایک آدھ غزل بھی یہاں پیش کی جا رہی ہے۔

حیاتِ جاوید (فارسی)

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

حیاتِ جاوید (اُردو)

گماں نہ کر کہ ہُوا ختم کاروبارِ مغاں
ہزار بادۂ نوشیدنی ہے در رگِ تاک

چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتوان زیست
قبای زندگیش از دم صبا چاک است

چمن ہے خوب پہ غنچے کی طرح کیا جینا
دم صبا سے ہے جس کی قبائے ہستی چاک

اگر ز رمز حیات آگہی مجوی و مگیر
دلی کہ از خلش خار آرزو پاک است

ہے رمز زیست سے واقف اگر تو کر نہ قبول
وہ دل کہ ہے خلش خار آرزو سے پاک

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساران زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

رہ اپنی ذات پہ محکم تو کوہسار صفت
نہ بن خس کہ ہوا تیز شعلہ ہے بیباک

غلامی (فارسی)

آدم از بی بصری بندگی آدم کرد
گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد

غلامی (اردو)

بندگی کرتا ہے بندے کی یہ آدم بے بصر
نذر کر دیتا ہے شاہوں کی جو رکھتا ہے گہر

یعنی از خوی غلامی ز سگان خوار تر است
من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

یعنی ہے خوئے غلامی میں سگوں سے بد تر
سگ کے آگے کوئی سگ آ کے جھکا دیکھیں سر

انسان (فارسی)

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

انسان (اردو)

رات پیدا تو نے کی، پیدا کیا میں نے چراغ
خاک پیدا تو نے کی، پیدا کیا میں نے ایاغ

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

تیری قدرت نے بنائے کوہ و صحرا دشت و راغ
میری محنت نے بنائے گلشن و گلزار و باغ

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

سنگ سے میں نے آئینہ پیدا کیا
زہر سے میں نے نوشینہ پیدا کیا

غزل (فارسی)

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی
ولیکن سوی مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی

غزل (اردو)

نہ جچتے ہو حرم میں نے صنم خانے میں آتے ہو
پہ مشتاقوں کی جانب کیسے مشتاقانہ آتے ہو

قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقان
تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی

قدم بیباک رکھو مشتاقوں کے حریم جاں میں
تم ہو مالک تو گھر ہے کس لیے دزدانہ آتے ہو

بجلوت نی بنی سرمایہ گنج خسروان را
بخلوت بی نیازی با نگاہ دلبرانہ می آئی

کبھی قناعت کہ سرمایہ سب گنج شاہوں کا
کبھی زندانوں میں صورتِ ترانہ آتے ہو

گہے صد لشکر انگیزی کہ خون دوستاں ریزی
گہے در انجمن با شیشہ و پیمانہ می آئی

کبھی لشکر لیے آتے ہو خون دوستاں کرنے
کبھی محفل میں لے کر شیشہ و پیمانہ آتے ہو

تو بر نخل کلیمی بے محابا شعلہ می ریزی
تو بر شمع یتیمی صورت پروانہ می آئی

تجلی طور پہ تو بے حجاب کل کرتے ہو
شمعِ صبح جہاں صورتِ پروانہ آتے ہو

بیا اقبال جامی از خمستان خودی در کش
تو از میخانہ مغرب ز خود بیگانہ می آئی

خودی کے تخم سے اے اقبال آؤ اک قدح بھر لو
کہ تم میخانہ مغرب سے خود بیگانہ آتے ہو

نوائے مزدور (فارسی)

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیب خواجۂ ناکردہ کار رخت حریر

نوائے مزدور (اردو)

غریب بے سروساماں کی کمائی سے
ملی ہے خواجۂ بیکار کو قبائے حریر

ز خوی فشانی من لعل خاتم والی
ز اشک کودک من گوہر ستام امیر

مرا پسینہ بنا لعل خاتم والی
بنے ہیں اشک مرے طفلکاں کے تاج امیر

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگ ساز
مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم

سنو کہ تازہ نوا آ رہی ہے از رگ ساز
مئے کہ آتش نے سے گداز جام کریں

مغان و دیر مغان را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

مئے نظام پہ تازہ بنائے میخانہ
جو مے کدے ہیں پرانے انھیں تمام کریں

ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم
بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم

گلوں کو رہزنِ گلشن سے خونبہا مانگیں
بساطِ گل پہ نئی طرح اہتمام کریں

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے
ز خویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

طوافِ شمع کہاں تک مثالِ پروانہ
جئیں گے اپنے کہاں تک خودی سے بیگانہ

فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان پریم چند

"ادبی مناظرے" کے پروگرام میں فیض احمد فیض اور آغا عبدالحمید کی یہ بحث 18 جون 1911 کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کی گئی۔ بحث خاصی طولانی ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس کا وہ حصہ پیش کر رہے ہیں جس سے فیض کے نظریات کا علم ہو سکتا ہے۔
اس ادبی مناظرے میں چیدہ چیدہ نقطۂ پریم چند کی تخلیقات، ان کی سماجی، سیاسی، اخلاقی اور ادبی اقدار پر بحث کی گئی تھی۔

فیض: کچھ عرصہ ہوا تم نے ادبی دنیا میں پریم چند پر ایک مضمون لکھا تھا، جو "ہمایوں" میں چھپا ہے۔ تو اس میں پریم چند کی اتنی تعریف کی ہے کہ ٹالسٹائی اور دوستوئفسکی وغیرہ وغیرہ سب ہیچ معلوم ہونے لگے ہیں۔ پریم چند میں وہ جادو خوبیاں تھیں جو کسی اور کے میدان میں اپنے عہد میں شاید ہی کسی میں تھے۔

حمید: جس مضمون کا تم ذکر کر رہے ہو وہ میں نے تقریباً آٹھ نو سال پہلے لکھا تھا۔ اگر اب اسے دوبارہ لکھوں تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہو۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی تھی جو بالکل غلط ہو۔ آخر تمہیں کس چیز پر اعتراض ہے۔

فیض: اعتراض تو ہوتے رہیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم اب بھی پریم چند کو ٹالسٹائی اور دوستوئفسکی کا ہم پلہ سمجھتے ہو؟

حمید: جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے پریم چند کو ٹالسٹائی اور دوستوئفسکی کا ہم پلہ تو نہیں کہا تھا۔ اب بھی یہی کہتا ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں پریم چند کو ایک بڑا افسانہ نویس سمجھتا ہوں۔

فیض: تو اسی مضمون کے شروع میں تم نے مرزا رسوا، نذیر احمد، سرشار اور رسوا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ان سب سے ہم کسی کو بھی اول درجے کا ناول نویس نہیں کہہ سکتے۔ ہر ایک میں جہاں خوبیاں ہیں وہاں خامیاں بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ پہلے درجے کا ایک ناول بھی پیدا نہ کر سکے۔ ان تمام حضرات کے ناول افسانوں میں اونچے پریم چند بڑھ گئے ہیں۔" جو ایک حد تک درست ہے لیکن سرشار کے فسانۂ آزاد کو تو ناول نہیں کہتے ہیں۔ اگر نذیر احمد کے ناول اول درجے کے نہیں ہیں اور اگر ... امراؤ جان ادا پہلے درجے کا ناول نہیں ہے تو میں نہیں جانتا کہ پریم چند نے ان سے بڑھ کر کیا چیز لکھا ہے؟

حمید: میں مانتا ہوں کہ نذیر احمد کے ساتھ میں نے کسی قدر بے انصافی کی ہے۔ مرزا رسوا کے لیے میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اب تو میں یہ بھی خیال کرنے لگا ہوں کہ نذیر احمد پریم چند سے کم مرتبہ نہیں ہیں۔ بلکہ جہاں تک ناول کا تعلق ہے نذیر احمد پریم چند پر سبقت لے گئے ہیں۔

فیض: لیکن تمہارے مضمون سے جو ... پڑھتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم پریم چند کی شخصیت کو ... سمجھتے ہو۔

تو دیا پریم چند سے پہلے کسی کو اتنی مقبولیت نصیب نہیں تھی۔

حمید: نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ میں نے تو اس مضمون میں پریم چند کے فن کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

فیض: بہر حال تم نے جو مثالیں دی ہیں پریم چند کی حقیقت نگاری پر ایک حد تک درست ہے۔ آگے چل کر تم نے پریم چند کی حقیقت نگاری کی نہایت مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ اول تو ناول لکھنے والے صرف ایک ہی طبقے کی زندگی کو نمایاں کر کے دکھانے کے قائل ہوں تو حقیقت نگاری کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت ایک جامع چیز ہے۔ اور اس کی وضاحت وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن میں اس کا کوئی مکمل تصور موجود ہو۔ اور پریم چند کے ذہن میں یہ تصور موجود نہیں تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے بعض پہلو ایسے ہیں جن کے متعلق منشی پریم چند خاموش رہتے ہیں لیکن دراصل ان سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اور جو کچھ بھی ہوں حقیقت نگار ہرگز نہیں کہلا سکتے۔

حمید: آپ کے پہلے اعتراض سے مجھے اتفاق نہیں۔ ایک افسانہ میں زندگی کو پیش کرنا ہی تو کسی حقیقت نگار کا کام ہے۔ ضروری صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے جس پہلو کو پیش کرے، وہ سچا ہو۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں پر اس کی حقیقت روشن ہو جائے۔ بہت سے ناول ایسے ہوتے ہیں جن کی داستان نہایت محدود ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ ادبی وجہ سے افسانوں میں گنے جاتے ہیں۔ … ایک محدود طبقے کے متعلق لکھے ہیں لیکن پھر بھی آرٹ کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور بھی مثالیں ہیں۔ …

فیض: ٹھیک ہے اب تم اصل بحث کی طرف آئے ہو۔ اس وقت ناول کی جامعیت یا وسعت سے بحث نہیں تھی۔ حقیقت نگاری کی بات ہو رہی تھی۔ مجھے … کی عظمت سے انکار نہیں۔ لیکن میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ پریم چند نے کسان طبقے کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے … حقیقت نگار کہلانے کا مستحق نہیں … اس طبقے کے متعلق … تفصیل … ایک … ناول … حقیقت … مسئلہ … یہ دوسرے اعتراض کا جواب ہے … پریم چند زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کے متعلق کچھ نہیں کہتے اور ان سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔

تو یہ بڑی تعجب کی بات ہے کہ پریم چند نے بعض … پر اعتراض … لیکن … صاحب … اعتراض … مان لیں بات یہ ہے کہ پریم چند ہمارے نہایت شریف آدمی تھے۔ … کام … اگر آپ … ہیں تو آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ … ضرورت ہوتی ہے۔ اور … تو … ہمارے پریم چند نہایت شریف آدمی تھے۔

حمید: یہ بالکل غلط ہے کہ پریم چند میں ہماری معاشی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو بیان کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ ان کے ابتدائی افسانوں … میں کچھ جدت پسندی ضرور پائی جاتی ہے لیکن "گوشہ عافیت"، "میدان عمل"، "گئودان" میں انھوں نے ہمارے دیہات کو نہایت بے نقاب پیش کیا ہے۔ ان کتابوں کے لکھنے سے ان کا مقصد یہی دکھانا تھا کہ دیہات کے لوگوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ اور انھیں … کے لیے کیسی زندگی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ "قصہ آزاد" کے بعد ہمارے کسانوں اور دیہاتیوں کے تجربات انھیں کی زبان میں صرف پریم چند نے ہی ادا کیے ہیں۔

فیض: یہ پہلی زبان کی طرف اشارہ کرنے کا شکریہ۔ میں کہتا تو یہ تھا۔ یہ بتا جائے پریم چند کو جیسے بنائے دیہاتی زبان استعمال کرنے کی بہ ضرورت پیش آتی ہے۔ جو اس سے ان کی دیہاتی زبان مطلب آتا ہے کہ مضمون کو محدود مشکل کو مشکل الفاظ دیا جائے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ایک ہی دیہاتی ایک ہی تقریر میں ایک لفظ دیہاتی زبان میں بولتا ہے اور دوسرا لفظ ٹھیٹ ادبی فصیح اردو میں۔ پھر کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے پریم چند پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے افسانوں میں تھیم کھلا چھوڑ کر تجزیہ کر دیتے ہیں۔ تو کوئی بات پڑھنے سے باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایسے ناول یا افسانے پر بہت سے حضرات کے پلاٹ کا فیصلہ ہونے لگے۔

حمید: یہ بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ سب کی صنف کو ماننا انہی کی کتابوں میں ہماری کئی خامیاں موجود ہیں۔ ٹالسٹائی کو لے لو۔ اس نے اپنی آخری عمر میں چند مضامین میں ناول نگار کے بارے میں لکھے تھے۔ کوئی نقاد ان پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ اس سے ان کے ناولوں کی ادبی قیمت کم ہو گئی ہے۔

فیض: ٹالسٹائی کے علاوہ کوئی اور بھی تو بتاؤ۔

حمید: میکسم گورکی۔

فیض: ان لوگوں کی بات دوسری ہے۔ اگر کوئی بڑے ادیب اپنی چیزوں میں بعض ایسی چیزیں بھی لکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ اگر ایک ادبی فنی اعتبار سے کامیاب ہو اگر اس میں بعض چیزیں شامل ہوں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ہر طرف ناول کی ادبی قیمت میں فرق آ جاتا ہے۔ ناول کا وہ حصہ بھی بے اثر ہو جاتا ہے۔ میں ایک مثال لے لو۔ جو فارسی ادب میں ہے شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔ کئی فارسی شعرا ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اشعار میں طرح طرح کی نصیحتیں کی ہوں لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ زندگی میں اتنے پاک نہیں تھے۔ جس نے لکھا ہے کہ اخلاق کے متعلق ان میں ایک نہایت سخت منافقت پائی جاتی ہے۔

حمید: یہ درست ہے کہ تھیم کھول کر رکھ دینا افسانے کے لیے اکثر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے لیکن پریم چند کے چند ایک افسانے ایسے بھی ہیں جن میں یہ خامی موجود نہیں۔ اور ان میں ایک افسانہ تو ایسا ہے جو تھیم کھلا رکھنے کے باوجود بہت کامیاب ہے۔

فیض: کون سا؟

حمید: اس کہانی کا نام ہے "واردات"۔ یہ ایک کسان اور ایک چور کی کہانی ہے۔

فیض: بعض دفعہ کہنے کا ڈھنگ بھی بڑی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ پریم چند ایک مناظر کو بڑی کامیابی سے بیان کر سکتے تھے لیکن بہت شدید جذبات کے اظہار کے لیے ان کے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

حمید: یہ حقیقت ہے کہ منظر کشی میں ان کی مہارت مسلم ہے۔ ان کا طرز تحریر بھی ایک خاص ادب ہے جس کی تعریف ان کی عظمت کے بغیر ممکن نہیں۔

فیض: لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی ہر چیز میں ایک خاص تاثر ہوتا ہے۔ پریم چند کے تمام کردار اور افسانے کے پلاٹ کی بات ہے۔ سوال اٹھتے ہیں لیکن ان کا جواب دینے کے بعد بھی ان سوالوں کا جواب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ پریم چند کی عظمت کیا ہو جاتی ہے؟

آپ: جو مسائل آپ نے اپنے مضمون میں زیر بحث لائے ہیں ان کا ایک بڑا تعلق [illegible] ناول نگاری کی صورت [illegible] اردو زبان میں کوئی اور
ناول نویس پیدا نہیں ہوا جس میں [illegible] تیسری چیز جس کی طرف میں نے ابھی تک اشارہ نہیں کیا یہ ہے کہ [illegible] جس میں
ظاہر اور [illegible] ہے جو ان کی تحریر کے ہر لفظ میں سے ٹپکتی [illegible] کہانی [illegible] ہے [illegible] اس چیز کی قیمت [illegible]
ہوں کہ [illegible] ایک افسانہ [illegible] ایسا ہوا ہے جس کو پڑھ کر راحت ہوتی ہے [illegible]
[illegible] کسی قوم [illegible] اول درجے کے مصنفین کی [illegible]
درجے کے مصنفین [illegible] ایک خاص رنگ [illegible] ایک خاص صورت میں [illegible] ہمارے یہاں ناول کے
سوال میں [illegible] ہمارے ادیبوں کی رہنمائی کی ہے۔

☆☆☆

فیض کا عقیدہ

(مستند حوالوں کی روشنی میں)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انٹرویو [illegible]

[illegible]

[illegible]

افتخار عارف کے سوال "خدا، مذہب اور اقبال سے ملاقات" کا جواب دیتے ہوئے فیض صاحب نے کہا:

"یہ پوچھیے کہ بچپن میں ہم مسجد میں کب آئے۔ انجمن اسلامیہ کا ہر سال ایک جلسہ ہوتا تھا، جس میں مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے۔ ہمارے ابا انجمن کے صدر تھے۔ ہماری عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ جب ہم نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا تو جلسے میں ہمیں قرأت کرنے کے لیے کھڑا کر دیا گیا۔ ہم نے پہلے نام پڑھ کر قرأت شروع کی تھی کہ انجمن کے کسی بزرگ نے ہمیں اٹھا کر منبر پر کھڑا کر دیا۔ وہاں ہم نے تھوڑی سی تلاوت کی۔ یہ تھی ہماری پہلی پبلک اپیرنس (Public Appearance)۔ ہمارے ابا کے کچھ دوست تھے، اس حرکت پر وہ بڑے خوش ہوئے اور سب نے بہت پیار کیا تھا۔"

ڈاکٹر ایوب مرزا "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھتے ہیں:

"فیض نے کہا جب میں فوج میں تھا تو میں نے ان کو قرآن اور حدیث کا سبق دینا شروع کر دیا۔ ایک نوجوان کرنل جو دہریہ بھی تھا اور تعلیم یافتہ بھی اور جو بقول خود بہت ذہین تھا، یہ تعلیم دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ایک دن مجھے الگ لے جا کر پوچھا، "آپ کا مذہب کیا ہے؟" میں نے اسے بتایا کہ "میرا مذہب وہی ہے جو مولانا روم کا مذہب تھا۔" کرنل صاحب مولانا کا نام سن کر مطمئن ہو گئے اور خوش ہو کر کہنے لگے "پھر ہم مسلمان بھائی ہیں۔ آپ اچھا درس دیتے ہیں۔" کرنل سے دوبارہ کے بعد جب اکٹھے ہوئے تو کرنل صاحب کو میرے مذہب نے پھر ستایا۔ پوچھا: "فیض صاحب مولانا روم کا مذہب کیا تھا؟" میں نے کہا، "وہی جو میرا ہے۔""

پروفیسر فتح محمد ملک "فیض شاعری اور سیاست" میں لکھتے ہیں:

"مولانا جلال الدین رومی کے معاصر علما ان کے مذہب کے بارے میں ہمارے کرنل صاحب سے زیادہ پریشان تھے۔ ایک مرتبہ مختلف خیال علما نے رومی کا ایک ساتھی ان کی خدمت میں بھیجا تاکہ ان سے مناظرہ کرنے آیا۔ پوچھا گیا کہ مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں سے آپ کس فرقے کے عقائد سے متفق ہیں؟ مولانا نے جواب دیا کہ میں بہتر کے بہتر فرقوں کے عقائد سے متفق ہوں۔ اس پر وہ بہت برہم ہوا۔ ان میں سے کئی ایک میں آپس میں تضاد ہے۔ مناظر پھر بہت بگڑا اور بولا کہ پھر تو آپ کافر اور زندیق ہیں۔ مولانا روم نے فوراً جواب دیا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔ چنانچہ مناظر کو میدان چھوڑنا پڑا۔"

مناظرہ بازی اور کافر سازی کی فضا میں مولانا روم کی روش یہ تھی:

من ز قرآں مغز قرآں برداشتم

استخواں پیش سگاں انداختم

فیض مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ ان کی آخری رسومات بھی اسلامی شرع پر ہوئیں۔ ان کا 28 اکتوبر 1941ء کو ایلس جارج کیتھرین سے اسلامی شرع کے مطابق نکاح ہوا۔ ایلس بیگم ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی سالی تھیں۔ شادی سری نگر میں ہوئی۔ شیخ محمد عبداللہ نے نکاح پڑھا۔ فیض کی والدہ نے ایلس کا اسلامی نام کلثوم رکھا۔ فیض نے اپنے مجموعہ "دست صبا" کا انتساب کلثوم کے نام کیا ہے۔

شادی کی شرائط: یہ معاہدہ 12 اکتوبر 1941ء کو فیض احمد فیض (ہونے والے شوہر) اور ایلس کیتھرین جارج (ہونے

واضح رہے کہ حسب ذیل شرائط فریقین کے درمیان طے پائیں جن کی رو سے یہ شادی ہو رہی ہے۔ ان کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1) اس معاہدے کے تحت دونوں میں طے پایا ہے کہ چونکہ دونوں مسلمان ہیں اس لیے ان کی شادی اسلامی شریعت کے مطابق ہو۔

2) اس معاہدے کی رو سے اور حنفی شادی کے نتیجے میں فریقین فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایلس کیتھرین جارج سے شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد کی حیات میں بھی کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کریں گے۔

3) اس معاہدے کے مطابق اور حنفی طرز شادی کے پیش نظر فیض احمد اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اسلامی قانون کے تحت طلاق کا حق ایلس کیتھرین جارج کو تفویض کرتے ہیں۔

4) اس معاہدے کے تحت اور اسلامی قانون کی رو سے مہر کی رقم پانچ ہزار روپے مقرر کی گئی ہے جو شادی ہو جانے کے بعد فیض احمد ایلس کیتھرین جارج کو ادا کریں گے۔

دستخط

ایم اے صادق	فیض احمد	ایلس کیتھرین جارج
نور حسین	لیکچرر انگلش ہیلی کالج آف کامرس لاہور	شیخ محمد عبداللہ

سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کیا آپ واقعی صوفی تھے۔

فیض: اپنی قسم اٹھا کر تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم ایک قسم کے روایتی Traditional صوفی نہیں ہیں۔

فاروق احمد: فیض صاحب یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری کے رشتے سے آپ صوفی ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا اور مراد شاید یہ ہے کہ آپ کی ایک جانب انقلاب کے ساتھ ہے۔ دوسری جانب ادب سے خیال و سوچ کا حصہ ہے کہ صوفی ہر کام کو ایک جماعت کی حیثیت میں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صوفی یا اولیائے کرام صاحب حال ہوتے ہیں یا صاحب حال کی بات کرتا ہے وہ حال کے حوالے سے بہت بات کرتے ہیں۔ مجھے شاہ عطاء اللہ کی بات یاد ہے اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آپ کو صوفی کہتے ہیں اور حال کی بات کیا کرتے ہیں۔

فیض: بات آٹھ برس کی عمر سے ہے۔ جب تک ہم کالج نہیں پہنچے تھے ہمارا روز کا معمول یہ تھا کہ اپنے ابا کے ساتھ مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھنے کے لیے جاتے۔ نماز کے بعد مولوی ابراہیم سیالکوٹی کا درس بھی سنتے تھے۔ ان ساری باتوں کے اثرات ان کی ساتھ چلے آئے ہیں۔ ہم نے تو کوشش کی ہے کہ زندگی جو قیمتیں سکھاتی ہے اور ایک حدیث کی ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ! اسے مدنظر رکھا جائے۔

ناصر شہزاد: فیض صاحب آپ نے جو معاشرے کے لوگوں کی بھی تو تکمیل کی ہے۔

فیض: جی ہاں ہم ایسا کرتے رہے تھے۔ ان دنوں تیا گیا ہے میں مولوی محمد حسن کا درس ہوتا تھا۔ وہ شخص بڑی محبت سے پڑھاتے تھے۔ تقریباً ایک برس تک۔

منظر نیازی: "دست تہ سنگ" میں آپ کی ایک نظم حمد کے عنوان سے جس میں زندگی کے متعلق بھی بتایا گیا ہے۔ کیا آپ نے زندگی کو خدا سے مربوط کر کے دیکھا ہے؟

فیض: زندگی خدا نے پیدا کی ہے۔ ساری موجودات خدا کی مخلوق ہیں۔ ان کے واسطے سے ہم اللہ کی رحمت کو دیکھتے ہیں۔ ان کا

تعلق رکھتا ہے۔

رائی: جب بات روایت کی چل نکلی ہے تو ہمارے یہاں مذہب کے اثرات اور اس کی روایت بھی تو ہیں؟

فیض: یہ تو ہمارے ہاں ہر شاعر کا وطیرہ ہے۔ لیکن ان روایتوں کا اظہار دو طریقوں سے ہوتا ہے ایک تو مولویانہ طریق ہے۔ دوسرا جب کہ زاہد و محتسب کی ... دوسرا طریق اظہار میں، صوفیا کی باتوں پر زور دیا گیا ہے جب کہ صوفیوں کا طریقہ اس سے بالکل الگ رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ حضرت بلال میرے مرشد ہیں۔

افضل امام: کیا یہ صحیح ہے کہ جب آپ جیل میں تھے تو قیدیوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے یا کوئی اور تعلیم بھی؟

فیض: یہ بالکل صحیح ہے۔ میں قیدیوں کو قرآن و حدیث پڑھایا کرتا تھا۔

افضل امام: موجودہ دور کے کسی اسلامی مفکر سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟ اور اگر ہوئی ہے تو کس موضوع پر گفتگو ہوئی ہے؟

فیض: اس دور کے آخری مفکر تو اقبال ہی تھے۔ اس کے بعد شبلی نعمانی اور مولانا آزاد تھے۔ مجھے سید سلیمان ندوی سے بھی شرف ملاقات حاصل رہا ہے اور مولانا آزاد سے بھی سرسری طور پر ایک دو بار ملاقات ہوئی ہے لیکن شبلی زیادہ قریب تر ذہن سے رہا اور ان کی کتابیں بھی میں اکثر پڑھتا تھا۔ دوسرے وقت کی صحبت عطا اللہ شاہ بخاری مرحوم کی۔ ہم نے ان کی باتوں سے بھی کافی کسب فیض کیا ہے۔ ہمیشہ بچپن ہی سے ... اپنے شہر کے سب سے بڑے مولوی ابراہیم صاحب مرحوم کی صحبت میں ذہنی طور پر گزارا تھا اور وہاں میں قرآن شریف پڑھا کرتا تھا۔

افضل امام: اسلامی ادب کے ... ایک قاری کا سوال پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ جس طرح اقبال مرحوم نے آخری وقت میں تصوف کا گلہ ٹھکرایا، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بھی اس ضمن میں ان کا انداز اپنا لیں؟

فیض: امام صاحب پہلے یہ بتائیے کہ تصوف کو ہم آپ کی نظر میں کیا ہے۔ میں تو اپنے آپ کو اولیاء کے طریقے سے تصوف کا ہی ہو کر سمجھتا ہوں۔ اس مسلک پر تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے مگر بنیادی طریقہ تو میرا بھی ان ہی سے ملتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شک و شبہات کی بنا پر لوگوں نے اسلام کا ... جو اختیار کر رکھا ہے۔ کسی پر کچھ الزام عائد کر دو کسی پر کوئی بہتان باندھ دو۔ یہ سب اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے بلکہ ان طریقوں سے اسلامی شخصیت کی تذلیل کی جاتی ہے۔

افضل امام: موجودہ دور کے علما جیسے مولانا احتشام صاحب یا مولانا مودودی یا مولانا ... سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی ہے؟

فیض: مولانا مودودی صاحب سے میری دو تین بار ملاقات رہی ہے۔ جیل کے اندر بھی جیل کے باہر بھی لیکن میں نے دینی معاملات پر کبھی ان سے تبادلہ خیالات نہیں کیا۔ اس لیے کہ ان کا ایک ... مسلک بھی ہے۔ ان کے علاوہ اور وہ اس طرح واضح ہے کہ مجھے اشتراک کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے بھی کبھی دینی موضوعات کو نہیں چھیڑا اور میری عادت یہ ہے کہ میں دینی معاملات پر بحث نہیں کرتا۔

افضل امام: آپ کو کبھی ... دنیا کی صفت بھی رکھتے ہیں جو صوفیوں کی صفت ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ ... سے ... رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کے باطن میں بھی روشنی ہے!

فیض: میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شاعری اور فریضے سے دیکھا جائے تو ہمارا ایک رشتہ تو صوفی کے سے ہے اور ... غزل میں جو باطن اور ... وہ صوفیوں ہی سے موجود ہے۔ طریقت اور شریعت کے تضادات ہمارے یہاں موجود رہے ہیں۔ ... انسان دوستی، محبت اور آشتی کا درس دیتے تھے دنیا داری اور ملا پرستی، تعصب، نفرت اور تحکم کے خلاف

تھے۔

اقبال مرتضیٰ: ذہن بنانے میں آپ کا تعلق آف دی آرمی اسلام آباد کے جو حضرات تھے میرے لیے ایک اعزاز ہے کہ ڈاکٹر نے آپ کے مرحوم گورنر جنرل تھے، وہاں آپ نے ایک جرنل پر حاضری دی تھی۔ آپ کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور آپ نے رسول کی مطالعہ میں اپنی تحریر میں بات کو بہت قریب کیا تھا۔ آپ شعر و زبان کے تجربے کے ساتھ اس صورت حال کو کیسے مربوط کرتے ہیں؟

فیض: یہ ہمارے تجربے کا حصہ ہے۔ ہم تو دیہاتی آدمی ہیں۔ بچپن میں ہم دیہات میں زیادہ تھے وہیں قرآن شریف پڑھا ہم نے اس بات کو بچپن کی روشنی میں سیف الملوک اور یوسف زلیخا کے قصے پڑھے جاتے تھے اور دین میں کرم اللہ کے مزاروں پر بھی جاتے تھے اور دیہات کے اور سب ماحول میں بھی ہم لوگ حصہ لیا کرتے تھے۔

اقبال مرتضیٰ: ایک دفعہ آپ نے فرمایا تھا کہ بڑے ہو کے تصوف کے سلسلے پر آپ کو جو ہے ہمارے علاقے میں آپ کا روحانی رشتہ تھا، اس کے بارے میں فرمائیے؟

فیض: ہمارے ساتھ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا وہاں ایک پیر رہتے تھے، ہمارے ابا اُن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ہم بھی اُن بادشاہ کے پاس بیٹھتے تھے۔ یہ بہت بچپن کی بات ہے۔

ڈاکٹر ایوب مرزا "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھتے ہیں:

"سردیوں کی ایک شام ہم نے ارادہ باندھا کہ فیض صاحب کو اغوا کر لیا جائے اور اُن سے چند مسائل تصوف کے سلسلے میں استفادہ کیا جائے۔ گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شوالہ چلے گئے ہیں۔ قاضی جی کے بعد وہ گوجر خان کا رخ کرتے تھے۔ ہم نے اُن کا پیچھا کیا۔ گوجر خان پہنچے۔ میونسپل ہال کے باہر بڑی رونق ہو رہی تھی۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ شادی کا سا سماں تھا۔ ہم اندر گئے، پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں آج میاں محمد کا عرس منایا جا رہا ہے۔ ہماری قسمت بھی کیا ہے جو ہمارے ہاں اکثر ہوا کرتی ہے۔ سمجھ جائیے کہ فیض صاحب کو اغوا کرنے والے گوجر خان سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہم بھی میاں محمد کے عرس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ میاں محمد کی "الفی" اور "سی حرفی" بھی لاجواب ہے۔ ہال میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں فیض صاحب سٹیج پر براجمان بیٹھے ہیں۔ اُن کے ایک طرف ضمیر جعفری اور دوسری طرف افتخار امام رضوی۔ سامنے دربار لگا ہوا ہے اور سیف الملوک کا دور چل رہا ہے۔

فیض صاحب سے آنکھیں چار ہوئیں۔ ان کے رنگ میں بھی فرق آ گیا کہ ہم انھیں یہاں پکڑ لیں گے۔ میونسپل ہال سے میاں محمد کے مزار تک جانا تھا۔ ہم تو وہاں اور دوسروں کی طرح فیض اپنے عاشقوں کے جھرمٹ میں وہاں پہنچے۔ اُن کی باقاعدہ دستار بندی ہوئی۔ جب ایک عقیدت مند نے اُن کے سر پر پگڑی باندھ دی تو فیض اس خوبصورت دعا کی طرح خوش تھے جیسے دلہن ہو۔ یہی تمام رنگ بازی کے بعد فیض صاحب تو مسند پر تھے اور ہم واپس آ گئے۔ میں نے پوچھا، فیض صاحب! یہ کیا تماشا ہے؟ کہنے لگے، بھئی دستار بندی ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا آپ کی دستار بندی ہوئی۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ یہ بھی ہو گئے۔ بھئی ہم اس لذت سے آشنا تھے۔ میں نے پوچھا، حضور کیا ہوا؟ بولے، بھئی بعض نے کہا، پگڑی سر سے اتار دیں گے۔ کہنے لگے بھئی، ہم نے کہا بار کرتا ہو گا۔ ورنہ ہماری کوتاہی میں بھول ہو جائے گی۔ یہ پتا نہیں کسی کو کیسی اس گائیں، ہم ہیں، تم ہو، یہ کیا ہو رہا ہے آپ کہاں سے کہاں آ گئے ہیں۔

آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ آپ سوز و گداز اور بے مثال جذبہ ایمانی سے محبت کا ثبوت تھے۔ کہ وہ ان پر منکشف ہو جانے لگے اور بعض ایسے عارفین ہوتے ہیں۔

عبداللہ ملک "امروز" جولائی کے شمارے کے ایڈیشن 1982ء کے صفحہ 12 پر لکھتے ہیں جسے شیخ محمد ملک نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ:

"صوفی برکت علی لدھیانوی سے 22 جولائی 1981ء کو ایک خط میں فیض نے بتایا کہ آپ نے دین اور اسلام کی بات کی ہے کہ شاید آپ کی کوشش پر یہ حضرات مجھے حلقہ اسلام میں داخلے کی اجازت دے دیں۔ یہ کافی مجھولیت ہے۔ غالب نے کہا تھا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

یہ حضرات تو زاہد ہی کی طرح ہیں۔ دین کے سودا گر ہیں اور ضرورت کے وقت یہ فتویٰ دیتے رہے ہیں۔ آج سے پہلے بھی ان کا شوق حاصل رہا ہے۔ شمس العلماء سید میر حسن، مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ سب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور بھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے کہ مسلمانوں کو اسلام سے خارج کرنے کا ٹھیکہ اب شروع ہوا ہے اور دین داری کے معیار بھی کیسے کیسے ہو گئے ہیں مجھے ہمارے زمانے کے دوست کا یہ شعر یاد آ گیا:

بلند ہے دہر میں کتنی بلا کی بے وقت
اب صرف یہ رہ گیا ہے خرافات کا ہے

خود آپ کے بارے میں کیا بات کی ہے کہ کیا ایک دن آپ ڈاکٹر محمد اسلام کو کافر اور مرتد قرار دے چکے ہیں اور کل بھی کوئی ایسا فتویٰ دیا جا سکتا ہے اور ان لوگوں کے ذریعے ہی آئے ہیں جنہوں نے مجھے بھی کیا کہا ہے۔"

اشفاق احمد "فیض اور صوفی" میں کہتے ہیں:

"میرا اور فیض صاحب کا کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جس میں ایک شخص تنہا ہو اور فیض صاحب ملاقات کر کے ہوں۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو کسی ایسی شخصیت میں ڈال جائیں گی جہاں ایک شخص درویش کی دوستی ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر آخری وقت تک نبھایا۔ مجھے ایک شخص آدمی کی کسی مزاج سے دوستی کیسی ہوئی۔ فیض صاحب نے صوفی ازم پر تحقیق کی کس سلسلے میں بہت کچھ کر کے نہیں گیا۔ ان کی میرے اعتماد اور تحقیق کے مطابق انھوں نے یہ وظیفہ یا چیز شامل کی ہے۔ انھوں نے صوفیوں کا ایک مجموعہ اکٹھا کیا ہے جو مجاہدے سے لکھا ہے۔ اس کو انہوں نے ادب اور تصوف کا نام دیا ہے ہیں۔"

حضرت عالی صاحب جو کچھ فرماتے ہیں کہ "آپ علم والا بات حاصل کرنے کے لیے ادب اور خدمت کو اختیار کرنا چاہیے" بہترین دونوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "طریق تصوف کے طالب کو چاہیے کہ ادب ظاہری اور باطنی دونوں ملحوظ رکھے۔ ادب ظاہری یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ بہ حسن ادب و کمال خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے اور ادب باطنی یہ ہے کہ تمام اوقات و احوال و مقامات میں باحق رہے۔

نئی ادب تو ہر وقت اور ہر زمانے کا ہے۔ نہ صرف ادب کا جواز عمل ہے اور حسن جمال اور صداقت کے تحت ہوتا رہے گا۔

یہ ادب یہ صحیح ہے یا صحیح نہیں: اس قدر زیادہ کہ مذمت کی اور احتجاج سے بھرپور ہے بے خوفی کے کلام ہیں۔ ان سب کو فیض صاحب نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ ایسے ہی ملاقاتی رنگ میں پیش کیا ہے کہ شعر آیت کا حکم ہو کے بکھرتے ہیں کہ کوئی قریب ہو آئے اور محبوب کا راز حق ہو نہ کہ ادا ہو کی دوا:

چھوڑی گر دے بچن گھر ہے وا اس لکھا ہے لوٹ نہ ملک

پھر اخلاقیات کی بات کریں تو اونچے خاندانوں سے ہے اور جس مسلمان بادشاہوں کی چیرہ دستیوں اور ملوکیت کو بھی اسلام سمجھا گیا، اس لیے میں ان اور ان کی باتوں پر بات نہیں کر سکتا۔ لیکن کبھی کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی اور چپ چاپ نہیں سوچا کرتا؟ اس کا اثر یہ فیض صاحب پر حملہ ہوا کہ زمانے میں ہوتے تو ان کے پیچھے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی ہوا میں وہ مطلوب ہوا ملتی ہے تو ان کی زندگی اور ان کی تحریک تو مطلوب کی کی ضرورت ہے کہ آج فیض کو دیکھ کر بھی پوچھا ہے، مارا ہے، خدا یاد ہے، احتجاج نہیں کرتا، شعر بھی کہتا ہے ..... جا رہے مسلک پر عمل کرتا ہے!"

فیض نے ابراہیم یا غوثی اور مولوی محمد حسین کو قبولی کے سلسلے تک اس سے عقیدت کیا تھا، علما کی قدر کرتے تھے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات تک میں ان کی محبت کا ذکر ہے جو انھوں نے مختلف انٹرویوز میں بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی ثقافت میں اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی مماثلت پر گفتگو کی ہے:

سوال: اشتراکی نظام میں وہ کون کون سی جاذبیت ہے جو اسلامی نظام میں نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے پڑھے لکھے طبقے کے لوگ بجائے اللہ کی طرف دیکھنے کے ماسکو کی طرف دیکھتے ہیں؟

فیض: اصل میں یہ سوال تو آپ اپنے آپ سے کر رہے ہیں۔ مجھ سے کیوں؟ لیکن چلیے میں عرض کر دیتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں بہت سے مسلمان ملک ہیں جن میں مختلف قسم کے نظام رائج ہیں۔ مصر ہے، شام ہے، سعودی عرب، پاکستان ہے اور انڈونیشیا ہے۔ ان میں سے آپ کس کو اسلامی نظام کہتے ہیں، جس کی طرف آپ کہتے ہیں لوگوں کی توجہ نہیں ہوتی۔ یا سامراجی ملک آپ کے سامنے عملی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں جو کچھ ہے لوگوں کو نظر آتا ہے مثلاً وہاں کے لوگوں کی روٹی چلتی ہے، تعلیم ملتی ہے، وہاں بچوں کی اور ان کی مساوات ہے انصاف ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس وقت کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جس کی طرف آپ رجوع کریں یا جس کو آپ کہیں کہ اس ملک کا نظام روس اور چین سے بہتر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں آج کل کے زمانے میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جس میں کہ عوام کو اتنی آسائشیں حاصل ہیں جتنی کہ روس اور چین میں حاصل ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام میں کوئی خرابی ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو اسلامی نظام رائج ہیں ان میں بادشاہیاں موجود ہیں اور کسی نے یہ کوشش نہیں کی کہ ان ملکوں کی اصلاح ہو جائے اور ان میں روس اور چین سے بہتر حالات پیدا ہو سکتے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسا ہو تو لوگ اس طرف رجوع نہ کریں گے اس طرف نہیں گئے۔ تو اس کا علاج یہی ہے کہ روس اور چین کی مذمت کرنے کے بجائے اپنے آپ سے شکایت کرنی چاہیے کہ ہم نے ایسے حالات کیوں نہیں پیدا کیے۔

یہ بھی ہے کہ فیض نے صرف اقبال کی طرح غزل کو مکمل طور پر رد نہیں کیا بلکہ اسی طرح فیض نے اپنے کسی شعر میں بھی حسرت موہانی کی طرح اشتراکی مسلم و مومن صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جیسا کہ حسرت نے کہا تھا:

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا　　　صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

نجیب جمال: اسلامی ادب کی تحریک سے متعلق کیا خیال ہے۔

فیض: ہمارے ذہن میں مسلم معاشرے میں مساوات تھی، والوں کی ذہنی تحریک اسلام ہی کا حصہ ہے۔

انجمن: کیا عربی ادب کے مطالعے نے آپ کی شاعری پر کیا اثرات ڈالے ہیں؟

فیض: ہم نے اسے جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔

اور پھر فیض کی شاعری میں بھی نظم "ویبقیٰ وجہ ربک" میں لکھا:

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے، حاضر بھی
جو منظر بھی ہے، ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

ڈاکٹر محمد حسن "فیض شاعری اور سیاست" میں لکھتے ہیں:

"جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں تخلیق ہونے والی نظم "سرِ وادیِ سینا" فیض کی تخلیقی زندگی میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں فیض نے پہلی بار کھل کر اپنی اسلامی شناخت کا اثبات کیا ہے۔ فیض اب ماضی کی طرح اشتراکی اور اسلامی جدوجہد میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے بلکہ اب تو ان کے یہاں مادی اور روحانی اقدار ایک ہی حقیقت کے دو رخ بنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

فیض نے جب ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے لکھا اس میں قرآنی آیت کو مصرعوں میں یوں پیوست کر دیا:

ہم جیتیں گے
قد جاء الحق و زہق الباطل

قربِ موعودِ ربِ اکبر

ہے جن کا چھاؤں تلے

اور سایۂ رحمت سر پہ ہے

فیض نے ایران کے اسلامی انقلاب پر جو نظم لکھی اس کا عنوان قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ "و یبقیٰ وجہ ربک"
فیض کے بعض اشعار مضمون و اسلوب میں ایسے ہیں جن کو ان کی وادیٔ نعت میں پڑھا جا سکتا ہیں۔

بلغ الحمد یا امام ہدیٰ ابن ترکاں

کل شہر عام لیہ شیریں انتہاں

فیض کے مرثیہ امام کا پہلا بند یوں شروع ہوتا ہے:

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل

الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل

فیض "سرِ وادیٔ سینا" کے دوسرے حصے میں کہتے ہیں:

سنو کہ اس حرفِ لم یزل کے

ہمیں تمہیں بندگانِ بے بس

علیم بھی ہیں، خبیر بھی ہیں

سنو کہ ہم بے زبان و بے کس

بصیر بھی ہیں، قدیر بھی ہیں

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو

کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

سفرنامہ حجاز میں کہتے ہیں:

مری آنکھوں میں چھپی ہے خدائی ساری

میرے مقصود کی ہے مجھ کو خبر یا ثقلین

فیض نہ صرف ماحول و مزاج کی حد تک کلام میں بھی عربی کے قریب اور روایت سے استفادہ کرتے تھے اگرچہ ان کی ابتدائی تعلیم انگریزی اسکول اور میر حسن کی زیر نگرانی ہوئی تھی جو عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ گھر کا ماحول بھی مذہبی تھا جس کی وجہ سے انھیں چار قرآن کے پاروں کو حفظ بھی کرایا تھا۔ فیض نے عربی میں بی۔ اے آنرز کیا۔ ایم اے عربی اول درجہ میں پاس کیا۔ عربی زبان پر ان کی گرفت کے ثبوت کے طور پر ہم یہاں "افکار و معارف" کے صفحہ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں انھوں نے عسکری مرحوم کی کتاب پر بحث کرتے ہوئے آیت قرآنی پیش کی ہیں۔ لکھتے ہیں: "ایمان یا عقیدہ ذٰلک لکم دینکم ولی دین کے ضمن میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اگر ایک جانب یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ "الحیوۃ الدنیا الا لہو و لعب" تو دوسری جانب یہ بھی کہ "ما خلقت ہذا الدنیا باطلا"۔

فیض نے اپنے ایک انٹرویو میں خود کو اسلامی کلچر کا نمونہ بتایا ہے کیوں کہ کسی بھی قوم کی تہذیب میں اس مقام کے ادب اور تہذیب کی چھاپ گہری ہوتی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ پنجاب کی دھرتی پر صدیوں سے اسلامی کلچر کا اثر ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا

فیض کی مجموعی ادبی خدمات میں سے ایک اہم امر ہے "دستِ تہِ سنگ" کی نظم "شورشِ زنجیر بسم اللہ" کے کئی مصرعوں کو بسم اللہ کے لفظ پر ختم کیا ہے جو ردیف کی صورت نہیں بلکہ ان مصرعوں میں "بسم اللہ" کے بغیر معنی ادھورے رہ جاتے ہیں:

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
کرو یارو شمارِ نالۂ شب گیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

یہ اسی نوعیت کی نظم "کی بات ہی [illegible]" میں

پھر ہوئے نے آ گئے بسم اللہ
اج دوواں ساڈے گھر آئیاں گیاں

ایسی کئی مثالیں فیض نے اپنی شاعری میں قرآنی آیات سے لے کر بھی شامل کر دی ہیں۔ سورۃ [illegible] میں قیامت کے دن کا منظر اور جب سورج سوا نیزے پر آ جائے گا وہ میدانِ حشر جب سب کو جمع کیا جائے گا اور حساب کتاب ہوگا

دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو!

....

وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی

ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب سے کہا: "فیض صاحب مجھے سول ہسپتال کے کمرے میں ایک اطلاع ملی
کہ آپ [illegible] نظر آنے لگے تھے ذہن کی باتیں [illegible] ۱۹۸۴ [illegible] مسئلہ [illegible]

کہ ان کے بے مصرف ہاتھوں کا بوجھ اب کیسے زیادہ جائے۔

یکایک حضرت حاجی کی نظر جو ہمارے قافلے میں تازہ شریک ہوئی تھیں، ان خستہ جان، خستہ حال، بے سروسامان، مشکلات کے شکار خواتین سے مخاطب ہوئیں، آپ لوگ قرآن شریف پڑھا کریں۔ قرآن شریف میں بڑی برکت ہے۔ اس سے آپ کو طاقت ملے گی۔ اس سے تمہیں صبر کی توفیق ملے گی۔ پھر تمہیں بڑا سکون ملے گا۔ اور آپ اللہ کے شکر سے بچ گئیں، دیکھیں آپ قرآن شریف کتنی مشکل سے پڑھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی سوالیوں نے سوال کرنے شروع کر دیے۔ وہ اپنی بچی کچی بے نور آنکھوں سے ان محترمہ کو دیکھ رہے تھے۔ اور بالکل "ڈرون حملے" سے لبریز گئے تھے۔ اس وقت لگتا ہے کہ یہ کیا ان کی تمام مشکلوں کا، تمام مسئلوں کا حل پیش کر رہا تھا۔ جب سب نے ان محترمہ کی طرف دیکھا تو بے چارگی سے زخمیوں کو دیکھا اور موقع سے وہ ہلدون کے بخار کی طرف آگے بڑھ گئے۔ اور وہ نیک خاتون ذرا جلدی نکل گئیں، وہاں سے ذرا آگے جا کر سوار ہو کر اس موٹر کار سے آرام سے رخصت ہو گئیں۔

فیض صاحب نے یہ بات اطمینان سے سب کچھ دیکھنے کے بعد کہنے لگے، مذہب بڑی گہری چیز ہے۔ انسان کا ہر طرف انسان کی ترقی اور معراج کے لیے ضروری ہے کہ انسانی برادری کا مسئلہ حل ہو۔ تمہیں سب اصل مسئلہ یہ ہے کہ بچے بھوکے کیوں ہیں؟ لیکن دیکھو تو غریب آدمی کی تحقیق نہیں کرتا۔ وہ بنیادی طور پر انسانی بہبود اور مساوات کا حامی اور سچائی آتا ہے۔ اسی لیے وہ پیغمبروں، رسولوں سے ہوتے ہوئے حضرت آدم تک پہنچتا ہے اور یہ جو بیچارہ مذہب کے بجائے حاجی صاحب نے ان بیچارے مظلوموں کو قرآن شریف پڑھنے کا مشورہ دیا تو مجھ غلط کو کہیں کیا، یہ طبقہ پاتا ہے جنہیں وہ نصیب کو حفظ کرنے کے لیے بھی وہ ہال ارض سے لڑتا ہے۔ مذہب کی جو اخلاقی قدریں ہیں جو کہ انسانی برابری اور مساوات کی ہدایات دیتی ہیں ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مذہبی روایات سرمایہ داروں کے لیے ہم آہنگی کا ذریعہ ہیں اور طاقت کی مدد سے مذہب کو مزدوروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مثلاً اپنی حالت پر قناعت کرو جس کا مفہوم یہ ہے کہ دل کا سکون تو ہے مگر مسائل کا حل نہیں ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار کبھی بھی اس قسم کی حدیث کا ذکر کرنے سے گریز کریں گے:

کاد الفقر ان یکون کفرا

قریب ہے کہ غربت کفر تک پہنچا دے

ہمارا ملک اس حقیقت کا مرکزی نمونہ ہے اور مذہب کی اصل روح کی تحقیر کرتا ہے۔ ہر روایت جو طبقاتی لوٹ کھسوٹ اور اس نوع کے نظام پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہے تاثر قبول ہے۔ معاشرہ تو ہمارے اصلاح پسندوں اور علمی نے جو حمایت کرنے کے بجائے یہ ہے کہ انہیں ورثہ میں ملنے والی رکاوٹوں کو عمل پر تحریر دیتے تھے، کہ وہ فطری طور پر بات سمجھنے کے قابل ہوں۔ شیطانی حرکت میں شیطان کے گھس جانے کا بہت بڑا خطرہ ہے تو وہ بدی کے آنے کے منظر دماغ میں اور ذہن میں بیٹھ کر بات کا اثر لے لیتا ہے۔ فیض صاحب کہنے لگے مجھی یہ مسئلہ سمجھ میں ہے کہ اہل غرض لوگ مذہب کو کسی طبقاتی نظام میں کیسے استعمال کرتے ہیں، اب بھی

دیکھ لو کہ رسولِ اکرمؐ نے غلامی کے مروجہ نظام کی سختی سے مذمت کی اور آقا قسم کے لوگوں کو جو اقتصادی طور پر ان کا استحصال کرتے تھے اس سے باز رہنے کی تلقین کی۔ مگر آج تم اسلامی ممالک کو ہی لے لو۔ نظامِ زر کے تو اصول اور ضابطے الگ ہوتے ہیں، لہٰذا یہاں بھی اقتصادی غلام موجود ہیں۔ جب تک ایک انسان دوسرے انسان کا استحصال کرتا رہے گا یا وہ اس قابل ہو کہ استحصال کر سکے تو پھر یہ غلام موجود رہیں گے۔ لہٰذا ایسے نظام کو ختم کرنا اور غلاموں سے پاک معاشرے کو پیدا کرنا عین جہاد ہے، اور انقلاب کا تصور نظر بھی یہی ہے"۔

فیض جہاں کہیں موقع ملتا اپنی فارسی اور عربی سے استفادہ کرتے تھے۔ اپنے یادوں کے مجموعہ "مہ و سالِ آشنائی" میں داغستان کے باب میں لکھتے ہیں کہ:

"سبزے پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے، ایک طرف دو خیمے نصب تھے۔ ایک میں گوشت کٹ رہا تھا دوسرے میں دیگیں چڑھی تھیں۔ ہم صبح سے کھا کھا کر نڈھال ہو چکے تھے، سب قالینوں پر دراز ہو گئے۔ ایک داغستانی صاحب میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے۔

مسلمان؟ "الحمدللہ"

میں نے کہا: "الحمدللہ"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

میں نے دہرایا۔ انھوں نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا تعارف کروایا: "محمد علی"۔ میں نے کہا: بہت خوشی ہوئی۔

اب انھوں نے میری ترجمان خاتون سے کہا، ہٹ جاؤ ہم خود بات کریں گے۔ پھر ٹوٹی پھوٹی عربی، فارسی اور اشاروں سے دوستی اور محبت کا اظہار رہا"۔

میجر اسحٰق "روداد قفس" میں لکھتے ہیں:

"فیض صاحب اُن انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اُسی سلسلے کی کڑی ہیں، جسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی، بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمٰن بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض بخشا ہے۔

حیدرآباد میں اُن کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے تو کوئی صوفیہ کرام کی تصانیف "فتوح الغیب"، "کشف المحجوب"، "احیاء العلوم" وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے کسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔ اُردو و فارسی ادب تو تکیہ کلام تھا"۔

ہم اس ناتمام گفتگو کو جو فیض فہمی کے تحت جاری رہے گی اور آئندہ آنے والے ہر زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالیں گے، یہاں صرف ایک شیریں حکایت پر تمام کرتے ہیں۔ ایوب مرزا اپنی کتاب میں جو فیض کے انتقال سے سات سال قبل شائع ہو چکی تھی، لکھتے ہیں:

"میں نے کہا، فیض صاحب! یار لوگوں نے جناب جوش ملیح آبادی کو شاعرِ انقلاب بنا دیا اور انقلاب کے لیے جیلوں کی سیر آپ کرتے رہے۔ آپ کو اس قسم کا آج تک کوئی خطاب نہیں ملا۔ کہنے لگے، بھئی جوش صاحب

ایک بزرگ تھے بڑے وضع دار، بہت سلیقے کے آدمی ہیں۔ اپنے اوقات اور آداب کے پابند۔ شاعری سے لے کر معاملات زندگی تک بھی صاحبِ کمال۔ اس لیے قابلِ احترام ہیں۔ بامحاورہ اس قسم کے خطاب سے پاتے تھے۔ تو یوں سمجھو بال بال بچ گئے۔ میں نے پوچھا فیض صاحب! وہ کیسے؟ کہنے لگے یوں لاہور کے شاعروں میں ہم نے جو غزل سنائی، کہا: بھئی داد تھی کی ضرورت ہوئی۔ ہم کس وقت قلعہ اجڑ تھے ہوں گے۔ اس زمانے میں ایک روحانی شخص بزرگ وارثی صاحب تھے بھی بہت والہانہ انداز میں اپنا وارثی رنگ کا کلام مشاعروں میں سنایا کرتے تھے۔ وارثی صاحب ایک مشاعرے میں آئے اور ہمیں کچھ حد سے زیادہ سے نوازا۔ ایک دن وہ میرے ہوٹل کے کمرے میں آ گئے۔ کہنے لگے: تمھیں دیکھ کر خوش ہوا۔ ایسے لگتا ہے جیسے شہود دیکھ ہوں۔ بات یہ ہے تمھارا کلام سنتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے الہام ہو رہا ہے۔ ان کا یہ وطیرہ تھا۔ یعنی ہم کہو کہ جناب ہو۔ تو وارثی ہم پہ مہربان ہو گئے ہیں۔ پھر وہ مجھے قوالی سننے ساتھ لے جانے لگے اور قوالی کے بعد پوچھتے کہ کچھ وجد طاری ہوا؟ ہم صاف صاف کہہ دیتے قبلہ کچھ نہیں ہوا۔ قوالی اچھی تھی۔ یہ سلسلہ تو کچھ چلتا رہا۔ ہم تنگ آ گئے۔ ایک روز تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم نے وارثی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تو کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ”آہ“ بھری کی، فرمایا اور کہا: ”میں تو تمھیں صوفی بنانے کی فکر میں تھا کہ میاں یہ سب اللہ کو قبول ہے۔“ اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ میں نے کہا آہ وارثی! ایک دن کی آنکھیں بند کر لیں۔“

☆

فیض کی صحت اور بیماریاں
(خطوط کی روشنی میں)

ایک توانا ذہن کے لیے ایک صحت مند بدن ضروری ہے۔ فیض جی نے جہاں تخلیق اور حسن کے دریچے کھولے وہیں ذہن میں ایک دریچہ ان کی صحت اور بیماریوں کے متعلق اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ گوشہ بھی فیض کے چاہنے والوں کے علاوہ فیض کی شخصیت اور فن کو سمجھنے والوں کے لیے معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ ایسے بھی شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی آسودگی میں سگریٹ نوشی کی [illegible] اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح سے فیض کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ فیض بڑا صحت مند نظر آتے تھے لیکن ورزش اور چہل قدمی سے دور بھاگتے تھے۔ تاہم ان میں بھی ان کی حیثیت صرف تفریح اور دل بستگی تک محدود تھی۔ وہ دو گھنٹے [illegible] کی کرسیوں پر بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے۔ تمباکو نوشی اور بدنی آرام طلبی میں فیض علامہ اقبال سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ راقم نے علامہ اقبال کی بیماریوں پر ایک جامع کتاب "بدنِ مرگ آہ" تصنیف کی ہے جس میں ان کے خطوط سے 251 فقرے چن کر ان کی بیماریوں کی تاریخ اور ان کے امراض کی تشخیص کی ہے لیکن یہاں فیض کے بارے میں ایسی تحقیق لانے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ ماسکو، لندن اور پاکستان کے ہسپتالوں میں فیض کے تمام طبی ریکارڈ اور ان کی رپورٹیں موجود ہیں اور اقبال کی غیر تشخیص شدہ [illegible] اور حلق کی بیماری کے برعکس فیض کی بیماریوں کی تشخیص سے فیض اور ان کے ڈاکٹروں کی ٹیم واقف تھی۔ اگرچہ راقم نے فیض کے کسی طبی ریکارڈ کو ملاحظہ نہیں کیا لیکن تقریباً 30 سالہ مطب کے تجربے کے بعد مریض کی علامات پڑھ کر تشخیص کرنا میرے لیے مشکل نہیں۔ فیض کے دستیاب خطوط میں بیماریوں کی روداد، ان کی سرگزشت اور ان کے [illegible] اور جو علامتیں [illegible] ایلس، حمید اختر اور [illegible] کے خطوں میں نظر آتی ہے وہی ہماری تحریر کا خام مواد ہے۔ فیض کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم از کم پانچ قسم کی بیماریوں سے دوچار ہوئے:

الف۔ دل کی بیماری

ب۔ پھیپھڑوں کی بیماری

ج۔ گردوں کی بیماری

د۔ کان کی بیماری

ہ۔ دانتوں کی بیماری

الف۔ دل کی بیماری: فیض دل کے مریض تھے۔ فیض نے دل کی موروثی بیماری (Genetic) بھی پائی تھی۔ فیض کے والد اور بڑے بھائی طفیل دونوں ہی اچانک دل کی حرکت بند ہونے سے دوچار ہوئے تھے۔

* فیض کو 1962ء میں [illegible] سال کی عمر میں [illegible] ایک [illegible] کے بعد میں فیض نے خوب صورت نظم بھی لکھی:

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے

- فیض اوائل جوانی سے سگریٹ نوشی کرتے تھے اور وہ Chain Smoker تھے جس کی وجہ سے دل، پھیپھڑے، دانت، کان اور خون کی بیماریوں نے انھیں گھیر رکھا تھا۔
- فیض نے افتخار عارف کے 18 مارچ 1984ء کے خط میں جو نصف شب کو ضیق النفس کے دورہ کا ذکر کیا ہے وہ قلب اور پھیپھڑوں کا مشترکہ عمل تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ فیض کے پھیپھڑے اور دل تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔
- اس بات کا تقریباً یقین ہے کہ فیض کا انتقال پھیپھڑوں کی بیماریوں کے ساتھ قلب کے حملے کے باعث ہوا تھا۔

ب:۔ پھیپھڑوں کی بیماریاں:

1:۔ Chronic Bronchitis

2:۔ Emphysema

3:۔ Pulmonary edema

4:۔ Terminal Pneumonia

نصف صدی کی لگاتار سگریٹ نوشی نے فیض کے پھیپھڑوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ایلس کے نام جیل کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برانکائٹس اور قلب کے مریض تھے۔ اسی لیے اُن کا ایکس رے اور کارڈیوگرام نکالا گیا۔ فیض کی مسلسل سگریٹ نوشی اور برونکائٹس نے پھیپھڑوں کو اس قدر شدید نقصان پہنچایا تھا کہ وہ آخری عمر میں تیز راستہ چلتے تو تنفس تنگی کا احساس کرتے تھے، کمزور پھیپھڑوں کی وجہ سے وہ آخری انفیکشن سے شدید نمونیا کا شکار ہو کر ان بدنی تکالیف سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔

- 29 اپریل 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں: ”میری صحت کے بارے میں کسی تشویش کی ضرورت نہیں اس لیے کسی قسم کے پریشان کن خیالات کو اپنی مسرت میں حائل نہ ہونے دو۔ میرا کارڈیوگرام لیا جا چکا ہے اور کل ایکس رے ہو گا۔ میں نے درخواست دی ہے کہ مجھے چند دنوں کے لیے کراچی بھیج دیا جائے تاکہ کوئی ماہر ڈاکٹر معاینہ کر سکے، نہ جانے یہ درخواست منظور ہو گی کہ نہیں، لیکن تم خاطر جمع رکھو۔ ڈاکٹر بیلرز کی دوائیوں کی فہرست مجھے مل گئی ہے اور آج کل میں انھیں شروع کر دوں گا۔ کارڈیوگرام اور ایکس رے کے نتائج آئیں گے تو بھجوا دوں گا، وہ انھیں دکھا دینا اور ان کی تشخیص اور مشورہ یہاں بھجوا دینا“۔
- 29 اپریل 1953ء کو ایلس کو لکھتے ہیں: ”میری صحت کے بارے میں تشویش نہ کرو۔ میں اچھی طرح اپنا خیال رکھتا ہوں۔ کارڈیوگرام اور ایکس رے دونوں ٹھیک ہیں۔ صرف کان میں ابھی تک تکلیف ہے جس کا علاج ہو رہا ہے۔ بڑے صاحبوں سے زیادہ درخواستیں کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا، اپنے دوستوں سے مشورہ کر لو۔ اگر وہ سمجھیں کہ اس میں کوئی فائدہ ہے تو درخواست بھجوا دو“۔
- افتخار عارف کو 9 مئی غالباً 1980ء ماسکو سے لکھتے ہیں: ”ہمیں ابھی تک ہسپتال سے چھٹی نہیں ملی اور تقریباً مزید بارہ چودہ دن یہیں پر گذریں گے، ہمیں چوں کہ اس سے پہلے ڈاکٹروں سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا (صرف ایک بار اکیس برس پہلے ہارٹ اٹیک کا شوق کیا تھا) اس لیے ہم نے اپنے باطن کی کبھی خبر ہی نہیں لی اور اب جو بے شمار الٹی سیدھی مشینوں سے سب کل پرزوں کا معاینہ ہوا تو پتا چلا (ہمیں نہیں ڈاکٹروں کو) کہ دل، جگر، آنتیں، پھیپھڑے وغیرہ وغیرہ سبھی آخری دموں پہ ہیں گویا بقول پطرس بخاری مرحوم کے ایک ایک سیزیرین آپریشن کے علاوہ ہم سے سب کچھ ہو چکا ہے اور ڈاکٹروں کا فیصلہ یہ صادر ہوا ہے کہ دو ڈھائی ہفتے تو ہم ہسپتال میں گزاریں اس کے بعد کسی نرسنگ ہوم میں کم از کم تین ہفتے باقی مرمت کروائیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جولائی کا مہینا تو یہ ہر طور یہیں غارت ہو جائے

کا امتحان کا طوفان تو تبدیلی ہے لیکن شکست کے بعد سے پہلے نہ تاکلش نہیں ہو سکے گا"۔

خطوط کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی صحت قید کے دوران کمزور اور انھیں خون کی کمی کی شکایت بھی ہو گئی تھی۔ بخار رہنے اور کمزوری کی شکایت کی وجہ سے ڈاکٹر ٹیکے تجویز کرتے تھے، استعمال کر رہے تھے۔

خون کی کمی: خون کی بیماریوں میں انیمیا (Anaemia) کی شکایت رہی۔

کان کا انفیکشن:

دانتوں کا درد، دانتوں کا درد اور کان کا انفیکشن کی شکایت ان کے خطوط سے واضح ہے۔ فیض نے یہ تمام خطوط قید سے ایلس کو لکھے:

☆ 17 مئی 1953ء یہ مقامی ڈاکٹروں نے دانتوں اور دوسرے امراض کے ماہرین کی خدمات کے لیے کراچی لکھا ہے اور ان کے جواب کا انتظار ہے۔ دانتوں میں مسوڑھوں اور گلے کی جلن اور اب بائیں کان میں بھی درد رہنے لگا ہے۔

☆ 19 مئی 1953ء کان ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا، علاج ہو رہا ہے۔ خون کے دباؤ کی کمی اور انیمیا کی معمولی سی شکایت ہے۔ جس کی تجویز کردہ دواؤں کے علاوہ ڈاکٹر ٹیکے بھی استعمال کروا رہا ہے، وٹامن بی، کیلشیم وغیرہ وغیرہ۔

☆ 27 جولائی 1953ء مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے اور اس دوران میں چیف فزیشن صاحب میرے ٹیسٹ کر چکے ہیں باقی سب مکمل ہو چکے ہیں۔ خون کا دباؤ اب معمول پر ہے اور کان اور دانتوں کے سوا اور کوئی شکایت نہیں۔ مزید تو تبدیلی ہو ملاقات کی بات کریں یا انھیں اس سے کچھ زیادہ تکلیف دہ ہے۔

☆ 12 اگست 1953ء کان کا درد اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔ مجھے پہلے آپریشن کی تجویز ضرور ہوئی تھی لیکن ٹھیک ہونے پر اور مزید علاج معالجے کے بعد یہ تجویز ترک کر دی گئی اور آپریشن ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جہاں تک دانتوں کا تعلق ہے وہ کم کر دی ہے۔ اور اب دو بار دیکھ لیا تھا اور ٹھیک لگا، ہو چکا تھا۔

☆ 27 نومبر 1980ء کو عبدالرحیم کو لکھتے ہیں: "لندن کے بعد ہم ماسکو میں Check-up کے لیے گئے تھے۔ وہاں کا دستور یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ ہسپتال میں ڈاکٹروں کے ہاتھ آ جائیں تو ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ پورا ایک مہینہ ہسپتال میں رہنا پڑا جس کا فائدہ یہ ہوا کہ دوا دارو کے علاوہ سگریٹ نوشی سے بھی پرہیز کرنا پڑا۔"

☆ 28 اکتوبر 1980ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "ہم کوئی ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد ابھی واپس لوٹے ہیں۔ پچھلا وقت ماسکو کے ہسپتال میں گزرا، کوئی خاص شکایت نہیں تھی بس وقتی Servicing کروانے کو گئے تھے۔ سگریٹ پینے سے پرہیز کے بعد کوئی دن وہاں گزارے اور یہاں بھی طبیعت کافی بحال ہو گئی لیکن جب دوبارہ ہسپتال کی ضرورت پڑے گی۔"

☆ 28 نومبر 1982ء کو لکھتے ہیں: "ہم صحت کے بارے میں شکایت تھی مگر اب ٹھیک ہے کوئی بھی جواب دے گا۔ بہرحال مختصر علاج کے بعد لندن کوئی موقع نہیں ہے۔ اس لیے طبیعت بالکل بحال ہے۔"

☆ 18 نومبر 1983ء کو لکھتے ہیں: "پانچ برس کے بعد حالات کے ساتھ ہم تجربہ کا ہے کہ ہم بالکل ٹھیک نہیں ہیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے Chronic Bronchitis کی شکایت ہے اس کا کوئی علاج نہیں کیا۔ اب پہلے تو کچھ اس کی تکلیف شروع ہو گئی جس سے کبھی کبھی رات کو جاگنا پڑتا ہے،

ہو گیا اور پھر ایک رات نصف شب کے قریب ضیق النفس کا شدید دورہ پڑا کہ جو اس کی موت بن گئے، جبکہ جس وارڈ میں رات گزری، وہاں گئے
وہاں موجود ہسپتال کے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم وارد ہو گئی۔ سب نے اس قدر تندہی اور توجہ سے معالجت کی کہ بیماری پر سب کو شبہ ہونے لگا
گئی۔ اس بار وہ ہسپتال میں گذرے اور اب وہاں کوئی ہے کہ بقول ان کے کبھی نہ تھا۔ البتہ سگریٹ نوشی ممنوع ہے۔ سگریٹ نوشوں کی صحبت
سے بھی پرہیز ہے۔ اس وقت اب تک تو ہم اس قید و بند کی پابندی کر رہے ہیں۔ بعد میں دیکھیں گے کہ وہاں تو قفل کرنے کو کہاں تک جگر
ادب مانتا ہے۔ دوست آئی ہے کہ مزید معالجے کے لیے وہاں کچھ وقت گزاریں۔"

"۔۔" 1984ء میں فیض نے اپنے آخری انٹرویو میں آئی اے رحمن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر مجھ سے اپنی
شکست کے ارادے میں جو نچ ہونے پر مجبور ہوئے ہیں۔ وہ پوری آرام کرنا چاہیں، پھیپھڑوں، ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کر رہا ہوں۔"

فیض کی صحت اور ان کی بیماریوں کے تعلق سے اہم حیثیت ایک طبیب فیض کی سگریٹ اور شراب نوشی کو بالاستعانی اس لیے بھی نہیں رکھ
سکتے۔ ان معاصروں نے فیض پیچھے چھوڑ ن کے کام میں عقل لالا اور شاید فیض کی بڑی گرمی ہم کو کرسی، یہ حق ہے کہ موت کا دن معین ہے
جس پہلا بڑی گرمی ہونا اور نظام بھی بچا ہوا ہے مگر خدا جب سے خود پوچھے تا حیرت بنا گیا ہے۔ فیض سگریٹ کے عادی تھے
انھیں لوگوں نے Chain Smoker کے روپ میں دیکھا۔ انھیں اچھے اور معیاری مرغوب سگریٹ بہت پسند تھے جیسا کہ
خط میں لکھتے ہیں کہ ان کے مسرالدان سے اچھے سگریٹ بھیجیں۔ بہ دقت سے وہ اچھے سگریٹ کبھی پی نہ سکے۔ سگریٹ نوشی کی وجہ
سے ان کے چہرے پر جھریاں اور سیاہی گہری تھی بالا ہو گئی تھیں۔ جن لوگوں نے فیض کو قریب سے دیکھا وہ بتاتے ہیں کہ ان کی وہ
انگلیاں زرد تھیں اور سگریٹ پکڑے رہتے تھے کہ وہ ان سے زرد ہو گئی تھیں۔ فیض کو نیند بستر پر لیٹنے کے بعد بہت دیر سے آتی، بستر پر سونے سے پہلے
آخری سگریٹ نوشی تھی۔ اور یہی بلا ان کی جان لیوا ثابت ہوئی۔ فیض کی شخصیت کو بیان کرنے والوں نے انھیں متحمل اور
کم گو ان کا بیان کیا ہے۔ مجاز جو خود بلا نوش تھے شراب کے نشے میں دعوت پڑھ رہے تھے فیض کو "بحر الکاہل" کہا کرتے تھے جس کا ذکر
آغا ناصر نے اپنے مضمون "ہم جیتے جی مصروف رہے" میں کیا ہے۔ کسی بھی تحریر میں سے انسان پہلے بہت زیادہ معمول سے زیادہ بڑھ گیا
Type ہو جاتا ہے تحقیق و مواد کی کمی سے بھی زیادہ کم کام کر سکتا ہے۔ بیشمار سگریٹ اور شراب کے عادی لوگ اہم ادبی کام
نہیں کر سکے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ایک مقام پر خود فیض نے لکھا ہے کہ شراب پی کر کبھی شعر نہیں کہہ سکا۔ اردو کے چار بڑے شاعروں
میں تین بڑے شاعر میر تقی میر، میر انیس اور علامہ اقبال شراب نہیں پیتے تھے۔ غالب کی عادت اور اردو شاعری غالب کے ان کی
نے جس کا ذکر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک ذریعہ غالب کی شراب نوشی تھی:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالب شراب سے غم دوراں بھلا کر بے خودی میں خوشی کی تلاش کرتے تھے۔ پھر بھی ان کی انتہا پسندی صدی بھر شاعری ان
کی زندگی کے پہلے حصے پر اللہ کے فضل سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ اس عمر میں وہ شراب نوشی کرتے تھے لیکن شراب کے اسیر یا
معتاد نہیں ہوئے تھے۔

فیض کی شراب نوشی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فیض شراب نوشی میں شریعت نوشی کے برخلاف اعتدال پسند تھے جہاں چھ تک
معاشرتی تقریب کے موقع پر دعوت کی محفل سے سگریٹ ہی ان کے ساتھ رہے اور پھر وہ ان کے ہمنشینوں کے تحفہ بنے رہے تھا۔
غالب کی طرح فیض نے شراب ضرور نہیں پی، ان کی زندگی میں بھی کوئی شراب کی تعریف۔ غالب نے شعری تخیل میں نقد کیا ہے، اس

تحریروں میں تعمیم اور شراب نوشی کا تذکرہ جس سے نوابوں اور امرا کے ذہن پر اثرات کے عمل کے تحت رہنے دیا گیا ہے ورنہ یہ دونوں شخصی مسائل ہیں اور ان کو شمار شخصیت کے زمرے میں لانا کسی مدرک کا ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی رہنمائی میں ان مطالب پر تلازمہ نہ ادا کی ادائی کا تصور کیا جاتا ہے۔

خیام، انشا اور جوش بیچ آبادی جیسے باشعور اساتذہ اور باطنی تحریروں میں ادب شراب نے بیشتر کے تعلق سے ان کے تذکرے کئے جاتے ہیں۔ غالب نے چیف سکریٹری کو شراب کی طلب میں جو قصیدہ لکھا اس میں یہ بھی اشارہ کیا کہ:

ہاں یہ ہے صراحی ہو ساقی صہبا

تا ابد نہ ہو وہی دور نا ہو ساقی

لہٰذا غالب کو چاہئے، وہ شراب سے مانوس رہے (آپ کے ہاں شراب جاری رہے) تاکہ وہ آپ کو وہ نادر مضامین انجام دے سکے۔

—☆—

فیض کے خطوط سے ہمیں کیا ملا؟

فیض کے تین سو تیس (330) سے زیادہ مطبوعہ خطوط دستیاب ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف خطوط فیض نے اپنی بیوی ایلس کو لکھے۔ فیض نے اپنی بیگم ایلس کو صرف انگریزی زبان میں خط لکھے ہیں اور مجید کو انگریزی اور اردو میں خطوط لکھے۔ باقی تمام خطوط اردو میں ہیں۔ فیض کے وہ خطوط جو انھوں نے جیل سے اپنی بیگم ایلس کو لکھے وہ مشہور ادیب نے اردو میں ترجمہ کیے۔ جیسا کہ ان کے قول کے مطابق: ''جیسے قید و بند کے زمانے میں یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی 'من و عن' ان کا ترجمہ کیا گیا ہے''۔ چنانچہ یہ خطوط 1971ء میں 'صلیبیں مرے دریچے میں' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اس بارے میں فیض کی کتاب کے مرتب ''مرزا ظفر الحسن'' اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں جو خطوط شامل ہیں وہ فیض نے جیل سے لکھے تھے انگریزی میں۔ یہ ترجمہ میں نے کیا ہے تو مجھ سے واقف ہے۔ اسے لکھوانے اور چھپوانے کے واقعے بھی بار بار یاد آتے ہیں جب سب واقعات مرزا ظفر الحسن نے دیکھا۔

اب سے چند ماہ پہلے مرزا صاحب نے تقاضا شروع کر دیا کہ میں اپنی سرگزشت زندگی بیت جانے کے بارے میں کچھ لکھوں۔ وہ اصرار کرتے رہے اور میں ٹالتا رہا۔ آخر پیچھا چھڑانے کی خاطر میں نے یہ خطوط بیوی سے لے کر ان کے حوالے کیے کہ ان میں کام کے حالات ضرور مل جائیں گے۔ اس کے بعد سے وہ صرف ان خطوں کی اشاعت کے در پے ہو گئے۔ گو ان کے ترجمے پر کئی مہینوں کا اصرار کر دیا۔ بات کسی حد تک تو معقول تھی۔ اب یہ خطوط ترجمہ کر کے چھپوانے کا بہت سے کر دیا ہے۔ لیکن یہ حضرت کا حکم تھا اور ہم پر یہ لازم ہو گیا کہ آپ ترجمہ لکھوائیے۔ بس انتظام انھوں نے چھپا کے مرتب کیے ہیں۔

کو ہم نے یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ یہ خطوط ہیں جو گھریلو حالات میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ خطوط اردو میں نہیں انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ ایک زبان کے مخصوص الفاظ کا ترجمہ بہت ہی مشکل کام سمجھا اور معمولی اداؤں میں بھی کوئی خاص بات وقت گزرنے نہیں آتی۔ لیکن انگریزی کا روز مرہ لہجہ اور بے ساختگی کا ادب۔ ہر زبان کی طرح انگریزی کے روز مرہ محاورے، تشبیہات، ضرب الامثال، کہاوتیں، علامتیں وغیرہ اسی زبان سے مخصوص ہیں اور ہیئت کی لطافت اور چاشنی کے بغیر انھیں اردو میں منتقل کرنا محال ہے۔ لیکن مرزا ظفر الحسن نے محنت اور عرق ریزی کی سہولت کو آپ رہنما بنایا ہے''۔

'صلیبیں مرے دریچے میں' کے علاوہ محترمہ مرزا ظفر الحسن اقبال کو لکھے گئے پچپن (55) سے زیادہ خطوط 1988ء میں ''کتاب یوسف'' کے نام سے اور کتاب فیض کو لکھے گئے 38 خطوط 2011ء میں 'فیض کا نام افتخار عارف' کے عنوان سے کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

جدول خطوط مطبوعہ

نمبر شمار	نام	تعداد	کتابیات
1	ایلس فیض	135	صلیبیں مرے دریچے میں
2	سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی	8	صلیبیں مرے دریچے میں
3	سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی	2	فیض کے مغربی حوالے
4	افتخار عارف	38	فیض بنام افتخار عارف
5	سرفراز اقبال	55	دامنِ یوسف
6	بیبا، ماٹو اور ندیم	8	دامنِ یوسف
7	ابراہیم جلیس	1	متاعِ لوح و قلم
8	احمد ندیم قاسمی	3	متاعِ لوح و قلم
9	اختر انصاری اکبرآبادی	1	متاعِ لوح و قلم
10	اطہر قادری	1	متاعِ لوح و قلم
11	چراغ حسن حسرت	1	متاعِ لوح و قلم
12	حزیں لدھیانوی	2	متاعِ لوح و قلم
13	حمید اختر	2	متاعِ لوح و قلم
14	خدیجہ بیگم	17	متاعِ لوح و قلم
15	خدیجہ مستور	1	متاعِ لوح و قلم
16	سحر انصاری	1	متاعِ لوح و قلم
17	سلام مچھلی شہری	1	متاعِ لوح و قلم
18	سید سبط حسن	3	متاعِ لوح و قلم
19	صہبا لکھنوی	2	متاعِ لوح و قلم
20	عبادت بریلوی	1	متاعِ لوح و قلم
21	عبدالرحمٰن چغتائی	1	متاعِ لوح و قلم
22	غلام رسول مہر	1	متاعِ لوح و قلم
23	مرزا ظفر الحسن	4	متاعِ لوح و قلم
24	محمد اجمل	1	متاعِ لوح و قلم
25	ایوب الیاس	1	متاعِ لوح و قلم
26	محمد طفیل	2	متاعِ لوح و قلم
27	نسیم سید	1	متاعِ لوح و قلم

28	اشفاق حسین	2	فیض کے متفرق حوالے
29	مسیح الزماں رضوی	1	فیض کے متفرق حوالے
30	کرنل انور احمد	3	فیض کے متفرق حوالے
31	سردار جعفری	1	فیض کے متفرق حوالے
32	محمد حسن	1	فیض کے متفرق حوالے
33	عبدالرحیم اعجاز	7	خوش نو نظیر۔ فیض احمد فیض
34	منیزہ ہاشمی	14	لاڈلی تحفے بنام میرا
35	سلیمہ ہاشمی	3	لاڈلی تحفے بنام میرا
36	عبداللہ ملک	4	لاڈلی تحفے بنام میرا

کل مطبوعہ خطوں کی تعداد 374 ہے۔

ہم جانتے ہیں اردو میں خطوط ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ڈاکٹر حمید یزدانی، مسعود قریشی اور ڈاکٹر ... وارثی مرتب ہیں کے خطوط بنام ... وغیرہ مرتب کردہ ہیں ان میں پانچ خطوط فیض کے بھی شامل ہیں۔ آخر میں اس مضمون کو فیض کی تحقیق کے مطابق ابھی ان کے خطوط لوگوں کے پاس محفوظ ہیں۔ شاید ایک بڑی تعداد شکریوں کی ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر ... کے خاندانی افراد کے پاس ہو جن کو ابھی ... سے ... ہیں اس لئے یہ ظاہر ہوا ہے کہ مجموعہ فیض بھی نہیں ہو سکے۔ جس طرح مشہور ہے:

وہ جب تک بھی سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

اسی طرح سے جب خط لکھ دیا جاتا ہے تو وہ منظر عام پر آ جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کو شاید کبھی گمان بھی نہ ہو کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے 1405 سے زیادہ خطوط جو کہ اب تک چار بڑی جلدوں میں شائع ہوں گے جس سے اقبال شناسی میں بڑی مدد ملے گی۔ غالب کا معاملہ ... خطوط ... اپنی تحریر کو ... بنا چکے تھے فیض احمد فیض بھی چاہتے تھے ... کے ... کہ 72 سال کی تعداد میں خطوط لکھے ... اقبال کے خطوط تو ... کے نام ہیں ... کے بہت سے ... فیض کے ... سے زیادہ خطوط ... کے نام ہیں جن میں بیوی، بیٹیاں اور دوسری خواتین شامل ہیں ... سے خطاب ہے جس کی وجہ سے خطوط میں ... اور ... موجود ہے۔ ... کے ... اور تہذیب کے ... کہ ... خطوط کو شائع کرنا ... تھا ... ہیں ... اپنے خطوط شائع ... اور ... نے ان سے فیض کے خطوط ... ان کو شائع کرنے کی اجازت چاہی ... جس کا جواب فیض نے جیل سے 11 مارچ 1953ء کے خط میں یوں دیا:

"خطوں کی اشاعت کے بارے میں تم نے پوچھا ہے ... بالکل معلوم نہیں ... بہتر ہے کہ اس بارے میں کسی ... سے پوچھو۔ ہر صورت اگر انہیں چھپوانے کا فیصلہ کرو تو ... پہنچ جائیں۔"

فیض کے خطوط ان کی وفات کے تقریباً بیس (20) سال بعد شائع ہوئے ... موضوعات کا ... ہے ... تقریباً ہر

خط کا موضوع، لہجہ، اسلوب اور رنگ جدا ہے۔ اس لیے ہم نے ان خطوں کو پانچ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے تاکہ حتی الامکان خطوں کے مواد سے استفادہ ہو سکے۔

1:۔ فیض بنام ایلس

2:۔ فیض بنام بچی وغیرہ

3:۔ فیض بنام سرفراز اقبال

4:۔ فیض بنام افکار عارف

5:۔ فیض بنام دیگراں

فیض کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے ایلس کو لکھے گئے خطوط مددگار ثابت ہوتے۔ اگرچہ ان خطوں میں پیار و محبت، گھر بار کے مسائل اور واقعات کا ذکر ہے، لیکن مسئلہ وزندگی، فلسفۂ زندگی، حیات کے تصور کے علاوہ شاعری، مطالعہ، خود شناسی، تنہائی، خوشی، اداسی، کاہلی، کتابی، مجلسی اور کائناتی مطالعہ پر مختصر مگر عمدہ نکات موجود ہیں۔ ایلس کو لکھے گئے خطوط عارفانہ، عشقیات، زن و شوہر کے خطوط میں اس لیے شامل نہیں ہو سکتے کہ یہ خطوط جیل سے لکھے گئے اور فیض جانتے تھے کہ تمام خطوط پڑھنے کے بعد بھیجے جاتے تھے جس کا انھوں نے بعض خطوں میں اشارہ بھی کیا ہے۔ دوسرے یہ خطوط انگریزی میں تھے جس کا "متبع زبانی" ترجمہ خود فیض نے کیا ہے، اس لیے اس بات کی گنجائش باقی ہے کہ یہ ترجمہ ترجمانی کی صف میں کھڑا کیا جائے جب کہ دوسرے خطوط جو جیل کے باہر اور اردو میں لکھے گئے ہیں ان خدشات سے مبرا ہیں۔ ہم ذیل میں خطوں کے اقتباسات سے پہلے صرف نکات رقم کریں گے تاکہ مطلب خط کے مواد سے ظاہر ہو جائے۔

الف: فیض نے ایلس کو سر بلند، عزم محکم اور زندگی کے سفر میں شریک سفر ہونے کی تاکید کی ہے۔

27 اکتوبر 1952ء

"جب دل میں درد و کرب کا طوفان بپا ہے تو سر اتنا بلند ضرور رہنا چاہیے کہ مستقبل میں امید کی کرن نظر آ سکے، زندگی پر اپنا ایمان قائم رہ سکے اور حسن و خوبی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر ان پانیوں کو سر سے گذر جانے دیں تو آدمی کھو جاتا ہے، اپنا توازن ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر مشکل سے گرفت میں آتا ہے۔ خوف و خطر کا مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ جب موجیں دھاڑتی ہوئی ٹھاٹھیں مارتی آتی ہیں اور تیرہ و تار سیلاب کا خاتمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب ہاتھ پاؤں سرد اور شل ہو جاتے ہیں اور مزید جدوجہد انتہائی اذیت ناک معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ جدوجہد تو جاری رکھنی ہی پڑتی ہے نہ صرف اپنی جان کے بچاؤ کی خاطر نہیں بلکہ ان سب چیزوں کی خاطر بھی جنھیں آدمی عزیز اور مقدس اور بیش قیمت جانتا ہے، اس لیے تم اپنے آنسو بچا کر رکھو صرف اپنا سر نیچا نہ ہونے دو اس لیے کہ طوفان گذر جائے گا، بادل کھل جائیں گے اور سورج کی روشنی پھر ہر سو پھیلے گی، کل نہیں تو پرسوں یا شاید ہفتہ وار کے بعد جب بھی ہو یہ ہونا یقینی ہے"۔

26 نومبر 1962ء

"کچھ دنوں تک خط نہ آئے تو یہاں کی تنہائی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چوں کہ تم اپنے نالائق میاں کی طرح

کافی نہیں کہ وہ محض ہوا ہو اور اپنے آپ تک نہیں رہ سکتی ہے۔

یہ نمبر تھا کہ تمہارا خط آ گیا۔ یہ سوال ختم ہو گئے ہیں اور شہید ہماری آزمائش تھی۔ اس لیے دل خوش رکھو اور

ہماری شکست کی فکر نہ کرو۔ یہ شعر یاد رکھو۔

"میرے ساتھ ساتھ کوئے جاناں کی منزل تک چلو

ہمسفر ہیں تو ابھی آگے آئیں گے"

سوال یہ نہیں کہ کون سی چیز کس چیز کے قابل ہے۔ یہ قیمت اس قدر ہے۔ اس کے لیے دل لگایا جائے یا

وصال اس قابل ہے کہ اس کے لیے فراق جھیلا جائے۔ بات یہ ہے کہ زندگی میں جو ہے وہ سادگی اپنی ذات

اور تجربہ یا کسی کے مجروح ہونے پر تھا کر چل سکتا ہے تو زندگی میں جو کچھ بھی آئے صرف ہو اس وقت ہر چیز اپنی

اپنی جگہ اچھی ہے۔"

ب: جب ایلس فیض کو یہ غلط خبر ملتی ہے کہ فیض کا تعلق چند پردہ نشینوں سے تھا تو وہ برہم ہو کر خط میں لکھتی ہیں جس کے جواب میں فیض نے یوں تحریر کیا۔

27 اپریل 1953ء

"الفاظ نے پرسوں تمہاری چٹھی جس کا ہمارا سے رابطہ اہم مسئلہ ہوگی۔ اس سے گھبراہٹ میں بہت جلدی

سے تحلیل کر رہا ہوں۔ اس میں آپ نے جو سوال کے سوا کوئی بھی ضروری بات نظر نہیں آئی اور وہ سوال

یہ ہے کہ ہم نے تمام باتوں میں اپنا وقت ٹھیک طرح سے کیوں گنوایا۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیا سوال

ہے۔ مجھے اس سوال سے شاید برہم ہونا چاہیے تھا یا پریشان ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ خیر

اس بارے میں اب سوال کا جواب سنو۔

سوال: کیا فلاں فلاں تمہاری محبوبہ تھیں؟

جواب: بالکل نہیں۔

سوال: تو پھر مری اور کراچی میں کیا ہوا؟

جواب: کوئی تعلق نہ ہونے سے مکمل نہیں تھی کہ از کم دل اتنی بات نہیں ہوئی تھی تو دوست قابل قدر

سمجھتے۔

سوال: تو پھر آخر کیا قصہ تھا؟

جواب: اول تو سوال مبہم ہے اور مبہم جواب چاہتا ہے اور اگرچہ مجھے اس کی چنداں پرواہ نہیں لیکن ایک

عام پبلک دستاویز میں خاص ذاتی معاملات کا بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سوال: تو تمہیں اقرار ہے کہ کوئی ذاتی معاملات تھے جو پبلک میں ظاہر نہیں کرنا چاہتے؟

جواب: مجھے بالکل انکار نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ذاتی معاملات پر کھلے بازار بحث کرنا مناسب نہیں۔

سوال: تو تم مانتے ہو کہ اس قصے میں کوئی نامناسب پہلو بھی تھا۔ دوسرے الفاظ میں کوئی ایسا قابل اعتراض

پہلو جو پبلک کے سامنے پیش نہ کیا جائے؟

نہ اب دیکھیے اب یہ تو آتش ہے میرا مطلب یہ ہے کہ اول تو یہ کہ لکھنا ترک کر لینا یہ تو تھی اور دوم اس کو نئی
پہلو نہ بناؤں (اس پر مجھے ندامت ہے)۔

ج: انسانی تعلقات میں ہمدردی و محبت کا ہر پہلو ان کی نظموں میں بھی جھلکتا ہے۔ انسان کی ادا یہ ہے کہ فیض نے اسے جگہ دی ہے۔ انسان نے
وہ حرف ادا کیے جو ہر دور میں ہمارے تجربۂ حیات سے جڑے رہے جن کو فیض کا ہر دور سمجھتا تھا۔ چنانچہ فیض کے تمام خطوط میں
حرف ایک ہی ہوتا ہے جو ذہن میں گونجتا رہتا ہے یعنی کہ وہ بھی انسانی زندگی کے مالک ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ
فیض سے قیدیوں کی کیفیات پر کچھ یوں رقم کیا ہے:

16 جنوری 1952ء

"جیل خانے میں انسانی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ان میں سب سے
زیادہ شدید کیفیت وہ ہے جسے جیل کی زبان میں Prisoe Cumal کہا جاتا ہے۔ ایک طرح کا مارا ہوا یا بیمار ہو جانا۔
جب ہر چیز بھی دور چلی جاتی ہے اور سب کچھ ٹھہرا ہوا اور بے وقعت نظر آتا ہے۔ جب کوئی امید باقی رہتی ہے اور
نہ کوئی ندامت۔ اور ہر چیز بے کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے پیچھا اور سب کچھ گزر جاتا ہے
لیکن جب تک ہو ذہن پر طاری رہتی ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو گی اور آدمی کسی اپنے بوجھ کی طرح بھی
جاتا ہے جیسے ذہن سے منقطع ہو گیا ہو۔"

د: فیض نے قید و بند، زندگی، اخلاق، معاشرتی اور تصوراتی اقدار کو قید خانے کی تنہائی میں ملاحظہ کیا۔

22 جنوری 1952ء

"فیض کے دن ہم نے پہلے بھی بہت دیکھے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جب ہم ساتھ تھے اور اب ہمارا یہ حال ہے کہ
تمہارے ساتھ ہوں یہ ہے۔ خیر کہیں اب بھی اتنا کچھ میسر ہے کہ شکر ادا کرنا چاہیے۔ مثلاً مجھے تو اب سے پہلے کبھی
ایسا شاندار کلب میسر نہیں ہوا۔ مگر اس طرح کا سکون جو اس وقت ہے اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دنیا میں
کسی سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا کہ مجھے تو تنگ رہا ہے کہ یہ جیل خانہ ختم کر لے سے پہلے ہم کہیں دل لگتے
ہی جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اب کوئی بات کوئی چیز نئی نہیں لگتی۔ ہمارے مشغلے ہمارے قریب رہتے ہمارے ساتھی
جن پر پہلے دل لگا کرتا تھا اب بیزار کرنے لگتے ہیں اور ایک طرح سے دل خالی ہوتا ہے۔"

17 مارچ 1952ء

"یہ حرف نہیں اور ہم جانتے ہیں کہ در اصل یہ سلسلہ صوفی قسم کی چیز ہیں لیکن ہم لوگوں سے یہ
بات چھپائے رکھتے ہیں کہ شاعرانہ صورت پر حرف نہ آئے۔"

فیض نے ادبی کام اور مطالعہ کی تفصیلات اس طرح دی ہیں۔

ہ: ایک خط میں لکھتے ہیں:

"Pillars of the Community" کا ترجمہ مکمل ہو گیا ہے۔"

و: فیض کے تیس (30) سے زیادہ خطوط میں ان کتابوں کے نام اور اشارے موجود ہیں جن کا فیض نے مطالعہ کیا تھا۔ ان ہی خطوط
سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی درجن کتابیں فیض نے پڑھیں اور تیس (30) سے زیادہ کتابوں کے نام بھی ان خطوط میں محفوظ

سے بعد میں نے ایک پورا مضمون اسی کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہاں صرف جدول میں کتابوں کے نام و موضوع شامل ہیں، پیش کرتے ہیں:

جدول

نمبر شمار	کتاب کا نام/مصنف	موضوع	نمبر شمار	کتاب کا نام/مصنف	موضوع
1	دیوانِ [illegible]	شاعری	2	[illegible]	شاعری
3	Dander کی [illegible]	ادب	4	The Masing	ادب
5	[illegible] (انگریزی)	تاریخ	6	[illegible] (دوسری جلد)	ادب
7	[illegible] کی کتاب	ادب	8	[illegible] کے افسانے	تحقیق
9	[illegible] کی تاریخ ادبیات [illegible]	ادب	10	[illegible] عبداللطیف بھٹائی کے ترجمہ	شاعری
11	[illegible] آف [illegible]	تاریخ	12	[illegible]	ادب
13	[illegible]	شاعری	14	[illegible]	فلسفہ
15	[illegible] کی تعریف	ادب	16	[illegible] کی تعریف	ادب
17	Golden Bough [illegible]	ادب	18	[illegible]	[illegible]
19	[illegible] لائف آف جانسن	[illegible]	20	[illegible]	ڈرامے
21	[illegible]	تاریخ	22	J. Cary: The Horse Mouth	ناول
23	The Star Turner	ڈرامے	24	[illegible]	ڈرامے
25	Three Sisters [illegible]	ناول	26	The Diplomat By James Aldridge	ناول
27	Magister Ludi [illegible] Meyer	ناول	28	The Jungle By Upton Sinclair	ناول
29	Howard End. By Foster	ناول	30	[illegible] Storm	ناول
31	[illegible]	شاعری	32	فرانسیسی [illegible]	[illegible]
33	[illegible]	فرانسیسی زبان	34	[illegible]	
35	[illegible]	متفرقات	36	[illegible]	متفرقات

[illegible] فیض کی [illegible] شاعروں [illegible] سیاست [illegible] تنقید [illegible] اور [illegible] نے فیض کی شاعری پر [illegible] مختلف زبانوں کے تحت گفتگو کی ہے [illegible] ہے [illegible] اُن کی شاعری کے متعلق اور اس سے مربوط [illegible] ان کے [illegible] خطوط [illegible] کے نام پیش کرتے ہیں۔ ہم نے اسی کتاب میں کلامِ فیض پر [illegible] مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔ [illegible]

ان تجزیاتی و تنقیدی پہلوؤں سے محروم رہے۔ شاعری و ادب کا کوئی ایسا عظیم شاعر ہو جس نے ذہنی انضباط اور التفات سے اپنے کلام پر کام نہ کیا ہو۔

14 جون 1951ء کو ایلس کے خط میں لکھتے ہیں:

"ترقی کے بعد میں نے ابھی ابھی ایک نظم ختم کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ تین برس میں جتنا کچھ لکھا تھا ان تین ماہ میں اس سے دوگنا لکھ چکا ہوں"۔

9 نومبر 1951ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"اپنی نئی نظمیں ایک نئے مجموعے کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں آنے کے بعد بالکل غیر متوقع طور پر کیفیت طاری ہے جس میں بہت سا کہہ لینے کو جی چاہتا ہے جلد اوراق بھر جائیں گے"۔

28 نومبر 1951ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"کل رات ایک نئی غزل مکمل ہوئی۔ نئی سرد شامیں ہیں جن میں نے سب سے زیادہ تمہیں دیکھنے کے لیے بہتر سے انتخاب۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک نہیں آئیں اور یہ پتہ نہیں کسی چیز کا کیا نام"۔

14 دسمبر 1951ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"تمھارے جانے کے بعد ہم ایک نظم میں الجھ گئے تھے جو ابھی ختم ہوئی ہے۔ شاعری کا دورہ بھی کبھی پڑتا ہے اور جب پڑتا ہے تو پتہ نہیں چلتا ہے کہ اگر کچھ دن اس طرح گزر جائیں تو یہ کیفیت کافور ہو جائے گی۔ یہ نظم بھی ایسی ہوئی ہے ایک طرح کا تماشا ہے جو میں نے پہلے نہیں لکھا۔ شعر تو شاید اچھے نکلے ہیں لیکن تجربہ بالکل نیا نہیں ہے"۔

24 دسمبر 1951ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"آج کل دو ایک نئی نظمیں شروع کر رکھی ہیں جو غالباً جلد ختم ہو جائیں گی لیکن یہ شاعری بے حد مشکل کام ہے۔ اس کی وجہ سے اور سب کام رکے ہوئے ہیں جن میں تمہیں خط لکھنا بھی شامل ہے اور اگرچہ کام بہت کم ہوتا ہے مگر بے شمار اوقات ایسی الجھن ہوتی ہے کہ اسے ذہن کی نوکری میں بھگتنا پڑتا ہے (اسے شاید Blues Perfectionism کہتے ہیں) کبھی کوئی نئی چیز ہاتھ نہیں آتی اور بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے لیکن تاہم اس کا علاج نہیں"۔

15 جنوری 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"تین نظمیں لکھنے کے بعد دماغ تھک سا گیا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر سے شروع کر سکوں گا"۔

22 فروری 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"ایک دو نظمیں آدھی لکھی ہیں۔ انھیں ختم کرنے کو بڑی شدت سے جی چاہتا ہے لیکن دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ اس لیے انتظار میں ہوں کہ کوئی تحریک ہو آئے"۔

25 مارچ 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"دو تین نظمیں لکھی ہیں اور امید ہے کہ گرمیوں کے آنے تک ایک اور ختم ہو جائے گی۔ نئے مجموعے کی اشاعت کے

بڑے شوق سے تم آؤ گی تو بات کریں گے۔"

23 مئی 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"نظمیں لکھ تو رہا ہوں۔ شاید تم کو نہیں بتلایا۔ اب جیل میں تو پہلے سے بہتر ہے۔ پھر اتنی فرصت یا ارادے سے شعر نہیں لکھا جاتا۔ بعض اوقات دو چار مصرعے صاف کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور جب تک سب باتوں کا مزہ کم رہتا ہے۔ غالب نے یہ شکوہ کیا ہے کہ مجھے دور سے دیکھنے والوں کو کوئی چیز لگتی ہے۔ اس لیے کہ مجھ سے عاشقانہ شعر کم ہی اور بات کی کمی ہے۔"

21 جون 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں

"کل رات ہم نے بہت دیر... کے طور پر چند شعر تمہیں بھیج رہا ہوں۔ کوئی کمال کی چیز نہیں۔ تحریر کو ...ساں ہی گئی۔"

9 جولائی 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"یہاں گزشتہ چند دن بہت اچھا ہے جس کے ساتھ ایک نظم بھی بھیجی تھی (دو اور غزلیں بھیج رہا ہوں، غالباً ان میں سے ایک اتنی بری نہیں ہے) اسی طرح جب سے ادھر ... کا ... آیا ہے ... مطالبہ ہونے لگا ہے۔ مجھے یہ شکایت ... ہے کہ ... سب ... ہو چکا اور اب کوئی نئی چیز شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ جیسے اس طرح نئے تجربوں سے ... نہیں ہوتی۔ پھر اوقات بے حد ... کا احساس ہوتا ہے اور جو کچھ لکھ رہا ہے ... اور ... معلوم ہوتا ہے۔ ... میں ایسا نہیں تھا۔ ان دنوں ... سے بہت کچھ ... کر کے لکھ رہا تھا ... آخر ... ہو گیا۔ لیکن اب ... کے طور سے لکھنا ... ہے۔ اس میں جذبہ ... ساتھ رہتا ہے ... تحریر میں ... کہ ... لکھا جاتا ہے ... بعض اوقات ... لکھتے رہتا ہے ... لکھنے سے۔ لیکن میں اس بات کا زیادہ قائل نہیں ہوں۔"

19 اگست 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"اب تک تمہیں میرا مسودہ مل گیا ہوگا۔ ... مشکل نہیں ... ایک آدھ غزلیں باقی ہیں جو غالباً اگلے ہفتے تک مکمل ہو جائیں گی اور جب تک یہ سب کچھ اشاعت کے لیے تیار ہوگا ... تمہیں بھیج سکوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ ... کے لیے ابھی تک ... نہیں ... کے لیے ... انتخاب نہیں ہیں اور ... بات ... کوئی ... مشکل ہے۔ ... جب کبھی ... سے ... شاعری میں ... ہوں جو میرا اصلی کام ہے۔ ... اب لکھنے میں ... سہولت ... محسوس ہونے لگی ہے۔ اب بھی ... خالی نہیں ہوں ... پہلے ... Hindy Poetries.com ... ہے۔ ... کے ... اب ... پہلے کی طرح ... اور ... کا کام ... ہے۔ اس ... طرح ... نہیں ... کہ ... ٹھیک ... ہے کہ ... کوئی ... نہیں ... سے ... کر لیا۔"

12 اکتوبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''مذاق کو ایک غزل بھیج رہا ہوں جسے بار بار شعر کے ہوسے ایک دو ترجمہ مختلف ہے۔ اس نظم سے مجھے خاص طور سے خوشی ہوئی، اس لیے کہ مجھے صاحب کے مطلوب الفاظ میں I don't mind telling you آج تک کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ نہ بہت عرصے تک لکھ سکے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اپنی صلاحیتوں پر گھمنڈ ہے۔ اپنی صلاحیت بہر حال محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اور عرق ریزی کی ہے جو خاص طور سے میں نے تحریر کی۔

مذاق سے تم نے کہا کہ آخری تین مصرعوں میں شاید ہم کچھ ترمیم کریں۔ لیکن اگر ایک دو دن میں تب آیا تو مجھے ٹھیک ہی لگے گا۔ دوسری احتساب کی بات تو اگر تم اپنے آپ کو اس کہا جاتی ہو تو تمھیں اختیار ہے کہ یہ ہے کہ کتاب بھی تمھاری ہے۔ میں نے کئی بار اس پر لکھا تھا کہ انتساب تو پہلے سے طے ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگ اس کے بارے میں تم سے شاید ... جو شاید تمھارے لیے ذہنی کوفت کا سامان ہو۔ یہ سوال جو تم اٹھاتی ہو یہ کہ صرف ''میری بیوی کے نام'' پر مجھے اعتراض ہوگا، یا اگر جی میں ہو تو ٹھیک ہے لیکن اردو میں یہ کچھ بھدا معلوم ہوتا ہے۔''

11 نومبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''یہ سن کر خوشی ہوئی کہ چغتائی صاحب نے سرورق بنا دیا ہے۔''

29 دسمبر 1952ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''ہم اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے کچھ اشعار گڑھے ہیں وہ بھیج رہا ہوں۔ دائیں کو بھیجنے کا ارادہ تھا لیکن مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔''

'' لیکن یہاں کے علما ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور تعزیت اور اعتبار محبت کے نام بھی اس کا بروہ رہا ہے لیکن یہاں انسان کی وجہ سے جیسا کہ خیال کی بات کری۔ ان دنوں کے نام بھی جو مجھ سے داخل کر سکتا ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی گئی کے نام بھی جو ہے حرکت قیاس کی دو روٹی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ کراچی کے طلبہ کے لیے بھی کچھ لکھوں لیکن اس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں ان سے پورا انصاف نہ کر سکوں۔ یوں بھی اپنی نظم میں اس موضوع کی گنجائش نہ ہوگی جو نہیں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھی تھی وہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور نہیں جب ہو جاتا کہ اپنے جی کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور موقع پر انھیں خراج ادا کر سکوں۔ اصل میں اب اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ اگر رہا ہو جائے تو ارادہ ہے کہ نیا دور، اسپین کے بڑے یا کوئی لمبی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کشمکش حیات کا بیان ہو سکے۔ اس نے بہ دانشمندانہ کہ سب سے بڑا شاعر اور ادیب اگر زندہ ہے تو ہونے دیں کیونکہ جانے گا کہ کبھی، لیکن ارادہ ضرور ہے۔''

8 فروری 1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

''آج کل میں کچھ لکھ نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کچھ عرصے سے منجمد ہو گیا ہے لیکن یہ وقتی کیفیت

سکیں اس لیے مجھے معلوم ہے کہ لوٹ آئے گی"۔

3 مارچ 1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"دستِ صبا کے ترجمے کے بارے میں وکٹر کا خط آیا تھا۔ ساری کتاب کا ترجمہ شاید ضروری نہ ہو۔ غالباً بہتر ہوگا کہ دونوں کتابوں سے انتخاب کر لیا جائے۔ اس طرح کام کم ہو جائے گا اور وکٹر نقشِ فریادی کے بعض حصے کا ترجمہ کر بھی چکے ہیں تم لوگ آپس میں طے کر لو"۔

11 مارچ 1953ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"میں نے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا ہے اور شاید اس ہفتے کے آخر تک کچھ اشعار ہو جائیں گے۔ اپنے گرد و پیش جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے"۔

22 مئی 1954ء ایلس کو لکھتے ہیں:

"دو مختصر نظمیں بھیج رہا ہوں۔ ایک لاہور جیل کا تاثر ہے اور دوسری روزن برگ خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ ان میں کوئی ایسی کمال کی بات نہیں لیکن شاید وکٹر کو ترجمے کے لیے پسند آئیں"۔

ح: ایلس پنجابی میں شاعری کی مخالف تھیں۔

9 جولائی 1952ء

"میں بعض دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پنجابی میں لکھنا شروع کر دوں اور دیکھوں کہ اپنی مادری زبان میں کیسا لکھا جاتا ہے۔ اُردو ایسی مرصع زبان ہے، کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا، اسے اپنے عوام تک پہنچانے کے لیے کس ڈھب سے لکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے پنجابی کے مخالف اس پر برہم ہوں گے لیکن زبان کے بارے میں تنگ نظری اور تعصب بہت غیر معقول بات ہے"۔

ط: فیض دراصل ایک اچھے اُستاد تھے۔ اُنھوں نے امرتسر میں انگریزی اُستاد کی حیثیت سے کئی سال کام کیا تھا۔ وہ عربی میں بی۔اے، ایم۔اے تھے، چناں چہ عربی اور فارسی پر عبور رکھتا تھا۔ فیض چوں کہ کثیر المطالعہ تھے اور غالب اُن کا پسندیدہ شاعر تھا اس لیے دورِ زنداں میں قرآن و حدیث کے علاوہ غالب کی شاعری کا درس بھی دیتے تھے۔ قرآن اور احادیث کی تعلیم کے کئی مستند حوالے کتابوں میں موجود ہیں، لیکن غالب کی شاعری کے درس کا تنہا مستند حوالہ ایلس کو لکھے گئے خط سے اخذ کیا گیا ہے۔

2 جولائی 1951ء

"آج کل رات کو کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کو غالب کی شاعری کا درس دیتا ہوں اور بہت لطف آتا ہے۔ اپنی بڑائی کی بات نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت اچھا اُستاد ہوں اور مجھے مدرّسی چھوڑ کر کبھی فوج میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جب اس مقدمے وغیرہ کی بکواس ختم ہو گی تو صرف پڑھنے لکھنے کا کام کروں گا۔ فی الحال مجھے اور کتابیں درکار ہیں، لیکن محدود وسائل میں جو منگوا سکو تو اچھا ہے"۔

ی: ایلس نے جب منٹو کے انتقال کی اطلاع دی تو فیض نے منٹو کی شخصیت اور اُس کے فن پر جو چند جملوں میں ریویو کیا وہ بے مثال ہے۔ اس سے سچا اور اچھا محاسبہ اور منٹو کے مقام کا تعین ممکن نہیں۔ یہی نہیں بل کہ فیض نے اس مختصر تحریر میں منٹو کی شخصیت کے وقوع کے ساتھ ساتھ فن کار اور اُس کی زندگی کی مشکلات پر عمدہ روشنی ڈالی ہے اور جو نظریہ فیض نے پیش کیا ہے، وہ درحقیقت

دیرپا فلسفے کی حیثیت رکھتا ہے۔

27 جنوری 1955ء

اسٹو کی وفات کا سن کر دکھ ہوا۔ سب ترقی پسندوں سے بڑھ کر وہ مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے بڑا فخر بھی ہے کہ وہ آخر عمر تک میرے دوست رہے۔ اگرچہ پچھلے کئی برسوں میں ملاقات کم ہی ہوتی تھی اس لیے کہ وہ [illegible] شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور مختلف افراد اور دیہاتی ادیب جانے کس کس موضوع پر گرما گرم بحث ہوتے تھے۔ [illegible] بچے انہیں [illegible] بچپن کی بات ہے۔ ہمارے شاعر [illegible] حضرت فن کاری کی [illegible] دل کا احساس ہے [illegible] ہمدردی [illegible] کے کر [illegible] تو اس کا اپنا قصور ہے [illegible] زندگی بسر کرتا تھا [illegible] وغیرہ وغیرہ [illegible] سوچ کا [illegible] تو [illegible] ایسے [illegible] اپنے [illegible] نے [illegible] سے [illegible] کی [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] جب [illegible] حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے [illegible] ان میں سے ایک کو قربان [illegible] ہے۔ دوسری صورت [illegible] دونوں کا [illegible] قربان کرتا ہے اور [illegible] دونوں کو [illegible] کے [illegible] کا [illegible] ہے جو [illegible] فن کا دل کا [illegible] ہے۔ [illegible] تھا۔ [illegible] [illegible] ہوتے [illegible] وہ [illegible] میرے خیال میں اس کا [illegible] جاتے [illegible] ہے گزرتے ہوئے وہاں سے ہوتا اور میری طرف سے [illegible] پر [illegible] بھیج دیتا۔“

ا۔ ان خطوط میں [illegible] کے نام سے خط [illegible] یاد [illegible] ایک اسلامی عالم نے [illegible] سے اسلامی تاریخ کا نیا تجزیہ لکھنے کی پیشکش کی تھی [illegible] راضی بھی ہو گئے تھے لیکن بعد میں [illegible] کے باعث اس پیشکش سے منحرف ہو گئے تھے۔

کچھ تو دیکھا تھا جو [illegible] میں کہ تھا؟

[illegible] 1953ء

”اسلامی تاریخ کا تجزیہ لکھنے کی پیشکش [illegible] ظاہر ہے کہ [illegible] بہت شوق سے کروں گا۔ اگرچہ [illegible] اس کام کا اہل ہوں [illegible] اس تجویز سے [illegible] امید وابستہ کرنا [illegible] چاہتا [illegible] صاحب سے [illegible] بارے میں پہلے [illegible] مجھے [illegible] کوئی [illegible] تو مجھے [illegible] [illegible] کے بارے میں [illegible] کر دیں گے۔“

26 اپریل 1953ء

”[illegible] صاحب [illegible] اسلامی تاریخ کے بارے میں ایک [illegible] میں [illegible] خط لکھوں گا۔“

8 مئی 1953ء

'' نسیم صاحب نے کتاب کا اردو ترجمہ کر دیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ آج کل ایک آدھ شعر کے علاوہ کچھ بھی موزوں نہیں ہوا۔''

2: فیض کے خطوط جو انھوں نے اپنی بیوی ایلس اور بیٹیوں کو لکھے وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک قسم ان خطوط کی ہے جو جیل سے لکھے گئے اور اس وقت بچیاں ابھی چھوٹی تھیں۔ دوسرے خطوط وہ ہیں جب دونوں بیٹیاں خود ماں بن چکی تھیں۔ چنانچہ دونوں خطوط میں بہت فرق ہے۔ اب خطوں میں نواسوں کا ذکر بھی ہے اور ایک آدھ خط ان کے لیے بھی لکھا گیا ہے۔

الف: فیض نے جو خطوط قید کے دوران بیٹیوں کو لکھے ہیں ان میں ایک باپ کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض کسی نہ کسی طرح گھر کو بیٹیوں میں چھپانے کی بجائے اس کی جدائی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ خطوں سے زیادہ بین السطور فیض کے دل کی جذباتی حالت لفظوں سے عیاں ہو رہی ہے۔ ''آج کا سارا دن بس وہ یاد ستاتا رہا''۔

'' اس خط کے لیے تمہیں بھی انتظار کرنا ہوگا اور اس سے زیادہ دیر کبھی کبھی تو مجھے بھی ہو جاتی ہے اور وقت پر خط نہیں ہو سکا۔ کل اردو کا سہ ماہی ان کا پیار ستاتا رہا۔ اس کتاب میں لڑکی کی کہانی بھی شامل تھی جس سے اطہر نے کہا تھا کہ وہ پڑھ کر بتاؤں گی۔ لیکن مجھے کچھ زیادہ دلچسپی کرداروں کے حالات کے بارے میں ان کا ادبی کیا ہے۔ اگر چہ نسیم نے اس بارے میں اپنی تنقیدی معلومات انھیں عنایت کی ہیں۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ انھیں سے کہ کیا خیال ہے۔ خدا کرے کوئی ایسی چیز ہو جس سے تھوڑا سا رنج کم ہو۔ اپنی خوشی کے لیے یہ چیز مل جائے تو کچھ بات بنے۔ اس لیے کہ محبت سے کوئی چیز دی جائے اور کھو جائے تو اس کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے اور اس خیال سے کہ شاید تحفے کے ساتھ وہ چیز بھی جو اس نے انتخاب کی ہو اپنے محبوب تک پہنچ سکے۔ پھر اس بات کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ سالگرہ کیسے منائی گئی۔ ہم تمھیں یاد کریں گے، دل میں تم سب کو گلے لگاتا ہوں''۔

ب: فیض بچوں کی تربیت کے لیے فکر مند رہتے تھے، ان کی تعلیم اور اخلاقی قدروں کی۔

11 نومبر 1954ء

'' کل رات یہ خط ختم نہ کرسکا۔ اس کے بجائے میں نے لڑکیوں کے لیے ایک پرانی کلاسیکی کتاب پڑھی، جو میں نے منیزہ کے لیے منگوائی تھی: پرانی وضع کی کتاب ہے لیکن ہمیشہ دل آویز داستان کی بات ہے کہ بچوں کے لیے جو بھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب انیسویں صدی یا اس سے زیادہ پرانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ایک مختلف ماحول اور فکر و خیال کی مختلف فضا میں لکھی گئی تھیں، اس لیے ہر چیز تجربے کی محدود ہے کیونکہ خیالات اب بالکل آؤٹ آف ڈیٹ معلوم ہوتے ہیں۔ بچیوں کا ادب بہت اہم چیز ہے کہ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ کچھ لکھنا شروع کر دوں۔ لیکن آج کل ذہن سنجیدگی سے بہت کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ اب آپ سے اور ہم سب کے لیے وہی قصہ پرانا ہے۔ کسان، مزدور، مجرو مجبور، جس نے کچھ بھی پایا اسے کچھ نہ کچھ کرنا پڑا ہے اور ہم دن میں کئی بار انھیں دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ بچے بھی کچھ سوچتے ہوں گے''۔

ج: فیض قید کے دوران بچوں کی تصویریں اور ان کی باتیں، ان کی معصوم باتیں اور کھیل کود کا سامان بھیج کر اپنی جدائی کو بھلانے کی کوشش کرتے تھے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ پڑھ کر اپنی بے قراری بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ فیض ان کی تعلیم و تربیت

اور رنگوں کے خوابیاں جیسے خطوط میں موجود ہوا کے بھی نظر آتے ہیں۔ مقامی اخبارات میں ان کی تصاویر دیکھ کر شائقین باغ باغ ہو جاتے تھے۔ چغتائی صاحب ہماری گفتگو کے کواڑوں [illegible] فیض چغتائی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"یہ تصویریں اب ہمارے سامنے ہیں۔ کمرے میں ان کی بڑی تکمیل شدہ تصویریں خوشنما [illegible] اور ان کی تیاریاں بھی کی تصویریں اس طرح حلقہ کیے ہوئے ہیں جیسے ہوا کے بگولے ہوں۔ یہ بھی خوب صورت تصویر ہے۔ [illegible] کے ساتھ ہے اسے روشنی اور محبت کا اتحاد کہتے ہیں۔ جب کسی پہلی تصویر پر پہنچتے ہیں تو گھرا کے دیکھتے ہیں اور اس کے چہرے میں اس کے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ چغتائی تک پہنچ کر ہم نظر آ گیا ہے۔ چہرے میں جو باتیں ہوتی ہیں [illegible] کی کوئی تحریری شکل کوئی نقش نہیں ہے۔ اس کا چہرہ کیا ہے ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جہاں جس شخص جاتا ہوں کہ وہ [illegible] ایک صاف زمین اور [illegible] ادا کرتے [illegible] حیران اور [illegible] ہوئی [illegible] اپنے [illegible] کی طرح [illegible] والوں کے دل قریب ہے [illegible] اس کے معنی ہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنا دل بھی دکھا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی [illegible] ہوتا کبھی وہیں گے لیکن اس کی خوش مزاجی مسکراہٹ کبھی نہیں جاتی اور اس کی ہنسی کبھی ناخوش نہیں ہوتی۔ یہ شخص اپنے کاموں کو [illegible] خوشی و مخالف اور [illegible] الگ چیزیں ہیں اور بالکل ممکن ہے کہ آدمی ناخوش ہو۔ [illegible] اور خوش بھی رہے۔ دکھ درد خارجی چیزیں ہیں جو ہماری ذات سے [illegible] کی طرح باہر سے وارد ہوتے ہیں جیسے ہماری موجودہ بیماری ہے یا جیسے ایک بھائی کی موت ہے لیکن خوشی ہماری اندر سے پیدا ہوتی ہے اپنے اندر کی چیز ہے۔ یہ اپنے اندر بھی [illegible] رہتی ہے اور اگر آدمی احتیاط کرے تو یہ اس کی شخصیت بن جاتی ہے۔ [illegible] سے تو کوئی مفر نہیں لیکن ناخوشی پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی کسی اندر کی چیز سے منہ نہ لگائے جس کی خاطر زندہ رہنا اچھا لگے۔"

مجروح سلطان پوری لکھتے ہیں:

"چغتائی کے انتقامات اور ہماری محبت سے باتیں ختم ہو جائے اور اس محفل سے وقت [illegible] ہوں کہ شیفتہ و غالب جیسی صورت اس کے قابل نہ تھا۔ اس کی بہت بڑی تقاضہ بس بیت [illegible] اور اسے معلوم ہوا ہے بالکل رخصت تھی۔ ہم اس کے بہت [illegible] کریں گے۔ [illegible] کو اور قلعے کا عالم سمجھ [illegible] کہیں سے تلاش کر لیتا کہ جس جگہ بیٹھ کر ہم [illegible] افسوس کہ اس کام کے لیے ہم خود اب موجود نہیں ہیں۔ ہم دونوں خواتین کو دل لگانے کے لیے مطلقہ رقیب کے آگے کہاں [illegible] کے اختیار کا اب مقصد تھا۔ شاید تمہیں وہ تمہارے مستقبل رہی گی جو کسی بات پر بالکل نہ ہوئی تھی۔"

فیض نے تعزیت کے پیغام بھی دیے۔ جہاں پر اپنا غم کی تو بھی اس طرف منتقل کرتے ہیں کہ:

"آؤ ہماری چھوٹی ملاقات بہت دور ہو گئی ہے؟ جانا تعجب میں اس کا ذکر کسی طرح میرے خطوط میں نہیں آتا۔ ہوتے کیسے۔ سب رہتی تھی۔ پہلے کے سامنے آتا [illegible] کے سے اچھا ہے لیکن محبت ایک حد تک رہا ہی تھی [illegible] اعصاب پر برا اثر ڈالتی ہے۔ خیر تمہیں کیا معلوم ہے لیکن تم کبھی [illegible] سرخرو [illegible] مرکز [illegible] ہو۔"

فیض کے جو خطوط ہیں ان میں سے ہم باتیں اور شخصیات کی تفصیل، امریکہ، یورپ، ماسکو اور دوسرے مقامات سے لکھے ان

کی نوعیت دوسری ہے۔ یہاں محبت کے ساتھ ساتھ دوسرے حالات پر بھی گفتگو ہے۔ فکر بھی ہے اور ہر حال میں زندگی کو شکست اور مشورہ دیتا ہے۔ بیٹیوں سے زیادہ تر نواسوں نواسیوں کی خیریت اور شرارت دریافت کی جاتی ہے۔ یہ خطوط اردو میں ہونے کی وجہ سے لفظوں کی چاشنی اور محاورے، مقولے اور دلچسپ فقرے نظر آتے ہیں۔

حمید ہاشمی کو لکھتے ہیں:

"اپنے تخلص کے لیے ذرا غور و فکر چاہیے۔ وجہ یہ ہے اب تمہارا معاملہ لکھا ہوگا۔ لکھا جائے گا ورنہ [illegible] سوچنا ہوگا کہ کیا کہیں۔"

بچوں اور بیٹیوں، نواسوں کو ایک خطوں اور نظموں میں روانہ کرتے ہیں بلکہ ان کو [illegible] کے لیے نواسوں اور نواسیوں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں بلکہ امریکا، کینیڈا اور بیروت کے حالات سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔

ہم نے اس تحریر میں ان خطوں کا ذکر نہیں کیا جو افتخار عارف، سرفراز اقبال اور دیگر خواتین و حضرات کے نام ہیں۔ سبب یہ کہ ان خطوں کی وجہ تصنیف جدا جدا ہے۔ دوسرا اس لیے کہ ہم نے اس بات پر الگ علیحدہ مضامین میں بیان کیا ہے تاکہ مضمون سے پورا انصاف کیا جا سکے۔

***

یادِ یارِ مہربان

سردار جعفری نے 14 دسمبر 1984ء کو ٹورانٹو میں کلیاتِ فیض کے شاہکار نسخہ "سارے سخن ہمارے" کے آخری صفحہ پر ایک مختصر تاثراتی تحریر بعنوان "یادِ یارِ مہربان" لکھی۔ یہ کرنل انوار احمد کی ملکیت ہے۔ یہ تحریر جس کے آخر میں سردار جعفری کا دستخط ثبت ہے بعن وعن پیش کی جا رہی ہے۔

"اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ دُنیائے شعر میں کسی شاعر کو اتنا پیار نہیں ملا۔ پھر اِس پیار سے رُوگردانی کیوں۔ فیض کی شاعری نے بہت سے کرشمے دکھائے اور دکھاتی رہے گی۔ لیکن فیض دوبارہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہاں فطرت بھی بے بس ہے کیوں کہ وہ اپنی تخلیق کو دُہرا نہیں سکتی۔

هم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
دُنیا میں تجھ سے لاکھ سہی تُو مگر کہاں

مخدوم محی الدین کے جشن کے موقع پر کسی نے کہا تھا:

کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ مے خانہ
ان دنوں صورتِ بربادیٔ یاراں کیا ہے

ہماری محفل میں بربادی کا یہ جشن جاری رہے گا اور فیض کے نام پر جاری رہے گا۔ ہم ساتھ ساتھ بربادی کے اُن تمام کوچوں سے گذرے ہیں۔ کبھی لکھنؤ میں، کبھی لاہور میں، کبھی بمبئی میں، کبھی ماسکو میں، کبھی قاہرہ میں، کبھی ٹورانٹو میں اور نہ جانے کہاں کہاں۔ فاقوں کی غرور اور مظلومیت کی کج کلاہی کے ساتھ۔ آئندہ بھی یہ محفلیں، یہ صحبتیں جاری رہیں گی، جہاں فیض کی نمائندگی فیض کے شعر کریں گے"۔

سردار جعفری

☆

فیض اور مصطفیٰ زیدی

(رشتہ جو موتیوں سے ڈھلکا رہا)

فیض نے کہا تھا:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

یہ طرزِ فغاں فیض کے زندان جانے سے دس پندرہ برس پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کئی نوجوان شاعر اپنی اپنی بساط کے مطابق اسی رنگ میں شاعری بھی کر رہے تھے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ وہ تقلید کر رہے تھے یا کسی کے مقلد تھے بلکہ اپنی تخلیق کے رخ کو اسی سمت موڑ رہے تھے۔ اسی زمانے میں ایک عظیم فطری شاعر جو ابھی جوانی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا وہ تیغ الٰہ آبادی کے نام سے اُردو شاعری کے فلک پر ایسا نمایاں ہوا کہ اس وقت کے تمام بزرگ اور عظیم شعرا جن میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض اور جگر مراد آبادی وغیرہ شامل تھے اس نئے لب و لہجے سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ اسے پسندیدہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔ یہی تیغ الٰہ آبادی بعد میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید مصطفیٰ زیدی، 10 اکتوبر 1930ء کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1950ء میں بی اے کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد پاکستان چلے گئے اور 1952ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کر کے 1954ء میں سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے انگلستان سے تربیت اور تجرباتی کورس کر کے پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے لیکن مخلوق سازشوں سے 1970ء میں سرکاری منصب سے برطرف کر دیے گئے اور 12 اکتوبر 1970ء کو 39 سال کی عمر میں اچانک موت کے سانحہ سے دوچار ہوئے۔ اُن کے پسماندگان میں جرمن نژاد بیوی ویرا کے علاوہ ایک بیٹی اور بیٹا ہیں۔ پہلے کچھ عرصے تک فراق گورکھپوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اُن کی تخلیقات میں چھ شعری مجموعے اُن کی زندگی میں اس ترتیب سے شائع ہوئے: (1) زنجیریں 1949ء، (2) روشنی 1950ء، (3) شہرِ آذر 1958ء، (4) موج مری صدف صدف 1960ء، (5) گریباں 1964ء، (6) قبائے ساز 1967ء۔
مصطفیٰ زیدی اگرچہ فیض سے بیس سال چھوٹے تھے لیکن کم عمری ہی میں ترقی پسند جدیدیت اور آزاد بیان کے مترقی شعرا کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ اپنے مجموعہ "روشنی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "اس مجموعے کی تمام نظمیں 1945ء اور 1950ء کے درمیان کی ہیں۔ یہ نظمیں مجھے الٰہ آباد کے اُن دنوں کی یاد دلاتی ہیں جب خوشی خوشی کی طرح اور غم غم کی طرح ہوتا تھا۔ ادب، جمالیات اور جدلیات پر دن رات بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ بحث میں شامل ہونے والے بزرگ بھی تھے، جوان بھی تھے، اور محض دیکھنے والے بھی۔ فراق گورکھپوری، اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، وامق جونپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر مسیح الزماں اور مسعود اختر جمال کے ساتھ ساتھ معصوم رضا راہی،

رہنما و امیر اور نفیس اُن نوجوانوں میں سے تھے جو اُن کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے۔ کبھی نشست بڑی پُرلطف ہوتی تھی اور بڑی شرط کے ساتھ کہ ان کی
مجلس تہذیب، میر، سودا، اور انیس کے کلام سے منفرد نہ سمجھے جائیں گے یا آپ کچھ ایسے مصرعے کے مصرعے پڑھے جائیں گے۔ جوش ملیح
آبادی، ساحر لدھیانوی اور مجاز مرحوم بھی کہا کرتے تھے کہ جب الٰہ آباد آتے تھے۔ آئے دن مشاعرہ ہوتا تھا، فراق نے اور مصطفیٰ نے پڑھے جاتے
تھے۔ ادب اور ادب پر بحث، بڑے بڑے بحث ہوا کرتی تھی۔ چھوٹے موٹے لوگ تو کچھ نہیں کہہ پاتے تھے، بس مرعوب ہو کر اپنی ست لے کر
فطرت کی مجبوری تک کے مراحل طے ہوتے رہتے تھے۔ عام طور پر اساتذہ اپنے طلبائے علم کے کو علمی اور سیاسی بلکہ تعلقات کو روانی
ہی سمجھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسے یہی فلسفہ ہم تا انحراف کی حیثیت حاصل کی ہوش کے بغیر تقاضے جماعتوں کے آلہ کار بن گئے ہوتے۔
"روشنی" کے پہلے ایڈیشن میں جو جو بازی کی جو نظمیں تھیں، اُن کی تعداد ... اور انھوں نے مجھے مقدمہ شعر کے متعلق بڑی ... سے
بہت علیحدہ نہیں کیا۔ اس زمانے کے اثرات بھی تھے، کیفیت بھی تھی کہ وہ بھی جوش کے رد عمل کے طور پر اختیار کر لیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ
جب جوش ملیح آبادی ایک طرف، پھر کلکتہ، لاہور، الٰہ آباد اور دوسری طرف "ہم ہند کی بھی ہیں" ... "کچھ تو ہے" ...
کی جو بہت بہار ہے، مجھے اب سے اجنبی پیدا ہوئی"۔

مصطفیٰ زیدی کے فن اور فیض کے فکر و فن میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے آخری مجموعہ "کوہِ ندا" میں لکھتے ہیں: "جب لفظ و
معنی پر پوری گرفت اور مدد ملی تو ان کے لیے نئی نئی راہیں کھلتی ہیں تو ان پر مجھے غزل اور استعارے کی نئی نئی شکلیں نظر
آتی ہیں۔ ہر تجربے کی خیالی ہمسائیگی، وہ بات جو وہاں کے لوگ سامنے آتا ہے۔ نئی شعر ہے کہ ایک ہی علامت کو کئی
طرح برتنے والے نئے نئے رنگ پڑھنے والا آئے۔ آنکھوں سے محسوس کر سکے۔ اس کے لیے استعارے اور تشبیہ کے نئے
راستے ابھر کر بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں"۔

حق تو یہ ہے کہ جو اہم نکات مصطفیٰ زیدی نے بیان کیے ہیں وہی نکات فیض کے ہاں بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ جوش مصطفیٰ
زیدی کی ابتدائی شاعری کے معترف تھے۔ کہتے ہیں کہ "جو حد بھر مصطفیٰ زیدی شاعر" جوش نے جس طرح فیض کی تعریف میں سبط حسن کو
خط لکھا جو کہ "تا" میں ادب پر روشنی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یادوں کی بارات میں مصطفیٰ زیدی کی شخصیت اور فن پر لکھا، لیکن
افسوس کہ وہ تحریر جوش کی "یادوں کی بارات" میں شامل نہ ہو سکی۔ اب اس سے عام قارئین بھی واقف نہیں۔
جوش لکھتے ہیں:

جب تک پر دم خدا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اس مادہ پرست اور متشرع دور میں بھی کسی ادا کار اور اخلاص کے ساتھ ... ہم سب قدر کرتے ہیں ... ... بہاولپور، لاہور...
جا دو لی ... بہت ... ہیں۔ الٰہ آباد، پاکستان اور سرحد (اللہ آباد، کراچی، پشاور، دہلی)

یہ ایک اتفاق بھی ہے کہ وہ ایک بہت باوقار شاعر ہے۔ ہر چند اس نے روشن خیالی کو ترک کر کے نئے جدید دور میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن اس کے کلام
میں اب بھی ادب کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ اس کی شاعری میں اتنی زیادہ نئی غزل اور اس کے متعلق اتنا فرق یا لفظی حامل ہے کہ پڑھ کر
مجھے اس کا شعر ہم سے بہت زیادہ ہی چاہتا ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جب
مصطفیٰ زیدی نے کہا تھا کہ ...

سر دشتِ تمنا، صحرا کی مانگ
تجھ سے میری کہانی باقی ہے

اس بچے کے حالات نامساعد ہو چکے ہیں، یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب اقربا و احباب منہ پھیر لیا کرتے ہیں مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ جوشؔ اس کے واسطے جان تک دینے کو تیار ہے۔ مصطفیٰ زیدی اپنا دل ڈھونڈنے والو تم ایک دولت بیدار ہو تم کو اپنی قدر اور حفاظت کرنا ہے۔

جوشؔ کا نثری نوحہ جو مصطفیٰ زیدی کی ناگہانی موت پر ہے، جوشؔ کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا رہے گا۔

مصطفیٰ زیدی، اے میرے خوش مقال زود یہ ممال شاعر..... تجھ کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا بہت آسان تھا کہ عصر نو کے اخلاف میں ایسا جوہر موجود ہے جو اسلاف سے بازی لے جا سکتا ہے اور ان سے بہ مراحل بلند ہو سکتا ہے۔ تیرے مرنے سے..... اردو شاعری عظیم ترین شاعر فرد سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔ زیدی کی موت نے ایک جوان سال ذہین رفیق سفر سے محروم کر دیا ہے جو فکر کے بھیانک جنگلوں میں میرے شانے سے شانہ ملا کر چلنا اور مسائل کائنات سلجھانے میں میرا ہاتھ بٹایا کرتا تھا"۔

مصطفیٰ زیدی کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار دیکھیے تو خود بخود فیضؔ کے نغمے ذہن میں گنگنانے لگیں گے۔ یہاں ہمارا مقصد تقابل نہیں بلکہ چراغ سے چراغ جلانے کی روایت کی پاسداری ہے۔ اس تحریر کو طوالت سے بچانے کے لیے ہم فیضؔ کے اشعار پیش نہیں کریں گے۔

تال دے اٹھتی تھیں یوں اس کے قدم پر راہیں
جیسے برسات کے پانی میں چھنکتے جھانجھن
جیسے کرنوں سے جھنک جائے کسی کا کنگن
جیسے کلیوں کے طرب زار میں جھولے ساون

....

چھپ گئے رات کے دامن میں ستارے لیکن
یہ تری شعلہ نوائی کا نیا دور سہی
عزم پرواز کی توہین سے مایوس نہ ہو
ایک بار اور سہی اور سہی اور سہی

....

اک نئے عہد کی امید، نئی صبح کی ضو
اس اندھیرے سے ابھرتے ہیں چراغاں کتنے
زیست کے جامۂ صد چاک کا ماتم کیسا
زیر تخلیق ہیں خلاق گریباں کتنے

....

اس نوجوان عصر ترقی پسند میں
اک کہنہ یاد وقت بلا ہاں ہے آج بھی

....

ہاتھوں پہ تلنگوں کے صلیبیں لے کر
زنداں کے ساز پہ ہم جب گیت گائیں گے
نئی بہار جنھیں گردشوں کے ہاتھ میں ہے
یہ نظام تمھیں سمجھ جائیں گے

مصطفیٰ زیدی کی غزلوں کے اشعار سے فیض کی غزلوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے:

ترے جسم کی سب گتھیوں کو کھولیں
مسکراتے ہوئے ہونٹوں میں گرم بوسہ رہا
ہم جیسے دوچار ادیب اور بھی ہوں گے لیکن
جن کو ٹھوکر کے سائے میں قلم یاد رہا

. .. ...

غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ جاناں کے چلن
وہی سوچی ہوئی چالیں وہی بے ساختہ پن
اتنی ہولی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگیٔ صبحِ وطن

....

ترے چہرے کی طرح اور مرے سینے کی طرح
مرا ہر شعر دمکتا ہے نگینے کی طرح

.. ..

اے سانس کی خوشبو لب و رخسار کے پیچھے
کھلا تھا مرے دوست نے بستر اسی گھر میں
فردوس ہوا تھا کبھی پیار امارت
بکتا تھا قبیلوں کا مقدر اسی گھر میں

....

آنے والے دن کا استقبال کرو
گزری شام سے کیا لینا ہے گزری شام

....

رات کو انجمنِ ناز میں محو ہو کر
جھلکتی ہے نظر ترے بدن کی صورت
ایک اک ذرہ چمکتا ہے ستارہ بن کر
ایک اک یاد تڑپتی ہے دلہن کی صورت

فیض کی شاہکار نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' کے آخری اشعار کا اثر دیکھیے۔ زیدی کی نظم ''نوروز'' میں کہتے ہیں:

گھٹتے جلتے ہوئے گوشت کی بُو دیتے ہیں
اسپتالوں کو جراثیم نمو دیتے ہیں
اسی منڈی میں جہاں صاف کفن بکتا ہے
جسم بکتے ہیں، ادب بکتا ہے، فن بکتا ہے

مصطفیٰ زیدی کی شاعری میں کہیں کہیں ''لو ہار آتی تری زن'' کا ساز موجود ہے لیکن نعرہ بازی اور للکار نہیں۔ نظم ''میں امن چاہتا ہوں'' میں کہتے ہیں:

زمین گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پہ آدمی کے لہو سے پپڑی جمی ہوئی ہے
جلوں سے کپڑا کہاں بنے گا
کہ تکلیوں کو گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں

خود زیدی کہتے ہیں کہ میری ابتدائی نظموں پر جوش ملیح آبادی کی گرم آہنگی کا بڑا نمایاں اثر تھا، لیکن رفتہ رفتہ میں نے اپنا مزاج سمجھنے کی کوشش کی۔ میں شعر لکھنے میں کسی کی انگلی تھام کر نہیں چلا، اس لیے ممکن ہے کئی ٹھوکریں کھائی ہوں، لیکن ان ٹھوکروں سے ''ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت''۔ میری ترقی پسندی کسی زمانے میں ایک جماعت کی ترقی پسندی تھی لیکن اب کئی جماعتوں کی ترقی پسندی ہے:

تیرے غموں سے ایک بڑا فائدہ ہوا
ہم نے سمیٹ لی دلِ مضطر کی کائنات

....

انھیں پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

فیض کی نظم ''تنہائی'' ایک عظیم شاہکار نظم شمار کی جاتی ہے۔ مصطفیٰ زیدی نے ''گانے والیاں'' میں اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ ہم صرف چند مصرعے پیش کرتے ہیں:

جاگتے ہونٹ چہکتے ہوئے عارض کا نکھار
مسکراتے ہوئے یوں اشک بہیں گے کب تک
یہ دہکتے ہوئے رخسار رہیں گے کب تک
گاؤ تکیے سے لپٹتے ہوئے دو بچوں نے
اپنی ماؤں کو کبھی رقصِ جنوں کو دیکھا
سازِ ویراں کو کبھی سوزِ دروں کو دیکھا
لوریاں دے کر سلائیں گی یہ مائیں کہ نہیں؟

اس نعرہ بازی کو مصطفیٰ زیدی کے اس شعر پر تمام کرتے ہیں:

مری نگاہ میں ادبی علامتیں کیا ہیں

یہ شاعری مری سب سے بڑی عبادت ہے

لیکن اور [illegible] ناظرات سے اگر ہم مصطفیٰ زیدی کو جوش اور فیض کی درمیانی کڑی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ زیدی فیض کی طرح جوش کی انقلابیت کو [illegible] اور محدود سمجھتے ہیں [illegible] میں لکھتے ہیں: "زیدی کے اکثر نقادوں نے اس دور [illegible] کے بارے میں اس [illegible] کا مطالبہ کیا ہے ان کے مقابلے میں [illegible] تمام تحریکات کا [illegible] عمل [illegible] یہاں بھی [illegible] چنانچہ [illegible] کارل مارکس [illegible] ان آوازوں نے بڑی [illegible] یہاں [illegible] اس وقت [illegible] معیار [illegible] تھا کہ ہم [illegible] انقلاب کیے جاتے تھے۔ اس انقلاب سے [illegible] انسان کا [illegible] تھے۔ اس کے مقابلے میں [illegible] انقلاب [illegible] ہے کہ ہمارے نظریہ [illegible] کا ایک [illegible] ثقافت کی [illegible] شامل ہو گئے ہیں۔ یہ نظریہ [illegible] گئے

خواب کو جذبۂ بیدار بنا دے ساقی

قوم کے ہاتھ میں تلوار بنا دے ساقی

"[illegible] کے فرزندوں سے خطاب" ایک نظم تھی جس نے بائرن کی چائلڈ ہیرالڈ (Childe Harold) کی طرح اپنے مصنف کو [illegible] شہرت [illegible] اس نظم میں بھی کسی نظریے کا اعلان [illegible] کیا تھا [illegible] جب کہ [illegible] ہیں۔

زیدی [illegible] اس بات پر [illegible] ساتھ [illegible] اتفاق [illegible] کا اعتراف [illegible] جوش نے کیا ہے:

میرے [illegible] میں [illegible] رنگ ہے

[illegible] رنگ ہے

.. ..

چند [illegible]

[illegible] انقلاب

....

بے خبر تھا میں کہ یہ تھا رنگ نمود راز ہے
وہ بھی میری خامشی ہے جس کا نام آواز ہے

……………… .

یار من شاید اب تجھ جلنے سے نجات
کیوں کہ اب پیش نظر ہیں طلب باب کائنات

جوش، فیض اور علی سردار جعفری نے بھی آزادی کے بعد کی گھٹن اور اس کرب کی کیفیت کو جن نظموں میں پیش کیا ہے، آزادی، ماتم آزادی اور اگست 1947 ان کی نظموں میں اظہار ہے۔

جوش: وہ جشن ہے کہ لہو کی بہار لگتے ہیں
فیض: چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مصطفیٰ زیدی:

ابھی غبار سر کارواں نہیں بیٹھا
غروب شب کی سواری گزر گئی ہے ضرور
ابھی ہماری محبت پہ آنچ پڑتی ہے
کسی کی زلف پریشاں بکھر گئی ہے ضرور

فیض نے مصطفیٰ زیدی کی شاعری پر خوب غور سے ریویو کیا ہے۔ "متاع لوح و قلم" میں مطبوعہ اختر انصاری کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "آپ کی فرمائش نے عجب الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ کسی شاعری کے بارے میں سچی رائے کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والا اس کے کلام اور اس کی ذات کو اپنی جذباتی پسند و ناپسند سے الگ تصور کرے یا اجنبیوں کی طرح رائے قائم کر سکے۔ مصطفیٰ زیدی کے بجائے اگر قلی قطب شاہ سے لے کر اقبال تک کسی کے بارے میں اتنا ارشاد ہوتا تو آپ کو ایک مضمون تحریر کر دیتا۔ یہاں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ مصطفیٰ زیدی اور ان کا کلام دونوں اتنے زمانے سے میرے قریب ہیں کہ قلم اٹھاتے ہی ان پر لکھنے پر تو ایک طرفداری کا گمان ہوتا ہے۔ گرچہ فی الواقع یہ بات کہیں غلط نہیں اس بات سے کون انکار کرے گا کہ ہمارے نوجوان شعرا میں مصطفیٰ زیدی کے مد مقابل کم ایسے ہوں گے جنھیں سچ معنوں میں صاحب طرز کہا جا سکے۔ یوں نکلتی عمر بڑھ کر جا کر ایسا لگتا ہے۔ نئے طرز سخن کی قیمت بھی ادا ہو سکتی ہے لیکن اتنی طرز تو ان کی موجودگی ہے۔ یہاں کے معنی ہے اور اس کی ساتھ دوسرے شاعر کی کی آوازوں سے ممیز بھی ہو جب الفاظ کے خوب ادا کا حصہ ہے۔ یا مثلاً مصطفیٰ زیدی کے سامنے بھی اپنی پہچان کرتے تھے۔ جو زندگی سے ان کی آواز مصطفیٰ زیدی ہو گئے لیکن مصطفیٰ زیدی جب بھی تھے اور تیغ آزما اب بھی ہیں۔ یعنی ان کے فن میں جو جب بھی تھا اور جو شے اب بھی ہے۔ چنانچہ اب تو ان کے بیشتر کلام میں صداقت اور وسعت میں تک پہنچ رہا ہے معتبر ہے۔ ان کا کلام ان کی شخصیت اور فن کے معیار کو ارتقا کا وقار اور ان کی بہت نمایاں ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ نوجوانی میں جو جذبہ یا محبت ہو وہ ان پر اظہار بطور خاص سے وارد ہوتے ہیں بعد میں یہ بات کا دریا اتر جانے پر بھی ایک الجھن کو دوبارہ گرفت میں لے کے یہ جو گرداں رہتے ہیں۔ فیض کی اولی تحریر نہیں ہے مثال بھی ان کے تجربات کا تو غیب بھی ہے۔ زیدی سے بچے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے کہ شعر کو پڑھ کر ایک نئی تعبیر

کرنے کے بجائے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ... فیض کے حوالے سے ہم آہنگ رہ کے طرب نشاط سے غزل کا گلہ انھیں لوگوں کو زیب دیتا ہے جن میں شوق کی افزائش ہو اور یہ تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی عظیم وسعت پیدا کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی یہ خوبی بھی ہے اور فنی نقص بھی کہ ان کے دل کا فیصلہ کسی مکتب کی شاعری سے متاثر ہونے پایا تھا ... کی خطابت کے جال میں اسیر ہونے پائے اور نہ مغربی ادب و فنون کی زنجیر ... میں۔ روایت کی پاسداری ... شاعری تو موجود ہے ... ہے اور نہ ... محبت سے متوازن ... اٹھائے ... ہے۔ میرے خیال میں مصطفیٰ زیدی کے ہاں یہ ... مفقود ہے۔

چنانچہ فیض نے جو دیانت داری اور حق گوئی کی روایت قائم کی اور اتنی صبر سے اس کلیشے سے بڑی ... کر ... مراعات کی کم تر ہو گئی ہو تو ۔ مصطفیٰ زیدی ایک مثالی یا منفرد بھی تھے ہوئے فیض کے رنگ ... سے باہر نہیں نکل سکے، یہ اور بات ہے کہ چالیس سال کی عمر تک ... مصطفیٰ زیدی نے جدید ... سے انجام ہے تو ... ترقی پسند ... بھی ... کر سکے۔ مصطفیٰ زیدی نے فیض سے ... تعریف نہیں ... کی کہ فیض نے ... ادا کیا جو ... کی ایک چھوٹی مثال بھی ہے۔

☆

فیض اور نوبل پرائز

گلا ہے ہم نے ذرا دیکھ تو دیوانوں سے

لرزشِ گلشن و صحنِ بہار کا موسم

فیض شناسی کے لیے ہم نے یہ بھی ضروری جانا کہ فیض اور نوبل پرائز کی داستان پر تحقیق کو پیش کریں تا کہ صحیح مطالب روشن ہو سکیں اور یہ مسئلہ علامہ اقبال اور نوبل پرائز کی طرح لوگوں میں مختلف فیہ نہ رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں برصغیر کے لوگ ادبی انعام یعنی نوبل پرائز سے واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب رابندرناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز دیا گیا تو برصغیر میں اس خوش خبری نے تہلکہ مچا دیا۔ علامہ اقبال کے پرستاروں میں یہ چرچے نمایاں ہونے لگے کہ ٹیگور کو یہ انعام کیوں ملا اور علامہ اقبال کو کیوں نہیں۔ اقبال کے چاہنے والے عقیدت اور خصوصیت رکھنے والے دراصل علامہ اقبال کو آفاقی شاعر سے اسلامی شاعر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ بے شک اقبال وہ اسلامی مفکر و شاعر تھے جن کے کلام میں تمام بنی نوع انسان کی فلاح تھی اور تمام اہلِ دنیا کے مسائل کے حل اور مشکلات پر غور و فکر کا پیغام ہے۔ انہیں صرف دنیوی ... کی روشنی پھیلانے میں مصروف تھے۔ انہیں کسی دنیاوی ایوارڈ یا انعام کی تمنا نہ تھی۔ علامہ اقبال کے شاہکار "جاوید نامہ" میں تمام بشر اور ادیان کا تذکرہ موجود ہے۔ بیسویں صدی میں کسی ... تک دنیا کے کسی زبان کے شاعر نے اپنے کلام میں ایسی ... نظریاتی وسعت نہیں دی۔ اقبال ذاتی طور پر حق کی آواز تھے اور حق اور ظلم کی ... کے خلاف تھے۔ چنانچہ وہ مسجد کے خطیب کی طرح فکر کا طوطی نہیں بن سکتے تھے لیکن یقیناً اقبال کے کلام نے دنیا میں مشہور ہونے سے دنیا کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ اسی لیے اقبال کو اس انعام کا مستحق نہ جانا گیا۔ فیض احمد فیض کا مسئلہ مختلف تھا۔ وہ مغربی دنیا میں ایک غیر مذہبی شاعر اور ظلم و جور کے خلاف جنگ کی علامت ظاہر ہے جیسے ایک ترقی پسند نظریہ کے پیروکار ہوں اور عوامی سرزمین کا بے باک ترجمان ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب نوبل پرائز کا ذکر ہوتا ہے تو یہ سوال اور مسائل ہی ہیں جو بے جا الزامات دیے گئے۔ جب ہم نے اس مسئلہ پر غور و خوض کر کے مسئلے کی چھان بین کی تو ہمیں معلوم ہوا کہ نوبل پرائز کے قصے کا آغاز فیض کے خط سے ہوا جو 10 ستمبر 1952ء سے ملتا ہے جو انہوں نے جیل سے ایلس کو لکھا۔ "ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ... مکمل ختم کیا ہے جس پر مجھے نوبل انعام ملنے کا امکان ہے۔ اس کا عنوان ہے Maqbool L...ali ... طویل نظم ... کی آخری تکمیل ہے جس کے صرف چند ٹکڑے ہوئے ہیں۔ ... انعام کا معیار کیا ہے؟ کوئی فیصلہ کیا گیا؟ ... تو ہم یہ انعام حاصل کر سکتے ہیں۔"

یہ خط طبقہ میں ... میں شائع ہوا۔ 1971ء میں منظر عام پر آیا۔

یہاں یہ بھی تذکرہ ضروری ہے کہ 1971ء تک فیض کی شخصیت بین الاقوامی سطح پر پہچانی جا چکی تھی۔ ... اس سے بہت قبل یعنی 1944ء میں برطانوی حکومت سے M.B.E کا اعزاز حاصل کر چکے تھے۔ 1948ء میں امن کونسل کے نائب صدر مقرر ہو چکے تھے

اور اس مدت میں امریکا، انگلینڈ، سوویت یونین، جرمنی، فرانس کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک اور ایشیا کے دو تین ملکوں میں اپنی اہمیت منوا چکے تھے، جو کہ سونے پر سہاگا 1966ء میں سوویت یونین نے انھیں لینن امن انعام دیا جو بلاشبہ تیسری دنیا کے اعزاز تھا جو ایک انتہائی مستحق کو دیا گیا تھا۔ ان تمام امور کی بنا پر یہ کہا جا رہا تھا کہ نوبل انعام کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ کہتے ہیں فیض کا نام نوبل انعام کے لیے تجویز بھی ہوا تھا جس کا ذکر ایلس فیض کے انٹرویو سے بھی ملتا ہے۔

ایلس فیض جن دنوں آپ بیمار ہو گئے تھے، یہاں پاکستان میں ایک عام خیال یہ تھا کہ اس سال نوبل پرائز آپ کو دیا جائے گا اور اس پوزیشن سے لوگوں کو اندازہ تھا مگر بعض لوگوں نے کہا کہ روس کی پالیسی سے مغرب والوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے افغانستان کے مسئلے پر اور آپ روس کے طرف دار ہیں، اس لیے آپ کے اس سال یہ انعام ملنے کے امکانات کم ہو گئے ہیں، تو اس پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

فیض: ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اول تو نوبل پرائز ہمیں ملا ہی نہیں ہے..... یہ تو محض کسی آدمی کے حوالے کیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ نام کا اعلان ہونے سے پہلے اس پر باقاعدہ بحث ہوتی ہے۔ جس کو ملتا ہے اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کا نام زیر غور ہے، ضروری تو نہیں ہے کہ ہر کسی کو انعام ملے۔ آخر دیکھیے ڈاکٹر عبدالسلام کو یہ انعام ملا تھا، پانچ سال پہلے فاورگی کی سوالات کر لیے، یہ بات یہ کہ پانچ سال سے بھی اوپر کا عرصہ پہلے، جب کہ پچھلے سال انھیں بلاوا دیا گیا ہے، سوئیڈن میں روسی روس کا قصہ نہیں ہے۔ ہم کوئی روس کے وکیل بھی نہیں ہیں۔ تو یہ تو محض بات تھی۔ جو ان کا اپنا طریقہ ہے، اس طریقے سے اب انھوں نے مارکیز کو انعام دیا۔ مارکیز بہت بڑا مصنف ہے، اس میں کوئی شک نہیں اسے ملنا چاہیے تھا۔ وہ بہت عرصے سے بہت بڑا ادیب ہے۔

فیض کے نوبل پرائز نہ پانے کی حسب ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں۔

الف: فیض سوویت یونین کے دوست تصور کیے جاتے تھے اور اس زمانے میں یورپ میں داخلی طور پر کسی بھی ایشیائی کو جو سوویت دوست ہو، اچھی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔

ب: روس کے افغانستان پر حملے نے روس سے منسلک بالواسطہ اور بلاواسطہ افراد کی امن پسند تحریکوں کو بے رنگ کر دیا تھا۔

ج: فیض فلسطینی تحریک کے حامی اور یاسر عرفات کے خاص دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے (یاسر عرفات کو بعد میں جو اسرائیل کے وزیر اعظم کے ساتھ نوبل انعام دیا گیا، وہ اصل شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا فیصلہ کیا گیا جس میں یاسر عرفات نے اپنا موقف بدل دیا تھا۔ اس تحریر میں مزید اس پر کچھ بحث کی گنجائش نہیں ہے)۔

د: فیض کی پانچ نظموں اور ایک مجموعے کا نام بھی فلسطین سے متعلق ہے:

1: سرِ وادیٔ سینا (عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

2: فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے۔

3: فلسطینی بچے کے لیے لوری۔

4: ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے۔

5: ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے۔

ہ: گذشتہ پانچ چھ دہائیوں سے نوبل انعام کی تقسیم پر یہودی لابی کا شدید اثر واضح ہے۔

و: فیض کے کلام کے تراجم تو ہوئے لیکن ان کی تشہیر نہیں ہوئی۔ ادھر فیض نے اس طرف خود کوئی توجہ نہیں دی اور فیض کے دوستوں نے بھی نوبل انعام کے حصول کو اپنا مقصد بنانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ فیض شناسائی سے زیادہ خود شناسائی اور فیض کشی سے زیادہ خود کشی میں زیادہ مصروف رہے۔

ز: فیض کی شخصی پالیسی اور تعارف کے لیے کوئی مقتدر آگے نہیں بڑھا جو موزوں ترین ذرائع سے ان کا نام نامزد کرتے۔

ح: فیض لینن امن انعام یافتہ ہونے کی وجہ سے مغرب کی نظروں میں معتوب ہو گئے۔ بقول فیض: "نوبل پرائز کو بھی دیکھا تو دور سے دیکھا"

یہی وجہ ہے کہ فیض آج بھی اپنی زندگی کے آخری دور کی طرح معروف اور مشہور ہیں لیکن نوبل انعام کا خواب تو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ہے۔

ی: فیض اردو کے ایک شاعر تھے۔

ک: فیض اسلامی تہذیب سے وابستہ تھے۔

ل: کسی بھی خارجی یا داخلی ادبی حلقے میں "فیض حیرت" کا ذکر کہیں نہیں۔

فیض اپنے ایک انٹرویو میں پیسٹرناک اور سارتر کے نوبل انعام لینے کے انکار کے بارے میں کہتے ہیں: "پیسٹرناک نے اپنے ملک کے ادیبوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے نوبل انعام لینے سے انکار کیا۔ جب نوبل انعام کا اعلان ہوا تو اس وقت اتفاق سے میں بھی وہیں تھا اور کئی روسی ادیبوں سے ملا تھا۔ ان کے ہاں دونوں طرح کے ادیب تھے، بعض ان کی حمایت کر رہے تھے، خود پیسٹرناک نے ... وہ ایک شاعر ہے، بہت اچھے شعری مجموعے چھپ چکے ہیں لیکن ان پر کبھی انعام کی پیشکش نہیں کی گئی۔ اتفاق سے اس نے ایک ناول لکھا جس میں روسی معاشرے کے خلاف کچھ پہلو تھے تو اس پر انعام دے دیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انعام کی پیشکش کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی تھی۔ یہ بات اتنی واضح تھی کہ روس کے ادیبوں نے اس سے اتفاق کیا۔ پیسٹرناک نے ان ادیبوں کی رائے کا احترام کیا اور انعام نہیں لیا۔

سارتر کا معاملہ بالکل مختلف ہے، اس نے صرف ذاتی وجوہ کی بنا پر انعام لینے سے انکار کیا۔ اس کا موقف تھا کہ اس کی ادبی کاوشیں کسی اعزاز کی محتاج نہیں۔ اس میں Artistic Ego (تخلیقی انا) کا شائبہ نظر آتا ہے۔"

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فیض ادب اور فکر کے نوبل پرائز کو ... اگر فیض کو نوبل انعام مل جاتا تو اس سے نوبل انعام کا معیار اور وقار بڑھ جاتا۔ نوبل انعام نہ ملنے سے فیض کے کلام کی مقبولیت یا تاثیر میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ فیض کے کلام کی ... اور کشش جو تھی وہ ایسی ہی ہے اور رہے گی: چاند نکلے کسی جانب ... ہم ہیں

فیض تھی راہ سر بسر منزل

ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

-☆-

فیض بنام افتخار عارف

(مختصر تجزیہ اور مستند دستاویز)

تحقیق میں وہی تحریر مستند ہوتی ہے جو مصدقہ ہو۔ اگر محقق کے سامنے خطوط ہوں تو بجا طور پر وہ ان الجھے مطالب کو بھی پیش کر سکتا ہے۔ بڑی شخصیات کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس لیے بڑی ہوتی ہیں کہ ان سے بڑے بڑے مسائل اور معاملات کا پتا چلتا ہے۔ جہاں تک فیض کی خطوط نگاری کا تعلق ہے آج تک ان کے دستیاب تین سو تیس (330) سے زیادہ خطوط مطبوعہ شکل میں موجود ہیں جن کی فہرست ایک جدول کی شکل میں ہم نے اپنے ایک اور مضمون "فیض کے خطوط سے ہم کیا سیکھتے ہیں" میں شامل کی ہے۔ فیض کی صد سالہ سالگرہ کی صدی پر شائع ہونے والی کتابوں میں ڈاکٹر ناشر حمید کی مرتبہ کتاب "فیض بنام افتخار عارف" ایک مختصر مگر اہم خطوط کا مجموعہ ہے جو فیض فہمی کے نئے گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب میں 38 خطوط کو شامل کیا گیا ہے جو فیض نے 1978ء سے 1984ء کے درمیان افتخار عارف کو لکھے۔ مقدمہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تقریباً ایک درجن خطوط کو اس کتاب میں اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ ان میں مکتوب نگار کے ذاتی مسائل کے حوالے سے کچھ باتیں تھیں جو مکتوب الیہ نے مناسب نہ سمجھا۔ فیض کے تیار کردہ خطوط ان کی بیگم اور بیٹیوں کے نام بھی ہیں جن سے ہم بخوبی واقف ہیں جو فیض ہی کے تحت ان پر الگ طور پر علیحدہ موجود ہے۔ سرفراز اقبال کے نام بھی فیض کے خطوط ہیں ان کی اہمیت ایک علیحدہ نوعیت حال سے متعلق ہے جس پر ہم نے پہلا کام ایک مضمون لکھا ہے۔ "فیض بنام افتخار عارف" فیض کی آخری عمر کی مراسلت ہے اس میں کئی ایسی باتیں ہیں جو فیض کے چاہنے والوں اور فیض کی شخصیت اور فن پر کام کرنے والوں کے لیے کارآمد اور دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ مراسلت دو ادیبوں، دو شاعروں، دو دوستوں اور دو ہم خیالوں کے درمیان ہوئی ہے۔ فیض کے خطوط کے متن سے افتخار عارف کے خطوط کی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط فیض شناسی میں کئی نئے دریچے کھول سکتے ہیں۔ ہم اپنے مضمون میں ان تمام مطالب کو یکجا نہیں کر سکتے جن کو تصدیق کیا ہے بلکہ صرف وہی نکات بیان کریں گے جو مراسلت کے مصداق ہوں۔

ایک ہی شخص کا مراسلہ ہر طرح کی اور ہر قسم کی شخصیت کے لیے ایک جیسا نہیں ہوتا، ہر خط میں الگ الفاظ اور عبارات ہوتے ہیں۔ یہ داخلی ارتباطات مکتوب الیہ کی شخصیت کے ساتھ بدلتی جاتی ہے۔ فیض ہر خط میں کچھ نہ کچھ مخاطب کی ذہنی دلچسپی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ سہولت کی خاطر ہم نے مختلف مباحث اور اہم نکات کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور کچھ اہم حصوں کو ان عنوانوں میں درج کیا ہے۔

1۔ ادب اور شاعری:

خطوط نگاری دو شاعروں اور ادیبوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے خطوط کی زبان ادبی یا شاعرانہ تو نہیں لیکن ادبی ضرور ہے جس

میں بھی روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال اور اساتذہ کے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند نکات جو خطوط میں موجود ہیں۔

الف۔ خط نمبر (6):

ظاہر ہے کہ یہ ہنگامے ایک طرح سے اس تحریکی طوفان کا پیش خیمہ تھے جس نے باقی ملک کے ساتھ ہمارے ان سب عزیزوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ عبداللہ ملک، انجمن، ظہیر کاشمیری، قاسمی، مرحوم، عارف، حمید اختر، علی اور شوکت ہاشمی۔ بعض نادان نے تیرے صحیفے بچوا دیا تھا سے بچی تیب کر کے امانت وطن اور کالے وغیرہ بند فرمائے۔

ب۔ خط نمبر (1)

خیر بات تھی کہ جو صاحب کے پاؤں بیڑی عشق کے بغیر قیدی زنجیری ہو گئے تھے۔

ج۔ خط نمبر (8)

یہ تسلیم ترین شاعری والی بات جیسا وہ ہماری عظمت سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اب آپ اس کا جواب یہ سبب ہے کہ عربی مثل کے مطابق چڑیاں کی موت سے بنوانا کر دیتے ہے۔

د۔ 16 مئی خط نمبر (16)

اپنے صورت سے شدید تحریر سے پہلے ابھر آتا تو مجھے بار بار "میرا یار ہو سکے گا تو تحفے چاہو جس وقت ہے۔ الحمد للہ کی طلب نخرے بڑی اصولت۔

ہ۔ خط نمبر (28)

لیکن 19 تاریخ کی بات سے تم تک علی اور سے بیہ پار کر کے بعد پیٹ کا شعور لے کر جیو"۔

و۔ خط نمبر (28)

mus... تک سے روشن کے لیے بھی تو میں بات نہیں آتی ہے۔ اس کے بعد ابھی کو اور تو اعوہ ہی ہو گا مالیہ تیں پر کچھ ہاں وہاں ہمارا آیا میں کے بیچ مہر سے پیچھے ہے بیٹھا ہے آئے والی کیفیت ہوگی۔

ز۔ خط نمبر (29)

جو ملک کیا اقبال اللہ آنا تعمیر میں نے فلق کر دیتے ہے۔ لاؤ تو اس کا میرا رہ جیب تک مجھے یاد ہے۔ بچوں دماغ سے بھی لکھا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اصل شوہ والی کسی لائبریری میں دماغ کا کوئی تجربہ بھی کیا تو لکھا ہو۔

ح۔ خط نمبر (30)

اگر آپ نے کسی ہر بات پر اپنی دوران بیان کرنے لگیں تو آپ کی بھی دلیل ہے جان کا کیا گر سے گا۔ تو تم اچانک اچھا کر کے اپنی باہ اس خرافات پر شب جاتا۔ خوب تر پیالہ آم بن ہے اور کہ مشکل ہے اور ہر کوئی بے سوچ کے طرح دیوار کا سامنے کہیں کر سکتا۔

ط۔ خط نمبر (31)

تو اس کے چند ایک بات سے کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

ہم سب ملک تو قدرت سے تھی۔ جو سب نکلی ہے کہ جو اچھا کہ جس کو بھی بھلا ہو گا کہ اس کا کبھی ہاتھ۔ طبل بغلی بجا کے اپنے تو تلیس والا۔

ی۔ خط نمبر (34)

ایلس نے بتایا تھا کہ تمہارے کلام بالاتفاق تم نے ... دیکھو اس طرح سے چھپا ہے "نقش فریادی" کے دیباچے کے ساتھ" ... [illegible] ... میرے بچے نے تمہاری کتابیں ... ہماری خوشی دیکھ لی ہے تو دیکھ لیں۔

ک۔ خط نمبر (20)

اللہ کا شکر ہے کہ ہم پاکستان میں ... تھے ... دست صبا کے ... بالا۔ حاضر ہے تا۔

ل۔ خط نمبر (38)

اب ہم جیل پہنچ گئے ہیں۔ ہم سب لوگ اسی مصروفیت ... [illegible] ... کے باعث میں گئے تو ...

ادبی صورت کا باعث ہے۔

فیض ان شعرا میں شامل رہے جو ... [illegible] ... سے رابطہ رکھتے تھے ... کے لیے ... فیض نے جیل سے ... اپنے اشعار کی ... مجموعوں کی اشاعت کی ... کے (38) ویں خط میں ... ہیں جن میں فیض نے نظمیں، غزلیں اور ... قطعوں کے اشعار ... کر کے ... پاکستان میں ... مجموعہ ... "دست صبا" ... ان خطوں میں پوری نظمیں اور غزلیں ... قطعوں کے ... (30) اشعار ... حاصل ہوتے ہیں۔ ... [illegible] ... "فیض" ... [illegible] ... اور اصلاح ... [illegible] ... ہم نے بھی کی۔

فیض کے ... [illegible] ... شعری ... [illegible] ... خطوط ... [illegible] ... معلوم ہوتا ہے ... [illegible] ...

الف۔ خط نمبر (4)

جیل آنے سے کچھ لکھنے کے لیے ... [illegible] ... ذہن نے ساتھ دیا۔ ... [illegible] ... اکیلا ... ہو گیا ہے۔

ب۔ خط نمبر (13)

... نئی غزل ... حاضر ہے۔ ... [illegible] ... چاہئے۔

ج۔ خط نمبر (21)

آج کل ... حاضر ہے ... [illegible] ... ہیں۔

2۔ ذہنی اور ادبی سیاسی اقتباسات

فیض نے ان خطوں میں اہم ... [illegible] ... ہیں جو ادبی سیاسی ذہنی اقتباسات ہیں۔ مثلاً

الف۔ 8 مارچ 1952ء خط نمبر (71)

... [illegible] ...

ہے اس لیے کہ یہ پوچھنا کہ ادب پڑھنے کے لیے اب کس قسم کی جمالیات کی Dimension کا اضافہ لازمی ہے ورنہ وہ محض صحافت یا کالم نگاری کا disappearment ہو کر رہ جائے گا۔

سوال نمبر (11)

یہاں پر محبت یاراں کا بدل صرف [illegible] ہیں انھیں یہاں آ کر یہ کھلا کہ محبت یاراں کے بغیر تماشوں سے لطف [illegible] سے حاصل نہیں ہوتا البتہ شعر اس سے مستثنیٰ ہے۔ مثلاً

تدبیر [illegible] تیار [illegible]

[illegible] آئینہ [illegible]

(حالی)

[illegible] قدردان آئے

[illegible] واہ [illegible] (طالب آملی)

سوال نمبر (17)

آپ نے عسکری مرحوم کی کتاب کے بارے میں رائے طلب کی ہے جو [illegible] ہم جیسے کم علم لوگوں کو حرف زنی کا حق نہیں پہنچتا، اس لیے [illegible] بہرحال [illegible] ہے کہ اگر آپ کسی بھی مسئلے کے بارے میں پہلے ہی سے ایک منتخب کردہ نظریے کو بغیر کسی وضاحت، ثبوت یا استدلال کے مستند قرار دے دیں اور اس کے بعد اس نظریے سے اختلاف، انحراف کو گمراہی تصور کریں تو آپ سے بحث لاحاصل ہے کیونکہ دوسرا فریق بھی اسی طرح کسی مخالف نظریے کو [illegible] قرار دے کر آپ کی ہر بات کا رد کر سکتا ہے۔ [illegible] اگر آپ نے منطقی یا عقلی استدلال کو جزوی عمل قرار دے کر پہلے ہی سے غیر معتبر ٹھہرا دیا تو بات آگے کیسے چلے [illegible] (جس کی کوئی تعریف بھی آپ نے نہیں فرمائی) کو صداقت فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس کی رو سے مغرب کی گمراہیوں [illegible] کر رہے ہیں تو اسی طرح کوئی مادیت نظریے کا قائل [illegible] مشرقی [illegible] کی نفی کر سکتا ہے۔ ایمان بالغیب [illegible] کے ضمن میں آتا ہے جس کے بارے میں بحث ہی کیا؟ یہ تو ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ نے ایک بنیادی مفروضے کو بلادلیل قبول کیا تو آپ اس کی بنا پر اس کی مفروضات کو حقائق قرار دینے پر مجبور ہوں گے۔ جدیدیت [illegible] ایسے ہی مفروضات سے [illegible] ہے۔ مثلاً ''یورپ کا ذہن پچھلے چھ سو سال سے [illegible] ہو رہا ہے اور [illegible] کے خلاف [illegible] پانچ سو سال سے ہم مسلمانوں نے ذہن کے دروازے بند کر رکھے ہیں اور [illegible] سے [illegible] ہو چکے ہیں اس لیے ہم میں صداقت کو سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔''

سوال نمبر (19)

قیام پاکستان سے پہلے قائد اعظم سے جب ایک بار یہ پوچھا گیا تھا کہ پاکستان کی Ideology کیا ہوگی تو آپ نے جواب میں کہا تھا کہ پاکستانی آئیڈیالوجی یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی اپنی حکومت ہونی چاہیے [illegible] یہ ہے پاکستان کا نظریہ [illegible] علامہ اقبال [illegible] اسلامی [illegible] اسلام [illegible]

جا سکتا ہے۔

3۔ خطوں میں صحت اور بیماریوں کا ذکر

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے دکھ، بیماری اور مصیبت کے وقت کسی ہمدرد سے بیان کرتا ہے جو اس کے دکھ درد میں شریک ہونے والے ہوتے ہیں۔ بیماری اور مصائب پر دوستوں سے کوئی بھی شخص اپنی کیفیت اور خراب صحت کا ذکر کرتا ہے۔ فیض نے اپنے خطوں میں اپنے خاندان کے علاوہ بھی دوست احباب کے خطوں میں بلڈ پریشر اور دل کی بیماریوں کی روداد بھی تفصیلات کی رو سے کی ہے اور مختلف علاجوں کے بارے میں بھی بتایا ہے جن سے استفادہ کرتے ہوئے راقم نے "فیض کی صحت" ایک علیحدہ مضمون "فیض کی صحت اور بیماریاں خطوط کی روشنی میں" تحریر کیا۔ اگر ان کا مطالعہ کے خطوط دیکھے جائیں تو مختلف بیماریوں کی تشخیص اور علاج کا ثبوت دیکھے جا سکتے ہیں۔ فیض کے خطوں کے اقتباسات سے بات واضح ہوگی اگرچہ فیض کی صحت اور بیماریوں کو سمجھنے کے لیے راقم کے علیحدہ مضمون کا مطالعہ مفید ہوگا۔

☜ 28 اکتوبر 1980ء کو بیروت سے ایلس اور بچوں کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"ہم کوئی دو ہفتے دل کی تکلیف کے بعد ابھی ابھی ہسپتال سے نکلے ہیں۔ ہم کو کوئی خاص شکایت نہیں تھی لیکن ویسے ہی کچھ دنوں سے سب Servicing کروانے کا خیال تھا۔ تین ہفتے پہلے سے پرہیز کے بعد کوئی دس پندرہ دن رہا اور یوں بھی طبیعت کافی بحال ہو گئی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بیماری علاج تو کر دیتے ہیں ہو سکتا ہے ابھی ڈاکٹر اور ہسپتال کی کیا ضرورت ہے۔"

☜ 18 مارچ 1984ء کو لاہور سے افتخار عارف کو لکھا:

"پچھلے چند برسوں سے بیماری کی حالت کے ساتھ ہم بستر کا تجربہ ہوا ہے جس کے ہم بالکل عادی نہیں ہیں۔ تفصیل صوفی کی زبانی آپ کو معلوم ہوگی۔ Chronic Bronchitis تو پرانی تھی لیکن اس کو ہم نے کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اب پچھلے دنوں سانس کی تکلیف شروع ہوئی جس سے کبھی کبھی رات کو بے خوابی کا سامنا ہوتا رہا اور ایک رات تقریباً تین بجے کے قریب شدید تنفس کا دورہ پڑا اور بے ہوش ہو گئے۔ ایمرجنسی وارڈ میں رات گزاری اور اگلے دن میو ہسپتال کے ڈاکٹروں کی پوری پلٹن حاضر ہو گئی۔ سب نے اپنی قدر شناسی اور حق سے عبادت کی کہ یہ دن سب وقت دوا ہوتی رہی۔ دس دن ہسپتال میں گزرے اور اب یوں لگتا ہے کہ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ سگریٹ اور شراب سے پرہیز کی ہدایت ہے اور دوستوں کی صحبت سے بھی پرہیز کا اصرار ہے لیکن ہم ان قیود کی پابندی کر رہے ہیں۔ بعد میں انہیں دیکھیں گے کہ کہاں تک چل سکتے ہیں۔ سو اسے فرصت کا وقت سمجھ کر پڑھنا لکھنا اور کچھ وقت گزاری ہے۔"

4۔ کلامِ فیض کی تصحیح، تدوین اور تشریح

فیض کے بعض خطوں میں بعض چند اپنے اشعار ہیں جن میں کبھی فیض کے خط میں پوچھا ہے کہ کلام کی تصحیح کی جائے اور ان سے کہا گیا کہ اس طرح سے دیکھا جائے۔ کبھی خط میں بھیج کر ان کی تصحیح کروائی گئی۔ انگریزی اخبار میں کئی مثال گزارنے کے بعد اردو زبان میں باقی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کا کام بقیہ نظر سے دیکھیے کہ زبان کا مسئلہ ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور بار کئی جملے

جس میں اس قسم کے شواہد موجود ہیں۔ علامہ اقبال کے خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدائی کلام میں داغ دہلوی سے مشاورت کرتے تھے اور بابائے اردو کو بھی مرزا دہلوی کو اصلاح دیتے تھے۔ وہ سید سلیمان ندوی سے اپنے اردو کلام کے بارے میں مشورہ کرتے اور اصلاح لیتے تھے۔ بہرحال لکھنؤ کی زبان دہلی کی زبان کی طرح ٹکسالی زبان قرار دی گئی ہے۔ فیض کو لکھنؤ کی زبان اور وہاں کی اردو تہذیب سے کم شغف تھا جس کا ثبوت انھوں نے ذکر کیا جب لکھنؤ کے ادیبوں نے ان کا بعد مرحوم احتشام حسین منظر یار ہم یہاں پہنچیں کہہ سکتے ہیں کہ فیض نے افتخار عارف سے اصلاح لی۔ عمل کرتے رہے ہیں کہ فیض صاحب کو افتخار عارف کی طبیعت اور زبان دانی پر اعتماد تھا اور 27 مارچ کے خط نمبر (8) میں یہ لکھتے۔

الف

ہم نے لکھا تھا کہ اس کو بھی نہیں پڑھتے تاکہ کتابت کی غلطی ہی نہ رہ جائے۔ اس لیے تم خود ہی احتیاط سے پڑھ لینا اور کوئی لفظ غلط ہو تو ٹھیک کر لینا۔

ب۔ خط نمبر (19)

ہم آخر میں کچھ لکھا تھا جو پہلے آئے تو روزنامہ میں بھیج دیے ہیں۔ مرزا ظفر الحسن نے جو اس کا تقاضا ہے کہ تم نسخہ کے لیے ان حرکات کو بھی ملحوظ رکھنا ہے۔

ج۔ خط نمبر (5)

یہاں پہنچ کر دو تین غزلیں ہمارے کلام کے بارے میں احتیاط کی اور آپ کی مدد لی ہی تھی۔ سب سے زیادہ اعتماد ان پر ہی کیا گیا کہ آیا تی قصیدہ صحیح ہے یا نہیں اس لئے نقاش کا تمام حصہ سے دوبارہ لکھا ہے۔

د۔ خط نمبر (26)

فیض اپنے مجموعہ "سارے سخن ہمارے" کے بارے میں جو لندن میں ترتیب ہو رہا تھا، لکھتے ہیں۔

"کتاب کے مسودے پر نظر ثانی کے لیے تمہاری تجویز بالکل معقول ہے۔ ہم پروف ریڈنگ کے بارے میں نہیں کہ صرف اس لیے آپ نظر دیکھنا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے کہیں ایک آدھ لفظ یا ترتیب بدلنے کو جی چاہے۔ شاید کوا سکو سے خط لکھا تھا اس کی ابھی رسید نہیں آئی۔ یہ دریافت کرنا مقصود تھا کہ کام کس مرحلے پر ہے۔ ماسکو میں ایشیائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہ تین ہی سے اشعار کو نقل ہونے جانے میں لگی ہوئی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ لندن میں دوستوں سے ملاقات ہوگی۔ فیض شفائی کا خط اور ان کی نظم تمہارے خط کے ساتھ ملی جس کا جواب لکھ رہا ہوں۔"

ھ۔ خط نمبر (9)

نام کا ابھی تک کچھ طے نہیں پایا۔ کام ان والے مجموعہ کا نام فیض نے "نسخہ ہائے وفا" طے کیا تھا۔ فیض نے جناب کا لکھا ہے کہ عنوان وسط اپنے پن کے لیے کوئی بھی ٹھیک ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں اسے مقرر ہونا چاہیے۔ کچھ نام جو تجویز ہوئے ہیں یہ ہیں۔ "نسخہ ہائے فیض"، "سخن فیض احمد فیض"، "منظومات فیض احمد فیض"، "مکمل کلام فیض"۔ آپ اور فیض صاحب غور کر کے بتائیے۔

5۔ خطوں میں قرآنی اشارے

افتخار عارف کے نام خطوں میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ان میں کئی مقامات پر قرآنی آیات کے اشارے موجود ہیں جن

سے فیض صاحب کی قرآنی علوم سے دلچسپی اور عربی پر مہارت ثابت ہوتی ہے۔

الف۔ خط نمبر (8)

گھر کی خبریں واقعی باعث پریشان کن ہیں لیکن شاید پہلے بھی لکھا تھا جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا اور "لا تقنطو" تو تسلی کے لیے ہے۔

ب۔ خط نمبر (17)

ایمان یا عقیدہ تو "لکم دینکم ولی دین" کے ضمن میں آتا ہے۔

قرآن حکیم میں اگر ایک جانب یہ فرمایا گیا ہے کہ حیٰوۃ الدنیا الا لہو و لعب" تو دوسری جانب یہ بھی ہے کہ "ما خلقتا هذا لدنیا باطلا" اگر یہ باطل نہ ہوگی تو حقیقی ہوگی۔

ج۔ خط نمبر (35)

اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم پاکستان میں نہیں تھے ورنہ شاید جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ ہوتا۔

6۔ دلچسپ تعزیت نامہ

ڈاکٹر ایوب مرزا خوش بخت تھے جن کے انتقال کی غلط خبر سن کر فیض نے تعزیت نامہ لکھا جس کی آپ اپنی خاص اہمیت ہے دراصل یہ تعزیت نامہ مرزا ظفر الحسن کے لیے ہونا تھا جن کا انتقال کراچی میں ہو گیا تھا۔

HOTEL

INTER-CONTINENTAL

PARIS

پیرس

۲۰ ستمبر

آج افتخار عارف نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا چلے گئے۔

اے وائے وطن جہاں جرأت اور مروت، دیانت اور فطانت، اخلاص و وفا، صدق و صفا کی اقدار کا سراغ، ڈھونڈے سے بھی کسی کی ذات میں یکجا ملتا ہے، اس صف سے کسی کا اچانک بے وقت اٹھ جانا کیا المناک سانحہ ہے۔ ایسی ہی اوصاف سے متصف ہمارے صدیق عزیز ڈاکٹر ایوب مرزا کی شخصیت تھی۔ طالب علم تھے تو طلبہ کی سرگرم قیادت کی، فارغ ہوئے تو طبابت میں نام پیدا کیا، قلم سنبھالا تو انشا پردازی کے جوہر دکھائے۔ انبوہ خلق کی خدمت گزاری اور ان گنت دوستوں کی دلداری کی۔ ان کے چلے جانے سے کتنی محفلیں ویران اور کتنے گھر سوگوار ہوئے ہوں گے، اے وائے!

اک گل کے مرجھانے سے کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ مرجھا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے

فیض

☆

قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں؟

فیض نے اس مصرعے میں صنعتِ ایہام کو استعمال کر کے یہ سوال کیا ہے کہ یہ راولپنڈی سازش تھی یا غیروں کی سازش جو ملک کے خلاف بُنی جا رہی تھی۔ [illegible] سازش کا کیس ہے جس کا کچھ حصہ اس کو یہاں بیان کرنا دلچسپ ہو گا۔

فیض نے اسے جاری [illegible] سازش کو اس قصے کو اپنی شاعری میں کم اور اپنی نظم میں زیادہ بیان کیا۔ فیض کے [illegible] کے حالات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی لیکن راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں [illegible] صاحب نے لکھا شاید اس پر بھی بحث کی کہ ہر طرح وقت کے ہاتھوں [illegible] حضرت کو [illegible] واسطہ پڑا [illegible] شامل ہو جاتا [illegible]۔ اس تحریر میں ہم پہلے فیض کی گفتگو اور ان کے بیانات درج کریں گے پھر ان کی [illegible] کا [illegible] کی طرح صاحبانِ [illegible] کے علاوہ عوام کے لیے روشن ہو جائے۔ ملاحظہ ہو [illegible] اور غلام حسین کے [illegible] سے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

[illegible] راولپنڈی سازش کیس کا تجربہ ایسا [illegible] بات ہو گی جس [illegible] کا تعلق [illegible] آپ کی [illegible] یہ بات [illegible] کہ آپ کی شخصیت اور شاعری کی بنا پر ہے ان کے پیشِ نظر یہ سوال کر [illegible] حیرت ہوتی ہے کہ آپ کا کسی سازش، بغاوت یا حکومت کا تختہ الٹنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اب جب کہ اس کو کئی برس بیت چکے ہیں آپ اس بارے میں کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں گے؟

فیض: اصل قصہ یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس جو ہے وہ ایک بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا ہے۔ چونکہ ہم فوج میں رہ چکے تھے اس لیے بہت سے فوجی افسر ہمارے دوست تھے۔ ان سے ہمارے ذاتی مراسم تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہمارے سیاسی نظریات ہم آہنگ تھے۔ قصہ صرف اتنا تھا کہ ہم لوگوں نے ایک دن بیٹھ کر بات کی کہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طریقے سے یہاں کے حالات بہتر بنائے جائیں۔ چونکہ ملک کو بنے ہوئے چار پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا [illegible] آئین بنا تھا نہ سیاست کو [illegible] طریقے سے [illegible] ملک کی [illegible] بری اور ہوائی افواج کے سربراہ [illegible] تھے۔ کشمیر کا قصہ بھی تھا۔ غرضیکہ اس طرح کے مسائل تھے جن پر گفتگو ہوتی تھی۔ چونکہ ان دوستوں سے ہمارے ذاتی مراسم تھے اس لیے ہم بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے خود ہی [illegible] منصوبہ بندی کی [illegible] ہم سے کہا [illegible] ہماری بات نہیں! ہم نے ان کی بات سنی لیکن بعد ازاں انھوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ [illegible] ہے۔ انگریزوں نے سازش کا ایک قانون بنا رکھا تھا کہ اگر تین آدمی ایک جگہ جمع ہوں اور آپس میں کسی بات پر زبانی [illegible] اور تیسرا آدمی گواہی دے دے کہ یہ دونوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے تو سازش ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ضرورت نہیں کہ کسی قسم کی عملی کارروائی کی جائے۔ ہمارے معاملے میں اسی قانون کا سہارا لیا گیا [illegible]

ہیں ان کو منسوخ کیا جا سکے۔ یہ قانون ابھی پوری طرح پاکستان اسمبلی کے ذریعے منظور نہیں ہوا تھا لہٰذا اسے قانون ساز اسمبلی نے ترمیم کر کے تحفظ دیا اور قانون ساز اسمبلی کا فیصلہ کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم نے بتایا ہماری منشا میں یہ تبدیلی ہو چکی تھی کہ ہمیں حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے۔ دوسری طرف کسی نے اوپر جا کر مخبری کر دی کہ ہم لوگوں نے حکومت الٹنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن پھر فیصلہ کیا کہ منصوبے پر عملدرآمد نہ کیا جائے۔ لیکن ہم پر مقدمہ اس منصوبے کی بنیاد پر بنایا گیا۔ دوسری طرف استغاثہ کے جو انچارج تھے انھوں نے ہمیں بتایا کہ آپ لوگوں کی ساری باتیں ٹھیک تھیں مگر یہ کہ آپ لوگ بیٹھے تھے آپ نے گفتگو بھی کی آپ نے طے کیا تھا کہ حکومت کا تختہ نہیں الٹنا ہے۔ ہم نے جواب میں عرض کیا کہ یہ بات ذکر کیا تھا کہ آپ نے حکومت الٹنے کا تہیہ کیا تھا۔ خیر یہ کہ ان لوگوں نے یہ سارا پلان بنایا تھا۔

مجاہد مسعود: میجر جنرل اکبر خان سے؟

فیض: جی ہاں، انھوں نے ساری بات کا فیصلہ ہو جانے کے بعد یہ کہا ہے کہ جو کاغذات اس سلسلے میں جمع کیے گئے تھے وہ کہیں نہیں گئے تھے وہ ان کے پاس موجود تھے اور جب کسی نے مخبری کی تو سارے کاغذات نکل آئے۔ اور پھر بات کا بتنگڑ بنایا گیا۔ بس یہ ہے عالم یہی تھی کہ حکومت اور سب دوست تنگ ہی آ گئے تھے۔ دوسرے حکومت کا یہ خیال بھی تھا کہ شاید یہ لوگ پوری طرح سے قوت کے حامل نہیں ہیں اور ان سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح انھیں ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہم تو بیچ میں یونہی آ گئے۔

مجاہد مسعود: اس واقعے سے تو آپ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے؟

فیض: ہم چار برس تک جیل میں رہے۔ بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ لکھنے پڑھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا مجموعہ کلام تو کیوں کہ ہم نے کچھ زیادہ نہیں کیا ہم بیچارے تھے۔

مجاہد مسعود: ایسی صورت میں بے گناہ اور بے قصور ہوتے ہوئے یا قید ہوتے ہوئے کیا شدید غم و غصہ اور تلخی محسوس نہیں ہوتی؟

فیض: غصہ تو آتا ہے لیکن اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو جاتا ہے۔

مجاہد مسعود: کوئی ایسا موقع بھی آیا جب معافی مانگ کر رہائی پا لینے کی پیشکش ہوئی ہو؟

فیض: راولپنڈی کیس میں معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے ایسا کوئی موقع نہیں آیا۔ ہاں ایوب خان کے دور میں جب ہم ایک بار گرفتار ہوئے تھے تو اس میں پیشکش ہوئی کہ معافی مانگ لو اور رہا ہو جاؤ۔ لیکن ظاہر ہے معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اطہر: عوام کی تائید کے بغیر فوج کی مدد سے انقلاب برپا کرنا کیا مارکسزم اور لینن ازم کی تعلیمات سے انحراف نہیں ہے؟

فیض: آپ جس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اس سلسلے میں کچھ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ اول تو میرا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ دوسرے فوجی افسروں نے دیکھا کہ ملکی حالات ابتر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ حکومت کو مجبور کیا جائے کہ وہ آزاد جمہوری اور اصلاحی پالیسی اختیار کرے۔ لیکن کہانی یہ بنائی گئی کہ تختہ الٹنے کی سازش ہو رہی ہے۔ چونکہ فوجی افسران کا معاملہ تھا اس لیے حکومت نے ایک قدم اٹھایا اور سب کو اندر کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔

اطہر: راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں میجر جنرل اکبر خان نے جو لکھا ہے اس سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

فیض: جنرل اکبر خان کی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے۔

طاہر مسعود: آپ کے ناقدین کے حلقوں میں آپ کی شخصیت ہی کی وجہ سے آپ کی شاعری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو آپ کو بڑی سازش کیس کے حوالے سے شہرت ملی اور اب بھی آپ کے ہم عصر نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر آپ کو اور آپ کے نام کو بطور علامت (Symbol) کے استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: بات یہ ہے کہ راولپنڈی سازش کیس، جیل خانہ، سیاست یا اس طرح کے جو واقعات پیش آئے ہمارے ساتھ پیش آئے اور ظاہر ہے یہ سب چیزیں نہ آتا تو ان کا اثر ہماری ... مشکل ہے کہ آگے کیا کرتے ہوتا اور کیا نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ فن کا تو فن کی بات دوسری ہے، اس لیے کہ انہیں ہماری ذات سے مخالفت یا مناسبت تو نہیں ہے۔ ان کی قوت تو ہمارے سیاسی نظریات سے ہے۔ اگر ہم جیل خانے نہ بھی گئے ہوتے اور کچھ بھی کیا ہوتا تو بھی انہیں ہماری قوت کو کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا۔ اس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم جیل نہیں جاتے تو ہمارے پاس اخبارات رہتے۔ اگر مارشل لا قائم نہ ہوتا تو اخبار ہم سے چھینے نہ جاتے اور ہم صحافت کیا کرتے اور نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں بھی نام پیدا کرنے کی گنجائش موجود تھی، امکانات روشن تھے۔ ممکن ہے شاعری میں پیچھے رہ جاتے اور صحافت کے راستے قوموں کی خدمت کر لیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہم صحافت میں نہ ہوتے اور مدرسی کیا کرتے رہتے جیسا کہ ہم نے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ ممکن ہے اس پیشے سے وابستگی کے نتیجے میں ہماری استعداد میں اضافہ ہو جاتا اور ہم کم از کم اچھے استاد ہو جاتے۔

نوجوانوں کے سامنے میں ادھر ادھر کے پیشے سے ہو کر آئے اور سب کا تجربہ ہوتا رہا۔ ہم نے اپنی مرضی سے کوئی بھی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ حالات بدلتے گئے اور ہمیں ان حالات کے ساتھ چلنا پڑا۔ اب یہی دیکھیے کہ اخبارات ضبط ہوئے لیکن ہم نے انہیں اپنے شوق سے تو ضبط نہیں کروایا۔ اگر یہ سب کچھ اس طرح سے نہ ہوا ہوتا تو ممکن ہے ہمیں شاعری کرنے کا زیادہ وقت مل جاتا اور ہم اسی پر زیادہ توجہ اور وقت دے سکتے یا مدرسی کر لیتے یا کچھ اور۔ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ ہمارا نام اس لیے ہو گیا کہ ہم جیل خانے چلے گئے تھے تو سوال یہ ہے کہ جو لوگ جیل نہیں گئے انہیں شہرت کیوں مل گئی۔ مثلاً فراق صاحب تو جیل نہیں گئے تھے، اس سے ان کی شاعری میں فرق تو نہیں آیا۔

فیض کی گرفتاری اور لیڈروں نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ فیض اب ایک بڑے محبوب و محترم شخصیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں، خواتین اور طلبائے علم کے پسندیدہ شاعر بھی بن گئے کہ ایک پیدا ہو جانے جانے لگے۔ جیل کی دیواروں کے باہر ان کی نظموں اور غزلوں کا انتظار کیا جاتا ... فیض اب معتبر اہل ... کے طور پر شمار کیے جانے لگے۔ چند ہی سال قبل ... جس کو جماعت اسلامی کے ... رسالے میں ... "... " ... کے نام ... بھی۔ اس وقت فیض کا شمار سردار جعفری، ... کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ ... فیض کو جوش، فراق اور ... کے مقابلے میں بڑا شاعر مانا نہیں جاتا تھا ... علاوہ ... نے اپنے مضمون "فیض کی مقبولیت اور جیل" میں کیا ہے ... فیض کی شاعری کی مقبولیت میں ... اب اس شاعری کا ذکر ... کے تمام ... جو ... اپنی ... ان نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے لیے ... افراد ... رہتے ... کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے اخبارات اور رسائل شائع کرتے۔ فیض کے کلام کے ... ترجمے کر کے شائع بھی کیے جاتے تھے۔

... فیض ... قید ہوئے ... سازش کیس ... تحریک ... اور ... ایوب خان

سے سیفٹی ایکٹ (Safety Act) کی زد میں آئے۔ اور دسمبر 1958ء سے اپریل 1959ء تک جیل میں رہے۔ اور قید تنہائی میں محصور رہے۔ فیض 9 مارچ 1951ء میں راولپنڈی سازش کیس میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید رہے اور اپریل 1955ء کو جیل سے رہائی ہوئی۔ لیکن دوسری مرتبہ 1958ء میں گرفتار ہوئے۔ فیض نے قید کا عرصہ سرگودھا، منٹگمری، حیدرآباد، کراچی اور لاہور کی جیلوں میں کاٹا۔

راولپنڈی سازش کیس میں کل پندرہ افراد شامل تھے جن میں گیارہ فوجی افسران تین سویلین اور ایک خاتون نسیم اکبر خان بھی تھیں۔ ان سازشیوں کے مقدمے کی سماعت کے لیے حیدرآباد جیل میں خصوصی عدالت قائم کی گئی۔ ایک الگ بارک میں ان قیدیوں کو رکھا گیا اور میجر جنرل اکبر خان ایک علیحدہ وارڈ میں تھے۔ یہاں ادبی محفلیں ہوتی تھیں اور شعر و سخن کی محفل جمتی تھی۔ باقاعدہ مشاعرے منعقد ہوتے تھے جن میں سب قیدی شریک ہوتے تھے۔ یہ مشاعرے کئی بار جیل میں منعقد ہوئے جن میں اکثر شاعر طرحی غزلیں ادا کرتے تھے۔ ان چودہ قیدیوں کے نظمیں اور غزلیں ان کی نظموں سے نکالا جاتا تھا مگر فیض اپنی نظموں میں اپنی تخلیق لکھتے تھے۔ ظفراللہ پوشنی کے مطابق جب بریگیڈیئر عبداللطیف خان اور بریگیڈیئر محمد صدیق خان کے علاوہ سب نے کم از کم ایک بار مشاعرے میں اپنا کلام سنایا۔ پہلے مشاعرے میں فیض نے شرکت کی۔ فیض کی دو مشہور غزلیں جیل کی مشاعروں کی طرحی زمین کے مطلعے ہیں۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

جسم کی رگوں میں بستی تھیں ... انجمن سے پہلے
سر دار خطائے نظر سے پہلے محتسب ... سے پہلے

بقول ظفراللہ پوشنی فیض کا یہ ترانہ قیدیوں کے سامنے حیدرآباد جیل میں جو ... سنایا گیا ... گایا جاتا ہے۔ یہ اس کا آغاز تھا:

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

سازش کیس میں جو افراد گرفتار کیے گئے تھے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

1) میجر جنرل اکبر خان (چیف آف جنرل سٹاف)
2) میجر جنرل نذیر احمد سابق
3) ائیر کموڈور محمد خان جنجوعہ
4) بریگیڈیئر محمد صادق خان (... بعد میں ... کی طرح ... صاحب کی ... وقت ... کے ... گئے)
5) بریگیڈیئر عبداللطیف خان ...
6) لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب ...
7) لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین ...
8) میجر اسحاق محمد (...)
9) میجر حسن خان ...
10) کیپٹن ظفراللہ پوشنی
11) کیپٹن خضر حیات ...
12) فیض احمد فیض شاعر
13) محمد حسین عطا ...

14۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

....

[illegible]

[illegible]

....

[illegible]

[illegible]

....

[illegible]

[illegible]

ہم جانتے ہیں کہ تمام مقدمہ سازش کے ملزمان عدالت جاتے ہوئے اور تمام مقدمہ کے بعد اپنے وارڈ میں واپس آتے ہوئے وہ شعر ترانہ گاتے تھے، جسے فیض نے جیل میں لکھا تھا کہ "دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے"
فیض نے مقدمہ کی سماعت کا آنکھوں دیکھا حال سارے جہان کو اپنے اشعار سے بتایا:

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

....

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

....

روشن ہوئے امید سے رخ اہلِ وفا کے
پیشانیِ اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

....

جو رکھ سکی ہی نہ پاسِ تعلق لب کے یاروں سے
تو دیدنوں سے زندہ و سلامت ہوئی رہی

....

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں وہ سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

... .

جب بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

فیض نے اپنی شاعری سے حکمران طبقے کی غلط بیانی کا پردہ فاش کیا۔ وہ جانتے تھے کہ حق کو دبایا نہیں جا سکتا اور دبانے والے تھک جاتے ہیں۔ کہ ان سے کوئی آزادی ہو سکتی ہے نہ ذہنی جیل اور تدبیر سے زندگی کی تعمیر کو مقدمات کے لیے جیتا جا سکتا ہے مگر دلوں سے فیض کو نہیں چھینا جا سکتا۔

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

....

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

....

جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

....

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

....

اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہوئی تشہیر

مقدمے کے ملزموں کے وکیل حسین شہید سہروردی کو مدح کے عنوان سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فیض نے لکھا:

حرّیتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
معلوم ہے ان کو کہ رہا ہو گی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر
ہر دور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

مقدمہ سازش کی نوعیت لیاقت علی خاں کے قتل سے قبل دوسری نوعیت کی تھی۔ جس شام وکیل مدافع حسین شہید سہروردی نے ایلس فیض سے کہا کہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد صورت حال بھی بدل گئی ہے اور اب میں تمھارے شوہر کو بچا سکتا ہوں، اُسی رات فیض نے جو غزل لکھی اُس کا مطلع تھا:

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

ادھر فیض نے اپنی داستانِ اسیری 'زنداں نامہ' سمیت بے شمار ادیبوں اور ادب کے چاہنے والوں نے اپنے قلم سے بڑی کتابیں اور نظموں
کے مجموعوں اور کتابوں کے صفحات سیاہ کرنے کی کوشش کی۔ رشید حسن خان نے تو اپنے مضمون کا آغاز ہی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے
ہوئے کیا ہے۔

"شعر ان کو یہ امتیاز شہرت ملی ہے کہ 1951ء کے بعد جب پاکستان کے مشہور مقدمہ سازش کے سلسلے میں زندانِ اسیری کے بعد جس سے بہت لوگ واقف ہوں گے (اگرچہ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس "سازش" میں فیض کس طور پر شریک تھے یا محض خیال آرائی کے ذمہ دار تھے یا صرف بعض بڑوں کی رفاقت کے مجرم تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ "سازش" اس ملک کے چند افراد کے ذہن کی پیداوار تھی یا کسی غیر ملکی طاقت کے اشارے پر کچھ نظریاتی وفاداری رکھنے والوں نے اس کا خاکہ بنایا تھا) اس سے پہلے وہ شاعر تھے اور ایک محدود ترقی پسند حلقے میں ان کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ 1951ء سے پہلے یعنی ان کے جیل جانے سے پہلے ترقی پسند نقادوں نے ان کی شاعری کی طرف زیادہ التفات نہیں کیا تھا۔ لیکن جب سجاد ظہیر وغیرہ کے ساتھ وہ جیل گئے تب سے ان کا "نقشِ فریادی" مان لیا گیا اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے مختلف سطحوں پر ان کی "محبوبیت" کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان کے کلام کو بھی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ ان کی شاعری کی بحث میں اضافی صفات کا عمل دخل غالب رہا۔ شاعر کو مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا اور ان کی ہر تحریر کے متعلق یہی کہا جانے لگا کہ اس شاعری سے خون اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ... کی وجہ سے ... ہو گئی۔"

چنانچہ بعض افراد اس مقدمہ سازش پر جب سے زیادہ تشویش کر کے فیصلہ دے بیٹھے۔ یہ مقدمہ سازش کی پوری طرح ایک منصفانہ طور پر تحقیق نہ کر سکے۔ بہر حال اس سے اس مقدمہ کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس تمام قضیہ کو فیض کے چند اشعار اور چند خطوط پر مکمل کرتے ہیں۔

25 جون 1951ء کو ایلس کے خط میں لکھتے ہیں:

"گزشتہ تین ماہ سے پہلی بار وقت اس مقدمے میں الجھا رہتا تھا مگر اب جو مقدمہ شروع ہوا ہے تو اس کی وسعت میں زندگی کی بے کسی محسوس نہیں ہوتی۔ جب بار بار دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ معاملہ یہ ہے لیکن یہ ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہیے لیکن دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کھیل ہو رہا ہے حقیقت سے الگ کیا جا رہا ہے اور ایک دن اچانک اور بے نتیجہ ختم ہو جائے گا جیسے کہ شروع ہوا تھا۔ یہی گرفتاری اور اسیری کی طرح اس کا بھی کوئی سبب نہیں ہوگا۔"

(صلیبیں مرے دریچے میں)

جولائی 1951ء کو جیل سے ایلس کو لکھتے ہیں:

"اب کوئی بات کوئی چیز بری نہیں لگتی۔ سب سے زیادہ ... ہمارے قریب ... ہماری تجسس ... پہلے دل گھبرایا کرتا تھا اب ... ایک طرح سے دل خوش ہوتا ہے۔" (صلیبیں مرے دریچے میں)

11 اگست 1951ء کو ایلس کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"ہمارے دوست نے ترجمہ کر کے بھیجا تھا "Peace Comes From Within" ۔ اگر تم یہاں ہوتے تو تمہیں احساس ہوتا کہ اس کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اب مجھے معلوم ہے کہ یہ پتا چلا ہے کیا کیا ہے دل میں جو تم ہو۔ اگر تو کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور تکلیف، سب منافقتیں، سب تخیلات، سب مظالم، غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے جو باہر سے کسی کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس، ظلم کرنے کا احساس یا یہ کہ آپ سے ہونے کرنے کا احساس ایسی چیز ہے جس کا کوئی مداوا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس ابدی طور پر آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی نہیں لڑ سکتا۔ سب کا اس پر یقین ہو جائے کہ اس صحبت میں تھے اور تمہیں [illegible] شعری اصطلاح میں [illegible] کا کام دیتے ہیں"۔

جون 1952ء کے خط میں ایلس کو لکھتے ہیں:

"جب یہاں سے نکلیں گے تو شاید اپنی شخصیت پہلے سے زیادہ مکمل اور منظم ہوگی۔ میں نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کے لیے مناسب یہی ہے کہ جو کچھ اسے ملے اسی پر قناعت کرے اور جو کچھ نہیں ملتا ہے وہ پانے کی کوشش میں وقت اور طاقت ضائع نہ کرے۔ اس طرح کی کوشش سے حماقت اور خود فریبی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں"۔

22 جولائی 1952ء کے خط میں ایلس کو لکھتے ہیں:

"ایک صورت یہی ہے کہ جو کام ہم خود سے کرتے ہیں اس لیے کہ ہم بھی اس حساب میں [illegible] اپنے ضمیر کے علاوہ نیکی اور بدی کی کوئی منزل [illegible] سکتی ہے"۔

9 اگست 1952ء کو ایلس کو لکھتے ہیں:

"اپنا تو یہی جی چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد پوری دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ ہو جو ہمیں ڈرا سکے کون؟ تم ہمارا ساتھ دو گی"۔

29 اپریل 1953ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"سچی اور پوری کامیابی کبھی ہوتی نہیں سب ظلم و ستم کے باوجود اصل مشغلہ اور عبادت یہی ہے کہ انسان کی کوشش ہو کہ تمہارے جیسے حق پرست لوگوں کا ساتھ ملتا ہے۔ جو بدی سے نفرت کرتے ہیں اور جو کچھ اچھا ان کے پاس ہو اسے اپنے سے زیادہ کم نصیبوں کو راحت پہنچانے کے لیے قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے"۔

5 جولائی 1953ء کے خط میں ایلس کو فیض نے لکھا:

"اگر تم کبھی دوسروں پر نگاہ ڈالو تو [illegible] پاکستان میں تمہیں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملے گا جس نے [illegible] اس سے زیادہ [illegible] ہو اور کسی کا [illegible] نہ کیا ہو [illegible] سختی سے تنگی اور مصیبت کی کوئی [illegible] طرح [illegible] ہے"۔

ہم قید کے [illegible] شعروں کا [illegible] واقعہ [illegible] فیض نے کیا ہے:

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیض
کاش افلاک کے ملازم ہوتے

....

فیض تخلص آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

.. ..

لیکن بیٹا سب جو بیٹا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹے!

☆

فیض کا مرثیۂ امامؑ

قدیم اُردو یا دکنیات کی پہلی کتاب "نوسرہار" شہادت نامۂ امام حسینؑ ہے جس کو 1505 عیسوی میں بیجاپور کے شاعر شیخ شفیع نے تصنیف کیا۔ اُردوئے قدیم کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں 5 مرثیے جن میں تین مکمل اور دو (2) نا تمام مرثیے سولھویں صدی کی یادگار ہے۔ اُردو ادب کے باوا آدم ولی دکنی کے کلام میں بھی مرثیے موجود ہیں۔ اُردو کے چار بڑے شاعروں کے کلام میں مراثی نظر آتے ہیں۔ میر تقی میر خدائے سخن کے چونتیس (34) مراثی اور پانچ سلام مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ میر انیس کے 213 مرثیے اور 112 سلام ہمارے درمیان موجود ہیں۔ مرزا غالب کا ایک تین بند کا نا تمام مرثیہ اور ایک سلام اُردو میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک مکمل نظم فارسی میں بہ عنوان "واقعہ کربلا" لکھی جو در حقیقت مرثیہ ہی ہے۔ اُردو ادب کا شاید ہی کوئی عظیم، ممتاز اور معروف شاعر ہو جس نے صنفِ مرثیہ کی طرف توجہ نہ کی ہو۔

بیسویں صدی کے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی نے بھی نو (9) مرثیے، کئی سلام اور متعدد قطعات و رباعیات رقم کیے جس کو حال ہی میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرتب کیا اور انھیں توحید اسلامک سنٹر او سلو ناروے نے شائع کیا۔

فیض احمد فیض نے بھی ایک بارہ بند یعنی بہتر مصرعوں کا مرثیہ بنام "مرثیۂ امام" لکھا۔ یہ مرثیہ اگرچہ 1964ء میں لکھا گیا لیکن 1978ء میں شام شہر یاراں میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" میں لکھتے ہیں کہ مرحوم منور عباس ایڈووکیٹ نے انھیں بتایا کہ علامہ رشید ترابی مرحوم نے فیض سے مرثیہ لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ لاہور فروغِ مرثیہ کے زوج رواں ممتاز مرثیہ نگار مرحوم وحید الحسن ہاشمی نے اپنے ایک خط میں اس بات کا تذکرہ کیا کہ فیض کے بعض شیعہ دوستوں نے فیض سے کہا کہ "جوش کمیونسٹ ہو کر بھی مرثیے لکھتے ہیں لیکن آپ نے مرثیہ نہیں کہا، چناں چہ انھیں ایک میرانیس کا مرثیہ دیا گیا۔ ع "آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے" کچھ مدت گزرنے کے بعد فیض کا مرثیہ منظرِ عام پر آیا۔ روزنامہ جنگ لاہور میں ڈاکٹر حسن رضوی نے فیض سے ایک انٹرویو لیا جو 18 فروری 1982ء کو شائع ہوا جس کے دو سوال جو مرثیے سے مربوط تھے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔

حسن رضوی: آپ نے مرثیے بھی لکھے ہیں ان کی تحریک کا سبب کیا تھا؟

فیض احمد فیض: ایک تو موضوع ہی ایسا ہے کہ اس سے ہمارا تعلق بنتا ہے۔ ویسے بھی ذیڈا اے بخاری، ہمارے اُستاد بھی مرثیے لکھتے تھے، فرمایش بھی ہوئی اور ہم نے مرثیہ لکھا۔ کراچی میں کچھ ماحول اور فضا بھی ایسی میسر آئی کہ مرثیہ لکھنے کی ترغیب پیدا ہوئی۔

اشفاق احمد: میں اسے نہیں مانتا کہ مرثیہ آپ نے فرمایشی لکھا تھا، اس لیے کہ آپ اپنی سائیکی سے ابھی تک اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اُسی زمانے میں اُسی مقام پر آپ سے کوئی تو ایسے شاعری کی فرمایش کرتا تو کیا آپ ایسی شاعری بھی کرتے؟

فیض احمد فیض: فرمائش سے میری مراد وقتی تحریک سے تھی۔ واقعۂ کربلا ہماری سائیکی کا حصہ ہے۔ اس کی تحریک کے بغیر میں مرثیہ کیسے لکھ سکتا تھا۔ "معمولیہ شاعری" کے لیے میں داخلی طور پر تیار نہیں ہوں۔

جناب ضمیر اختر نقوی "اُردو مرثیہ پاکستان میں" فیض کے مرثیہ پر چند جملے لکھ کر مرثیے کے چند بند بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ "ممتاز شاعر فیض احمد فیض بھی ایک مرثیہ لکھ کر مرثیہ نگاروں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ فیض کا مرثیہ اُن کے مجموعے "شامِ شہرِ یاراں" میں شائع ہُوا ہے۔ یہ مرثیہ لاہور کی ایک مجلس عزا میں فیض نے خود پیش کیا تھا۔ فیض نے یہ مرثیہ 1964ء میں کہا تھا"۔

اسی ذیل میں ابوسعید قریشی "فیضانِ فیض" میں لکھتے ہیں: "فرمائش پر بھی مرثیہ لکھنے کے لیے ممدوح کے مسلک سے یگانگت کا احساس لازم ہے اور "وفا" کا وہ تصور جو "اشعار" میں آیا تھا، کچھ یوں کھل کر سامنے آتا ہے۔

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی

کسی شخص، گروہ یا معاشرے کو "عدل" سے محروم کر دینا، جفا کی بدترین شکل اور اسلامی تعلیمات کا انتہائی بطلان ہے۔ جمہوریت کی روح مختلف گروہوں یا پارٹیوں کے مفادات میں نہیں بل کہ ضمیر کے احترام میں مضمر ہے۔ "یزید" سے بیعت کا مطلب "یزیدیت" کے حق میں "ووٹ ڈالنے" کی بہ نسبت حسینؑ نے جہاد اور شہادت کو ترجیح دی:

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل

اور بزم کا شاعر "صبحِ شہادت" کی رزمیہ داستان کو یوں پیش کرتا ہے:

پھر صبح کی لَو آئی، رُخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خونناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لیے آئنہ رُو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کارزارِ کربلا میں شہیدوں کے لہو سے لالہ رنگ ہونے والی شفق کی سُرخی "شامِ شہرِ یاراں" کی ایک مختصر سی نظم میں جھلک اُٹھی ہے۔ المیۂ کربلا کے درد و غم کے دوش بہ دوش عزم و ہمت، صبر و استقلال اور حق کے لیے جذبۂ ایثار و قربانی کی فراوانی اور اسلام کے مقدر پہ یقین نے ظلم و شقاوت کی تاریکیوں میں بھی شمعِ اُمید کو روشن رکھا ہے۔ اور اپنے تمام تر حزن و ملال کے باوجود شاعر "اُمیدِ سحر" کی بات کر رہا ہے:

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو

نثار ہے جو زخمِ نگہ سے حرفِ کرم
جبینِ پا بجنوں مرحلِ سفر کی بات کرو
مسافرانِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات کرو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات کرو

معتمد حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ فیض مجالسِ عزا میں شرکت کرتے تھے۔ آفتاب اقبال شمیم اپنے مضمون "پیام آشنا" میں لکھتے ہیں: "قیامِ پاکستان کے بعد سید اخلاق حسین صاحب جو جرمنی کے بعد مغربی پاکستان کی کورٹ سے ریٹائر ہو گئے اور خاندان کے ساتھ لاہور میں مقیم ہو چکے تھے۔ محرم کے دنوں میں سید اخلاق حسین صاحب مجالس دیکھتے ہوئے فیض خواہش ظاہر کی کہ ہر کسی کو کوئی مجلس سنی جائے۔ فیض لاہور کا علاقہ اندرون بازار سے رہنمائی کے لیے کہا گیا۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ فیض صاحب مظفر علی خان قزلباش کی حویلی میں مجلس ہوتی ہے وہاں پہنچ کر جٹھا کر دم لے چلا ہوں گے۔

شبِ عاشورہ میں شام اخلاق اور میری مستورات کرنے کو میں وہاں سے چلے۔ تنگ گلیوں میں بے حد طویل بازاروں میں سبیلیں لگی تھیں بہت سے روشنی تھی۔ ہم لوگ رستے میں پیچھے جا رہے تھے۔ ایک پان والے کی دکان پر کالی شیروانی سفید شلوار میں ملبوس فیض صاحب سگریٹ خرید رہے تھے۔ انھوں نے ایک کر دیکھ لیا۔ بولے "آپ یہاں؟" کہنے لگے تم کو جب سے ہو انھیں نے کہا مستورات کو مجلس میں لے جا رہا ہوں۔ کہنے لگے چلیے ہم بھی آ رہے ہیں۔ آج کی رات ہم بھی مجلس سنیں گے۔ انھوں نے کہا یہاں ایسی بھیڑ بھاڑ میں بھلا آپ سے کہاں ملاقات ہو گی۔ کہنے لگے کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔"

ڈاکٹر عالیہ امام "فیض وابستگی" میں "حضرت فیض احمد فیض" کے عنوان سے لکھتی ہیں: "محرم کی نویں تاریخ تھی... میرے گھر پر آئے۔ عالیہ! آج مجلس کا پروگرام ہے۔ تمھاری... مجلس کر چکی... دیکھو تو ایک ہم کھڑا تھا... نیچے مجلس ہو رہی تھی... خوب محبت کا اہتمام تھا... میں دو منٹ تو بیٹھی اس کے بعد انھوں نے ایک سوال کیا، تم کی طرف دیکھ لیا... فیض صاحب... بولے آؤ... تم دعوت چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو... ہم سے کیا ہوا؟ یہ بتاؤ۔ کیا کام لوگ نے کہا؟" ... میں نے کہا "نہیں... بات یہ ہے کہ آج کی دعوت تو آج کی نہیں تھی... میرے اس جملے پر انھیں شاید محسوس ہوا جیسے ان پر کیا گزر چکی۔" اللہ! اللہ یہی خاطر آیا کیا تم بھی روتی ہو؟"... انھوں نے جذبات کا اظہار کیا۔ فوراً بات بدل دی... مجھے شرمندگی بھی ہوئی۔ ملاقات کا مزہ کرکرا ہو گیا... مجلس ختم ہونے کے بعد کھانا ہوا۔ انھوں نے کہا کہ فیض صاحب آج کی بات تو ہم لوگ حضرت عباسؑ کی اکثر یاد کرتے ہیں، ابا میاں نے زیارت دی... پڑھی بھی تھی... ہاں تو ٹھیک ہے، ہم بھی ان کے ساتھ رہیں گے... تم وہاں کیا کرو گی؟... کھانے کے بعد ہم بیٹھے رہے... فیض صاحب نے بھی مجلس کا ذکر کیا۔ مرثیے کے چند بند سنائے۔ پھر کہنے لگے "مرثیہ تو میں نے بہت کم لکھا ہے۔ آپ ... کی کتاب ... لکھا ہے۔ کیا تم پڑھ چکی ہو؟ اب ہمارے اور تمھارے مسلک میں کیا فرق رہ گیا؟"

"ایک اور واقعہ ہے، ایک مرتبہ ہم عراقی حکومت کے بلاوے پر بغداد گئے۔ صدام حسین، وزرا اور ہم حضرت عباسؑ اور امام حسینؑ کے روضے کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے... جب ہم اندر گئے تو دیکھا کہ صدام حسین اندر سے روتے ہوئے چلے جا رہے ہیں... ہم بھی سب شامل ہو گئے۔ ہم میں ایک عجیب سی کیفیت کی شدت ہوئی۔ جہاں چراغ ہم نے جلائے ... مگر تھکا ہوا... اندر گئے۔ ہمارے کان ناد سے ایسا ماحول بنا تھا... ہر کوئی اپنی طرح گم ہو گیا... انھوں نے یہ بات جذبہ احساس کا تحفہ ہے۔"

"الغرض ایک اور بات سنیے ہماری۔ لاہور میں مجلس تھی۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ ہمارے ساتھ ایک اور بہت معقول سے صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب حسبِ دستور رو رو کے گلا کھنگار کر پڑھتے رہے۔ ... وہ صاحب کہ میرے نزدیک بیٹھے تھے وہ تھک گئے تو بولے ... دیکھتے ہو فیض ... یہ چلا جا رہا ہے ... یہ چلا جا رہا ہے ... ارے ان سے پوچھو کہ یہ جان کہاں رہا ہے ... شیخ صاحب کا رہا ہے ... سب دوچار اور پھوپھی زاد بہن کی زبانی تھی ... تو مرثیے کے مصائب میں بولے ... کون ہوتا ہے ....."

فیض نے بتا دیا کہ دنگل کرنے چلا ... پھوپھی زاد بھائی کی زبانی تھی یعنی ظالم اور مظلوم کی جنگ تھی۔ یہ حق اور باطل کا معرکہ تھا جس طرح فیض نے امام حسینؑ کے خطبے سے ... کو موزوں اور خوبصورت انداز میں ... کی زبانی ہے:

فرمایا کہ کیوں درپۓ آزار ہو لوگو؟
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو!
واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

یہی نہیں بلکہ فیض نے اپنے مرثیے میں جو شخص امام مظلوم کی طرفداری نہیں کرتا اور ظلم پر لعنت نہیں کرتا اسے لعینوں میں شمار کیا ہے:

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ" میں فیض کے مرثیے پر تبصرہ کرتے ہوئے کربلا کے موضوع کی کیفیت کی تبدیلی کرتے ہوئے حق اور حریت کی حمایت کے اثر کو فیض کی نظموں میں دکھاتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ لکھتے ہیں:
"فیض احمد فیض نے یوں تو ایک مرثیہ بھی کہا ہے (رات آئی ہے شبیر پہ یلغارِ بلا ہے) تاہم ان کے یہاں اس موضوع کو برتنے کا انداز زیادہ تر غزل ہی کا ہے ... یہ اشعار اپنی اشاریت ... [illegible] ... حساب چکانا ... [illegible] ... مزید یہ کہ ان اشعار کا زمانی تناظر عہدِ حاضر کا ہے ... آج کے انسان کا درد نمایاں ہے:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض کے کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں "مرے دل مرے مسافر" کے بعد کا کلام "غبارِ ایام" کے تحت درج ہے۔ اس میں ایک نظم ہے "ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے" جس میں ان مظالم کا بیان ہے جو اسرائیلی درندوں کی طرف سے فلسطینی مجاہدوں پر

بلائے گئے ہیں، گویا کہ جوش و خروش کے تخمینے تناظر تک اس نظم کی نظم انگیزی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں فیض کی جو نظم زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ دستِ تہِ سنگ کی "شورشِ زنجیر بسم اللہ" ہے۔ لاہور جیل میں لکھی گئی اس نظم میں اگرچہ ذکر کیا گیا اس کے پس منظر کا ذکر نہیں لیکن مختلف پیکروں کی مدد سے جو فضا تعمیر ہوتی ہے اس سے پرسشِ دار و رسن وغیرہ اتنی الفاظ داروگیر کی صدیوں پرانی روایت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے

لگی ہے حرفِ ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

"دستِ تہِ سنگ" کی ایک اور نظم "آج بازار میں پابجولاں چلو" بھی اسی نوعیت کی ہے۔ ان دونوں نظموں کا زمانہ تقریباً ایک ہے یعنی دونوں لاہور جیل میں کہی گئیں۔ پہلی نظم 11 فروری 1959ء میں کہی گئی اور دوسری فروری 1959ء کی یادگار ہے۔ آخری کے فوری کے سے محدودوں نگاہ ڈوبی کیفیت سے شاعر ادائی کے لیے قربانی کی ہے:

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب، شہرِ جاناں چلو

جہاں تک فیض کے اس مرثیۂ امام کا تعلق ہے یہ ایک جدید مرثیہ ہے جس میں فیض نے جدید تجربات کیے ہیں اور بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ یہ مرثیہ پہلے بند سے آخری بند تک موضوع کے لحاظ سے خالص مرثیے میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس مرثیے میں کلاسیکی مرثیے کے اجزا نظر نہیں آتے لیکن بعض اجزا کی چھاپ ضرور دکھائی دیتی ہے۔ میر انیس نے مرثیے کے تین لوازم خود بتائے ہیں: یعنی عمدہ زبان و بیان: عالی مضمون اور درد و غم

انداز بھی نکہت ہو، مضمون بھی عالی نکلے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہ تینوں لوازم بخوبی فیض کے مرثیے کا احاطہ کیے ہیں۔ اس مرثیے پر میر انیس کے شاہکار مرثیے کا خاص اثر دکھائی دیتا ہے جس کا مطلع ہے:

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی

....

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اُس شب کی سیاہی
ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی

... .

کہتے تھے کہ شب بخت نہ ہووے گی اب ایسی
مردوں نے کبھی دیکھی تھی نہ تاریک شب ایسی

فیض کا مطلع اور اس کے بعد کے تین بند شبِ عاشور کی منظر کشی، مجاہدینِ حق کی عبادت گزاری اور دشمنوں کی مدہوشی کی عکاسی کرتے ہیں۔ تنہائی اور مظلومیت کا تذکرہ، اصحابِ حسین کا جذبۂ شہادت، اُن کا آخری خطبہ اور معرکۂ شہادت کی تیغ اور قتل کا تذکرہ ہوتا ہے۔ فیض کے پہلے چار بندوں کے تقابلی مطالعہ سے بیان کو روشن کریں گے۔ مطلع:

رات آئی ہے شبیر پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے

... .

تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیر کی ویرانی کی شب ہے

....

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ ادھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی

فیض نے مرثیۂ امام میں امامِ مظلوم کی مرکزیت کو برقرار رکھا ہے۔ جب پورے مرثیہ میں بجز امام حسینؑ کا اسم گرامی شبیر ہی آیا ہے۔ فیض امامِ مظلوم کی بے بسی، بے کسی، بے دیاری کی تصویر کشی میں اپنے خاص فن، نئی علامات اور الفاظ کا خاص اہتمام سے استعمال کرتے ہیں۔

اک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
ان خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھیے سو زخم سجے تھے

اور فیض کی شاعری نے اپنے قلم سے ایک نہج رقم کر کے مرثیے کو مرتسم بنایا ہے۔

منم ساختم بزم با انجمن   ورنہ یکی بود در طریب

مگر مرثیے میں شاعر کو جو بڑی بیبت مصیبتوں کی کردار نگاری کرنی ہے اس کا قلم ... اور زبان و بیان مجبور ہیں۔ وہ ... فیض ... بخوبی واقف تھے لیکن یہ فیض کی کامیاب کاری ہے کہ وہ اس مضمون کو کئی طرح ... امام کے تحمل اور خصائل کی ... دیکھیے:

نہ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا بھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرار وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی

تسلیم و رضا، اقرارِ وفا اور منکرِ دستورِ جفا کی تو تعلیم کا دشمن پر مسلسل حملہ ہے۔ اور ایسے ہی نورانی چہروں سے تبسم کا عکس ابھرتا ہے۔ جہاں چہرہ امام اپنے اصحاب کو خطاب کرتے فرماتے ہیں۔

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل

بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام ، مُبارک ہو عزیزو !
باطل ہُوا ناکام ، مُبارک ہو عزیزو !

شبِ عاشورہ ہی امام نے جانبازوں کو فتح کی مُبارک باد دے دی ہے۔ اِس بند کے پہلے دو مصرعوں میں "الحمد" کوزے میں دریا کو سمونے کے مصداق ہے۔ میر انیس کے جس مرثیے کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے اُس میں چالیس بند میں رات کا ذکر کر کے انیس نے صبح کی جلوہ نمائی اِس طرح سے کی ہے:

جلوہ وہ دمِ صبح کا وہ نور کا عالم
سُرخی وہ شفق کی اُفق چرخ پہ کم کم

فیض نے بھی پانچ بند کے بعد ایک بند میں صدرِ صبح کی منظرکشی کی ہے:

پھر صبح کی لَو آئی رُخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خوںناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لیے آئنہ رُو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

صبح کی منظرکشی میں فیض نے میدانِ جنگ کی نقاشی کی ہے۔ اگرچہ کلاسیکی مرثیہ کی طرح یہاں آمد، لڑائی، تلوار اور گھوڑے کے مضامین پر طویل بند نہیں مگر اِس ایک بند میں نیزے اور تلوار کی چمک، مقتل اور صحرا میں لہو کے رنگ کی جھلک کے ساتھ سُرخیِ خورشید فلک بھی نظر آتی ہے۔ فیض کا یہ نیا تجربہ اُس فکری مشاہدہ کا سلسلہ ہے جو اُن کی انقلابی نظموں سے جُڑا ہُوا ہے۔ اِس مرثیہ کا سب سے اہم حصّہ خطبۂ امام ہے جس میں دشمنوں کو حق بتانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش بھی شامل ہے۔ امام کا آدرش فیض کے دل کی بات ہے۔ یہی وہ حصّہ ہے جس کے بارے میں شیخ کہہ چکے ہیں کہ مرثیہ کا موضوع ہماری تحریک اور فکر سے بندھا ہُوا ہے۔ ؎:

خطبہ کیا ارشاد امامِ شہدا نے
خلوت نہ خلافت ، نہ حشم چاہیے ہم کو
اورنگ نہ افسر ، نہ علم چاہیے ہم کو
زر چاہیے ، نے مال و درم چاہیے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اِک حرفِ یقیں ، دولتِ ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے، نیکی کے، مروت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں، وہ منکرِ دیں ہے

انقلابی شاعر جوش ملیح آبادی نے بھی کہا تھا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

فیض نے اِن مرثیوں میں بتایا ہے کہ یہ انسانی آزادی اور حقوقِ بشر کے اقدار ہیں جو صرف ایک خاص مسلک سے وابستہ نہیں اور یہی پیغامِ انسان دوستی اور حریت کربلا کا پیغام ہے۔ یہاں حق، صداقت، انصاف، نیکی، مروت اور مظلوم کی حمایت سبھی کچھ ہے۔ جہاں ظالم اور ظلم کے خلاف جہاد کرنے کا عزم بھی ہے۔ فیض کے ان آخری مرثیوں میں جوش اور ولولہ اور دھیما آہنگ بھی شامل ہے۔
فیض نے جو خط جیل سے ایلس کو لکھا تھا اس میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ ایک طویل مرثیہ لکھیں گے: "اب چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے اگر چھٹی ہو جائے تو ارادہ ہے کہ پرانی روایت سے نظموں کے بجائے کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کشمکشِ حیات کا بیان ہو سکے۔ اس لیے کہ ہمارا دور شاید تاریخ کا سب سے ہنگامہ خیز اور ولولہ انگیز دور ہے۔ نہ جانے یہ کیا جائے گا کہ نہیں، لیکن ارادہ ضرور ہے۔"
لیکن فیض کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ مرثیہ امام اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ طویل نظم شاہکار نظم ہوتی ہے۔ حق پر جان دینے والے امر ہو جاتے ہیں ان کا مرکر مرنا زندہ ہونا ہے۔

جو صاحبِ دل ہے، ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حُر ہے، ہمیں احرار کہے گا
نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

فیض نے آخری بند کے تین شعروں میں امام کی آخری مناجات، شہادت اور دوام و ثبات کا نقشہ یوں دکھایا ہے:

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیر
پھر نعرہ زناں محوِ وغا ہو گئے شبیر
قربانِ رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیر
خیموں میں تھا کہرام، جدا ہو گئے شبیر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

کربلا کے واقعات جو مقاتل میں لکھے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مظلوم زمین پر گرنے سے پہلے کچھ دیر تک زخموں سے نڈھال فیضؔ کے اس مصرع کی طرح تھے بقول "مر کب پہ تن پاک تھا اور خاک پہ سر تھا"

اس مرثیہ کا آخری مصرع فیضؔ کی معجز بیانی کی سند ہے۔ بقول "اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا"۔

ڈاکٹر عقیل رضوی "مرثیہ کی سماجیات" میں لکھتے ہیں، "فیضؔ نے صرف ایک ہی باقاعدہ مرثیہ لکھا ہے۔ "مرثیۂ امامؑ" مگر چوں کہ فلسفۂ کربلا اور غمِ حسینؑ کو انھوں نے تہذیبی تجذیب کے ساتھ اپنایا اس لیے ان کی کچھ نظموں کی فضا میں بھی مرثیہ کی وہ تی صورت پیدا ہوگئی جسے صحیح معنوں میں جدید مرثیے کا معروضی رُخ کہنا چاہیے کہ مرثیے میں جدید رنگ اپنی معروضیت سے زیادہ کامیاب ہے۔ کیوں کہ وہ سماج کے دلوں کی آواز بنتا ہے جس میں ادبی فضا بہت کم ہے۔ فیضؔ نے جس طرح کربلا اور اس کے غمِ مشترک کو اپنے اشعار اور مصرعوں میں جذب کیا ہے، وہ مصرعے اور اشعار بڑے بڑے بیانیہ مرثیوں پر بھاری ہیں، جن میں محسوسات کی زیریں لہریں (Under Currents) چلتی رہتی ہیں، جن میں شور و شغب نہیں مگر جنھیں محسوس کر کے غمِ حسینؑ کی شدت، جیسے احساسات پر چھانے لگتی ہے۔۔۔

ذرا فیضؔ کی نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجیے اور ان پر واقعاتِ کربلا کی اشاریت اور فلسفۂ کربلا کے اثرات دیکھیے جو سب اجتماعی، سماجی اور سیاسی تجذیب سے دکھ دیکھ میں آ گئے ہیں اور اپنے وقت کی آواز بن گئے ہیں۔

(1) شامِ غربت (غبارِ ایام)، (2) عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا (غبارِ ایام)، (3) لاؤ تو قتل نامہ مرا (مرے دل مرے مسافر)، (4) آج بازار میں پابجولاں چلو (دستِ تہِ سنگ)، (5) ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے (غبارِ ایام)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ مرثیوں کا سماجی ارتقا اب اسی صورت میں ہو رہا ہے جس میں عالمیت (Universality) ہے اور بین الاقوامیت بھی، اور شاید یہی شعری اور تہذیبی تجذیب آج کی مرثیت کا عروج بنتی ہے۔ اس رنگ میں نظمیں بھی لکھی جا رہی ہیں اور غزلوں کے اشعار بھی ہیں اور طویل مرثیے بھی جو بیانیہ کے ساتھ بھی فکری اور محسوساتی طریقوں کو نہیں چھوڑتے۔ فیضؔ کی نظموں اور مرثیے سے کچھ اشعار دیکھتے چلیں جو شاید مرثیہ میں کسی باطنی اسلوب کا پیش خیمہ ہیں:

شامِ غربت

دشت میں سوختہ سامانوں پہ رات آئی ہے
غم کے سنسان بیابانوں پہ رات آئی ہے
نورِ عرفان کے دیوانوں پہ رات آئی ہے
شمعِ ایمان کے پروانوں پہ رات آئی ہے
بیتِ شبیرؑ پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے
درد سا درد ہے، تنہائی سی تنہائی ہے!

ایسی تنہائی کہ پیارے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے
درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے
ضعف سے چاند ستارے نہیں دیکھے جاتے

اب جتنا کہ ستمگاروں کی یاد آتی ہے
دل دھڑکنے کی بہت دور صدا آتی ہے

....

آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب، شہرِ جاناں چلو
حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں، یارو چلو!

("دستِ تہِ سنگ")

ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آخرِ شب پہ کڑی تھی
رو رو کے بکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
گھر گھر کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار

ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی

پھر صبح کی لو آئی رخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خونناک پہ چمکی

آغاز کو کیا کرتی ہے ہر عہد کی تقدیر
ہر عہد میں دیوار پہ ہوتی ہے تحریر

(مرثیۂ امام۔ شامِ شہریاراں)

راقم الحروف نے پچھلے صفحات میں یہ عرض کیا ہے کہ پاکستان میں مسلسل فوجی حکومت کے تجربے نے شاید ان محسوسات کو پھر سے تیز کر دیا تھا، [illegible] گواہوں سے بھی پتا چلتا ہے کہ ایوب کی حکومت میں جب فیض صاحب کو گرفتار کیا گیا تو [illegible] انھیں مسلسل اور مطلق [illegible] کرنے کے بازاروں سے [illegible] گیا تھا [illegible] فیض صاحب پر صرف اپنے ہی ملک کی فوجی حکمرانوں کو [illegible] تھا۔ مگر جب وہ [illegible] کی زندگی گزار رہے تھے تو بھی اسی طرح کے [illegible] جہاں تک [illegible] انھیں روز [illegible] رہتے تھے [illegible] ظلم و جبر [illegible] خصوصیت [illegible] ہے، وہ [illegible] ان کے اس خیال کو [illegible] کرتا رہا ہے اور [illegible] ہے کہ جب بھی کسی سرزمین پر ظلم کی انتہا ہوتی ہے تو تاریخ [illegible] اور [illegible] تہذیب سے وابستہ ہونے والوں کو [illegible] آتی ہے اور یہ [illegible] کے لیے [illegible] ظلم کی [illegible] کو دور کر [illegible] پیدا کرنے کے لیے، یہ سائنس اور صاحب [illegible] کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے الفاظ، مصرعے اور اشعار مرثیے کی شاعری [illegible] کے [illegible] بھی دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ سرمایہ بہت مختصر ہے مگر شاعری کی دنیا میں [illegible] بہت [illegible] اور دل ہلا دینے والی اور [illegible] (Nerve Shattering) کیفیت ان مختصر سے مرثیہ میں ہے اور مرثیے پڑھنے والوں کو محسوسات میں [illegible] فیض کا یہ رنگ اور طرز اسے نیا ذائقہ دکھاتے گا [illegible] یہ مختصر سرمایہ [illegible] بات [illegible] چاہیے کہ فیض کی یہ تخلیقات بابت [illegible] (Robert Sarnoff [illegible]) کا مال تجارت [illegible] اور یہ بازار کے [illegible] ہیں اور ان کی اقدار [illegible] بالکل [illegible] تخلیق کار کو اپنی تخلیق سے بیگانہ کر کے بیگانگی (Alienation) کی صورت پیدا کرتے [illegible] فیض کے [illegible] صورتیں [illegible] اور ان [illegible] سے [illegible] کے بجائے ظلم و جبر کے خلاف [illegible] اور [illegible] کرتے [illegible] کرتا ہے اور [illegible] ہے۔ یہ [illegible] تجربات [illegible] سے [illegible] ہوا ہے [illegible] اور یہ [illegible] صورتوں نے انھیں محسوس کروایا ہے۔ فیض نے انھیں کربلا اور واقعات کربلا اور امام حسین کی [illegible] ان کی [illegible] آواز [illegible] کے اپنے احساسات [illegible] کی مدد سے بیان کر دیا ہے، ایک دلچسپ بات اور ہے کہ ان [illegible] اور [illegible] تہذیب اور [illegible] نے ان کے [illegible] ہے [illegible] فیض کے ان اشعار [illegible] پر لایا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ بھی ہے کہ محسوسات کی سطح میں [illegible] Tools [illegible] محسوسات کو [illegible] فیض [illegible] کے محسوسات [illegible] عام [illegible] سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مرثیے اور مرثیے کے [illegible] سے آتے ہوئے الفاظ مصرعے اور نظمیں [illegible] ہیں۔ [illegible] اور [illegible] اور [illegible] کے ساتھ [illegible] ہے۔

یہ سب بالکل ٹھیک ہی ہوا ہے۔ جدید مرثیے کی ادبی روایات نے ابھی [illegible] سے [illegible] اس

طرزِ شاعری اور کیفیات کی اہمیت، بیانیہ سے زیادہ ہو کیوں نہ ہٹ گئی یہ طرزِ عام ہو گا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ [illegible] کا ایک افضل پہلو یہ بھی ہے کہ وہ
یہ [illegible] ہے کہ لوگوں کی ضرب (Decorum) جس قسم کی ہے وہ دور کی [illegible] ہی کی جیسی ہے کہ یہ اعلیٰ کس مزاج اور طبقے کے لوگوں
سے [illegible] اور چند خاطر میں (Popularity) کو عزیز ہے، یہ سب کچھ مرثیے کے حسن کی [illegible] نہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی [illegible]
میں اندر [illegible] یہ [illegible] سے یہ چلتی رہتی ہیں۔ یہ سامنے کی بات ہے کہ مرثیے نے ہمیشہ [illegible] کے ساتھ اپنے [illegible]
رکھا ہے۔ شعرا مضامین کی گرفت پسند اور تشبیہ کے ساتھ ان کے فن کا بھی ان میں ہمیشہ خیال رہا ہے۔ ان کی [illegible] کا بھی ہر جگہ اس کا
جائزہ اس طرح لیا جا سکتا ہے۔ جدید مرثیے میں لفظیات، قریب قریب وہی ہے، [illegible] (Phraseology) سے لے کر خیال کی [illegible]
تک ہر جگہ سامعین کی [illegible] اور مسائل [illegible] اپنے [illegible] کے احساسات کے [illegible] ان کی [illegible] اور [illegible] سب
کو [illegible] دیا ہے۔ یہ صورت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ممکن ہے حضرت امام حسینؑ اور ان کے [illegible] کی طرف دیکھا جاتا ہے ہیں اسی
طرح ان کے دور کے آئینے میں ہو سکتے ہیں۔ [illegible] اور [illegible] اتفاقی نہیں ہوتی ہیں۔ [illegible]
مرثیہ میں [illegible] موجود ہیں۔ جدید مرثیے میں نئے مرثیہ گویوں نے [illegible] کی [illegible] کی جا رہی ہے [illegible] صورت
اسے عالمی ادب کے قریب لے جائے گی۔ ابھی مرثیوں میں [illegible] مختصر قالب کا [illegible] ہیں۔ واقعات تو مجبوری ہیں مگر
بیانِ واقعہ میں فکر اور [illegible] شعری صورتوں کے پیدا کرنے کے امکانات ہیں جس کی جدید سے جدید تر مرثیہ گویوں کو کوشش کرنی
چاہیے کہ اسلوب اور فکری تجربہ ہی کسی مختصر [illegible] کو [illegible] کے ساتھ تازگی رکھتے ہیں اور [illegible] بھی اٹھاتے ہیں۔

-☆-

فیض نے انٹرویو لیا

اگرچہ فیض کے دو درجن سے زیادہ انٹرویو مطبوعہ شکل میں موجود ہیں جن میں فیض نے متعدد سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے ہیں لیکن ہمارے پاس ایک ایسا بھی انٹرویو موجود ہے جس میں فیض نے سوویت یونین کے مقبول و معروف افسانہ نگار چنگیز اتماتوف سے انٹرویو لیا تھا جو ماسکو ٹیلی ویژن سے ریلے کیا گیا تھا۔ چنگیز اتماتوف کے افسانوں کے مجموعے "الوداع گل سرائے"، "مدرس"، "سفید جہاز"، "جمیلہ" وغیرہ سوویت یونین کی مختلف زبانوں کے علاوہ بعض یورپی اور ایشیائی زبانوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ چنگیز اتماتوف قرغزستان کے رہنے والے ہیں روسی اور قرغز زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔

فیض: میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں اپنے ناظرین سے مخاطب ہوں، جیسے کہ آپ کو علم ہے سوویت یونین میں بہت سی قومیں آباد ہیں، بہت سی زبانیں رائج ہیں، اور ہر زبان کا اپنا مخصوص ادب ہے۔ ہم اجنبی لوگ سوویت ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری نگاہ یا تو صرف کلاسیکی ادب کی طرف جاتی ہے، یا اُن بڑے بڑے انقلابی ادیبوں کی جانب جو روسی زبان میں لکھتے ہیں اور باہر کی دنیا میں معروف ہیں۔ اس ٹیلی ویژن پروگرام کا ایک مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس وسیع سرزمین کے چند ممتاز ادیبوں سے متعارف کروانے کی سعی کی جائے۔ آج میں آپ کو ایک ایسے ہی بلند پایہ ادیب سے روشناس کروانا چاہتا ہوں جن کا تعلق قرغزستان جمہوریہ سے ہے۔ چنگیز اتماتوف نام نامی ہے، لینن انعام یافتہ اور سپریم سوویت کونسل کے رکن ہیں، سوویت یونین کے ہر علاقے کے علاوہ اُن بیرونی ممالک میں بھی مقبول ہیں جہاں اُن کے تراجم ہو چکے ہیں۔

ہاں تو چنگیز صاحب! میں آج کی گفتگو کا آغاز ایک ایسے سوال سے کرنا چاہتا ہوں جو غالباً آپ سے سینکڑوں بار پوچھا جا چکا ہے اور جس کا پورا تسلی بخش جواب مشکل سے ہی دیا جا سکتا ہے، لیکن اس قسم کا پروگرام عام طور سے کسی ایسے ہی سوال سے کیا جاتا ہے اس لیے شاید بار خاطر نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ آپ ادیب بنے کیسے؟ یعنی آپ کو پہلے پہل ادیب بننے کی اُمنگ کیسے پیدا ہوئی؟ گرد و پیش کے مشاہدے کے سبب سے، کتابوں کے مطالعے سے، یا کسی خاص سماجی یا معاشرتی صورتِ حال کے سبب سے، یہ تحریک کیسے ہوئی؟

چنگیز: میں بات سمجھ گیا۔ لکھنے کا جذبہ کیسے جنم لیتا ہے اور میرے اپنے ذہن میں اس کی جڑیں کہاں تک پہنچتی ہیں، دلچسپ مضمون ہے، اگرچہ اپنے اَن دیکھے ناظرین کے سامنے اپنی بات کرنا کچھ اشتہار بازی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال سنیے، اگرچہ یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتا ہوں کہ آپ اتنے بڑے شاعر کیسے بن گئے؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ فوری یا اضطراری عمل ہوتا ہے۔ غالباً بچپن ہی سے آپ کو بھی ادھر رجحان رہا ہوگا، ایک طرح کا داخلی دباؤ جو تمام روحانی محرکات کو یکجا کر کے کسی ایک ایسے نقطے پر جمع کر دیتا ہے جو شاعری کی جانب لے جاتا ہے۔ میں تو شاعر نہیں ہوں، نثر نگار ہوں اور مجھے روزمرہ زندگی کے علاوہ دُور کی باتوں سے

واسطہ نہیں۔ پھر بھی بعض جذبوں کی کوئی شاعر ہو یا نثر نگار اپنی تخلیق میں ان جذبوں کو بروئے کار لانے کا کوئی فطری ذریعہ ضرور ڈھونڈتا ہے۔
اس میں نئی کوششیں شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان نے تحقیق کیسے کی ہو اور یہ جو نئی نسل کے لوگوں سے واسطہ پڑا تو فقط سائنس
کی۔ خلا کے بیچ ہمارے انسان کے قدم رکھنے ہی پر شعر کرنے سے ہمیشہ قربت حاصل ہوتی ہے۔ اور کچھ معنوں میں ایک واقعی مسئلہ اور
بیسویں صدی میں ہونے والی فتوحات تھیں۔ انھیں قدروں کا علم نہیں ہو گا۔ کلاسیکی ادب سے میری رغبت سب سے پہلے انھی کی وجہ سے پیدا
ہوئی۔ ان میں کئی کہانیاں، مضامین، مقالے اور پرانی کتابیں، اقبال کی وجہ سے جو شہرت انھی سے ملی تھی۔ انھی ایک بیڑا اٹھا
تھی یا دکھی تھیں، پھر کبھی بنا پایا کرتی تھیں اور خاص طور سے اپنے پرانے کوچ کی تھی۔ پھر میرے بچپن کے ایام اور شباب کے
حالات میں تو جنگ عظیم نے آ لیا۔ آپ کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک، ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے
لیے یہ کیسی کڑی آزمائش کے دن تھے۔ میں نے ان دنوں اپنے لوگوں کو اجتماعی زوال اور اجتماعی دہشت کے واقعات کا سامنا
کرتے دیکھا، ساتھ ساتھ ہم نے بے نظیر شجاعت کے مظاہرے بھی دیکھے۔ ایک پوری قوم کی بے مثال شجاعت کے مظاہرے۔ ان سب
باتوں نے کوئی خاص اثر چھوڑا۔ اب یہ طلب ہوئی کہ جو کچھ لکھا ہے، جو کچھ محسوس کیا ہے اسے منتقل کروں، پھر یہ بات کا اتفاقی نتیجہ
ہے۔ ہم جس سرزمین میں رہتے ہیں اس کے وسیع روسی ادب سے انگریزی ادب تک پہنچے تھے۔ کلاسیکی ادب سے بھی اور جدید
ادب سے بھی۔ اور شاید آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ پڑھنے کے کتنے شوقین ہیں، پھر روسی زبان کے ذریعے سے ہم عالمی
ادب کا مطالعہ بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ ہوا کہ پچھلے کئی برسوں نے جس ادبی تجربے سے فیض حاصل کیا ہے اس میں ہماری تمام
روایت بھی شامل ہے، روسی ادب بھی اور عالمی ادب بھی۔

فیض: کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ آپ کے ملک کی ادبی روایت تو نسبتاً بہت جدید ہی ہے اور غالباً آپ اپنی زبان کے پہلے ادیب ہیں جو
دوسروں کی اس صف میں ہیں جنھوں نے اپنی زبان میں جدید تحریری ادب کی بنیاد ڈالی۔

آئتماتوف: ہمیں کسی پرانی روایت کو برقرار رکھنا کوئی نئی روایت پیدا کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے میں تو ان سب اسلاف کا
شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھ سے پہلے تحریری ادب کے لیے راستہ ہموار کیا۔

جب یہ بحث ہو کہ ہر بات کو اسی ترتیب سے لکھا جائے، یہ سوچ بھلا ہی ہے کہ وہ ایک مشکل تھی، جس کے سامنے ہر حق ادا ہو سکے کہ
اس کی زندگی میں اور اس کی زندگی سے پہلے جو کچھ پایا، وہ بہت کچھ جس کا تعلق ہم سے ہے، ان سب سے پوری طرح مطمئن ہونے
سے پہلے وہ کچھ سوچی ہوئی اور معاشرتی وجوہ سے پہلی کوشش ہوتا ہے، بے شمار انسان ناخواندہ اور جن کی خدمت کیے گئے ہیں، جس
کو مجھے بھی دکھ ہوتا ہے کہ انھیں سے وہ کچھ جو عظیم مصنفوں نے لکھا ہے اور وہ کچھ جو عام طور سے لکھا ہے تو مجھے اپنا
آپ محدود ہوتا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ وہ ان لذتوں کے لیے کیسے اچھے اور ان کی خوشی کے بیچ ہے، ان سے یہ لوگ محروم ہو
گئے ہیں تو میرا دل بہت دکھتا ہے۔

فیض: یہ تو میرے یا آپ کے ذہن ہونے کی بات نہیں۔ ہماری تاریخ یا اجداد کا ورثہ ہے۔ آج سے کئی چالیس برس پہلے تصور کیا تھا
چغتائی دنیا یا مغربی تحریروں کے کسی ایک میں تھی، اور جیسی شکل ہم نے حاصل کی وہ اور خود آپ کی حیثیت سے دوبارہ تحریر کیا
ہے۔ روس کے لوگوں کو تو کئی صدیوں کے بعد پہلی بار آگہی ملی ہے اور وہ علم بالخصوص ان سب ادیبوں اور ان کے حسن و حقیقت
سے پہلی بار آشنا ہو رہے ہیں۔ ان ملکوں کے زیب انتہائی خلوص کے ساتھ یہ جو ہم انسان کے تمام ذہنی تجربے کے علم و ادب
سے آشنا ہونے کی کوشش ان کے لیے صرف خلوص اور جدید بیش بہا ادب اور اب بھی لازم ہیں جو آپ کے پاس موجود ہیں لیکن ہم

اشاعت شکل میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن اب کئی ایک پاکستانی ادیب دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ اس عمل کی ابتدا تو ہو چکی ہے اور دنیا بھر کے ادیب اور قاری ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔ مثلاً رسول حمزہ توف کے اشعار کا ترجمہ ہمارے ہاں ہو چکا ہے۔ آپ کی کتب کا ترجمہ بھی غالباً جلد شائع ہو جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں سب لوگ مل کر کوشش کریں کہ اس رابطے کو مزید بھی مستحکم ہم اپنے لوگوں تک پہنچا دیں۔ دنیا بھر کے ادیبوں میں بہتر رابطہ پیدا ہو سکتا ہے۔ چناں چہ ہمیں افسوس نہ کرنا چاہیے بلکہ امید رکھنی چاہیے کہ یہ دوستی پہلا مرحلہ تو ہوئی ہے۔

اب میں آپ سے ایک دوسرا سوال کرتا ہوں یعنی آپ کے ناولوں میں ایک بات مجھے بہت دلچسپ نظر آئی اور وہ یہ ہے کہ آپ غیر جاندار چیزوں کو جیسے پہاڑ ہیں، دریا ہیں، جنگل ہیں، جانور ہیں، ان کو پیش کرتے ہیں اور ان مخلوقات کو جیسے "گھوڑ سوار" ہے انسانی کرداروں کی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ مغربی ادب میں تو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ نقطۂ نظر ادبی نگاری کا یہ آپ کی روایت میں شامل ہے یا آپ کی اپنی ایجاد ہے۔

چنگیز: میرے خیال میں غالباً حد تک یہ ایشیائی روایت ہی سے متعلق ہے جو ہماری کئی نسلوں میں رچی ہے یا یوں سمجھیے کہ جمالیاتی حقیقتوں کے ادراک کا ایک قرینہ ہے۔ ویسے تو یہ مسلّم ہے کہ انسان جو بھی ادب کی ایک منزل میں زمین، پانی، آسمان، درخت کو انسانی رنگ میں دیکھتا ہے اور انھیں دیوی دیوتا بنا دیتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ قدرتی صورت پر ان اور زمین کی کشش ہے۔ بعد میں دوسرے فطری مظاہر بھی انسانی روپ دھار لیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ایک قدیم قصہ ہے جس میں ایک شکاری ایک وحشی جانور "بڑی سینگوں والی پہاڑی بکری" کی بچی پر عاشق ہو جاتا ہے جو ایک خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے لیکن وہ جب جانتی ہے وہ اس کی ماں بکری کی نسل کا صفایا کر رہا ہے اور کوشش کرتی ہے کہ شکاری کو بہلا پھسلا کر اسے جنگل میں بھٹکائے لیکن یہ قصہ ہمیں دکھاتا ہے کہ جب ہمارے لوگ یہ قصہ سنتے ہیں تو وہ اسے بالکل سچ سمجھتے ہیں اور انھیں اس میں کوئی غیر فطری بات نظر نہیں آتی۔ میں حقیقت پسندی کے جدید اسالیب سے واقف ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حقیقت نگاری میں کئی ایسی باتیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں جو الہامی یا غیر حقیقی یا حقیقت سے دور نظر آئیں۔ لیکن پھر بھی حقیقت نگاری ہی کا جزو ہیں۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ میں نے روسی ادب اور عالمی لٹریچر سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ لیکن ادب یا تجربے سے کچھ حاصل کرنا تو آسان ہے۔ اس بنیاد پر اپنی سچی تخلیق اور تخلیقی قوت احساس سے فن پر لانا اور منفرد تکنیک وضع کرنا اصل کام ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں گے کہ میری نثر میں ایک لے ہے، ایک آہنگ یا ردھم ہے۔ یہ ہم قرغز لوگوں کی عام بول چال میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی سبب سے میں شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ہماری پرانی روایت سے ملا ہے جو اس سے زیادہ معروف نہیں ہے۔ اس کا ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔ ہر بات ایک شعر یا گیت ہو گی۔ ہمارا ایک کلاسیکی قصہ "ماناس" زبانی روایت کا ہے جس کے کئی حصے ہیں۔ کچھ بات ایسے اشعار ہیں جنھیں ہماری دادیاں نانیاں سب قصے پڑھتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عالمی ادب کا ایک اہم شاہکار ہے۔ آپ کی قدیم شاعری میں بھی ایسی ہی عظیم تخلیقات ہوں گی جو آپ کے عوام کو عزیز ہیں۔ انھیں بھی عالمی ادب میں ان کا مقام ملنا چاہیے۔

فیض: آپ کا تخلیقی کلام نثر ہے لیکن آپ نے یا کسی اور ادیب نے اس قصے کو کسی اور زبان میں ترجمہ کرنے کی زحمت کی ہے؟

چنگیز: ہمارے بہت سے ادیبوں نے کئی مرتبہ اس کا انگریزی یا روسی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ قصہ منظوم ہے اور قصہ کی بحر یا قافیہ اور شاعری کی بحر کا ترجمہ سے باہر ہے۔

فیض: اچھا ایک بات اور بتائیے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ روسی اور قرغز دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ بہت سے ناولوں میں جس میں ہمارا

خلف بھی شامل ہے ایک عام مشاہدہ ہے کہ ادیب روزمرہ بول چال میں ایک زبان استعمال کرتا ہے یعنی اپنی مادری زبان اور لکھنے میں ایک دوسری زبان جو اس نے تعلیم و مطالعہ سے سیکھی ہے۔ جب آپ کوئی چیز قرغیزی زبان میں لکھتے ہیں یا پھر روسی زبان میں تو آپ کو اظہار مطلب میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟ کیا آپ ان میں سے ایک یا دوسری زبان میں نسبتاً زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں؟

چنگیز: میں اپنی ہر تحریر پر بہت محنت کرتا ہوں۔ بعض وقت مجھے کئی بار مسودہ یا عبارت کی نظر ثانی کی ضرورت نظر آتی ہے اور میں اس میں کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں۔ جہاں تک زبان کے انتخاب کا تعلق ہے تو یہ سوال بہت سیدھا ہے۔ مگر مجھے ایک زبان میں لکھنا دونوں ہی زبانیں اچھی لگتی ہیں بلکہ تو میں دوسری زبان میں لکھ لیتا ہوں۔

فیض: اب ایک آخری سوال آپ کی تصانیف کے بارے میں۔ میں نے تو صرف آپ کے تین یا چار ناول یا طویل افسانے پڑھے ہیں جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ آپ کا کوئی طویل ناول میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن آپ کے افسانے بھی کسی ناول سے کم نہیں۔ مجھے پوچھنا یہ تھا کہ ان افسانوں میں جن کرداروں یا شخصیتوں کا بیان ہے، جیسے دانیار، جمیلہ اور دوسرے لوگ ہیں، یہ سب خیالی کردار ہیں یا کوئی زندہ شخصیت آپ کی نظر میں تھی جسے آپ نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

چنگیز: دیکھیے یہ بھی ہر افسانہ نگار کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس میں مرکزی تو حقیقی زندگی ہی کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو زندگی ہی سے کوئی واقعہ یا کوئی مضمون اخذ کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنے ذہن یا تخیل سے کسی افسانوی روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔ حقیقی لوگ، ایک خاص زمانے اور ایک خاص ماحول میں یہ تجربہ پیدا کرتے ہیں اور پھر اس مسالے پر تخلیقی عمل کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس لیے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے سبھی کردار واقعی حقیقی شخصیتیں ہیں لیکن وہ کون ہیں؟ ان کا نام کیا ہے؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔ کئی لکھنے والے کسی خصوصی شخصیت کو سامنے رکھ کر اس کی ہوبہو تصویر کشی کرتے ہیں لیکن میری رائے میں اس طرح کی کردار نگاری ہمیشہ سپاٹ ہو جاتی ہے۔ میں اپنے آپ پر اس قسم کی پابندی لگانے کا قائل نہیں ہوں۔ کچھ لوگ اس سے اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ادبی یا افسانوی کردار کا نقش کسی واقعی کردار کا عکس ہونا چاہیے۔ حقیقت نگاری کا تقاضا بھی ہے کہ حقیقت کو بعینہٖ پیش کیا جائے۔ اس مسئلے پر اکثر بحث چلتی رہتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ بنیادی حقیقت کو صداقت سے اور سچے طور سے پیش کرنا چاہیے لیکن اسے کس صورت میں یا کس انداز میں پیش کیا جائے یہ ادیب کے اپنے اختیار میں ہونا چاہیے۔ دونوں کا فرق یہی ہے جو عرض ہے۔

-☆-

نذرانۂ عقیدت

نذرِ فیض

افتخار عارف

جو فیض سے شرفِ استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہلِ درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں
رموزِ مملکتِ حرف جاننے والے
دلوں کو صورتِ معنی کشادہ رکھتے ہیں
شبِ ملال بھی ہم رہ روانِ منزلِ عشق
وصالِ صبحِ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں
جمالِ چہرۂ فردا سے سرخ رو ہے جو خواب
اُس ایک خواب کو جادہ بہ جادہ رکھتے ہیں
مقامِ شکر کہ اِس شہرِ کج ادا میں بھی لوگ
لحاظِ حرفِ دل آویز و سادہ رکھتے ہیں
بنامِ فیض، بجانِ اسد فقیر کے پاس
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

☆

بیادِ فیض

احمد فراز

قلم بدست ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دُنیا کا تذکرہ لکھوں
لکھوں کہ تُو نے محبت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں
جہاں یزید بہت ہوں، حُسین اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمیں کو بھی کربلا لکھوں

ترے سخن سے ہر لفظ "نقشِ فریادی"
تو تخیل "دستِ صبا" پہ ہے آئینہ لکھوں
مثال "دست تہِ سنگ" تھی وفا ان کی
سو کس طرح انھیں پابندِ جفا لکھوں
حدیثِ کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو نقشِ تحریر روا لکھوں
سجی سجی ہیں "صلیبیں مرے دریچے میں"
سو اہلِ حق و منصور جابجا لکھوں
گراں‌تر ہے بہت "شامِ شہرِ یاراں" آج
کہاں ہے تو کہ تجھے جانِ دلربا لکھوں
کہاں گیا ہے "مرے دل مرے مسافر" تو
کہ میں تجھے رہ و منزل کا ماجرا لکھوں
تو مجھ کو چھوڑ گیا کہہ کے "سج رہے وقت"
بتا کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں
"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
تھا حوصلہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

***

احمد وحید اختر

کچھ بات سے انتظار سوالِ نظر میں ہے
سازِ حیات لذتِ سوزِ جگر میں ہے
سوزِ جگر کا راز تمھاری نظر میں ہے
کب تک حجاب اے مہِ کامل میں رہو گے تم
جس کا جمال زینتِ صورت گری میں ہے
مشتاقِ جلوۂ یار کے نکلے ہو بار بار
اقسامِ حیات تمھاری نظر میں ہے

***

فیض

اختر حسین جعفری

وہ جو شبِ دیدنی میں تھی روشنی
سرِ طور شوق رہی نہیں
یہ چراغ کس نے بجھا دیا شبِ منتظر ہے سحر سے
ابھی اس حرم کے طواف میں تھے قدم مرے
مجھے کس نے روک دیا ہے ہمسری کہ بہت ضرور تھے مرے ابھی
اس کے منبر و بام سے

مجھے وہ پہر ہے عجیب قحط سا پڑا
ترے ساز میں کوئی پرندہ سا لحن لیث اتر گیا تو فغاں
کی شکل بدل گئی

مجھے وہ پہر ہے عجیب قحط سا پڑا
جو جسم تھا صفات کی کشش اور دست لگی
کسی خواب کی منتظر شبِ ذات میں
کہیں ... وقت کی صدا نہیں کہ ملامت کی جا کا
وہ جو زخم کو اٹھا چلا گیا

مرے سامنے شبِ منتظر سے چراغ کس نے بجھا دیا
مرے جسم و جان میں سخت زباں ... ناقصت میں حصار ہوں
... سینے میں سانس تھے جو گزرتے ہم کی ...
پہ نثار ہوں
ابھی اس حرم کے طواف میں تھے قدم مرے
مجھے کس نے روک دیا ہے ہمسری کہ بہت ضرور تھے مرے
ابھی اس کے منبر و بام سے
ترے ... مرے ... خوشبو تمام سے
... سر شام سے
رہ گیا

اسد اردا ...

اے دنیا ... ری اے
نے ... بیٹھ ... چلا

واری واری اسیں ساریاں کھچی کرنہ
آئی وار نہ تیرے انگو جانا
میرے وچھڑیاں وچھوڑن کئی ہو گئے
تے کسیں کئی پن دے وچھڑیاں جد جانا
باہیں شاں دوپٹے لیراں والیاں نے
سجناں قافلے ٹرے ہی ٹور جانا

☆

آغا آفتاب قزلباش

نوید آمد فصل بہار لائے ہیں
چمن کے نام پہ عز و وقار لائے ہیں
تری نوا سے جوانی کو پاکیزگی ہے نصیب
وطن میں آج تمہارے حضور لوگ عجیب
تجھی سے مسلک دار و رسن کی زینت ہے
ترے ہی فیض سے دنیا میں اپنی عزت ہے

☆

نذرِ فیض

ابوالخیر کشفی

ارباب ہوش منزل آسودگی میں ہیں
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آگے ہیں
جس دل سے زندگی کو ملی تھی سرمدی
نغمے مرے خیال کے اس دل سے آگے ہیں
صحرا کی ریگ چشمۂ مہتاب بن گئی
جلوے نظر کے رونق محفل سے آگے ہیں
تیغ جفا بھی عشق کے قدموں پہ جھک گئی
زنداں ہو کہ کوچۂ قاتل سے آگے ہیں
کشفی ادائے دوست کے سانچے میں ڈھل گئے
جو "آگہی" ہے اس کے مراحل سے آگے ہیں

☆

وہ جو فیض تھا

ادا جعفری

وہ چلا گیا
وہ جو آشنائے فغاں بھی تھا
جو نشانِ سرِ زیاں بھی تھا
جو نگارِ دار و رسن بھی تھا

کہ قبائے گل میں جو رنگ تھے
وہ اسی کے داغِ جگر سے تھے
جو صبا کے نقشِ قدم ملے
وہ اسی کی حدِ نظر سے تھے

وہ جو اس کے لہجے کی خستگی
وہ جو خستگی کا طلسم تھا
وہ ثباتِ عشق کی بات تھی
وہ جمالِ درد کا نام تھا
وہ گواہِ شبِ نیاز تھا
کہ اجالے دن میں جو سوز تھا
وہ اسی کے حرفِ سخن سے تھا

وہ ابھی دولتِ سحر رہا
وہ اسیرِ خوابِ وطن سے تھا
جو وفا کے نام پہ سو طرح
کبھی جی اٹھا، کبھی مر گیا
وہ مسیح و خضر بہ قدِ عمر
وہ غزل سرا جو چلا گیا
تو کھلا ہے اس دیار پہ
وہ جو فیض تھا الم نشرح
وہ جو انجمن میں تھا ایک ہی

جسے اُمید ملی ہے صدی صدی
جسے موت بھی نہیں چھو سکی
یہ جو دشتِ شب میں چراغ ہیں
اُسی کی خوش نوا نے جلائے ہیں
اُسی چشم چشم نگاہ نے
مہر و آفتاب لٹائے ہیں
مری آنکھ کو، تری آنکھ کو
جو کرن کرن سے سجا گیا
وہ چلا گیا!

نذرِ فیض

اسلم فرخی

صلیب و دار کے موسم کا رازدار گیا
گلوں کا دور گیا، عصرِ نو بہار گیا
غرورِ شعر گیا، حرفِ اعتبار گیا
اُداس شہرِ تمنّا ہے کہ شہریار گیا

وہ اس طرح شبِ تاریک غم گزار گیا
جو جیت ہار سے بگڑی تو جیت ہار گیا

تمام عمر رہا جس کے عشق فریادی
تمام عمر لکھی سرگزشتِ آزادی
اُسی کے نغموں پہ نازاں ہیں دل کی آبادی
قفس میں نقش ہے اُس کی بہار ایجادی

اُسے متاعِ سحر بھی وہ جلوہ بار گیا
کھِلا شگوفۂ شب ہائے انتظار گیا

اُسی کے فیض سے مہکا ہوا ہے دستِ صبا
اُسی کے نغموں سے موتی ہے دامنِ سینا

تہ بہ تسلسل نہ تھا اہتمام رسم کہا
بجا ہے جامۂ زنداں، در قفس ابھی خالی

یہ مت کہو کہ گیا فیض شہریار گیا
ہمارے عہد کا اعزاز و افتخار گیا

فیض صاحب

امجد اسلام امجد

بہت خوش بخت ہیں آنکھیں
جنھوں نے اُن کو دیکھا ہے
بہت خوش صوت ہیں وہ لفظ جو ان کے
قلم کی نوک پر چمکے
سخن کے آسمانوں پر ستاروں کی طرح ابھرے
بہت خوش رنگ ہیں وہ پھول جو اُن کے
چمن زارِ ہنر میں کھِلے اور اُن کی مہکتی خوشبو
ہمارے صحن تک آئی
صبا کے ہاتھ پر چڑھ کر
سحر کے آخری تارے کی وہ صبحِ ضیا لائی
کہ جس کو روشنا دیوارِ زنداں کے مقابل میں
قفس میں جو کبھی آباد و شاداب رکھی تھی
امیدِ چشمِ مہتاب رکھی تھی

وہ کہتے تھے بہار آئی ہے یادوں سے جدا ہونے والا
تمھارے در پہ آیا ہے نیا آزار کا موسم
چلو پھر سے غزل لکھنے کی یہ دن ہیں شاد ہونے کے
چمکنے کا سماں آیا نیا فریاد کا موسم
ابھی تک یاد ہیں مجھ کو
وہ ان کی سوچتی آنکھیں، وہ ان کا ٹوٹتا لہجہ
وہ ان کا ذہن جو ہر مظلوم کے غم میں بہہ جاتا تھا

وہ اُن کے خواب جن کی روشنی تک نہ پا سکے
کسی بھی ذات کے سائے!

سحر ہو شب گزیدہ تو میں اُن کو یاد کرتا ہوں
نظر ہو آبدیدہ تو میں اُن کو یاد کرتا ہوں
مری مٹی کی خوشبو بولتی ہے اُن کے شعروں میں
وہ شاعر تھے
محبت کے سمندر میں، جفا کے مرحلوں میں
ہمارے آپ کے بھرتے اندھیرے چاند خوابوں میں
قلم سے اُن کے جو لکھا جو دیکھا اُن کی آنکھوں نے
دلوں کو گدگداتا ہے
اندھیروں اور اُجالوں کا
وہی تو استعارہ ہے
ہمارے عہد کے زندہ سوالوں اور جوابوں کا

بہت خوش بخت ہیں وہ لوگ
جو اپنے کسی محسن کو دل سے یاد کرتے ہیں
اگر وہ محسن رہے ہیں تو (یقیناً محسن رہے ہوں گے)
مجھے بس اتنا کہنا ہے
کہ فیضِ فیض ہے جاری ہمارے ہر طرف جاری
ہم اُن کو یاد کرتے ہیں
اور اُن پر ناز کرتے ہیں

ـ نذر ـ
نذرِ فیض

اشرف جاوید

”کچھ عشق کیا کچھ کام کیا“
کچھ تقدیر سے، کچھ نام کیا
کچھ رنگ بکھیرے کاغذ پر
پھر اُن میں جو الہام کیا

ہر روز اُسے اِک خط لکھنا
ملنے ماہ و برس کو عام کیا
دو آنکھیں ہونٹوں سے باتیں
جب اُن ہونٹوں کو جام کیا
جب پَر پھیلائے اُڑنے کو
جب آب و دانہ دام کیا
ہر ہاتھ اُٹھائی پایل میں
محفل میں بپا کہرام کیا
پھر خاک اُڑائی گلیوں میں
پھر اُجلے دن کو شام کیا
اب صحرا اوڑھ کے بیٹھے ہیں
وحشت نے ہمیں گمنام کیا
جس دل پہ صدقے واری تھے
اُس دل نے کام تمام کیا

☆

فیض کے فراق میں

پروین شاکر

تجھے خبر ہے
کیسا چراغ رات نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہوائی ہوا
کفِ دستِ یارِ صبا سے عشق پہ کیا گرا
تجھے کیا دکھیں اب بہار کتنی کھلی
ہمہ شہر یاد میں اور نگار کہیں کہیں
گلہ سحر پر کوئی ہم راہ دور داب نہیں تیرے سخن
وہ عیار اُٹھائے کہ مرتضیٰ کہیں راستے
مرے ماہتاب کہاں ہے تو
کوئی اور بھی ہے نگار ماہ رو جنوں جس کی دور ذات ہے تو
ترے قرض کیا ادا کریں پہ کوئی ان سے زمین کی یہ کشش بڑھی

کہ یہ بہ لطف تمھی میں قدم اٹھاتی ہیں تمھارے لیے

مرے لیے نواز

قبائے ساز تن سے فراق میں چاک ہے

وہ شکستہ شیشۂ تن میں ہے

کہ صدائے دریچۂ چشم شیشۂ تار دل نشانی ہے

یہ وقت عجب اور آپ کی خوب ہے

کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے

کوئی طلسم ہو کہ راہ گھر سے سجھائی دے!

آپ کا

فیض

حبیب جالب

وہ شعار محبت کی روشنی ہے فیض
سلام فیض کو، ہم سب کی زندگی ہے فیض
نہ شیخ سے کوئی رنجش، نہ برہمن سے لگاؤ
کہ آدمی ہے، سمجھدار آدمی ہے فیض
ہوئے ہیں ایک یہاں بندۂ مصلحت کیا کیا
الگ ہے فکر و اظہار اور وہی ہے فیض
شب سیاہ کو ہم جو سحر نہیں کہتے
یہ بات کہنے کی جرأت بھی تو نے دی ہے فیض
یہ حسن اور جس میں نظر نہیں آتا
جدا بھی ہے مگر اپنا یار بھی ہے فیض

جالب

حسن رضا عباسی

زمین پہ کس کی؟ دشمن کوئی بھی جلاد کرے
کہاں عمر یک گزرے قصیدہ یا مرثیہ
شعر جنت کے گلستان دا آئے ہیں
وہ شعر کا آئینہ ولولہ وقت کے زخموں پہ

جہاں دریچہ واسطے انجانے
تمام عمر کی نے کی قرا حسین کی تھی

اُسی بلادِ تمنا کی سرحدوں کے تئیں
سلام یارِ دلِ آزردہ کا پیام ہے
”قفس سے آتی صبا بے قرار گزری ہے“
اور ایک بار نہیں بار بار گزری ہے
”تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے“

☆

فیض

حمیدہ شاہین

عروجِ حرف و معانی سنبھالنے والا
متاعِ کرب کو لفظوں میں ڈھالنے والا

مکانِ شہرِ شبِ تار کے پیالوں میں
لہو میں بھیگے ہوئے خواب ڈالنے والا

کسی کے دستِ صبا سے بہار کا ساغر
نئے ہنر کو فلک تک اچھالنے والا

قلم سے گویا ہمارے تراش لیتا تھا
تیرے فکر سے راہیں اُجالنے والا

وہ فیض جس نے چراغوں کو کر لیا گھر
محبت زندگی میں اپنی پالنے والا

وہ ایک چراغ تھا شب کی منڈیر پہ روشن
زمانے بھر سے اندھیروں کو ٹالنے والا

بفیضِ فیض رواں ہے جو کاروانِ سخن
ہجومِ اشک میں رستے نکالنے والا

☆

رفیقِ منزل

رفعت سروش

تجھے رفیق کہوں ، ہم سفر کہ راہ نما
مری نوا میں ترا سوز و ساز شامل ہے
چھپی رہی ہے جو منزل ترے تصور میں
وہی مرے بھی شعورِ جنوں کی منزل ہے

جہانِ درد میں ہم سب ہیں "نقشِ فریادی"
جہاں کا درد ترے نغمہ و کلام میں ہے
عجب ادا سے تو اِس دور میں ہے نغمہ سرا
نوا کی گونج تری بزمِ خاص و عام میں ہے

"یہ داغ داغ اُجالا ، یہ شب گزیدہ سحر"
کہ جس کی تاب نہ لائے شعورِ اہلِ نظر
ترے جنوں کو نیا عزم اُسی نے بخشا ہے
تری غزل ہے کہ اِک نغمۂ عروجِ بشر

فرازِ دار و رسن پہ ہُوا تو نغمہ سرا
حیات تیرے لیے بے قرار گزری ہے
نشانہ سنگِ ملامت کا کیوں نہ بن پایا
"یہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے"

اُن کا خیال ، اُن کا بیان ، اُن کا تذکرہ
ہر بزمِ شاعری میں ہے اِک موجِ رنگ و بُو
یہ ماننا پڑے گا کہ ہیں فیضؔ بے مثال
اکثر دبی زبان سے کہتے ہیں خود عدو !

اِنسان دوستی کا وہ عالم کہ جیسے پھول
جو چاہے رنگ مانگ لے، نکہت سمیٹ لے

ہے ان کے دل میں خون کے بدلے ضمیر بھی
جو آئے زندگی کی لطافت سمیٹ لے !

سمجھے تھے شمار معیارِ حق ہیں وہ مگر .....
ان کی نگاہ انجم و مہتاب دیکھتی ہے
قرض ہو گی ندیم غالبِ خستہ کر اب تو یہ :
اب ایک شکل جہاں آ رہا ہے !

—٭—

رنگِ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام

رعنا اکبر آبادی

جو دوانی ہے وفا میں جل کے مر جانے کا نام
شمع کی آغوش میں روشن ہے پروانے کا نام
کیفِ غم کی صحبت مستقل ہے زندگی
موت ہے اس ساز کے خاموش ہو جانے کا نام
دیکھیے اب آپ کی نظروں پہ الزام آئے گا
آپ کہلائے شمار ہیں کس کے دیوانے کا نام
مجھ کو دیوانہ بنائے اک زمانہ ہو گیا
یاد بھی اب تو نہ ہو گا ان کو دیوانے کا نام
نیں کے سمجھاؤ رعنا اپنے دیوانے کی قدر
شیشہ جب ٹوٹا تو پتھر بنتا ہے پیمانے کا نام

—٭—

ہزار رفقا اور ہے آزار رسا ہے

رضا ہمدانی

مسعود و افکار میں اک حشر بپا ہے
اب تک بھی انساں کے لیے عرفِ دعا ہے
ہر گام پہ ملتی ہیں مستوں میں کہرام بپا ہے
دیوانوں نے جینے کا چلن سیکھ لیا ہے
اب وحشتِ جاں بھی جو سہہ آئے عجب ہے
دیوانہ کوئی سنے کے تو نام آتا ہے

ہم ذوقِ سماعت سے ہیں محروم وگرنہ
ہر قطرۂ شبنم میں دھڑکنے کی صدا ہے
دھڑکا یہ لگا ہے کہ نظر آئے نہ آئے
اس غم سے سرِ شام ہی دل ڈوب رہا ہے
انداز کچھ ایسا ہے رضاؔ اپنی غزل کا
سنتا ہے جو بے ساختہ کہتا ہے رضا ہے

☆

رشید احمد لاشاری

اے نگارِ فیضؔ! اس لطف و کرم کا شکریہ
دم نہ تھا کچھ اپنے دم میں تیرے دم کا شکریہ
شہریارِ علم و فن، لوح و قلم کا شکریہ

☆

فیضؔ

عبدالغفار عزمؔ۔ لندن

قدرِ قلم و لوح ہے عرفانِ فیضؔ
ہے عام زمانے میں کہ احسانِ فیضؔ
پایا ہے عمل کا درس دُنیا نے عزمؔ
پیغام میں جاری ہے کہ فیضانِ فیضؔ

افکار و احساسات میں اس کا فیض
تحریکِ حق و انصاف ساز تھا فیضؔ
وہ خوشحالی و امنِ عالم کا نقیب
سرگرم مجاہد تھا کہ رہنما فیضؔ

بیداد گروں کے حق میں کھٹکا ہے فیضؔ
آوازۂ انصاف بھی یکتا ہے فیضؔ
ہر ظلم و ستم کو ڈھانے کے مقصد میں
بس فیضؔ کا ہر سمت کہ پھیلا ہے فیض

مقصد یہ ہے کہ فیض سے کیا ہم کو ہے گلہ
آفاقی اُن کی نظر ہو، مفہوم ہو
کہ داستانِ زندگی جدا اصل سے نہ ہو
غم اور بھی ہوتے ہیں محبت کے سوا

۔۔۔

فیض۔ ایک چراغِ فکر

سلام مچھلی شہری

سمجھا! میں روشنی کا پجاری نہیں اور مجھے
ہر ایک چراغِ فکر و تخیل سے پیار ہے
یہ شمع جس جگہ ہو؛ جہاں بھی ہو ضوفشاں
میری نگاہ صدقے، مرا دل نثار ہے

دور از حدودِ وقت ہے شعر و ادب کی بات
جس دل میں بھی خلوص ہے منزل اسی کی ہے
طوفاں سے بھی لڑے گا جو آرٹ کے لیے
تا حشر بزمِ جلوۂ ساحل اسی کی ہے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہے مجھ کو ربطِ خاص
ہمعصر دوست "فیض" سے، اُن کے کلام سے
ہم ایک میکدے ہی کے ہیں بادہ کش تمام
حسرت ہے نہیں کہ پی بھی ہو گھونٹ اُن کے جام سے

کہتا ہوں اُن کو "دوست" مگر راز یہ ہے
دیکھا بہت قریب بھی، دیکھا ہے دور سے
وہ ایک چہرۂ فکر ہیں، اِن محفلوں میں آج
اے دوست واسطہ ہے تجھے حرفِ نور سے

۔۔۔

گرمیِ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو!

جمیلہ نجمہ علیم

دوستو! خوابِ شبستاں کا ہنر تو دیکھو
کاسۂ سر لیے آئی ہے نظر تو دیکھو
درد کی دولتِ نایاب مرے پاس بہت
ظرف کی داد تو دو میرا جگر تو دیکھو
منزلِ شوق شبستاں ہے گریزاں ہی سہی
راہ گم کردہ مسافر کا سفر تو دیکھو
کون سے زخم اٹھاتا ہے بہاروں کا غلاف
مجھ کو الزام نہ دو اپنی نظر تو دیکھو
فکر ہم رنگئ پیمانہ تلاش جائے ہو
داغِ ہم رنگئ مطلب مگر تو دیکھو

☆

سالک الہاشمی

"نقشِ فریادی" ہو کہ ہو بے نفس تا عمر ہا
ہر ورق پیار کا مجموعہ ہے "دستِ صبا"
"دستِ زنداں" میں ہر حرف سے لہو کی زندگی
اہلِ زنداں کو چھوڑ آئے نہ کیوں اس کی ادا

جلم کی خوشبو سے تا "دستِ تہِ سنگ" آج تک
شاہکارِ عصر کی صورت گری کرتا رہا
اہلِ فن کے درد کی تصویر ہے تیرا کلام
گونجتی ہے قصرِ استبداد تک تیری صدا

☆

نذرِ فیض

شاہد ماکلی

اس کی ہر ایک گفتگو پر
مسکرا دی
اس نے اپنے تحفتاً مسکرا دی

اُس کے الفاظ دِل میں اُترتے رہے
اِک زمانے کو گرویدہ کرتے رہے
اُس کی دُنیا نے سب کچھ دیا تھا اُسے
دادو تحسین بھی، عزت و پیار بھی
بامِ شہرت بھی، عظمت کا اقرار بھی
کوئے جاناں بھی، زنجیر بھی، دار بھی
گلشنِ درد بھی، تلخیِ جام بھی
کنجِ زنداں بھی، رنگوں بھری شام بھی
لطفِ یاراں بھی اور سنگِ دُشنام بھی

اور وہ خوب لوا پنے افکار سے
ساغرِ وقت لبریز کرتا رہا
اُس کی ہر ایک تخلیقِ نَو
مُسکراتی رہی

-☆-

شبنم رُومانی

دستِ صبا کی دستک سے
زنداں کا در ہی ٹوٹ گیا
میرا مُسافر، جو میرا دل تھا
ساتھ ہی اُس کا چھوٹ گیا

اب ہر ہاتھ ہے... دستِ تہِ سنگ
اب ہر نقش ہے فریادی
جس کے دریچے میں تھیں صلیبیں
مل گئی اُس کو آزادی
جس کی متاع تھے، لوح و قلم
اور جس کی آنکھیں تھیں بیداراں
شام شہرِ یاراں میں
کھو گیا وہ بھی چاند سا ماں

اُس کی آنکھیں روشن تھیں
تو ساری شمعیں روشن تھیں
اُس کی آنکھیں بند ہوئیں
تو سارا جہاں بے فیض ہُوا

☆

جاوید شاہین

جس سے لگا ہُوا تھا یہ میلا کہاں گیا
رونق پسند عشق تھا، تنہا کہاں گیا
شب کے جگر میں اُتری کرن رہ گئی کدھر
جو تھا نشانِ صبح وہ تارا کہاں گیا
اب ظالموں سے میرا مقدمہ لڑے گا کون
انصاف کے حصول کا وعدہ کہاں گیا
ہاتھوں میں رہ گئی فقط تشنگی کی ریت
جو بہہ رہا تھا سامنے دریا کہاں گیا
مشکل ہُوا ہے دیکھنا دیوارِ دل کے پار
سچائی کی طرف کا دریچہ کہاں گیا
ٹھٹھرا ہُوا بدن لیے پھرتا ہُوں شہر میں
اِن سردیوں میں دھوپ کا ٹکڑا کہاں گیا
اب جسم کے نواح میں بکھری ہوئی ہے راکھ
دل سے نکل کے درد کا شعلہ کہاں گیا؟

☆

مجتبیٰ طہرانی

ذرّوں میں تابشِ مہ و انجم تجھی سے ہے
قطروں کے دل میں دولتِ قلزم تجھی سے ہے
موجوں میں آرزوئے تلاطم تجھی سے ہے
محنت کشوں کے لب پہ ترنّم تجھی سے ہے
تیرے جنوں سے عظمتِ فصلِ بہار ہے
ہاں تُو جہانِ شعر کا پروردگار ہے

☆

شوکت عابدی

جو اہتمامِ بہار دوام کرتے ہیں
بصد خلوص انھیں ہم سلام کرتے ہیں
ہیں ابتلا کے طوفانوں کی تُرشیاں اُن سے
وہ لوگ دیدہ و دل میں قیام کرتے ہیں
فرازِ دار انھیں کو نصیب ہوتا ہے
جو کائنات محبت میں نام کرتے ہیں

☆

نادر غنکاری

تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعرِ عصر تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز

نطقِ جمہور کی ہے آہ تو
تیرے افکار کی اساس ہے یہ
ہمدردی، قرب، راستی، خوشبو
تیرے اشعار کا لباس ہے یہ

تو نے کتنی ہی دکھ بھری راتیں
اپنے پندار میں سمو لی ہیں
کٹ گئے جب بھی تجھ سے لوح و قلم
انگلیاں خون میں ڈبو لی ہیں

کبھی تیور ہے "نقشِ فریادی"
کبھی شہرِ صبا ترا حرف
درد کا رشتہ استوار رہا
کبھی پُرنگار ہیں، کبھی دل

کوئے دار و رسن کیا آباد
صحنِ زنداں بھی بستا رہا
آسمانِ وطن کے شبستاں چاند
تو بہر طور جگمگاتا رہا

موجِ دردِ فراقِ یار میں بھی
شعلۂ دم بہ دم دمکتا رہا
مشعلِ نور بن کے تیرا قلم
ظلمتِ دنیا میں چمکتا رہا

کبھی چھلکا ہے جامِ محفل میں
گردشِ بادۂ گلرنگ دیرِ مغاں کی طرح
کبھی اپنے لہو سے آسودۂ داغ
پر کیا جامِ انجمن کی طرح

اہلِ دنیا کے گلشن میں بھی
نئی صورتِ بہار کیا
کبھی ڈھلنے قبائے خونیں سے
دامنِ گل کو لالہ زار کیا

تیرے آہنگ سے گلستاں میں صبا
ترمِ الفت کا کاروبار رہا
تیرے ہی نغمے سے زمانے میں
پرچمِ الفت کا وقار رہا

☆

تہمینہ وریاض

یہ مرحلہ نئے گل سا نازک ہے
یہ ساعتِ عرفانِ سوز و دم کا
یہ جلوۂ شام کی تمکنت ہے

اے ابر جوش، تماشہ بہار
جادو نہ تھا ، نہ کوئی منزل
تجھ دیدۂ آب گوں الجھن کے
تجھ طلب الجھن کا خونچکاں ہیں

ڈالے تجھے جس جہاں پکار
تھمیں مجھے ڈگر زمیں نگاہیں
ماتھے تکیں پلٹ کے آئیں
دیں مجھیں سب تیری صدائیں

تم سرخ گل میں آ رہا ہے
بے خود راتیں نگاہ داری
تم بندۂ شعر ، پرندۂ جاں
پروانہ جلی زندگی

اب ممکن ہے کہ ہر عذاب سے محفوظ
باہر نگھوں کی دھڑکن سے
ماؤں حصار محبتوں میں
تم محفوظ ہو چکے ہو کب سے

"اب آؤ تم چھوڑ کے کبھی تم"
اے دلبری میں نقش انجم
کیا سخت قیامت پڑی ہے
یہ وصل دوام کی گھڑی ہے

—
فیض

نگیں شفائی

عسکر قاتل فیض کے ہو جائیں گے
خون دل میں جو قلم اپنا ڈبو جائیں گے

سب کو جانا ہے مگر جائیں گے جب لیتی نے دوست
کالی راتوں سب تک ٹھہر پہ جائیں گے
وقت رخصت آج وہ لڑکی کے بادل کی طرح
بوندیں جھولیں پلکوں پہ آئے ٹھہر جائیں گے
اک دن بھی کے وہ خوابوں کے جزیرے ایک دن
اس کے ہونٹ منظر کو بنا جائیں گے
پاؤں کا بہانے سے جائیں گے بھی
وہ تو پاتال میں بہت گہرا اتر جائیں گے
بجلی کے بعد نرم بوتل و روشنی کو نکال
رات تجھ سے میں پر آتی کئی لمحہ جائیں گے
ہم کو بھی چھوڑ کر چلے گئی آپ دور کچھ
ایک دن تم بھی ڈھونڈ کے سر جائیں گے

-۱۲-

کشور ناہید

زمین محبت ہے ذہن کے خلیوں میں
وہ سبز جو زمین سے نکلنے کا راستہ ہے
وہ ذہن کے شعور میں گم رہتا ہے
وہ ذہن کے دریچوں سے نام کرتی
طاقتور کے بھی زمانے
سمجھوں سے آگ لگانے
وہ ڈھونڈنے جو بارشے میں گم ہو
آئے بھی سائے بچھے
تو اب آئینہ آنکھوں کے تخیل
کی اماں جان کے گھر تک
کہ میرے ہاتھ
بنت قلب محبت سے نفرت جو کم آئے
نہیں تیسے مانے
کہ جسے دیکھو ہاتھوں میں
بلا سوال جسم نکلے

شہریار پاشے

میں اپنے گھر میں بطور قیدی ہی دن گزاروں
میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاؤں
مگر نہ رزق زمیں پاؤں
میں اپنے دیوار و در کی چھاؤں میں
دشمنِ وطن کو فراغ پاؤں

☆

نعرہ حق دا، شہید منصور والی

منّو بھائی

دیوا آس دا بلے ہنیریاں وچ
نویں فجر دا سانوں یقین دیوے
کجھ رحمتاں عرش دی مہربانی
کجھ نعمتاں سانوں زمین دیوے

باس مٹی دی، روپ گلاب والا
ہتھ قلم دا، مکھ کتاب والا
مزہ شہد دا، ڈنگ عذاب والا
وچ شوق دے نشہ شراب والا

چپ رات تاروں مہربان تھوڑی
سخن سحر دوپہر دے نور ورگا
مینہ جیٹھ دا، دھپ سیال والی
چھاں بوہڑ دی، میوہ کھجور ورگا

عقل عاشقاں، سوچ دیوانیاں دی
فکر ماپیاں، بھول ایانیاں دا
پینڈے عمر دے ڈونگھ سمندراں دا
سفر تھلاں دے، صبر مہانیاں دا

نعرہ حق کا، شہید منصور والی

ترجمہ: پروین ملک

دیا آس کا جلے اندھیرے میں
نئی صبح کا ہمیں یقیں دے دے
کچھ رحمتیں عرش کی مہربانی
کچھ نعمتیں ہمیں زمیں دے دے

باس مٹی کی، روپ گلاب جیسا
ہاتھ قلم تو چہرہ کتاب جیسا
مزہ شہد کا ڈنگ عذاب جیسا
بلا شوق میں نشہ شراب جیسا

چپ رات سے بے مہربان بڑھ کر
سخن بھری دوپہر کے نور جیسا
مینہ جیٹھ کا، دھوپ ہے سرما کی
چھاؤں برگد، میوہ کھجور جیسا

عقل عاشقوں، سوچ دیوانوں کی
سوچ بڑوں کی، بھولپن بچوں کا
سفر عمر میں وسعت سمندروں کی
تھل کی راہوں پہ، صبر ملاحوں کا

جیہڑا شیریں دے نال فرہاد والا
جیہڑا عشق دی بھٹھ مخمور والی
جیہڑا یوسف دا نبی محبوب والے
نعرہ حق دا جیویں منصور والی

وہ جو شیریں کے ساتھ فرہاد جیسا
پھر عشق کی بھٹی مخمور والا
جو یوسف کا نبی محبوب کے جیسا
نعرہ حق کا ، جیسے منصور والا

ایہناں وچوں سچ اک وی ملے تحفہ
ساڈی شان نوں کل جہان من جائے
ایہہ نعمتاں سکھیاں ہو گئے تے
کدی فیروں آون تے فیض بن جائے

ملے ان میں سے کوئی ایک تحفہ
اپنی شان کو سارا جہاں مانے
ساری نعمتیں ہو جائیں گر تجھ
جب فیض کی آنکھیں پہچان جائے

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

مرتضیٰ برلاس

اک مرتی جی بھر کے سزا کیوں نہیں دیتے
گر حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
ایسے ہی اگر مونس و غمخوار ہو میرے
یارو! مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے
قربت کی گھڑیوں میں مجھے ڈھونڈنے والو
بستی کے دریچوں سے صدا کیوں نہیں دیتے
موتی ہوں تو پھر سوزنِ مژگاں سے پرو لو
آنسو ہوں تو دامن پہ گرا کیوں نہیں دیتے
سایہ ہوں تو پھر ساتھ نہ رکھنے کا سبب کیا
پتھر ہوں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

☆

محسن بھوپالی

وہ ساتھ لے گیا قول و قرار کا موسم
تمام عمر ہے اب انتظار کا موسم
حیات اب بھی کھڑی ہے اسی دوراہے پر
وہی ہے جبر ، وہی اختیار کا موسم
ابھی تو ذرے کی فارغ کئے ہیں اہلِ جمال

ابھی کہاں ملی اُس بہار کا موسم
اُسے بھی وعدہ فراموشی ڈھب لگتی ہے
ہمیں بھی یاد نہیں کچھ انتظار کا موسم
جہاں گرے کا لہو جنوں کی محفل کے نقش تھا
کسی کے لب پہ کھلے ہے بہار کا موسم
کبھی تو اُترے کے پھولوں کی مہک سے
سلام ہے فیض سے پیار کا موسم
ہم نے آپ کو محبت کے لئے بہکیں گے
ہمیں بھی نہ آئے یاد کا موسم

-☆-

محسن احسان

شہر میں جس کو سب نے اجڑا گھر کہا ہے
شعرِ فیض کا لاثانی گھر بنا ہے
جن بستیوں سے اس نے لاکھ آزار دیکھے
اُن بستیوں کا ساتھ نبھانا گھر بنا ہے
جس طرح کھلا دیا ہے شوق میں زمین کا نور
کیسے تنہا ہے مگر کو ملا گھر بنا ہے
جس نے ہونٹوں پر حرفِ عشق کو لکھ دیا
ہزاروں غم جیسے محبت کے پالا گھر بنا ہے
جس سے ہوئی لفظ و معانی کی تحسین
شعر و سخن کو جس نے سنوارا گھر بنا ہے
جاتا ہے کون کون سر کے بالوں
کہتا ہے اُن کو تن نازک گھر بنا ہے

-☆-

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے

ظفر نقوی

سرد رگوں میں جاگے تیرا اپنی یاد کے
غم آ گئے تیرے نصیب میں کہاں شمار کے

شبنم کی بوند بوند کو ترسی کلی کلی
دریا بلک سے تھک گئے ابر بہار کے
برقِ جمال و شعلۂ احساس و سوزِ دل
سب ہو گئے چراغ تری رہگزار کے

قطعاتِ تاریخِ وفات

شان الحق حقی

”رفیقِ مخلص و جوہر عالی مقام“
1405ھ
ہو گئی گو عمر یہ روزہ کی شام
اور چلے گا ابھی تو اُن کا نام
وہ رفیقِ مخلص عالی مقام
”فیض سب جادو نگاروں کے امام“

ـ۲۲ـ

1405ھ

رئیس امروہوی

اُس سے روشن تھا جہانِ شعر و فن
جذبِ کامل فیض احمد فیض تھا
کیوں نہ ہو تاریخ الہامِ غزل
وہ مکمل فیض احمد فیض تھا

☆

1984ء

شہاب کاظمی

خالی رہتی ہے دیکھیے کب تک
ترک تو نے جو کی ہے مسندِ فیض
کل تک تھا جو زینت و زیبِ جہاں
آج ہے زیب و زینِ مرقدِ فیض
ہے مقطع کا مصرعِ تاریخ
مالکِ علم فیض احمد فیض
1984ء

حنیف اسعدی

یہ عزمِ پیرویِ فیضؔ دیکھنا یہ ہے
کہ کوئے یار سے اب کون سوئے دار چلے
جو دل پہ گذری سو گذری مگر نگارِ وطن
کسی کے اشک تری عاقبت سنوار چلے

1984ء

-☆-

مغیث الدین فریدی

"سادہ طبع فیض احمد فیضؔ"

1984ء

خوشبو ترے اشعار کی دستِ صبا میں بس گئی
تاریخ بن کر رہ گیا "لطفِ غزل حسنِ سخن"

1984ء

-☆-

یزدانی جالندھری

رحلت بزمِ شعر میں تھی فکرِ تاریخِ وفات
ناگہاں آواز آئی ...... "آہ فیضانِ غزل"

1984ء

-☆-

دل سے یزدانیؔ آتی ہے پیہم صدا
"مطربِ بزمِ سازِ غزل" چپ ہوا

1405ھ

-☆-

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حضرت علی کا قول ہے کہ میں نے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ انگریزی ضرب المثل ہے Man proposes God disposes۔ غالب نے کہا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جب کوئی شخصیت عظیم ہو جاتی ہے تو اس کی ذات سے مربوط ہر چیز عوام کی دلچسپی کا باعث ہو جاتی ہے۔ ہم گلاس میں آدھا بھرے پانی کو دیکھتے ہیں مگر بصیرت رکھنے والی نظر اس خالی نصف حصہ کا بھی حساب رکھتی ہے۔ فیض کا منظوم اور منثور کلام، ان کی تقریریں اور انٹرویوز زیور طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے آئے جن سے فیض شناسی میں مدد ملی۔ اس تحریر میں ہم نے مختلف حوالوں (جن میں منظوم تحریریں، تقریریں اور انٹرویو شامل ہیں) سے وہ نکات بیان کیے ہیں جو پورے نہ ہو سکے۔ بعض چیزیں ایسی تھیں جو تکمیل کے قریب پہنچی ہی تھیں مگر کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکیں۔ بعض کا ہیولا بالکل ہی تیار نہ ہو سکا۔ ان تمام کاموں کا لوگوں کو شدید انتظار تھا۔ ان میں سب سے اہم کام اس طویل نظم کی تخلیق کا انتظار تھا جس میں فیض اپنی آپ بیتی کے ساتھ گزشتہ نصف صدی کی جھلک دکھانا چاہتے تھے۔ ایک طویل رزمیہ اور بزمیہ نظم لکھنے والے تھے۔ اس نظم کا بہت بڑا حصہ بھی فیض نے بڑی حد تک کر لیا تھا؛ چنانچہ جس کی اشاعت سے لے کر مختلف شعری و نثری کتب سے زبانی بلاوے پہنچے تھے۔ لیکن افسوس یہ عظیم کام ادھورا رہا۔ اس نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے سبط حسن نے فیض سے ایک تحریر میں سوال کیا تھا کہ اب تک کیوں نہیں شاہکار دیکھنے کے لیے انتظار کرنا ہو گا۔ ہم جانتے ہیں کہ فیض کی بعض تحریریں نامکمل صورت میں ہیں۔ وہ ڈاکٹر ایوب مرزا اور دیگر نے بعض حوالہ جات دیے ہیں۔ مگر فیض کی سوانح کی مختلف پہلو پر مشتمل تحریریں کتابوں کے حاشیوں پر لکھے ذہن میں محفوظ ہیں اگر سامنے آ جائیں تو فیض شناسی میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گا۔ فیض کو جن کاموں کو کرنے کی تمنا تھی ان میں سے بعض یہاں پیش کرتے ہیں۔

فیض طاہر مسعود کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی کمال پیدا نہیں کیا۔ ہم جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ ہم نہیں کر سکے۔ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جو چیز آدمی کے ذہن میں ہوتی ہے اگر ویسی بن جائے تو اسے خوشی ہوتی ہے اور اگر بدل جائے تو ندامت ہوتی ہے۔ ہمیں ہماری نسل سے زیادہ ہوا ہے۔ اس بے اطمینانی تو نہیں ہے لیکن تھوڑی سی حسرت ضرور ہے کہ جو ہم نے کیا ہے اس سے بہتر ہو سکتا تھا؟"

1۔ پاکستان ٹائمز کے اداریوں کی جمع آوری نہ ہو سکی۔

پاکستان ٹائمز کے اداریوں کے لیے ایک کتاب درکار ہے۔ ایک دوست جمیل اختر صاحب اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ (آئی اے رحمٰن کا انٹرویو)

2۔ ادبِ لطیف اور لیل و نہار کے اداریے جمع نہ ہو سکے۔

ادبِ لطیف، لیل و نہار، کراچی کے اداریے مرزا ظفر الحسن مرتب کر رہے ہیں۔

(آئی۔ اے۔ رحمٰن کا انٹرویو)

3۔ رزمیہ نظم لکھنے کی خواہش پوری نہ ہوئی۔

غلام حسین اظہر: آپ نے جیل کے خطوط میں رزمیہ نظم لکھنے کی جو خواہش ظاہر کی ہے، اس نظم میں آپ کیا پیش کرنے کے متمنی تھے؟

فیض: جو کچھ ہم اور ہمارے ملک پر پچھلے تقریباً تیس سال میں گزری ہے اسے اپنے دور خصوصیت سے کتاب کی صورت میں آپ بیتی اور جگ بیتی کے تجربات اور مشاہدات کو مربوط شکل میں پیش کرنے کی خواہش تھی۔ اور وقت ملا تو ممکن ہے میں اس کا منصوبہ بھی کروں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں یہ کام کر سکوں۔

4۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم شاعری میں سے جو مثال کو ترجیح دیتے مثلاً ناظم حکمت، پابلو نرودا اور کالیداس جیسے عہد کے شاعر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان جیسے بڑے شاعر تو نہیں ہیں۔ ہماری مثال تو عربی کے اس محاورے کے مطابق ہے کہ ہم بڑے نہیں تھے بڑوں کے ساتھ جانے نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے۔

5۔ راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے۔

غلام حسین اظہر نے انٹرویو میں کہتے ہیں: "جنرل اکبر خان کی تحریر بھی میری نظر سے گزری۔ اس قصے کے بارے میں پھر کبھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے"۔

6۔ پاکستانی ادب (شعر و افسانہ) کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی کو خط میں لکھتے ہیں: "آپ سے خیال نے تازہ ذکر کیا تھا کہ بعض غیر ملکی ناشرین پاکستانی ادب (شعر و افسانہ) کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے کہیں کہ یہ کام اب خیال نے (اپنے ذمے) لے لیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر سب کتابیں اکٹھا کرنا تو ممکن نہیں ہے البتہ بہت سی چیزیں پہلے سے میرے ذہن میں ہیں اور یہاں کے سکول آف اورینٹل اسٹڈیز کا کتب خانہ کافی اچھا ہے۔ اگر آپ اپنی پسند کی چیزوں کی فہرست بھیج سکیں تو مجھے سہولت ہو جائے گی۔ خدیجہ کا ناول اور اپنی نئی کتابیں تو ضرور بھجوا دیجیے"۔

7۔ روزنامہ جنگ کراچی سے صحافتی مراسلات کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں: "اب کچھ پڑھنے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ جنگ کی فرمائش پر صحافتی مراسلت کا ایک سلسلہ بھی زیرِ غور ہے۔

8۔ اردو غزل کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے تھے۔

جناب محسن حسرت کو خط میں لکھتے ہیں: "ایک زمانے سے آرزو تھی کہ اردو غزل کا کوئی ڈھب کا انتخاب مرتب ہو جائے، آج کل اسی کام میں مصروف ہوں"۔

9۔ شیکسپیئر کے ایک کھیل کا ترجمہ شروع کیا تھا۔

مدیرہ شمیم کو خط میں لکھتے ہیں: "جب آئے تو شیکسپیئر کے ایک کھیل کا ترجمہ شروع کر دیا تھا جو ابھی ادھورا پڑا ہے کیونکہ فرصت نہ ملی"

[illegible] ہے۔"

10:- 1951ء میں آپ [illegible] "[illegible]" [illegible] ہیں۔ [illegible] کی خواہش تھی۔ [illegible]
[illegible]۔"

11:- [illegible] مالی [illegible]۔ کسی مخصوص نظم پر [illegible] حاصل کریں۔ [illegible] کا مطالعہ [illegible] کریں۔

12:- [illegible] کے [illegible] کہ "[illegible] آپ کے [illegible] ہے۔ [illegible]
ہے۔ [illegible] آپ [illegible] ہے [illegible]"۔

13:- ابسن کے ڈرامے "Pillars of The Community" کا [illegible] ترجمہ [illegible]۔

14:- کیا [illegible] کے [illegible] ہے؟ کہاں؟

[illegible]: آپ نے [illegible] ہے؟
[illegible] ہے ... [illegible] ہے۔
اطہر: اس [illegible] آپ نے [illegible] کیا ہے۔
فیض: [illegible] سے [illegible]۔

٭٭٭

فیض نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا

فلاسفر کہتے ہیں، ذہن اور جسم روح کی کسی ستائش کا سامان نہیں ہیں۔ بات ہو تو اس کا تذکرہ کیا جائے گا۔ یاس ہو تو تمری بتائی جاتی ہیں۔ فیض کا قول ہے: "انسان ہر چیز کا مرہم کچھ نہ کچھ رکھتا ہے" شخصیت کے لیے جس کا ادراک لازم ضروری ہے۔ شاعری میں مطالعہ اور تجربہ کائنات کے اوراق کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ فکر میں وسعت لانے کے لیے فکر کا مطالعہ ضروری ہے اور فکر و خیال کی سرحدوں کو کتاب میں لفظوں کے رنگ بھرنے کے لیے ان اصولی In Seen اور پوشیدہ مطالب کا جاننا ضروری ہے جو کتابوں میں مستور ہے۔ زیادہ تر بین السطور ہوتے ہیں۔ اسی لیے بڑے شعرا فطرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ علم کے مطالعے میں بھی غرق رہتے ہیں تا کہ تخلیق سے پہلے جانچ لیا جائے اور لفظوں کی حدود سے باہر نکل کر دیکھا جائے۔ قدیم شعرا وسیع مطالعہ کے قائل تھے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب لکھتے ہیں میر انیس ایک ایک نظم سے سو سو نظم کا کام لیتے تھے۔ اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مضمون کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے پر قادر تھے۔ علامہ اقبال بڑی وسعت سے کتابیں پڑھتے تھے، فرمائش کرتے تھے اور کتابیں منگوا کر نظر میں گزارتے رہے اور تجربے سے خیالات اور روح پیدا ہو کر فکر و فن پر دور تک یہ طلسم ظاہر ہوئے۔ فیض نے اپنی زندگی میں زیادہ مطالعہ 1935 اور 1939 کے درمیان کیا، اور یہ وہ عرصہ تھا جب فیض کی شاعری پروان چڑھی۔ ویسے فیض کو بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا وہ ناول پڑھا کرتے تھے۔ کالج میں وہ زبانوں میں ایم اے کرنے کے بعد جب امرتسر اور لاہور میں استادی کرنے لگے تو مطالعہ ان کا مشغلہ تھا۔ ریڈیو اور اخبار کے علاوہ صوفی، تصوف اور شاعری کی محفلوں میں بیٹھنے کے سبب ان صحبتوں کا مطالعہ ضروری تھا اگرچہ یہاں جو کچھ مطالعہ کیا گیا ان کی فہرست مرتب کرنا بھی لازم تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فیض نے بھی ایک ایک نظم سے سو سو نظم کا کام لیا اس لیے وہ شعر فراز ہے۔ جیل اور قید میں، ریڈیو اور فلم سازی میں اپنے دوروں پر رہے۔ آخری عمر میں فیض کا مطالعہ کم ہو گیا تھا وہ شاعری سے زیادہ دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ جہاں جیل کے مطالعے سے عمل کی آمد کتاب کو پڑھتے تھے جس کا ایک حصہ انھیں ان کے مضمون "شاعر کی قدریں" جیسے کتابیں بن کر سامنے آیا ہے کہ بیسویں صدی اقبال اور جوش کو ... اور آخری عمر تک مطالعہ کیا۔ قید و بند جاری رہے تھے۔ اگر فیض کے جیل سے لکھے ہوئے خطوط نہ ہوتے تو ہمیں اس عہد کے شعرا کی طرح فیض کی بھی مطالعہ کردہ کتابوں کا پتا نہ چلتا۔ فیض نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور روسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ شعر و ادب کے علاوہ علوم عمرانی، الہیات پڑھا۔ ناول اور تنقید میں بھی فیض کا ذہن ہے۔ خطوط سے حاصل کردہ کتابوں کی فہرست ذیل میں درج کی گئی ہے۔ یہاں ہم نے صرف کتابوں کے نام کو درج کیا ہے۔ ان کتابوں کے بارے میں مطالب خطوط کے ان حصوں میں بیان ہوئے ہیں جو مختلف خطوط سے نقل کیے گئے ہیں تا کہ تحقیق کرنے والوں کے لیے سہولت کا باعث ہو سکے۔

جدول

نمبر شمار	کتاب کا نام/مصنف	مضمون	نمبر شمار	کتاب کا نام/مصنف	مضمون
1	[illegible]	شاعری	2	تمام اردو دیوان	شاعری
3	Daudet کی کتاب [illegible]	ادب	4	The Making	ادب
5	[illegible] (ڈی جلدیں)	تاریخ	6	[illegible] (مکمل سیٹ)	ادب
7	نطشے کی کتاب	ادب	8	[illegible]	[illegible]
9	[illegible]	ادب	10	شاہ عبداللطیف بھٹائی کے گیت	شاعری
11	[illegible]	تاریخ	12	[illegible]	ادب
13	[illegible]	شاعری	14	[illegible]	مختصر
15	[illegible]	ادب	16	[illegible]	ادب
17	فریزر کی Golden Bough	ادب	18	فارسی لغت	لغت
19	[illegible] لائف آف جانسن	بائیوگرافی	20	[illegible]	ڈرامے
21	[illegible]	تاریخ	22	J. Carey- The Horse Mouth	[illegible]
23	The Star Turns Red ڈرامہ	ڈراما	24	[illegible]	ڈرامے
25	Three Sisters چیخوف	ناول	26	The Diplomat by James Aldridge	ناول
27	Magister Ludi / Meyer	ناول	28	The Jungle By Upton Sinclair	ناول
29	Foster By Howard Fast	ناول	30	Storm [illegible]	ناول
31	[illegible]	شاعری	32	[illegible]	[illegible]
33	[illegible]	فرانسیسی زبان	34	[illegible]	
35	[illegible]	حکایات	36	[illegible]	حکایات

☆ 27 جون 1951ء: فیض [illegible] ایک [illegible] کتاب کا [illegible] ہے اور [illegible] کتاب کا نام ہے "دیوان الحماسہ" اور مصنف کا نام ابو تمام [illegible] اردو [illegible]

(حفیظ [illegible])

☆ 17 اگست 1951ء: [illegible] کی ضرورت نہیں [illegible] فرانسیسی [illegible]

(حفیظ [illegible])

☜ 15 اکتوبر 1951ء: تمھاری نظر میں کوئی ایسی دوست ہے جس سے چیخوف کے ڈرامے منگوا سکو۔ خاص طور پر Three Sisters جو پڑھنا چاہتا ہوں۔ کالج کے زمانے میں پڑھ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(صلیبیں مرے دریچے میں)

☜ 30 اکتوبر 1951ء: میں نے فرانسیسی میں کافی ترقی کر لی ہے۔ جب ہم ملیں گے تو فرانسیسی میں گفتگو کریں گے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے فرانسیسی کتب درکار ہوں گی۔ سہل یا کسی مصنف کی کتاب جو سلیس اور رواں زبان میں لکھی گئی ہو۔

(صلیبیں مرے دریچے میں)

☜ 28 نومبر 1951ء: مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے چیخوف کی کتاب بھیج دی۔ پڑھنے میں بڑا لطف آ رہا ہے۔ چیخوف کی تحریر سے کتنا پیار اور کتنی بے پناہ شفقت ٹپکتی ہے۔ اس کے ڈرامے اتنے عجیب ہیں کہ انھیں پڑھ کر کوئی کم سمجھے اور روتے رلاتے سے ہیں۔ کیا کوئی ایسی لطیف ہے لیکن چیخوف کے ڈراموں میں کچھ ادبی روایت ہے اور جو جس سے اس کا بڑا فن بھی ظاہر نظر آتا ہے۔

☜ 14 دسمبر 1951ء: آج کل میں Daudet کی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ تم نے بھی پڑھی ہے؟ بڑی خوبصورت کتاب ہے بالخصوص کہانی کے بڑھاپے میں اپنی لڑکی کے زمانے میں جو ایک عجیب حالت طاری ہوئی۔

☜ 24 دسمبر 1951ء: چیخوف کی تمام ڈرامے اور وہ مضمون اب پہلے سے بھی زیادہ سمجھ میں آیا ہے۔ اگرچہ یہاں پر کوئی تھوڑے سے شخص پاگل بالکل نہیں ہیں لیکن اگر کوئی روسی کی تمام زندگی دیکھے تو وہاں بھی عجیب کے سب لوگ سب ایسے ہی ہیں جو چیخوف نے وہاں کے دیہاتی لوگوں میں صوبے میں دیکھی ہیں جن کو ستاتے تھے وہ کبھی سے گزر گئے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ چار پانچ سال کا کام کر لیں گے اور اپنی خوبصورت حسین خواب دیکھتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ ان کا ظاہری دیہاتی تعلق (مرحوم دادی کے حال کے علاوہ) کبھی اچھی خوبصورت خیالات کے وقت میں کچھ ایسی ہوتی ہے اور عشق و محبت کی ان کی جان کو کسی طرح کے لیے جاتے ہیں۔ لیکن انھیں اپنی ترقی کا بہت ہے حقیقت میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ سب بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ یہی ان کا افسوس ہے۔

☜ 3 جنوری 1952ء: کچھ کے ڈرامے میرے لیے بھی انداز نہیں تھے۔ آج کل کچھ اور مجھ پر چھوڑ دیا گیا ہوں۔

(صلیبیں مرے دریچے میں)

☜ 15 جنوری 1952ء: آج میں سوچتا ہوں کہ کیا ایک عجیب و غریب کتاب ہے جو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نام The Diplomat ہے جس کے مصنف James Aldridge ہیں اور Bodley Head نے شائع کی ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کی ہے لیکن یہ کتاب تم بھیج دو۔ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر کئی سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں جو لطف مجھے ملا ہے یہ تم بھی شریک ہو سکو۔ ناول کا موضوع ایران میں ہونے والی روسی سیاست ہے لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا اخلاقی اور جذباتی تجزیہ ہے جو ایک قوم کی ایک قوت پر قابو کرتی ہیں اور اس بارے میں پہلی بار اس کی تحقیق کی صورت میں نے تحریر کی ہے۔

☜ 17 مارچ 1952ء: ہم اصلاح کی ہمیشہ کی کوشش کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے اب کے اپنی کتاب کا ترجمہ کرنے کا ارادہ ہے۔ کچھ مشکل طلب ہیں لیکن کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کی کتاب کا ترجمہ ہو گا اور اپنی کہانی اور نظموں کی کتاب کا بھی ارادہ ہے۔ مشکل سے یہ کوئی جواب طلب ہیں۔ ایک خط لکھنا ہے ایک رسالے کے لیے کچھ کام اور ایک ناول کا ترجمہ کا۔ ادبی کام کے لیے بھی ایک بہت کم ہے لیکن پھر بھی اسے کافی ہی سمجھتا ہوں۔ یہ ختم کرنے کے بعد کچھ پڑھنے کا ارادہ ہے۔

(صلیبیں مرے دریچے میں)

☜ 29 اکتوبر 1952ء: آج کل نیٹشے کی کتاب Thus Spake Zarathustra پڑھ رہا ہوں۔ یہ کتاب پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھی گو اس کے بعض فلسفے کی زیادہ اہم تصنیفات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس کتاب کی تحریر بھی عجیب ہے لیکن بعض جگہ تحریر بے حد حسین اور انتہائی خوبصورت ہے۔ اگر فلسفے سے تعلق ہوتا تو جرمنی کے فلسفیوں سے بھی کچھ لگاؤ ہوتا۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے انسان کے فکر و خیال کا خلفشار بگاڑ بہت زیادہ اور اس کی تحریک کے اصلی مقصد خیال یا انکار کو سمجھ کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بھی پائی۔ لیکن ہیئت حسن اور شاعرانہ قسم کا۔ اس کتاب کے جو حصے مجھے پسند آئے ہیں ان کے کچھ حصے میں نقل کروں گا۔

☜ 15 دسمبر 1952ء: تمہارے جانے کے بعد میں نے کوئی کام نہیں کیا اور دن خواب آلود یوں ہی گزرتے رہے۔ آج فیصلہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو جھنجوڑیں اور پھر سے کام شروع کریں۔ اگرچہ ہم یہاں جو کچھ کرتے ہیں وہ بھی کچھ جاندار کچھ پڑھا یا کچھ گھڑا یا کچھ سوچ لیا۔ اس کے بیچ کام کا لفظ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ جیل میں زیادہ وقت کام میں نہیں، کام کی آرزو میں گزرتا ہے۔ یہ خواہش بہت عجیب اور بڑی طلب کا مظہر ہے کہ جیل میں جہاں وقت کی سب سے زیادہ فراوانی ہے اور باہر کے بکھیڑے بھی نہیں ہوتے، وہاں بھی کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا باعث تو کچھ ایسا ہے کہ ذہن کی ہر کوشش بھی کی ہے لیکن دماغ اتنا گرفتار ہو گیا ہے کہ بعض بالکل بجھ گئی یہاں سب سے بڑی دوا یہی چیز ہے کہ جو ذہن پر مسلط رہتی ہے کہ ادھر اُدھر کے کام سے لگیں۔ کوئی ایسا کام جو مفید بھی ہو اور تسکین بخش بھی۔

ابھی ابھی میں نے وہ نظم ختم کی ہے جس پر گزشتہ ہفتے کئی روز صرف کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے Magister Ludi جو ہیسے کے طویل اشعار پڑھنے والی شیطان کی آنت کی طرح ہے۔ اس کے بعض حصے مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔ اگر اس کا ترجمہ نہ کر سکا تو کوئی اور چیز کی طرح کوشش کریں تو ہم یہ اقدام حاصل نہ کر سکیں۔ اب ایک نظم جو بہت پہلے سے ذہن میں ہے اس کو پکانے کی کوشش کروں گا اور ایک آدھ دن کے بعد کچھ تاریخی تحقیق کے سوا جو روز کا دھندا ہے پڑھوں گا۔

☜ 15 جنوری 1952ء: جیل جانے کی ابتدا کی روزمرہ معمولات میں طرح طرح کی خوشی اور جسمانی راحت بھی پیدا کر لی ہے جس کا خاص تجربہ لکھنا بھی مشکل ہے۔ مطالعہ کے طور پر ایک خاص دلچسپ چیز ہے جو میرے پاس پڑھنے کے انتظار میں رکھا ہے۔ اس کے بعد انتظار سے دو آ رہے ہیں۔ میں نے جو بھی اس سے پہلے اس افسانہ کو ختم کرنے کے بعد انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ ضروری بات بھی نہیں۔ آنکھوں سے مجھے شوق ہے لیکن کسی وجہ سے اسے اٹھا کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگرچہ اس دوران میں اور بہت سی چیزیں پڑھ چکا ہوں۔ (مطبوعہ میرے دو بچے ہیں)

☜ 3 فروری 1952ء: ہمارے ہاں ایک نوجوان نے کچھ بہت ہی عمدہ مصوری کی ہے اور آج کل پڑھ رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک کی نمود کا نام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طریقے سے یہ کتاب یہاں سب خواتین و حضرات کو پڑھوائی جائے۔ ان کے خیالات سے مجھے بھی دلچسپی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ اپنی ذاتی چیزوں کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے ہاں کئی دوست کتب خانے سے مزاج ہو رہے ہیں۔ (مطبوعہ میرے دو بچے ہیں)

☜ 17 فروری 1952ء: ہم نے قرآن شریف کی دوبارہ تلاوت شروع کر دی ہے۔ اس زبان کے معانی بہت دلچسپ ہو سکتے ہیں اور سب خود مطالعہ جاری رکھ سکتا ہوں۔

☜ 22 فروری 1952ء: اور عربی کتابیں لینے کے لیے کئی روز کی تاریخ بھی ملی جلد الف لیلہ دلچسپ ابتدا کی اور Mayer کا ناول جو ایک جلد میں ہے۔ یہ سب کتابیں مگر یہ سب موجود ہیں۔ تو پڑھنے سے لگتا ہے کہ اگر وقت مل سکے تو آ

عاشقی کے خیال کو اپنا معبود بنا کر پیچھے رہے ہیں اسی لیے ان کے مضامین میں عیوب ہیں۔ حسرت کی شاعری کا [illegible] سے [illegible] ہے۔

☆ 13 مارچ 1952ء: میرے خیال میں اب تنقید کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر ہو سکے تو I.A.Richards کی تینوں کتابیں ساتھ رکھنی چاہئیں، Principles of Criticism, Practical Criticism اور Meaning of Meaning۔

☆ 10 دسمبر 1952ء: آج کل میں ایک بہت عمدہ کتاب پڑھ رہا ہوں جو Sitwell خاندان کے والد Sir George Sitwell کی تصنیف The Making Of Gardens ہے۔ اس میں باغبانی کے فنی نکات ہیں اور باغوں کے تاثرات۔ کتاب کا بہت حصہ تو میری سمجھ سے باہر ہے اس لیے کہ مجھے پودوں اور اشجار کے بارے میں کچھ بھی معلوم (ہم تو بس پھول دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں) لیکن جس انداز سے وہ [illegible] کا ذکر کرتے ہیں اس لطف میں ہم بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

☆ 16 جنوری 1952ء: میں آج کل ایک بہت دہشت ناک کتاب پڑھ رہا ہوں Upton Sinclair کا ناول The Jungle اس میں امریکہ کے [illegible] میں کام کرنے والے مزدوروں کی [illegible] لکھی گئی ہے [illegible] یہ عالم ہمارے ہاں بھی نہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنی تکالیف بالکل معمولی معلوم ہوتی ہے۔

اب جب تم آؤ تو [illegible] ایک فارسی لغت لیتی آنا اور [illegible] کتاب [illegible] بھجوا دینا۔

☆ فروری 1952ء: [illegible] نے [illegible] The Horse's Mouth [illegible] کتاب کا نام Joyce Cary مصنف [illegible] نے چھاپی ہے۔

☆ 29 اپریل 1953ء: میں نے [illegible] Two Star Turns Red پڑھا اور بہت لطف اندوز ہوا۔ [illegible] شاعری کی [illegible] نہیں [illegible] ہے [illegible]۔

☆ 19 مئی 1953ء: میں نے [illegible] کا ناول Howards End ختم کیا ہے جس میں [illegible] کا بیان ہے [illegible] Wilcoxes [illegible] یہ کتاب پڑھی ہے [illegible] کا ناول Sturm پڑھ رہا ہوں بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

☆ 24 مئی 1953ء: [illegible] آف [illegible] کی [illegible] ایڈیشن بھی مجھے درکار ہے۔

☆ 28 جون 1953ء: [illegible] ایک بہت عمدہ کتاب [illegible] کے ساتھ [illegible] سندھی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام اور بہت سے [illegible]۔

☆ 12 اکتوبر 1953ء: [illegible] سے [illegible] ہے [illegible]۔

☆ 21 فروری 1953ء: [illegible] آف [illegible] شروع کی ہے [illegible] کے ساتھ [illegible] شروع کر رہا ہے اور [illegible]

کی حرمت کی چیز ہے۔

٭ 22 مئی 1954ء: جیل سے روزن ہوگئے جوڑے کے خطوط آپس کی نشست میں پڑھتا ہے۔ اگرچہ بار بار دل زیادہ بھر آتا تو کتاب ہاتھ سے رکھ دی جاتی۔ نہیں کہتا ہوں کہ ان کے اخلاق کا سوز اور ان کی قسمت آج ادب کا حصہ ہو سکتی ہے جس کی عزت و حیات نہیں اتنی عظیم اور درد انگیز ہیں۔ ان کا اور ان کے بچوں کا خیال آتا ہے تو اپنی مصیبت کی بات کرنا (اگرچہ یہ مصیبت بھی کچھ کم نہیں) بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔

آج کل سر جیمز فریزر کی کتاب شاخ زریں (Golden Bough) پڑھ رہا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں سرسری نظر سے دیکھی تھی اور کچھ فراغت سے پڑھنے کو ایک زمانے سے جی چاہتا تھا (اس قسم کی فہرست میں ابھی بہت کتابیں باقی ہیں۔ جیسے گیبن، اشپنگلر اور چند اور کی تصنیفات، رسل اور مارکس کی تاریخ فلسفہ وغیرہ اور کچھ تھیں۔ دوستوں کے کتب خانوں سے ان کی تلاش جاری رکھو۔ یہ ختم کر لوں تو) فریزر کی کتاب تمہیں بھی پڑھنی چاہیے۔ یہ کتاب وحشی قدیم کے اعتقادات میں سے ہے جو خاص طور سے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔

٭ 21 جولائی 1954ء: ٹی ایس ایلیٹ کی نظم پڑھ رہا ہوں۔ رات جو تاکیں یہ بہت ہی پاس ہے یہ بہت خوب صورت نظم ہے، اگرچہ اس کا حصہ جو آج کا زمانہ ہے کچھ ایسا لگتا ہے مرزا غالب۔

٭ 25 اگست 1954ء: اب ہم ابسن کا ڈراما جس کا ترجمہ شروع کر رہا ہوں جس کا نام ہے Pillars of The Community کا فلسفہ کے قریب ترین کر رہا ہوں۔ لیکن یہ اردو زبان میں بہت مشکل ہے پہلے ہی لفظ کی یہی بات اگلی ہوئی ہے۔ کسی ایک قوم یا محلے میں رہنے والے لوگوں کا گروہ۔ مگر یہاں سے مراد یا اخبار نوازی سے بچ کر کچھ کرنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے اپنی زبان کا کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا ہے۔ تو تمہیں خود بھی سوچنا ہوگا۔ کوئی روزمرہ عام بول چال کا لفظ ہے۔ چند الفاظ اور بھی ڈھونڈنے ہیں لیکن وہ آخر مل گئے تھا۔

٭ 4 ستمبر 1954ء: ابسن کا ترجمہ اب تک جاری ہے لیکن اب اس سے کچھ الجھن ہونے لگی ہے پوری محنت سے ترجمہ کرنے کی طرح دیر لگا کام ہے جس میں تخلیقی کام سے کہیں زیادہ دقت کرنی پڑتی ہے لیکن خیر یہ کتاب بھی ختم ہو ہی جائے گی۔

٭ 7 ستمبر 1954ء: ہم بار بار رسل کی ہدایات اور پیروی سے استفادہ کرتے رہے۔ مصنف نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ انسان نے اپنی فطرت کے مطابق دیوتا کیسے ایجاد کیے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی دیوتاؤں نے وہ طور بھی قابل تریں استعمال ان کا ہے جو ان کے مذہب کا خوداعتمادی ہے اس لیے کیا ضروری ہے کہ کسی کی لازمی ہے جس کا کوئی بھی نہ جانتے ہوں ۔ نہیں کر کوئی کیا؟ اب آدمی ضرور رہا ہے۔ خوب تکل اور فلسفہ بھی ....

٭ 22 فروری 1955ء: انگریزی کو قصبہ تیری میں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب بہت کچھ لکھتا ہے اگرچہ جنس کا لفظ بھی کم سے اپنے ہم سب کی طرف داری کی ہے۔ باقی لوگوں نے بھی یہی بات کہا ہے۔ اگر ان حقیقتوں سے اعتراف کریں تو ہمارے آگے معلوم ہوتا ہے ہمارے کئی نہ ہب فرشتے اور ولی بنے ہیں۔ دوسرے کو دیکھو جس کا اس کے نہ ہے مجھے معلوم ہے شاید کچھ زیادہ حقیقی سے ہم نے کیا ہے۔ اب خیال آتا ہے کہ اس معاملہ کے لیے مجھے بھی کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ شخصیت نہیں کی ہیں جو ہمارے ادیب تھے کیونکہ ان کا حلقہ زندگی بہت ہی تھا۔ جیسے رشید جہاں بیگم اور لکھنے والے تھے ان کی کہانی بہت کا ووٹوں کا انداز دیکھیں جیسے تاثر تھے۔ تحریک شروع ہے لیکن وہ بکھر گئی ہیں۔

٭٭٭

حواشی

۱: ۔ڈاکٹر ضیا احمد صدیقی پرنسپل گورنمنٹ کالج [illegible]۔

۲: ۔میاں افتخار الدین۔

۳: ۔سجاد ظہیر۔

۴: ۔عزیز [illegible] پاکستان ٹائمز۔

۵: ۔فیض کی باتیں۔

۶: ۔دستِ تہِ سنگ۔

۷: ۔احمد ندیم قاسمی۔

۸: ۔[illegible]۔

The Root And The Flower ۔:۹

۱۰: ۔حفیظ ہوشیارپوری۔

۱۱: ۔[illegible]۔

فیض کے بہتر (72) ادبی نشتر

اگر بلا تبصرہ فیض کی چند تحریریں یہاں ترتیب دی جائیں تو ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اتنا تو پتا چل جاتا ہے کہ تنگی محسوس ہو سکے۔ عوام تو ایک طرف بعض خواص بھی یہ نہیں جانتے کہ فیض نے شعر و ادب کے بارے میں اپنی کتاب قدر آرا کے علاوہ کتنے مفید مشورے بھی دیئے ہیں جن سے طالب ادب اور شعر و ادیب و شاعر کو تابندگی مل سکتی ہے اور اس سے فیض فہمی میں بھی مدد ہو سکتی ہے۔ ہم نے فیض کے وہ چند اقوال کا انتخاب یہیں دیا ہے جن سے ادبی مقام پر ان کی گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ اس تحریر میں ہم نے فیض کی تمام تحریروں، تقریروں اور تبصروں سے موتی چن کر ایک ادبی ہار بنایا ہے جس کو ہر شخص پڑھے جو ادب سے شغف رکھتا ہے۔ ہمارا مقصد یہی ہے کہ فیض فہمی کے دائرہ کو وسیع کیا جائے اور ان کی شخصیت اور فلسفہ پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ فیض کی مختلف تحریرات کو کھنگال کر یہ موتی پیش کیے جا رہے ہیں، کہ کسی حد تک فیض کی شخصیت، شعر و ادب سے واقفیت، تہذیبی ثروت، ان کی ذہنی و فکری تخلیقی قوت کے ساتھ ظاہر ہو سکے۔ یوں تو فیض محفل میں ایک پیدائشی انجمن ہوتے ہوئے بھی خود اکثر خاموش رہتے تھے لیکن تحریروں میں ان کا قلم جب متوجہ ہوتا تو ہر نکتہ کھل جاتا۔ ہم نے ان بہتر (72) نکتوں میں ان کے انٹرویوز یا تحریروں کے مطالب اس لیے شامل نہیں کیے کہ تکرار ہوتا۔ ہمارا مقصد فیض کے فکر کو پیش کرنا ہے جس کو لے کر فیض جیا ہے۔

تا مرد سخن نگفتہ باشد

عیب و ہنرش نہفتہ باشد

1۔ ایک آدمی اگر اپنے معاشرے کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتا تو وہ اپنی دنیا کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر مغربی شاعروں کے بارے میں آپ کا خیال صحیح ہے تو آفاقی قدریں مختلف ہو گئی ہیں۔ وہ ادب دیرپا ہوتا ہے جس کی حقیقت کا معیار وقت کا دھارا متعین کرے۔ (میزان)

2۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بڑا ادب زوال کے دور میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نئے تجربے میں جان کا وجود ہو۔ یہ بات غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ موضوع بڑا ہو، موضوع کا تعلق بڑا ہو، چاہے وہ اور کسی قدر ہی نہ ہو، ہونا چاہیے۔ اس میں زندگی کی گنجائش ہونی چاہیے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ اقوالی زندگی کے ہر قدم کے ساتھ حرکت کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ ہو، اس کا اتنا بڑا ساتھ آنے کی ضرورت ہو۔ (میزان)

3۔ وزن ایک چیز ہے آہنگ بالکل دوسری چیز۔ جس کو ہم وزن کہتے ہیں وہ تو ایک عربی تصور ہے، جہاں الگ الگ حروف کی گنتی ہے، جو کہ بالکل حرفی کا ہے۔ وزن سے مراد صرف یہ ہوتا ہے کہ آہنگ پایا جائے۔ کسی قسم کا نظم بغیر وزن کے ہو سکتا ہے بغیر آہنگ کے کوئی شاعری نہیں ہو سکتی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم متعین پابندی اوزان اور سانچے جو مکتب ہیں ان کے مطابق ہی شاعری کی جائے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ کیا آہنگ پیدا کرتا ہے سو لے شاعروں کا کام نہیں ہے۔ (میزان)

4۔ شعری افادیت اس کے بلاغ میں ہے۔ نئی شاعری کی تحریک بھی حالت کی پیداوار ہے۔ جس کا سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ اس شاعری کو تحت لوگوں نے قبول کیا یا بعض نے قبول کیا۔ اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ قاری تک ابلاغ نہ ہو پایا۔ نتیجہ یہ کہ اس شاعری کی بیں تعطل ہوا۔ (میزان)

5۔ کسی کلچر کی قدروں کی تعریف، اظہار اور تعین اور اس کی تعمیری ضرورتوں کی تشخیص، بیان اور صورت پذیری زیادہ تر ادیب ہی کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے۔ اسی لئے اہمیت ادب کو کلچر کے ارتقائی عمل میں بھی حاصل ہے۔ ہر زندہ شعور ادیب اپنے معاصر کلچر کا عکس بھی ہوتا ہے اور اس کی تعمیر اور تشکیل میں بھی حصہ لیتا ہے۔ وہ معاشرتی قدروں کی تعبیر اور تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔ وہ خوبی اور برائی، حسن اور قبح کے معیاروں کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ اس معیار کی تحقیق اور ذوق کو بھی جانچ لیتا ہے۔ وہ اپنے مخاطبوں اور گرد و پیش سے متاثر ہو کر تعلیم بھی دیتا ہے۔ ادیب مختلف ادبی فنون کی صف میں ادیب کی حیثیت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ وہ سب سے زیادہ ذمہ دار بھی ہے۔ وہ ایک وقت اپنے عہد کی تخلیق بھی ہوتا ہے اور قائل بھی۔ اس کی ادبیت بھی اور اس کا شعور بھی اپنی قوت میں اپنے عہد کی تصویر بھی اور معیار بھی۔ (میزان)

6۔ علم کے دوسرے شعبے مختلف فنون میں سب سے زیادہ موثر ہیں۔ سب سے زیادہ وسیع ہیں اور اسی اعتبار سے کسی معاشرے کے فکر و عمل، شعور اور کردار کی تہذیبی وحدت میں ادب کا کردار بھی اسی مناسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔ (میزان)

7۔ ہر ادیب معاشرے کی اصلاح و تعمیر، حقیقت کے ادراک یا اظہار میں کسی نہ کسی صورت سے شغف یا اقرار کا مبلغ ہے۔ یہ تبلیغ جہاں خود نجدد کا دوش کا عمل ہے جس کی دو صورتیں ہیں، ایک بالواسطہ دوسری بلاواسطہ۔ تجربہ فکری اور آفاقی حقیقی اس کی کامیابی کا انحصار مقصد کے علاوہ تجربے کے خلوص و صداقت پر ہے۔ (میزان)

8۔ ادب انسان کے اجتماعی فکر کی پیداوار ہوتا ہے اس فکر کی صورت بدلتی ہے تو ادب کا رنگ بھی دوسرا ہو جاتا ہے۔ (میزان)

9۔ تخلیق ایک ذاتی عقیدہ ہے اس میں وہی تخلیق، وہی تنقید، وہی خود اختیاری ہوتی ہے جو دوسرے ہی کسی دوسرے کی حقیقت میں آپ دیکھتے ہیں۔ لیکن آدمی جب کہ تم نے خود کو عقیدہ نہیں اعداد سے موسوم ہیں اس کا تجربہ ہے۔ اُن کی بڑی دنیا میں صرف تخیلی ہوتی ہے راحت کا تصور بھی نہیں، بلکہ اس کے لوٹ آنے کی امید اور آرزو بھی ہوتی ہے۔

10۔ انگریزی زبان اور انگریزی ادب ہمارے ماحول کا ایک حصہ ضرور ہے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جب اس کا پلٹ اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ ہمارے ملکوں میں انگریزی رائج ہو گئی ہے بلکہ اس نتیجے کے طور پر کہ ہماری روز مرہ زندگی کے طور طریقے بدل گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تبدیلی میں بھی انگریزوں کا ہاتھ تھا لیکن انگریز نہ بھی آتے تب بھی ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بدلنا ضروری تھا۔ (میزان)

11۔ کوئی تہذیب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے اس کی مجموعی شکل و صورت ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اس مجموعے کے بنیادی اجزا کیا ہیں اور وہ سب عقیدے، تمدنی اشکال، تجربے اور تشکیل و نمو (Idea) یا آدرش، جسم، زبانی کردار اور عمارتیں گئی ہے۔

کلچر ادب ان عناصر کی ہم آہنگی اور تنظیم سے جنم لیتا ہے، جن کی رنگ آمیزی ہوتی ہیں۔

بیان و لفظ اور مضامین، موسیقی، رقص اور عمارت گری، وہ چیزیں ہیں جن میں باطنی تجربے، عقیدے، معاشرتی افکار اور ظاہری صورت پذیری میں ہم آہنگی کی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔ (میزان)

12۔ ادب کلچر کا سب سے اہم، سب سے نمایاں، سب سے جامع اور سب سے موثر ذریعہ ہے۔ کلچر کے باطنی اور نظریاتی پہلو پر نظر

دی ہے تو مجموعی تاثیر وہی تبدیلی تجربات اور اسلوب کا تخلیقی تجربہ اور تعریف سب سے زیادہ ہے جب ان کے ساتھ نظم سے ہوتی ہے۔ (میزان)

13۔ مجاز نے جدید اسلوبی شاعری پیدا کی ہے (الف) ہر تک شوخی کی سماجی ہوا آزادی کے بعد غزل اور نظم میں لکھنے والے شاعر تھے اس کے مجموعے میں نظر آتا ہے کہ وہ ایک محروم ... مختلف تجربات کرتے رہے ہیں لیکن ان کی اس میں ایسے مخصوص ... کا حق حاصل ہے۔ (میزان)

14۔ نظیر اکبرآبادی۔ ان کا کلام ہندوستانی شاعری کی زبان اور خیالات کے لحاظ سے ایک پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ نظیر کی تمام شاعری عوام کی زبان میں ہے اور ان کے مضامین بھی عوام کے ذہن کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہولی کی تعریف میں، بسنت کی تعریف میں، دیوالی کی تعریف میں اور اسی قسم کے بہت سے موضوعات پر نظم لکھی۔ یہ بات کا ثبوت ہے کہ نظیر صاحب عوام کے ساتھ ہوتے ہوئے زندگی کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کی ان کی بیان کی تعریف اور ان کے سماجی نقطہ نظر کا ان کی اچھا اظہار ہے۔ غرض یہ کہ نظیر کی شاعری کا موضوع زندگی سے متعلق ہونے کی کوشش کی ہے۔ یہ ترقی پسند نظم کے ساتھ ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے کہ وہ عوام کو بھی اپنی زندگی میں شریک ہونے کا حق پہنچاتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان کی ضرورت انہیں کی زبان میں بیان کرنی چاہئے۔ (میزان)

15۔ ان کی شاعری عظمت میں کلاسیکی کوشش بھی ہے اقبال ان سے پہلے بڑے شعرا میں سے ہیں جو محض جمالیاتی خلوص کے علاوہ ایک فلسفیانہ پیغام شاعری کی شکل میں دینے میں کامیاب ہوئے۔ یہ بات اور سے باقی ہی کی شاعری سے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔ وہ باقی شاعری محض چند ذاتی تجربوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہی بات انہیں محدود کرتی ہے کہ وہ جذب موضوع بھی ان کے ان کا کلام کلاسیکی روایت کی حد تک ہے۔ (میزان)

16۔ ان کے حال چند مشہور شاعروں نے ہندوستانی شاعری میں نئی چیزوں کا اضافہ کیا۔ جو ان کے اپنے تجربات کا آئینہ دار ایک ذہنی اور جذباتی تعلق کے بجائے ایک مثالی جمالیاتی محبت کا تصور، استعاروں کی ایک نئی قسم کا رواج۔ محبت کا یہ تصور اور لکھنوی شعرا نے بھی تعلیمات سے اخذ کیا ہے لیکن وہ محبت کو محض جمالیاتی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ محبت کے تصور (Sublimation) اور وصال کی خواہش جدید شعرا نے واضح کی۔ اس شاعری میں بڑی خوبی یہ ہے کہ عام عشق کے بجائے وہ ایک اعلیٰ تصور پیش کرتی ہے۔

(پہلی روایت سے محبت تک۔ میزان)

17۔ بدقسمتی سے میر حسن اور مرزا شوق کی مثنویوں کو ابھی تک تنقیدی نقطۂ نظر سے وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ مستحق ہیں۔ مثنوی سحرالبیان اور مثنوی زہر عشق کا ظاہری حسن صرف ان کی قصہ گوئی یا اسلوب ہی نہیں ہے بلکہ ان کے اندر میر حسن اور مرزا شوق کی بہت نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری کا پیمانہ سماجی حقیقت کی تصویر ہے۔ جو حقائق سے محض شعوری طور پر کام لیتے ہیں۔ ان پر چند ایک تحسین کے ساتھ تصویری انداز بیان ہوتا ہے۔ ان کا طرز بیان سادہ ہے اور انہوں نے بھی زندگی اور معاشرت کا جائزہ ہی لیا ہے لیکن ان معاملات میں ان کی نظر بہت تیز اور گہری ہے۔ (میزان)

18۔ انیس اور دبیر کے تذکرے میں جدید تنقید کی مرثیہ کے ساتھ خاص طور پر ناانصافی ہے۔ یہ بات ابھی تک اپنی جگہ ہے کہ قریب قریب سبھی ان کے اخلاقی اور مذہبی اصولوں پر بحث کرتے ہیں اور جو پہلے سے ہی تھے۔ اس کے علاوہ ان کی فنی خصوصیات سے بہت کم بحث کی گئی ہے۔ مرثیہ کی صنف میں ان کا ایک نیا تجربہ بھی موجود ہے۔

19۔ مرثیہ نویسی کا کلام اس لیے قابل قدر ہے کہ انہوں نے مرثیے میں بہت کچھ اضافہ کیا اور عوام کی طرف رجوع کیا اور انہیں زندگی

حالات کا جو ماحول تھا اور انہیں سے جو تنگی نے انھیں مذہبی مضامین کی جانب راغب کیا۔ انھیں لکھتے ہیں:

ناقدریِ عالم کی شکایت نہیں ہوتی
کچھ جبر بشر کی حقیقت نہیں ہوتی
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں ہوتی
ہم کیا کہیں کسی روح کو راحت نہیں ہوتی
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اگر مرثیہ لکھنے پر ہی توجہ دیتے تو ہندوستانی زبانوں میں لکھی جانے والی شاعری کی بنیادی شکل بدل سکتے تھے لیکن بدقسمتی سے انھوں نے موضوع سے فائدہ اٹھایا اور کربلا کے مختلف واقعات کو مسلسل واقعاتی بیان کرنے کے بجائے چند واقعات منتخب کر کے ان کو بار بار نظم کرتے رہے۔ اسی وجہ سے مراثی کے مجموعے غزل کے اشعار کی طرح پریشان اور بے ترتیب ہیں۔ اب اگر ایک ہی واقعہ بار بار بیان کیا جائے تو پڑھنے والے اکتا جاتے ہیں۔ چنانچہ مرثیہ لکھنے والوں نے اس سے بچنے کے لیے دو طریقے وضع کیے۔ واقعات شہادت کی اہمیت تو ان کے لیے بھی کم نہ تھی۔ انھوں نے مرثیوں میں اپنے ذہن کی بنا پر ایسی باتیں داخل کر دیں جن کا واقعات سے براہ راست تعلق نہیں تھا، جیسے گھوڑے کی تعریف، تلوار کی تعریف، صبح کی آمد، شام کا منظر اور اسی قسم کے دوسرے مناظر جن میں محض خلاف حقیقت باتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ شاعرانہ صنعت اور شاعرانہ ترکیب کا استعمال اور الفاظ کے الٹ پھیر کا تھا جو اردو شاعری کی کسی صنف کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔ (میزان)

20۔ معاشی نظام کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے۔ اب ادب ایک مخصوص طبقے کی تفریح کا سامان نہیں رہا۔ اس کی نوعیت محض تفریحی نہیں ہو سکتی چنانچہ ادب کے تقاضے بدل گئے ہیں۔ ہماری موجودہ روایات مغرب کی تقلید کو ترجیح نہیں دیتیں، ہمارے معاشی ارتقا کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئے اور پرانے ادب کے مثبت پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی خامیوں اور اچھائیوں میں توازن قائم کرنے کی کوشش کریں۔ (میزان)

21۔ مولانا حالی نے قومیت کی شاعری کا آغاز کیا لیکن اقبال کے کلام میں اس کی تکمیل ہوئی۔ حالی کو اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک نئی شعری زبان کی ضرورت تھی۔ نئے اسالیب، نئی اصطلاحات اور نئے استعارے کلام میں نہیں آ سکے تھے اور یہ اس لیے کہ شاعری کے روایتی انداز سے ہٹنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ اقبال نے یہ کام بخوبی سرانجام دیا۔ اقبال کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ انھوں نے یہ کام جس خوبی سے کیا اسے انجام تک پہنچا دیا۔

(میزان)

22۔ اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا اصل میں ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ان میں دوئی کا تصور غلط ہے۔ انسان کے معاملات ایک بات کے بعد دوسری بات تک پہنچتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں ہے تو اس کا طرز بیان کیا ہوگا اور اگر اسے بیان پر قدرت بھی ہو تو کوئی یہ نہیں سمجھ سکے گا کہ حضرت کہنا کیا چاہتے تھے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ادب کوئی مقصد رکھتا ہے اور ادب کا تجربہ اور خیال ایک ہی ہے۔ اگر ہم کوئی بات کہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تعلیم کو جاننا ہوگا کہ ہمارا بیان اور طرز ادا کیسا ہو، کوئی تجربہ ہو جو خود میں نکل آتا

نہیں پیچیدگی ناکامی کا نتیجہ ہے کہ کسی تجربہ کا حسن ہے جو بی اور عظمت کی غیر ادا معمولات اعلیٰ سے کچھ تو بہتر نہیں نکلتے۔ (میزان)

23۔ جس طرح ہمارے ادب میں خواب کی قدیم ادب کی عمارتیں کھڑی ہیں اسی طرح اس نئے ادب کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سماج میں عوام کے حقوق کی جدوجہد و مقبولیت بھی اسی طرح سماج کا فرد بن کر ادا ہو رہا ہے اور غیر مکمل رہ جاتا ہے۔ جہاں ہمارے ادب میں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں کسی حد تک یہ نقائص بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ نیا ادب ابھی تجرباتی دور میں ہے اور اسے پختگی کو پہنچنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ ابھی اس دور کا تعین میر، غالب، اقبال یا حالی نہیں ہوا۔ لیکن نئے ادیبوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی راستہ صاف کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ادیب ان کی جانب یہی کہیں کہ

مرے بعد آنے والے پائیں نہ کہیں بھی راحت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے تلوؤں سے

{ ''ادبی دنیا'' جنوری 1947ء }

24۔ شاعر یا لکھنے والے کی حیثیت سے اس کا مضمون پر عبور ہے۔ اور اگر یہ غزل بالکل بحر ہے تو اس کی لطافت سے بالعموم کلی بے حسی نہیں تشبیہ و استعارہ ہو یا کوئی تحریر میں کوئی منفرد نہیں۔ مثلاً ایک واحد یا ایک آدھ ہے اور ہو جاتا یا اکثر کی طرح اس کا حسن جیب تعلق ہے ہم کسی شعر کو اس کی تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے حسین و دوام قرار نہیں دے سکتے۔ ان کی شعر گوئی ان کے ہونے پر ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ ادب ہمارے ادب کی طرح تحریر یا تشبیہ یا استعارہ ہو یا لفظ و لفظ اور معنوی نظر رہے ہے۔
(میزان)

25۔ تعلق ایک عقیدہ ہی ہے اور ایک کیفیت بھی۔ بعض لوگ عقلی طور پر تصوف کو قبول کرتے ہیں اور بعض ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں جن پر ان کو عبور کی نظر ہے لیکن ذہنی طور پر کسی شاعر کو محض اس سے اختلافی یا اختیاری شاعر سمجھ لینا کہ اس کے کلام میں انقلاب کا لفظ بار بار دہرایا جاتا ہے اسی طرح کسی شعر کو محض اس وجہ سے صوفیانہ شاعری سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ''مساوات'' کے نظریے کی تکرار ہوتی ہے جو ''اصل تصوف یا تصوف ایک ہی ہے۔ یا یہ'' زندگی کو دو صرف نہ ہونا نہیں تو کیا ہوتا''۔ اور اس قسم کے اشعار عیناً مسائل تصوف بیان کرتے ہیں جیسے کہ ایسے صوفیانہ اشعار نہیں کہا جا سکتا جن میں تصوف کی ذہنی کیفیت موجود نہیں ہے۔ (میزان)

26۔ رومانیت، انفعالیت، موضوعیت، قنوطیت ان سب کا قول سے ادبی بحثوں کو حل کیا جا چکا ہے۔ ترقی پسند اور رجعت پسند کا جھگڑا ہے لیکن سب معمول ابھی تک ان الفاظ کی کچھ مکمل وضاحت نہیں ہوئی جیسے کہ ہو چکی تھی۔ مختلف احباب ترقی پسند ادب کے مختلف تصورات قائم کیے بیٹھے ہیں۔ دونوں کی حد بندی ہر ادب اور وقت میں تشریح سے نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جس کو ہم تجویز کرنے کے لیے ادب سے تعبیر کرتے جائے تحقیق اور انصاف کے کام ترقی میں منظم ہونے کا امکان پیدا ادب کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جو اس نظریہ میں کوئی ایسی نئی بات ہے جس سے جہاں تک اس کی تعریف کو تسلیم کیا جائے۔ (میزان)

27۔ حزن و یاس کو ہم نے اس لحاظ سے تباہی کہا ہے کہ وہ اپنے متعلق تجزیہ نہیں۔ حزن و یاس کے متعلق جو کوئی بھی لکھے گا وہ یہ ہے کہ تصور یا شخص یا طبقہ اس سے ہوگا۔ ان تجربوں سے ادب بھی ہو جائے گا اور اب ان مسائل پر غور کر کا طریقہ بدل جائے گا کی قیمت ہے۔ حزن اور سرمایہ داری کی جگہ صرف حزن کی جگہ نہیں۔ ہم سب کی جگہ ہے۔ ('' ادب کے ترقی پسند نظریے '' میزان)

28۔ کوئی شخص یا صحبت کو گزارنے سے مختلف الفاظ کو دہرا دیتے تو ہم ان سے اکثر ان کے تجربات میں شریک ہونے

کے۔ شاعر کا تجربہ جتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوگا اتنا ہی زیادہ اس میں شعر خلق کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ اور یہ صلاحیت جسے کہ ہم فن کہتے ہیں یقیناً ایک جمالیاتی خوبی ہے۔ اگر جمالیاتی قدر محض الفاظ کی شگفتگی اور بندش کی چستی پر منحصر ہوتی تو چکنی چپڑی باتیں ہمارے چوٹی کے شعراء سے بہتر ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے ہمارے بڑے شاعر اس لیے تسلیم کیے گئے کہ ان کے تجربات قدر و قیمت میں اعلیٰ ہیں۔

("شاعر کی قدریں" میزان)

29۔ شعری، ہیئتی اور جمالیاتی اقدار کا خلاصہ ہے۔ (1) شعری جمالیاتی قدر کا بڑی حد تک شاعر کی ذہنی قدروں پر منحصر ہے۔ (2) ان قدروں کی ترتیب ان کی معنوی اہمیت کے مطابق ہونا لازم ہے۔ (3) جمالیاتی قدر بھی ایک ذہنی قدر ہے جو اجتماعی قدر کی تشکیل کرتی ہے۔ اس لیے اسے دوسری افادی قدروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ (4) شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی قبولیت اور افادیت دونوں شامل ہیں۔

اس سے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر بھی پورا اور زندگی کے معیار پر بھی پورا اترے۔ (میزان)

30۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر تجربہ جسے وہ ظاہر کرتا ہے اس کی اپنی ذات اور اپنے ماحول دونوں سے وابستگی ہوتی ہے۔ اسے اپنی وفاداری کو جتنا اپنی ذات اور اپنے فن سے ہے اتنا ہی اپنے سماج پر بھی مرکوز کرنا چاہیے۔ اسے چھٹکارا نہیں کہ وہ اپنا ایمان اور اپنا نظریہ نہیں چھپا سکتا۔ اسے اپنے تجربات اور مشاہدات سے جو دلیل پیش کرنی ہے اور مصلحت آمیز رویہ اختیار کرنا ہے اور قبولیت اور رد کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ (میزان)

31۔ ایک ترقی پسند ادیب ان اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے جن کے ذریعہ اور تجربے سے زندگی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی ہے۔ وہ انسانی اور اجتماعی بنیادی انفرادی، اہم اور غیر اہم ہر قسم کے تجربات پر لکھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان میں کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے ان کی اہمیت اور غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ تجربات غلط نہیں کیے جا سکتے لیکن ان میں انتخاب تو کیا جا سکتا ہے اور ترقی پسند ادیب سے یہی تقاضا کیا جاتا ہے کہ اس کا انتخاب ایسا ہو جس سے پڑھنے والے زندگی کے اہم مسائل کو غیر ضروری تفصیلات میں الجھا کر نہ دیکھیں۔

("ادب کا ترقی پسند نظریہ" میزان)

32۔ جہاں اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ اسے قبول کریں اور اس طرح بھی کہ آپ اس کے خلاف بغاوت کریں۔ ترقی پسند ادیب اگر اپنے ماحول کو تسلی بخش سمجھتا ہے تو پہلا رویہ اختیار کرتا ہے۔ غیر تسلی بخش خیال کرتا ہے تو دوسرا۔ وہ محض الفاظ کی ترتیب تو دیتا ہے۔ اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ تنقید ہمیشہ ہی مخالف ہی کی جائے۔ تنقید میں اصلاح بھی ہو سکتی ہے لیکن اس میں اصلاح بھی تبھی کی جا سکتی ہے جب حقیقت نظر آئے۔ (میزان)

33۔ شعر لکھنے کی مشق سے زیادہ شعر لکھنے والا ذاتی تجربہ بھی ہیں۔ (دعا چند "فکر آبادی")

34۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ عظیم ادب کی سب سے اہم خصوصیت اس کی عالمگیریت اور حقیقت پسندی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری نہیں ہوتا۔ ہر بڑا ادیب اپنی بساط کے مطابق اور اپنے رنگ میں حقیقت پسند تھا۔ چنانچہ بڑے ادیب میں انتخاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس نے ان میں سے جن کا بھی انتخاب حقیقت پسند تھا اس پر عمل کیا کہ اس دور میں حقیقت کسی معلوم ماحول میں دیکھی اور اس میں حقیقت کے لیے حقیقت کی جگہ ہے۔ اور یہ انتخاب ہی کا نظام ہوا اس کے فنا میں۔ (میزان)

35۔ پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تجربات اور جذبات نہیں بدلتے۔ اگر شاعر نے ان کی کامیاب

ترجمانی کی ہے تو ان اشعار کی قیمت وقت اور مقام کی پابند نہیں۔ (حرفِ چند، دستِ صبا)

36۔ کسی بات کو صرف اس لیے شعر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موزوں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لیے بھی ہے یا نہیں۔ اسے کہنا آتا ہے یا نہیں، کہنے کے لیے اس کے پاس موزوں الفاظ اور سلیقہ ہے۔ اگر اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں اور اس کے باوجود وہ نظم کہے تو وہ شعر نہیں۔ (تقریب، میزان)

37۔ ادب کی تاریخ ہماری ذہنی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اب بھی ادبی تحریکوں کے متعلق بحث ہے کہ یہ عالم تخلیقی مقامات تھے اور یہ جتنے آئے ہیں ذہن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں کسی بنیادی تغیر کے نتائج ہیں۔ اور اگر کسی انسانی عمل کا سبب ان سے الگ ہو کر تخلیق ہو سکتی ہے تو یہ مفروضہ غلط ہے۔ ادب معاشرے کے بدلتی فکر کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس فکر کی صورت بدلتی ہے تو ادب کا رنگ بھی دوسرا ہو جاتا ہے۔ (میزان)

38۔ فطانت اصلی شاعری کی ایک بہت بڑی شرط ہے۔ لیکن کامیاب شاعری کا یہ امتحان ہوتے ہیں کہ شاعری کی جان اور اس کی اصل روح اس کا Content یعنی مواد ہوتا ہے۔ اور جو اپنے معاشرے اور ماحول کے تضادات اور ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے Crisis کو نظر انداز کر دیتا ہے وہ کمزور ادب Content ہے۔ (ہم کہ ٹھہرے اجنبی)

39۔ جب آپ معاشرے کی بڑی بڑی اقتصادی، سیاسی اور سماجی حقیقتوں Objective Realities سے منہ موڑ کر انہیں دو پاٹ اور صرف ذاتی تجربہ کو مقصود بنا کر لکھتے ہیں تو پھر یقیناً آپ کے دماغ میں خلل ہے یا پھر آپ نے یہ فرار اختیار کر لیا ہے......
شعر کو بھی ہم مزدوری کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اچھا شاعر معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور نقاد بھی۔ (ہم کہ ٹھہرے اجنبی)

40۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے اور برے اور پاک اور ناپاک یا جیسے کہ خاص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے اور احتیاط نہیں کرتے۔ (متاعِ لوح و قلم)

41۔ نظریے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شعر کو محض نظریہ ہونا چاہیے یا نہیں، کسی فلسفے کا تابع ہے یا اس کا، کسی اور چیز کا کوئی شعر اور مزہ اور کلام میں شامل کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ یا کوئی بھی تجربہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ایسی چیز کو آپ کسی خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ (متاعِ لوح و قلم)

42۔ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلاحیت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔ (دیباچہ "دستِ صبا")

43۔ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اس لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔ (دستِ صبا)

44۔ کمال کو مقصود میں شمار نہیں کرتا، اس لیے کہ تخلیق کرنے کا وہ کام ہوتا ہے کہ کوئی بات نہیں ہے کہ کمال کی تخلیق کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے لوگ مال کے گروہ کے ہاتھوں اور ان ہاتھوں میں عوام کو کھو کر دینا ہی انداز کرتا ہے سب رہ جاتی ہے۔
(ہم کہ ٹھہرے اجنبی)

45۔ اگر کلام میں کسی تہہ (قطعہ) کو صحیح حیات نو کا اظہار ممکن ہے تو یہ کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ہماری انا اپنی زندگی ہو

تو قومی زندگی میں ادب کا حصہ بہت ہو گا بلکہ وہ ہر ایک خیالات و تصورات کو ... سے ہو گی۔ ساتھ ہی یہ قصہ ... صحیح سمت کی طرف لے کر جاتی ہے اور زندگی کو بناتا ہے۔ انسان ایک ایسے ان آنکھ اور دل لے کر تجربے میں داخل ہوتا ہے جو عالم انسانی کا مشترکہ دیدہ و دل ہے اور فقط نظر بھی۔ طور (تضاد) ایک ابدی سچائی ہے جو عہد کی علامت ہونے کے علاوہ انسانی ترقی کے لیے ناگزیر بھی ہے۔ (احمد ندیم قاسمی)

46۔ ایک خارجی زندگی ہے جو آپ کے گرد و پیش ہے۔ ایک داخلی زندگی ہے جو آپ کا ذہن ہے۔ آپ دونوں زندگیوں سے حسن اور بدصورتیوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں اچھی چیزیں بھی ہیں اور وہ باتیں بھی ہیں جو آپ کو ناپسند ہیں۔ ان سب سے کسی سے گریز کرنا درست نہیں ہے۔ ترقی پسندی کے یہ معانی قطعی نہیں ہیں۔ جو کچھ بھی اس وقت آپ کے سامنے حقیقت ہے اس کی اس قسم کی تاویل نہ کیجیے کہ اس کی اچھی باتیں سامنے نہیں ہوں اور بری باتیں سامنے نہ آ سکیں۔ جو حسن ہے وہ کیوں بیان کرنا چاہیے جو بدصورتی ہے اسے بھی پوری طرح اظہار ہونا چاہیے۔ جو اچھا ہے وہ اچھی بھی تو نظر آنی چاہیے۔ جو برائی ہے اس کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے۔ جو ظلم ہے اسے بھی سامنے آنا چاہیے اور جو نیکی ہے اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ زندگی کی ادب میں ادائیگی تو کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ ادھوری رہتی ہے۔ (اختر حسین رضوی)

47۔ ادب کا مقصد پہلے تھا ہے۔ ادیب نے جو دیکھا ہے جو محسوس کیا ہے جو سوچا ہے اس کو پیش کرتا ہے۔ آپ بھی وہی کچھ دیکھیں، وہی محسوس کریں اور وہی سوچیں جو اس نے سوچا، لیکن ادب پروپیگنڈا نہیں ہے تو پروپیگنڈا کسے کہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب اور دوسری اقسام کے ادب میں یہ فرق نہیں ہے کہ یہ پروپیگنڈا کرتا ہے اور وہ نہیں کرتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا پروپیگنڈا صحیح اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے دوسرا گمراہ کن اور منتشر و غیر مفید۔ (میزان)

48۔ ترقی پسند ادیبوں نے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی اور اس کا تجویز کردہ علاج بھی صحیح تھا لیکن دقت یہ تھی کہ ان میں کوئی صاحب یا اقبال یا نذیر احمد کے پائے کا کوئی ادیب نہیں تھا جو اس سنے ہوئے مرض کا علاج کر سکتا۔ اور جب اس تحریک کے علم بردار بھی اپنے ہی تک محدود ہوتے چلے گئے تو دوسری جنگ عظیم سے ان کی مقبولیت بھی بہت کم ہو گئی اور اب یہ حالت ہے کہ ہمارے ادب میں انارکی اور انتشار نظر آتا ہے۔ جو جس کا جی چاہتا ہے لکھ دیتا ہے۔ (میزان)

49۔ ایک تاریخی نفسیاتی بنیاد کا ایک دھاگا ہر جاندار زندہ ادب میں ہے جو حقیقت پسند ہو اس میں نہیں ہو سکتا۔ (تجزیے)

50۔ نئی اور قدیم غزل کی شاعری میں اپنی خصوصیات اور عہد کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ تو ہر غزل کی واردات ہے جو بجائے خود ایک حقیقت ہے اور انسان کا اس سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس حقیقت کی اہمیت اور حسن کی قیمت ہم اپنی زندگی اور تجربے سے الگ ہو کر نہیں جانچ سکتے۔ (میزان)

51۔ شعریت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معنوی مادوں والے الفاظ ایک پراسرار اور ... صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مجاز ... کا استعمال ... انقلاب کا مطلب ہے۔ (دیباچہ "آہنگ")

52۔ شاعر سچ کو اپنے اسلوب میں ڈھالے اور ایک جان ... کر ... تب شاعر کا فن پارہ ... بہت زیادہ ... کی طرح ... (میزان)

53۔ ابہام کی وجہ سے شعر ابلاغ کا فرض ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح شعر بانجھ ہو جاتا ہے اور اپنی افادیت کھو دیتا ہے۔ (تجزیے)

54۔ ... فانی ... شاعری ... تمام جذبات اور محسوسات کی ترجمانی ہے اور اس میں تغزل یا ... کا مظہر ...

ہے۔ (میزان)

55۔ ہمارے ادب میں غزل قافیے سب سے زیادہ پابند اور سب سے زیادہ آزاد صنفِ سخن ہے۔ ظاہری آداب میں پابند اور داخلی معانی میں آزاد۔ اسی دو رنگی کے سبب سے غزل کے بارے میں اتنے اعتراض اور اتنے لوگوں کو اختلاف رہا ہے۔ (میزان)

56۔ ادب موضوع، اسلوب اور طریقِ اظہار دونوں سے عبارت ہے۔ موضوع بغیر طریقِ اظہار کے نقش اور اظہار بغیر موضوع کے بغیر بے معنی۔ ہاں اگر ان میں ہیئت اور اقدام و ترجیح کا تعین لازمی ہو تو ظاہر ہے کہ تخلیق کے دوران اولیت تجربے اور موضوع ہی کو حاصل ہے۔ (میزان)

57۔ ادب نہ صرف ثقافت کا تحفظ کرتا ہے بلکہ ثقافت آفرینی بھی ہے اور انسان کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ ادب انسان کو معاشرتی طور پر ایک متحد اور منظم شخصیت بناتا ہے۔ (میزان)

58۔ علم سوزی کا دور علم کی آگہی یعنی فن کی تحسین ایک منظم سماجی تجربہ داری کا عکس ہے اور اس بندوبستی کا بار صرف علم سازی پر ہی نہیں بلکہ محنت، اخلاق اور اعمال ہر ایک سب پر ہے۔ (میزان)

59۔ مثلاً یہ جملے نے جملہ وقعت ان زبان میں زیادہ جمہوری واقعیت سے کام لیا اور جس طرح حالی اور آزاد نے نظم سے اردو شاعری کو چند ایسے امیدواروں سے نکال کر عام مضامین، روزمرہ اور فطرت میں لا ڈالا تھا اسی طرح شبلی نے بھی اردو نثر کو ... پیچیدہ شکلوں میں سے نکال کر سیدھی سادی [illegible] میں لے گئے۔ (میزان)

60۔ کلامِ اقبال کا سب سے پہلا اثر، سب سے بڑی کشش سب سے بڑا جادو وہی ہے جو ان کی ذات سے متعلق ہے۔ یہ حقیقت فلسفے سے عاری ہے لیکن جذبے سے بھرپور ہے۔ اسی لیے خطابت کا جوش اور احساس کی لذت فراواں ہے۔ اس کلام پر اقبال کی شخصیت کا انحصار ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا انحصار اسی پر زیادہ ہے۔ (میزان)

61۔ اقبال مرحوم کے فلسفیانہ نظریات کا ارتقا تدریجی ہے، انقلابی نہیں ہے۔ ان کے ابتدائی اور آخری اکثر خیالات میں ایک داخلی ربط اور تسلسل ہے جو ٹوٹنے نہیں پاتا۔ مختلف اوقات پر مرحوم شاعر نے اپنے نظریات کی تفسیر اور تشریح کی ہے، ان میں اختلاف تو ہے تناقض نہیں ہے۔ (میزان)

62۔ جلیل کا عجب دور کا ذکر ہے۔ یہاں مسلم لیگ اور کانگریس تحریک سے لے کر تنظیم تک پیدا ہوئی۔ اور اس کے بعد بڑی اور طاقتور تھی ... سارا انحصار بھی اس کا اس پر تھا۔ ([illegible])

63۔ ہمارے یہاں جو روایتی تنقید تھی اس کا قاعدہ یہی تھا اور بڑی حد تک آج بھی یہی ہے کہ چند ایک اصطلاحیں یا ایک مبتذل سے الفاظ جن کو انگریزی زبان میں Cliche کہتے ہیں ان کو لے کر ہر کسی موضوع پر لکھنا ہوتا ہے، ادب پر تنقید مقصود ہو کر اس کو پہچان کر دیا۔ یہ ہماری پرانی روایت تھی اور جو آج تک چلی آتی ہے اس لیے کہ ... جو ... کرتے ہیں ان کے پاس علم تو ہے لیکن ان کا ذوق ان کے علم کا ساتھ نہیں دیتا۔

(محمد حسن عسکری کی یاد میں)

64۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریے، کسی مکتبِ فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو بہرصورت قومی اثاثہ ہے اس لیے حالات جو کچھ بھی ہوں ادب کی تخلیق بہرصورت ایک قومی خدمت کی ادائی ہے جس کا کچھ اعتراف اور کچھ قدر ہونی چاہیے۔ شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر خادمِ قوم کی طرح ادیب کو قلم کی آزادی ضرور میسر ہونی چاہیے کہ وہ خدمت انجام دے

تھے۔ ایسی انتظامیہ سے اگر کسی کی شخصی آزادی کو خطرہ پہنچا ہو تو ان اقدام سے جو کسی کی ذات، عزت نفس اور نجی زندگی سے لگے ہوتے ہیں۔ (سلیبیں میرے دریچے میں)

تجزیے الفاظ ہیں جو ... ہیں۔ میری مراد ہے اپنے الفاظ ہیں۔ ہم محض دوسرے لوگوں کے الفاظ میں سچ نکالتے ہیں۔ (سلیبیں میرے دریچے میں)

66۔ عظیم شاعری اور سماجی تصورات کے بارے میں شعر کے ذریعے جو پیغام دیا جاتا ہے اس کی اہمیت اتنی ہوتی ہے کہ وہ خود بخود دلوں میں اتر جائے۔ اسے پند و وعظ کی حیثیت نہیں دی جاتی ہو بلکہ اسے حقیقت کا ترجمان ہونا چاہیے اور اس حقیقت کو جو واردات قلبی کے ساتھ منطبق ہو اور شاعر اپنے دور میں جو تحقیق رکھتا ہے وہ وقت جذباتی و احساساتی طور پر شاعر قبول کرتے ہیں اور پھر یہی کیفیت لوگ اشعار کا تاثر رہتا ہے اور جو عظیم ان تصوراتی خیالات سے متعلق ... کے عمل کے لیے وقف ہوتی ہے جو حقیقت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ وہ اہم عظیم شاعری ہے جو کسی واردات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت کو تخلیقی رنگ میں پیش کرے۔ عظیم شاعری تو کسی دور کے آخر میں نمودار ہوتا ہے یا پھر کسی نئے دور کی ابتدا سے وجود میں لاتی ہے۔ جو حال کسی قوم کے زوال یا پھر اس کی بیداری اور حیات نو کا دور ہوتا ہے۔

67۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں (ترجمہ: قیامت ...) "شیطان شر، موت اور ... کا ایک مجسمہ ہے اور بدی کا مددگار۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں زندگی اور عمل کا ولولہ پیدا کرے۔ میرے خیال میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شیطان موت کا ... یعنی بدی ... کا ... ہے۔ اس کا کام انسان کے دل میں تمنا کی ... پیدا کر کے ... کے سامنے زندگی کا ... کہ یہ زندگی سے ... جلد ... کر دے وہ سب ... ہیں ... کی طرف لے جاتے ہیں اور ... حقیقت اور ... موت کو حاصل ہے۔ اسی لیے عقل کا مقتضی یہی ہے کہ ... حقیقت سے انکار کرے اور اس کی ملامت کرتی ہو۔ (گوئٹے کا پیام)

68۔ آج کل کے دور میں اگر شعرا میں سے کوئی مقدم ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں جو مشرق اور مغرب ... اقبال نے اپنے اچھے نظریات، خیالات اور ... کو کسی ... میں ... لانے کی کوشش کی۔

69۔ نظیر اور حالی دونوں باغی شاعر تھے۔ دونوں پرانی رسمی شاعری کی ... بات سے ... اور ایک نئی طرز کی ایجاد کرنے کے خواہاں تھے۔ دونوں کی ... یہ تھی کہ شاعری محض ... اور ... جذبات سے ہٹ کر واقعات اور حقیقت کی طرف لوٹ آئے۔ دونوں نے مختلف طریقوں سے شعر اور زندگی کے درمیان تعلق قائم کرنا چاہا۔ شعر کو ایک ... کی لذتیں عام ... (نظیر اور حالی)

70۔ غزل پر عام اعتراض یہ ہے کہ اس میں وحدتِ تاثر نہیں پائی جاتی ... مختلف خیالات اور جذبات کو محض ردیف اور قافیہ کی ... کا نام ہے ... کسی قسم کا تسلسل یا ربط نہیں ہوتا۔ ... یہ اعتراض ... ہے ... غزل کے بارے میں ... بات کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ ... کرتے ہیں ... اعتراض ... (غالب کی ایک اردو غزل)

71۔ شعر لکھنے کے لیے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور فوری دنیا اور ... involvement ...

Detachment دونوں ضروری ہیں اور وہ کیفیت بھی جسے صوفیوں کی اصطلاح میں "انشراحِ قلب" کہتے ہیں۔ جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اور حسنِ عالم کے درمیان حجابات کا اب کوئی حائل نہیں۔ (منتخبات اردو نظم)

12۔ اکثر اوقات شعر کے تخیلات واحد یا منطقی کے برعکس ایک خطِ مستقیم کی صورت میں منتقل ہونے کے بجائے ایک دوسرے کو مختلف نقاط پر قطع کرتے ہیں۔ تاہم ان کا مجموعی تاثر ایک ایسے عنصر کا حامل ضرور ہوتا ہے جو ان کی بوقلمونی کو وحدت میں تبدیل کر دیتا ہے اور ان کے انتشار کی بجائے ایک ساکن "نقطۂ مرکز" کا کام دیتا ہے۔ اسی عنصر کو عام طور پر ان کا پیغام یا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ (نغمے کا پیغام)

⁂

فیض کے لطیفے

حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کو "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔ اگرچہ یہ بات تو یہ ہے کہ خود غالب نے اپنے خطوط میں خود کو ایک مرد ظریف شاعر اور خوش گفتار بھی کہا ہے۔

ہیں ہم شاعر و ظریف و شریف
اپنی اوقات ہمیں معلوم

غالب کی شاعری میں جو ظرافت ان کے اشعار سے جھلکتی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بطور نمونہ ایک دو ہی شعر یہاں کافی ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

....

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

غالب کے خطوط سے کون آگاہ نہیں۔ غالب نے اپنے خطوط کو طنز و مزاح کا گہوارہ بنا دیا۔ غالب کے بعد بعض شاعروں اور ادیبوں نے بھی اسی انداز پر خطوط نگاری کی کوشش کی لیکن کوئی بھی کامیابی سے اس راستے پر چل نہ سکا۔

اردو کے چار بڑے شاعروں میں کچھ لطیفے غالب، اکبر اور اقبال سے منسوب ہیں، سوائے لطائف کے تحقیق میر تقی میر کے واقعات کو ذہن میں مرتب کریں تو ان کی بذلہ سنجی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مختلف واقعات کو کسی عظیم شخصیت سے منسوب کر کے لطیفہ تہذیب کے تحت بنے۔ بہرحال ظریف یا نی ہونا بھی خوش مزاجی کی علامتوں میں شامل ہے۔ دنیا بھر کے ادب نے فیض احمد فیض کو بہت بڑا قلوت میں دیکھا ہے اگرچہ کم ہے وہ اس بات کی نشاندہی کریں گے کہ فیض ایک ظریف اور شریف انسان تھے۔ اس سے یہ ہو کہ ان کے لطائف جو فیض سے منسوب ہوا ہیں ان کی شوخی اور ظرافت کی علامت ہیں۔ ہم اس مختصر تحریر میں چند لطائف اور چند ظریفانہ نکات پیش کریں گے۔

1: فیض 24 جون 195[?] کے خط میں جو حیدرآباد (سندھ) جیل سے ایلس کو لکھتے ہیں:

"ایک ہمارے مرکزی وزیر صاحب کا لطیفہ سنیے۔ حکایت ہے کہ کسی تقریب میں ہمارے کچھ مذہبی قسم کے ایک وزیر صاحب کے قریب ایک نوعمر لڑکی آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وزیر صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی صاحب سے کہا: 'دیکھو ہماری لڑ

گئی ہے جو ہوتی جاری ہی تھی کہ اپنے بچھانے نہیں؟ آخر دو بیٹے کو بھی نہ پاس تک نہ رکھی۔" الن صاحب نے کہا: "کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ یہ
ہیں۔ یہ جاری سے تکلیف سے بیچتے تک تو لوگ بالکل رکی ہے۔" وزیر صاحب نے فرمایا: "اس سے کیا ہوتا ہے مسلمان لڑکی کے
اعضا سے تعالیٰ اس کے نخوں تک دیکھتے ہیں۔"

2۔ فیض چراغ حسن حسرت کو خط میں لکھتے ہیں: "عید کے دن آپ نے لاہور کی طرف رخ کر کے تعویذ لگائے ہوں گے یہاں تو
شب برات کی تیاری نہیں۔ مستقل یہی کیفیت رہتی ہے اور اس کے اظہار میں ایک شعر بھی لکھ لیا ہے:

یہ حبس ہے یا حسرتِ نایاب دل کا
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

اس وقت ہے ساختہ مولانا عبد الباری آسی کی شرح غالب یاد آ گئی جس میں غالب کے ہر شعر کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں:
"میں نے بھی کہا ہے۔"

3۔ فیض جب لاہور میں پڑھتے تھے انگریزی ملک کے کسی ہوٹل گئے وہاں کے بیرے سے انگریزی بولا اور خوش ہوتا کہ فیض
انگریزی بول رہا ہوں۔ بیرے نے فیض کو کرنل Beard سے ملنے کو کہا کرنل Beard نے انگریزی بات کی۔ کہنے لگے فیض خاکی میں لکھا
ہے You are an advanced communist
فیض نے کہا: Are there retarded communists?

4۔ فیض جیل سے اپنی اہلیہ ایلس سے مخاطب ہو کر خط کے آخری حصے میں لکھتے ہیں: "جب حضرت نوح کی کشتی سے جانور اتر
رہے تھے تو ہاتھی نے چوہے سے کہا جو پیچھے تھا بھئی! دھکے مت دو کھیلو۔"

5۔ مجتبیٰ حسین "فیض صاحب کی ہمہ جہتی اور یادیں" میں لکھتے ہیں:
فیض کو پہلی بار 1941ء میں میں نے ان کے اور اپنے کالج گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک مشاعرے میں دیکھا۔ دوسری جنگ
عظیم شروع ہو چکی تھی، ان کا گورنمنٹ کالج کی تعلیم سے زیادہ کا تعلق نہ تھا اور ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی پڑھاتے تھے...... یہ
مشاعروں کا زمانہ تھا۔ لاہور کے اس دور کا مشاعروں اور مشاعروں میں حصے پارٹی کے لیے تعارفی تحفہ بنایا جاتا تھا یعنی اور
ترقی پسند کے یہ دو ایک دوسرے سے تقریباً دست و گریباں تھے۔ فیض نے نظم طرحی کی تو ہر مصرع پر داد و تحسین کے ڈونگرے برس رہے
تھے۔ جب انھوں نے یہ مصرع پڑھا:

جلے بجھے ہوئے ٹوٹے ہوئے بدن میں جسم

تو ہجر شیرانی والوں کا اس وقت بھی بڑا نام تھا نے زوردار آواز میں کہا:
فیض..... بجھے ہوئے کیسے کہتے ہوئے جسم ہو۔..... محفل میں قہقہوں کا ہجوم زور اٹھا تو فیض نے دھیمی آواز میں کہا حضرت آپ کا
مصرع تو ہمارے خود ہی ایک قطعہ ہے اس کا ایک نکلا ہے اور میرا پورا مصرع اس روایت کے خلاف احتجاج ہے اور فیض نے مشاعرہ لوٹ
لیا اور اس سے میری فیض دوستی کا آغاز ہوا۔"

لاہور کے تین چار ایسے گھر تھے جو ادبی اور تہذیبی گھر تھے جہاں علم کی بارش ہوتی اور ہر محفل میں علمی و ادبی جواہر بکھرے جاتے۔
یہ گھر تھا احمد بخاری، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور کرنل مجید کے تھے ان میں ہر شام ادبی محفل کا قیام رہتی تھی،
ان محفلوں میں مولانا چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، ہری چند اختر کے علاوہ ہر وہ شخص جو علم و ادب کا شیدائی ہو

ضرور حاضر رہتے۔ ان محفلوں میں حاضر جوابی، برجستہ فقرہ بازی، لطیفے، فن اور بات سے بات نکالنے کے ہاتھ کی تربیت اور تعلیم ہوتی۔ ان محافل میں وہ آدمی رہ جاتا جس کا مطالعہ وسیع نہ ہو، جس کی طبیعت ظریف اور جس کا ذہن کافی تیز نہ ہو۔ یہ لوگ بجا طور پر ہمارے چمن سے لاہور کی تہذیب کے نمائندے تھے۔ اس ماحول میں فیض کی بذلہ سنجی، زندہ دلی اور ظریفانہ طبیعت اور فقرے کسنے کی تربیت ہوتی رہی۔ یہاں اس محفل کا ایک چھوٹا سا لطیفہ پیش کرتے ہیں جو فیض کے لطیفوں میں درج کیا کرتے ہیں۔

کرنل مجید اور پطرس بخاری دونوں اچھے شاعر تھے۔ ایک دن کرنل مجید نے پطرس بخاری سے کہا:

کرنل مجید: بخاری صاحب! اب آپ کا کلام چھپ جانا چاہیے۔ میں نے آپ کے کلام کا نام بھی تجویز کر لیا ہے۔

بخاری: وہ کیا ہے؟

کرنل مجید: صحیح بخاری۔

بخاری: ہاں یہ نام مجھے پسند ہے، اگر آپ اپنے کلام کا نام "کلام مجید" رکھ لیں۔

دیکھیے آپ نے فیض کی بذلہ سنجی اور مزاح کی جھلک دیکھی ہے۔ ایسے ہی واقعات کئی جگہ ملتے ہیں۔ اور آپ تک یہ انہی محفلوں سے پہنچا ہے جو ان کے ذوق کو روشن کرنے کا سبب بنا ہے۔

6: فیض صاحب لکھتے ہیں، فیض سے پطرس بخاری نے کہا:

"صوفی صاحب! ادبی حلقوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری تعلیم مکمل کرنے کے لیے بادشاہی مسجد کے گرد و نواح سے متعارف کرایا جائے۔ میں نے پوچھا کہاں؟ کہنے لگے اس علاقے میں جو بیٹھے ہوتے ہیں ان لوگوں کا اچھا نہیں سمجھا جاتا، شرفا اس صورت میں جاتے ہیں۔"

7: "فیض کی وفات سے چند ماہ پہلے انہوں نے ایک لطیفہ سنایا۔ کسی نے کہا کوئی شخص بھی صحیح جواب نہیں دے پاتا۔ چڑیا اور طوطے کی اولاد کا کیا ہوا، اب یہ ہیں۔ کہنے لگے، ہاں! مگر یہ مسلمان کا تماشا ہے۔ ہم تو پہلے ہی تھے، کسی سے بات کرتا۔"

8: "یہ بھی یقین کی بات ہے کہ عبداللہ ملک اور میں فیض صاحب کی خاموشی کے منتظر رہتے تھے۔ حکومت پاکستان کے ایک بڑے آدمی تشریف لائے اور پوچھنے لگے فیض صاحب آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے؟ فیض صاحب ان کے متعلق سوچتے رہے، کہنے لگے: بھائی سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے کہ ہم پھانسی سے بچ گئے۔"

9: "لندن میں ایک معروف شاعر اپنی نظمیں سنا رہے تھے، ان نظموں میں لفظ "تو" کا بے دریغ استعمال تھا۔ ... فیض صاحب سے پوچھا، فیض نے کہا سب ٹھیک ہے بس "تو" کم کر دیں۔"

10: فیض خطوط نگاری میں بھی غالب کی طرح مزاح، ظرافت، انکسار اور بذلہ سنجی سے کام لیتے تھے۔ پاکستان چیمبر ... اور نگ آباد کے اچھے شاعر تھے، ان کے خط میں لکھتے ہیں:

"12 جون

بھائی منظور

تمہارا خط ... خوشی ہوئی۔

... آپ نے ... جواب دیا ... ۔"

مضمون تو نہیں ہے۔(اشارہ علامہ شبلی نعمانی کی طرف ہے)۔

11: فیضؔ بیروت سے 18 جنوری کو خط لکھتے ہیں:

''بیروت۔18 جنوری

مجی: سلام و دعا۔

عزیزی عمران کی خانہ آبادی کا دعوت نامہ ملا، تم دونوں کو تہنیت اور دولہا، دلھن کو دعائے عمر درازی۔

اور اب جو تم سسر بن گئے ہو تو گورنمنٹ کالج کے مولوی کریم بخش مرحوم، جو عربی پڑھاتے تھے، کی ایک بات یاد آئی، جب ہم گورنمنٹ کالج میں تھے تو مولوی صاحب مرحوم کو اُن کی مرضی کے خلاف، دیوانِ غالب پڑھانے پر مامور کر دیا گیا، مولوی صاحب ہر دوسرے، چوتھے شعر پر فرماتے کہ یہ تو بے حیائی کا شعر ہے۔ آگے پڑھا ایک دن ہم اس شعر پر پہنچے:

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا

یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

مولوی صاحب نے پھر وہی فقرہ دہرایا۔ ہم نے کہا، حضور کی شرح کیجیے۔ مولوی صاحب بولے، بھائی شاعر کہتا ہے کہ بچپن میں جو تم نے جھک ماری سو ماری اب تو منہ پر داڑھی آ گئی ہے، اب تو شرم کرو اور بے حیائی کی باتوں سے باز آؤ۔

سو اب تم سسر بن گئے ہو، اس لیے مولوی صاحب کی بات پر عمل کرو۔

سب کو پیار۔ فقط...... تمھارا...... فیضؔ۔''

12: معروف شاعرہ زہرہ نگاہ نے مختلف محافل میں فیضؔ صاحب کی ظرافت پر اُن کے فقرے سنائے ہیں۔ اس سال ساہتیہ اکادمی کی فیضؔ کانفرنس جو دہلی میں ڈاکٹر نارنگ کی سرپرستی میں منعقد ہوئی۔ محترمہ زہرہ نگاہ صاحبہ نے اپنی خوب صورت تقریر کے دوران یہ بھی کہا کہ ''فیضؔ جب لندن میں قیام پذیر تھے، ایک صاحب آئے وہ فیضؔ صاحب کی سگریٹ نوشی سے خوش نہ تھے، چناں چہ اُنھوں نے پہلے تو فیضؔ صاحب سے اُن کی سگریٹ نوشی کی ساری اطلاعات حاصل کی اور پھر سگریٹوں کی تعداد سے وہ ان تمام سالوں میں سگریٹ نوشی پر کتنا خرچ ہُوا بتانے لگے۔ اُنھوں نے کہا، فیضؔ صاحب! اب تک آپ کی سگریٹ نوشی پر اتنے ہزار اتنے سو اتنے پونڈ خرچ ہو چکے ہیں۔ فیضؔ صاحب نے یہ دقیق اور بڑی رقم سُن کر آہستہ سے جواب دیا، چلو یہ ایک تو فائدہ سگریٹ پینے سے ہُوا، ورنہ اتنے زیادہ پیسے لے کر ہم کیا کرتے۔ اچھا ہُوا اس طرح سگریٹ پینے سے ہم مالدار ہونے سے بچ گئے''۔

13: ڈاکٹر ایوب مرزا ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں لکھتے ہیں:

''شان الحق حقی کہنے لگے، صادقین کی جان بہت قیمتی ہے، یہ ہمارا جگری دوست ہے، یہ پاکستان کا مایہ ناز وغیرہ وغیرہ۔ پوچھا، قصہ کیا ہے معلوم ہوا کہ صادقین کے دل کے علاقے میں درد کی ٹیس اُٹھی ہے۔ طے ہُوا کہ صادقین کل صبح نو بجے سے ہماری تحویل میں ہوگا۔ دوسرے دن نو بجے ہم اُسے لے کر نیشنل ہیلتھ لیبارٹری اسلام آباد گئے اور تمام Tests کروائے، الغرض E.C.G وغیرہ وغیرہ۔ ان کاموں سے فارغ ہوئے تو دن کا ایک بج چکا تھا۔ میں صادقین کو پروگرام کے مطابق پی، این، سی، اے کے دفتر پہنچانے روانہ ہُوا۔ میں گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا صادقین بریکیں لگا رہا تھا۔ کونسل پہنچے تو پتا معلوم ہوا کہ صبح سے فیضؔ صاحب تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں، اور اس وقت اسلام آباد کلب میں ہیں۔ میرے دل میں وسوسے پیدا ہونے شروع ہوئے کہ فیضؔ صاحب کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ ایسا لگا کہ اسلام آباد کی فضا آرٹسٹ لوگوں کو محض دردِ دل ہی بخشتی ہے۔ ہم دونوں بھاگے اور اسلام آباد کلب پہنچے۔ فیضؔ صاحب ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ

گزرے ہوئے۔ کہنے لگے بھئی یہاں بھی ہر کوئی سر بہ سر ہے۔ ہر بیٹھنے والا شائق ہو۔ وہ تم ازکم اپنا اپنا بچہ چھوڑ جایا کرتا۔ کہنے لگے چلے تھے کہ سارا قصہ کیا
ہے۔ عرض کیا وہ ٹھیک ہے۔ کہنے لگے اس سے بہت دیکھو؟ میں نے بتایا سب ٹھیک ہیں۔ کہنے لگے 3000.0 ہے؟ میں نے کہا
نہیں۔ پھر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے ساتھ ان کی نشست پر لے بیٹھا اور کہنے لگے بھئی یہ سیٹھ لوگ کے آگے شرست دوڑ دوڑ کر نہیں ہوتے۔ ان کا
خیال رکھو۔ یہ لائق ہے۔ مینیجر رکھ کے بحال نہیں کرتا اور پروا نہیں کرتا۔ کہنے لگے ہیں وہ بھی یہ فرق لگا رہا ہے مگر یہ بھی کام کر دیا۔ پھر آیا اور
فیض صاحب نے کہا ہاں بھئی اللہ بس بھئی کے لیے اللہ شکر ہے دعا۔''

14: ڈاکٹر ایوب مرزا لکھتے ہیں:

''میں نے کہا فیض صاحب! یار لوگوں نے جناب جوش ملیح آبادی کو شاعرِ انقلاب بنا دیا اور آپ کے لیے جیلوں کی سیر
آپ کرتے رہے۔ آپ کو اس حصہ کو آج تک کوئی خطاب نہیں ملا۔ کہنے لگے بھئی جوش صاحب ایک بزرگ آدمی ہیں اور بہت سلیقے کے
آدمی ہیں۔ اپنے اوقات اور آداب کے پابند بہت عزیز رہے ہیں کہ معاملات ویسے بھی صاحب کمال ہیں اس لیے قابلِ احترام ہیں۔ وہ
مسئلہ ہے اس حصہ کے منصب دار ہیں کہ تو بھئی آج تو یہاں بیچ گئے۔ میں نے پوچھا فیض صاحب! وہ کیسے؟ بھئی یوں ہوا کہ
مشاعروں میں ہم نے پڑھ کر شروع کیا۔ ہمیں داد ملی شروع ہوئی۔ ہم اس وقت قصبہ اجڑ میں ہوں گے۔ اس زمانے میں ایک
بزرگ شخص وارثی صاحب بھی بڑے زبردست تھے۔ اپنا سارا کلام مشاعروں میں سنایا کرتے تھے۔ وارثی صاحب ایک
مشاعرے میں آئے۔ ہم بھی پہنچ گئے۔ بار بار داد سے نوازا۔ ایک دن وہ میرے ہوٹل کے کمرے میں آ گئے۔ کہنے لگے تمھیں دیکھ کر
اپنی جوانی یاد آ گئی۔ تمھارا کلام الہام ہے۔ الہام ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بھئی ہم سمجھے کہ جناب مولانا وارثی
ہم پر مہربان ہو گئے ہیں۔ پھر وہ مجھے قوالی سننے ساتھ لے جاتے اور قوالی کے بعد پوچھتے کہ کچھ وجد طاری ہوا؟ ہم صاف صاف کہہ
دیتے کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ قوالی اچھی تھی۔ یہ سلسلہ قوالی چلتا رہا۔ ہم تنگ آ گئے۔ ایک روز تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم نے
وارثی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کچھ فیض سے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ''آپ بھی ہیں'' کہہ کر پوچھا اور فرمایا ''نہیں تو تجھے صوفی
ہونے کی فکر میں تو رکھتے ہیں اللہ کا نور ہے۔'' اس کے بعد وہ کبھی نہیں آئے۔ میں نے کہا آپ وارثی صاحب تھے یہ کہہ کر تھیں ہنس کر لیں۔''

15: ظفر اللہ پوشنی ''خیالات فیض'' میں لکھتے ہیں:

''جب رسالہ چھپ گیا اور کتاب کی جیب میں فیض کی تقریب ہوئی تو میں نے نوٹ کیا کہ یہ انتساب درج ہے ''کلثوم کے
نام'' دل میں شک ہوا کہ یہ کلثوم کون ہے۔ فیض سے کبھی یاد اشتہار کیا تو ٹال گئے۔ ہم جھجکے اس سے پوچھا کسی کو کچھ معلوم تھا کہ
کلثوم کون ہیں۔ ایک تجسس کی لہر ہم دوستوں میں چلی گئی۔ بحث میں لکھے ہوئے پہلے مجموعہ پر ان خاتون کا نام ہے۔ جیسا فیض
صاحب کی کوئی عزیزہ ہوں گی۔ فیض محفلوں میں بہت مقبول رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی بے ہدایت یا نادان ہیں۔
(Don Juan) آپ سے مراد تھا کہ ان کی شاعری خود ہی فیض بخش ہے اور جوانی کی نوعیت طلب کر رہی تھی۔

''سہیل یا کسی کی کلثوم سے نام کا انتساب نے فیض کے تمام ساتھیوں کو ایک اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ یہ کلثوم آخر کیا
ہے کلثوم کیا ہو سکتا ہے؟ فیض صاحب نے کئی دن تک مجھے اور دیگر احباب کو جوش و اخلاص میں ایسی حالت میں لٹکائے رکھا اور آخر ایک روز یہ
اعتراف کیا کہ کلثوم تو دراصل ان کی زوجہ محترمہ ہیں کو بھلائی نام ہے۔ اس پر سب اہلِ دل کو شدید مایوسی ہوئی اور یار لوگ یہ کہتے سنائی
دیے کہ فیض نے تو حیران کر کر دیا۔ فیض سے جھجکے لوگوں کی نوک پلک کو بہت محفوظ اور بے تحاشا پیش کر رہے تھے کہ لوگ کیا
گمان بالا ہے اور جرائت ہوئی کہ نام انتساب کرتے وہ بابت مجھ کہا جاتی ہے سب کا ستعمال کی محبوبہ کی تلاش میں ہیں ہم سب فیض

صاحب کی اس شرارت پر کئی دن تک تبصرہ کرتے رہے۔"

16۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب بیان کرتے ہیں:

"1982ء کا واقعہ ہے فیض صاحب لندن آئے ہوئے تھے۔ انھیں الطاف گوہر صاحب نے یاد کیا تو ایک شام ہم لوگ فیض صاحب کو لے کر الطاف گوہر صاحب کے گھر پہنچے۔ الطاف صاحب نے گرم جوشی سے فیض صاحب کا استقبال کیا اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد الطاف گوہر صاحب نے فیض صاحب سے کہا کہ "فیض صاحب ہمارا ارادہ ہے کہ آپ کے منتخب کلام کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کریں۔" فیض صاحب نے اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب الطاف گوہر نے دوسری اور تیسری بار یہی تجویز پیش کی تو انھوں نے مختصراً جواب اس طرح دیا۔

فیض صاحب: "خیال تو اچھا ہے لیکن آپ ترجمہ کرنے کی تکلیف گوارا کریں گے تو ٹھیک ہوگا؟"

الطاف گوہر: "وہ کیوں؟"

فیض صاحب: "کیونکہ مترجم کو دو میں سے ایک زبان تو آتی ہو۔"

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

17۔ 1981ء کی بات ہے فیض لندن آئے ہوئے تھے۔ قیامِ لندن کے دوران وہ ہر روز مجھ سے ملنے کے لیے اردو مرکز (پکاڈلی) تشریف لایا کرتے۔ افتخار عارف اردو مرکز کے منتظم اعزازی تھے اور اس زمانے میں موٹر ڈرائیونگ سیکھ رہے تھے۔ کار کے آگے "ایل" کی تختی لگی ہوتی اور ان کے علاوہ کوئی تجربہ کار لائسنس ہولڈر بیٹھا ہوتا۔ انھی دنوں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی لندن آئے ہوئے تھے۔ فیض صاحب اور گوپی چند نارنگ صاحب کو ایک ہی دن لندن سے واپس ہونا تھا۔ دونوں کے ہوائی جہازوں کا ٹائم بھی قریب قریب ایک ہی تھا، پروازیں مختلف۔ افتخار عارف اپنی کار میں ان دونوں کو لے کر ہیتھرو ایئرپورٹ کی طرف اس طرح چلے کہ عارف کے برابر میں نارنگ بیٹھے تھے اور پچھلی نشست پر فیض صاحب۔ گوپی چند نارنگ کے ساتھ میں بیٹھا ہوا تھا۔ راستے میں سامنے سے ایک تیز رفتار گاڑی اس طرح گزری کہ ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ عارف کسی قدر گھبرا گئے اور اس کا اثر ان کی گاڑی چلانے پر اس طرح ہوا کہ ان کی گاڑی کسی قدر ڈگمگا گئی۔ اس پر نارنگ صاحب نے کہا: "فیض صاحب! اردو شعر و ادب کا مستقبل خطرے میں معلوم ہوتا ہے۔" فیض صاحب نے برجستہ کہا: "اردو تنقید کا مستقبل بھی کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔"

۔☆۔

فیض کی نعت

فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام "غبارِ ایام" میں ایک نعت بھی شامل ہے جو فارسی زبان میں ہے اور جس میں صرف پانچ شعر ہیں۔ اس نعت کی تخلیق کی تاریخ اور مقامِ تخلیق کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ نعت غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے جو مردّف ہے اور اس کی ردیف "تو" ہے۔ اس نعت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر محروم، مجبور، مظلوم اور مقہور افراد کے جذبات کی عکاسی اور ان کے حقوق کی پاسبانی کرتا ہے۔ فیض کی اس مختصر ربانی نعت میں نعت کے کسی اساسی اور روایتی موضوع کا ذکر نہیں لیکن یہ تخلیقی واردات سے لبریز عقیدت سے بھی بھری جذبات نگاری ہے جس پر فارسی تلمیحات اور تجربات کی گہری چھاپ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نعت میں کوئی ایک نعت کے اساسی مضامین یعنی میلاد نگاری، معراج نگاری، سراپا نگاری، شمائل نگاری، زہد، بخشش، شفاعت، رحمت، عرش، روضہ، مدینہ، عشق، تخلیقِ کائنات، علمِ لدنی، ختمِ نبوت، معجزات اور اسمائے گرامی وغیرہ کا ذکر نہیں ہے لیکن خیر البشر سے بشری مشکلات اور ان کی محبت کی پُرخلوص پیشکش ہے۔ نعت کے ہر شعر سے فیض کا منفرد لہجہ جھلک رہا ہے۔ فیض کی حمد ہو کہ دعا، مرثیہ ہو کہ نعت ان کا انداز جداگانہ ہے۔ کہیں وہ حمد میں دستِ دعا کو مختلف دیتے ہیں تو کہیں فیض کی دعا مانگتے ہیں تو کہیں مرثیے میں وہ ظلم اور جبر کو کربلا کے عصرِ حاضر سے یوں تعبیر کر دیتے ہیں:

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

فیض کی نعت کا مطلع ہے:

اے تو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو
آوردہ ام سرائے دگر از برائے تو

ترجمہ: اے حضورؐ! ہر رنجیدہ دل آپ کی رہائش گاہ ہے، فیض بھی ایک اور مسکن گاہ آپ کے لیے لایا ہوں یعنی حضورِ اکرمؐ چونکہ ہر رنجیدہ دل میں رہتے ہیں اور ان کے درد سے واقف ہیں اس لیے فیض بھی غم زدہ دل لایا ہوں تا کہ آپ میرے دل میں قیام کر کے میرے درد و غم سے آشنا ہوں۔

خواجہ بہ تخت بندۂ تشویشِ ملک و مال
بر خاک رشکِ خسروِ دوراں گدائے تو

ترجمہ: بادشاہ جو تخت پر بیٹھا ہے وہ ملک اور دولت کی فکر کا غلام ہے۔ آپ کا خاک پر بیٹھا ہوا فقیر شہنشاہِ وقت کے لیے حسرت اور رشک بنا ہوا ہے۔ اس شعر میں عشقِ محمدی اور حضورؐ سے نسبت کا بلیغ اشارہ ہے۔ تاریخ میں درجنوں ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں

تخت و تاج نے ایک شغلِ بحری میں ڈوبے ہوئے تھے تاکہ قیمتی نقیروں سے بٹورے اور ان سے خراجِ عقیدت کرتے تھے جنہیں عوام کی بے پناہ محبت حاصل تھی۔ مضمون اور عقیدتی تعریف کے علاوہ یہ توریٰ شعر محمود احمد میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس شعر میں فیضی نے شاہ و گدا، خواجہ بندہ اور تخت و خاک کو خوب صورت استعمال کیا ہے جو حقیقت آشنا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی صفت مراعات النظیر کی بھی مثال ہے چنانچہ خواجہ، تخت، فلک، مالک اور خسرو، خورو اس کا ثبوت ہیں۔ فیضی کے لہجے میں نوعیت کو جو دخل ہے اس کی جھلک اس شعر کے مصرعِ اولیٰ کی ترکیب "بندۂ شوقش فلک روان" سے ظاہر ہے جس میں تین اضافات کی گئی ہیں۔

آں جا قصیدہ خوانیِ لذّاتِ سیم و زر

ایں جا فقط حدیثِ نشاطِ لقاے تو

ترجمہ: وہاں قصیدہ خوانی کی جاتی ہے چاندی اور سونے کی چاہت میں مگر یہاں صرف محبت کی حدیثیں ہیں جو آپ کے دیدار کے شوق میں کہی جاتی ہیں۔ فیضی یہاں قصیدوں کے ان شعروں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو حکمرانوں کی شان میں بھرے پڑے ہیں، اس کے مقابل میں نعت کے وہ لاتعداد جاوید نمونے ہیں جو عشق اور شوقِ نبوی سے لبریز ہیں اور زبان زدِ عام بھی ہیں۔ اس شعر میں بھی فیضی نے حاکم اور محکوم، خواجہ اور بندہ کے درمیان واضح خطِ تفریق کھینچ کر دونوں حیثیتوں کے افکار اور مقاصد کو ظاہر کیا ہے۔

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ

از اشک تر ز دردِ غریباں رداے تو

ترجمہ: آتش فشاں کی طرح قہر اور ملامت شیخ کی زبان سے نکلتے ہیں لیکن غریبوں اور بے کسوں کے درد میں جو آپ کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں سے آپ کی چادر نم رہتی ہے۔ فیضی نے اس نعتیہ شعر میں ایک لطیف نکتہ کو واضح کیا ہے۔ حضور نرم خو اور قرآن کریم میں "انک لعلیٰ خلق عظیم" اعلیٰ ترین اخلاق کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تمام زندگی حضور نے خوش اخلاقی، نرمی اور خوش اخلاقی کی تعلیم دی جبکہ ہمارا واعظ اور شیخ سیرتِ نبوی کے برخلاف ہمیشہ تیز زبان استعمال کر کے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ حضور اکرم مجبوروں، مظلوموں، محروموں اور غریبوں کے درد کے ہمدرد، ان کے غم گسار ہیں اور ان کی مصیبتوں پر روتے تھے چنانچہ آپ کی چادرِ رحمت آپ کے اشکوں سے ہمیشہ نم رہتی تھی۔

باید کہ ظالمانِ جہاں را صلا کنند

روزے بسوے عدل و شفاعت صلاے تو

ترجمہ: چاہیے کہ دنیا کے ظالموں کو بلایا جائے گا آپ کے حکم سے قیامت کے روز عدل اور حساب کے لیے۔

نعت کے اس آخری شعر میں فیضی کی حاضر تخیلی بحر ترتیب ظاہر ہوتی ہے۔ فیضی اپنی تخیل کے اعجاز کو پالکی دیتے ہوئے مضمون کو عجز و انکسار تک پہنچا دیتے ہیں۔ ترکی ... سے ظالم ظلم کرنے کے بعد خود بنا ہے کہ زندگی جائیں تو روزِ محشر حضور کے حکم سے عدل اور عنایات کا بازار گرم ہوگا اور حقدار کو اس کا حق دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی نعتیں اس سلسلہ میں بھی اسی طرح کی تفتیش ہوتے کے ہیں۔ فیضی کی نعت عدل اور حسن کا مظہر ہے اور نعت کی تاریخ میں فیضی بھی اک ممتاز شعرا کی صف میں نظر آتے ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خداے بخشندہ

نعت

اے تو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو
آوردہ ام سرائے دگر از برائے تو

خواجہ بہ تخت بندۂ تشویشِ ملک و مال
بر خاک رشکِ خسروِ دوراں گدائے تو

آنجا قصیدہ خوانیِ لذاتِ سیم و زر
اینجا فقط حدیثِ نشاطِ لقائے تو

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ
از اشک تر ز دردِ غریباں ردائے تو

باید کہ ظالمانِ جہاں را صلا کند
روزے بسوئے عدل و عنایت صدائے تو

شامِ غربت

فیض احمد فیض کے مجموعہ کلام "م" مجموعہ میں ایک نظم "شامِ غربت" کے عنوان سے نظر آتی ہے۔ یہ نظم ترکیب بند ہیئت میں ہے جس کے ہر بند میں تین شعر ہیں۔ اس نظم کی تاریخ تصنیف اور مقامِ تصنیف معلوم نہیں۔ نظم کا موضوع "شامِ غریباں" ہے۔ اس شام کو کربلا کے میدان میں اہلِ بیت کے خیمے جلا دیے گئے، شہدائے کربلا کے سر نیزوں پر بلند کیے گئے اور امام حسینؑ کے اعزا و اقارب کو اسیر کیا گیا۔ فارسی، عربی کی طرح اردو شاعری میں بھی شامِ غریباں کا تذکرہ بڑے درد سے کیا گیا ہے۔ فیض نے اس شام کی منظر کشی میں تشبیہات اور استعارات کا سہارا لے کر درد و غم کی تصویر کشی کی ہے۔ شامِ غربت میں دشت، رات، تاریکی، خاموشی اور تنہائی کے ذریعے سوختہ سامانوں، نورِ عرفان کے دیوانوں، شمعِ ایمان کے پروانوں، آنکھ کے تاروں اور درد کے ماروں کو دکھایا گیا ہے۔ مصرعوں میں درد اور تنہائی کا احساس اتنا شدید ہے کہ قاری کو دل کے دھڑکنے کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی زبان میں صنعتِ تکرار سے مضمون میں تاثر پیدا کیا گیا ہے اور مصرعوں میں غنائیت بھر دی گئی ہے۔

مثلاً   درد سا درد ہے، تنہائی سی تنہائی ہے

ـ   آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے

درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے

شامِ غربت میں مثلاً "بیتِ شبیر پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے" اس ظلمت سے تاریکی سے زیادہ اس ظلم کا ذکر ہے جس کا نتیجہ شامِ غریباں اور درد بھری رات کی آمد ہے۔

شامِ غربت

دشت میں سوختہ سامانوں پہ رات آئی ہے
غم کے سنسان بیابانوں پہ رات آئی ہے
نورِ عرفان کے دیوانوں پہ رات آئی ہے
شمعِ ایمان کے پروانوں پہ رات آئی ہے
بیتِ شبیر پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے
درد سا درد ہے، تنہائی سی تنہائی ہے
ایسی تنہائی کہ پیارے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے

بڑے سے بڑے ذرے کو بھی دیکھے ہے

منصف سے چاند جیسے سب کو بھی دیکھا جائے

ایسا عالم کہ شیطانوں پر بار آتا ہے

یہی روشنی کا نتیجہ نور صبح پیدا ہے

☆

فیض اور ایرانی انقلاب

سیالکوٹ پنجاب کے دو بڑے شاعروں نے ایرانی ملت اور اُن کی آزادانہ حریت پسند قدروں کی قدر کرتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایرانی نوجوانوں کے عزم و وقار پر ایک نظم لکھی جس کے پہلے مصرع میں ایرانی جوانوں کو مخاطب کر کے اپنی جان کو اُن کی جان بتایا ہے۔ ع "اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما" علامہ اقبالؒ نے اسی نظم میں یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ ایک روز ایک مرد آئے گا جو تمھاری غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دے گا۔ اُسے میں اپنی آنکھوں سے تمھارے زندان کی فصیل کی کھڑکی سے دیکھ رہا ہوں:

مردی می آید کہ زنجیر غلامان بشکند　　　دیدم از روزن دیوار زندان شما

ہم سب جانتے ہیں کہ وہ مرد جس نے ایرانیوں کے پاؤں کی زنجیر کاٹ دی آیت اللہ خمینی کی صورت میں اقبالؒ کے انتقال کے کوئی چالیس سال بعد 1977ء میں آیا۔ ہمارے مطالعہ میں کوئی ایسا دوسرا ایرانی شاعر بھی نہیں جس نے ایسی پیشین گوئی کی ہو جو بالکل صحیح ثابت ہو۔

فیض احمد فیضؔ اردو کے دوسرے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے ایرانی انقلابی جدوجہد پر دو نظمیں لکھیں۔ پہلی نظم دستِ صبا میں لکھی جس کا عنوان ہے "ایرانی طلبہ کے نام جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے"۔ دوسری نظم "رشتی توجو بیک" لکھی جو "مرے دل مرے مسافر" میں شامل ہے۔ "ایرانی طلبہ کے نام" کی نظم پر اس کی تخلیق کی تاریخ درج نہیں، لیکن "صلیبیں مرے دریچے میں" میں کئی شواہد موجود ہیں کہ یہ نظم حیدرآباد جیل میں لکھی گئی تھی جس کا ذکر فیضؔ نے ایلس کو اپنے خط میں کچھ اس طرح کیا تھا کہ "اس ہفتے میں نے ایران اور مصر کے شہید طلبہ پر ایک نظم شروع کی ہے۔ جیل میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنی کسی چیز سے کچھ اطمینان ہوا ہے"۔ فیضؔ صاحب کا یہ خط اُس وقت کا ہے جب یہ نظم تکمیل ہوئی نہ تھی۔ اس ساری نظم میں مصر کے طلبہ کا ذکر کہیں نہیں بلکہ علامتوں میں صرف ایرانی نسل یعنی اُن کے بدن اور آنکھوں کی رنگت کا ذکر بھی ہے:

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
اے ارضِ عجم اے ارضِ عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"

یہ سچ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے دو بڑے انقلاب تقریباً ایک ہی زمانے میں ہوئے۔ مصر کے انقلاب کی سربراہی جمال عبدالناصر نے کی اور ایران کے انقلاب کی سربراہی ڈاکٹر محمد مصدق نے کی۔ مصر کا انقلاب کامیاب ہوا لیکن ایران کا انقلاب شہنشاہِ ایران اور امریکہ کی سازش کی وجہ سے ختم کر دیا گیا اور ہزاروں ایرانی طلبہ تہران اور ایران کے دوسرے شہروں میں شہید کر دیے گئے۔ آغا ناصر نے اپنی کتاب ”ہم جیتے جی مصروف رہے“ میں ”ایرانی طلبہ کے نام“ کے تحت تفصیل سے اس زمانے کے ایران کے داخلی حالات، خارجی قوتوں کی سازباز، محمد مصدق کی برطرفی، شہنشاہِ ایران کی جلاوطنی اور افسوس ناک انقلابی حرکت کے خاتمہ پر مکمل مطالب کا اظہار کیا ہے۔ آغا ناصر لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر مصدق نے شاہ کو ایران چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن شاہِ ایران کی یہ جلاوطنی بڑے مختصر عرصے کے لیے تھی۔ مغربی طاقتوں خصوصاً امریکہ سے ساز باز کے نتیجے میں مصدق کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ شاہ دوبارہ واپس آ گیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور اپنے محبوب رہنما کے لیے حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ سارے ملک اور بالخصوص تہران میں مظاہرے ہوئے جن کو بالآخر فوج نے بڑی سفاکی سے کچل دیا گیا۔ تہران کی سڑکیں بے شمار لوگوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ ان شہید ہونے والوں میں ایک بڑی تعداد نوجوان طالب علموں کی تھی۔“

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس عمدہ نظم پر تنقید کم ہوا ہے۔ رشید حسن خان لکھتے ہیں:

”ان کی نظموں میں نامناسب متعلق الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے ”ایرانی طلبہ“ ”انتساب“ کی جمادات ہے .....اصل میں بعض سے مقامات پر انگریزی سے براہِ راست ترجمہ کر دینے والا انداز پایا جاتا ہے اور ایسے لفظی ترجمے اردو کے مزاج سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، اجنبی اور بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:

جس میں بجھتے ہو اور کوری آگ
ہے ظلم کی اندھی رات میں بکھرو
صبحِ بغاوت کا گلشن

پھر نو کوری آگ اور گلشن یقیناً ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ شعر کی آواز سے اور ان کے اسالیب سے اجنبی ہی ہیں۔ اس نظم پر بعض جگہ لفظی ترجمہ کرنے کی بدمذاقی کارفرما ہے۔“

جہاں تک انگریزی شاعری کا مطالعہ ہے ہمیں اس نظم پر کوئی انگریزی کی نظم چھاپ نظر نہیں آتی جس کا ترجمہ ہو یا اس کا اثر ہو یا خیال، تو اردو میں بیسویں صدی کی جدید شاعری میں ملتا ہے جس کی ابتدا خود اسی زمانے میں فیض نے کی تھی:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

خود فیض نے حیدرآباد جیل سے اس نظم کی تشکیل پر اپنی بیگم ایلس کو لکھا ”میں سمجھتی ہوں کہ اجنبی کی جس بحث اور نئے نئے موڑ بھی اس نظم میں بھی یاد آتے ہیں۔ یہ بالکل خلافِ روایت انداز ہے۔“

فیض جنوری 1953ء کو جیل سے ایلس کو لکھتے ہیں:

”میں چاہتا تھا کہ ایرانی طلبہ کے لیے بھی کچھ لکھوں لیکن اس خیال سے نہیں لکھی کہ شاید میں اُن سے پورا انصاف نہ کر سکوں۔ یوں بھی ایک نظم اسی موضوع کی تکرار ہو گی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔

یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ اپنے شعلوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور واقعے پر ایسی نظم پیش کر سکوں گا۔"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض نے اس نظم کو اپنی سب سے اچھی نظموں میں سے ایک نظم قرار دیا ہے جس میں روایت سے ہٹ کر جو اظہار کیا ہے وہ آگے چل کر نئی جدید شاعری کا نقطۂ آغاز بنتی ہے۔ شاید فیض نظم کی ہیئت کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے اس نئے اظہار کو جدت کہیں:

کیسے جانیں حرم کے کس پندار
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

یہ نظم ایک جدید ہیئتی نظم ہے جس میں ایک حرکت ہے جو سوچوں کی شکل میں دنیا کی چادر پر پھیلی ہوئی ساحل پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظم میں ایک لَے ہے جو احساس کے دائرے سے نکل کر ذہن کی فضا میں کھو جاتا ہے۔ مصرعوں میں الفاظ کی ترتیب سے بعض مقامات ایک سمفونی کی صورت musical effect کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔

احساس ساحل پر پھیلی اشرفیوں کی چھن چھن کی صدا سنائی دیتی ہے۔ احساس یا صرف آنکھوں کے تیلم اور ہونٹوں کے مرجان جگمگ جگمگ دمکتے دکھائی نظر آتے ہیں۔ احساس زائقہ میں بیٹھے نور اور زندگی کے کام و دہن اور آنکھ سے ساحل پر شام میں تجارت سے لوٹنے کی خوشبو اور لمس کی دنیا سے دکھ ہے جو احساس میں ہے جو آنکھوں کے تیلم تیتی کے عکس جیسی پھیلی ریت تھے وہ سب آج بازار میں بکتی دنیا کا حسن اور آزاد زندگی گزار نے کا عجوبہ ہیں تھے ہیں۔ کیونکہ یہ ہے کہ ہم نے نظم کی اس نظم کو کوئی نام نہیں دیا۔

ایرانی عوام کی تحریک سے حالات ایسی بھی تھی جن میں ادیب اور شعرا نے اس نظم سے وابستہ تھے جو ان کے انقلاب کے لیے خود وجہ ساز رہے ایران کے شعروں میں ہوتے ہوئے انقلابات کے لیے تھے۔ تخلیق کی ہے، ہم نے تخیل پر مشتمل کو بازار میں بیچتے دیکھا ہے۔ یہی نظم جس کی اشرفیاں، کشکول، لہو، تیلم، مرجان، چاندی، سونا، عجیب پیکر صنعت مراعات النظیر کے ساتھ تیّقی اور تجارت کے علاوہ ثروت کے اظہار بھی ہیں۔

یہ نظم بتاتی ہے کہ دور میں ہم وطنوں کی زندگی کو کھا جانے سے شہادت کا پیکر تراشتی ہے جیسے لہو کے قطرے اشرفیوں کی طرح بچوں کی بھوک کے کشکول میں جمع ہو جاتے ہیں جہاں آنکھوں کے تیلم ہونٹوں کے مرجان، ہاتھوں کی چاندی، جسموں کا سونا بھی دیکھ کر وہ دیدہ ور کو جیسے یاد کر کے اپنی نظروں کو ملتی ہے اور یہ نظم عزت اور تجارت پر ختم ہوتی ہے جس کو ہم کی سرزمین پر آج بھی لوگ دیکھ سکتے ہیں کہ زمین کی الوالعزمی، جنگل اور جوانیوں کی تجارت اور شہادت نے کس طرح سے آمن کی زندگی کے ہاتھوں میں کشکول پہنا دیئے اور زندگی کی رات کو جوہر سے خوب صورت کیا۔ اس نظم میں نادر اور انوکھے استعارات اور تشبیہیں ہیں۔ ایسی صورت میں جس میں احساس کی علامت ہے کا خیال کی آرائش و دلکشی اور تفہیم ہو تو یہی شاعری کی اہمیت میں مرکزیت قرار دی جا سکتی ہے۔

پھول لاتی ہیں
زمین کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کے پیالے بھرتے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے

اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟"
"اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں
اُس نور کے نورس موتی ہیں
اُس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگمگ جگمگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن"

دوسری نظم جس کا آخر میں ذکر کیا جاتا ہے "مرے دل مرے مسافر" میں شامل ہے۔ سوائے آٹھ مصرعے کے یہ تینی اور ادیب و شاعر

نے اس نظم کی وجہ تخلیق بیان ہوئی ہے۔ آغا ناصر ہم جیسے ہی معروف ہے، لکھتے ہیں:

"1979ء کے موسم گرما میں میں نے ایک سرکاری ادبی جریدے کے ساتھ ترکی اور انگلستان کا سفر کیا۔ ابھی فیض صاحب کی بیروت کی زندگی کا عرصہ زیادہ نہیں گزرا تھا۔ پاکستان میں ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور میں نے محسوس کیا بیروت سے قریب ترین جگہ لندن تھی۔ "لوٹس" کے سلسلے میں وہ اکثر لندن آتے جاتے تھے۔

ترکی میں پندرہ دن گزارنے کے بعد جب ہم لندن پہنچے تو مجھے معلوم ہوا کہ فیض صاحب لندن میں ہیں اور ہیرو کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اپنے لندن قیام کے دوران میں ایک شام ان کے ساتھ گزاری۔ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا وہ بڑے ملول اور مضطرب ہیں۔ کھانے کے بعد جب لوٹ جانے لگے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ٹھہر جاؤں۔ میں نے کہا: عارف کو تو جانا ہے جن کے ساتھ میں آیا تھا تو انھوں نے کہا آپ ٹھہریے، میں انتظام کروں گا۔

فیض صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور ایک میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ جب انھوں نے یہ سطر مکمل کر لی تو ایک کاغذ پر لکھی ہوئی وہ نظم مجھے دی اور کہا: "پاکستان لے جاؤ دوستوں میں تقسیم کر دینا۔ ان میں سے ایک نظم ہم نے ایران کے انقلاب پر لکھی ہے۔" نظم کا عنوان تھا "ترانہ"۔ بعد میں انھوں نے اس کا عنوان تبدیل کر کے "ویبقیٰ وجہ ربک" کر دیا تھا۔ امام خمینی کی واپسی اور انقلاب ایران کو ابھی چند ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا۔

میں نے سوال کیا فیض صاحب ایران کا انقلاب تو اسلامی انقلاب ہے، آپ نے اس پر نظم کیوں لکھی تو بولے "بھئی انقلاب اسلامی اور غیر اسلامی نہیں ہوا کرتے۔ جب لوگ تخت و تاج کو اچھالنے اور دھرتی کو آزاد کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئیں تو پھر عوامی انقلاب ہوتا ہے۔"

کافی وقت گزر جانے کے بعد فیض صاحب سے ایک شاعر صحافی مرحوم حسن رضا نے انٹرویو کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ "ایرانی انقلاب کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟"

فیض صاحب نے جواب دیا تھا: "ایرانی عوام کا یہ بڑا کارنامہ ہے اور فرانس کے بعد اسی قسم کا انقلاب دنیا میں کہیں نہیں آیا۔ روس، چین، ویت نام، الجیریا کے انقلابوں میں طبقاتی قوتوں کے درمیان جنگ تھی۔ ایران میں براہ راست عوام کی فتح اور حکمرانی اداروں سے لڑائی ہوئی ہے، یہ عوام نے فتح کو جوڑا ہے۔"

ویبقیٰ وجہ ربک

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے

ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

بعض افراد نے اس نظم کی تاریخ جنوری 1979 لکھی ہے اور اس کا مقامِ تخلیق امریکا بتایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظم فیض نے ایران کے اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر لکھی۔ اس نظم کا عنوان بھی قرآن کریم کی آیت ہے۔ یہ آیت قرآن کی مشہور آیت "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" کے فوراً بعد ہے یعنی تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی مگر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس باقی رہے گی جو احسان اور عظمت والی ہے۔ مزید یہ کہ اس نظم میں فیض نے قیامت سے پہلے اور اس کے دوران پیش آنے والے واقعات بیان کیے ہیں:

جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

قرآن کی آیت کے مطابق قیامت کے روز زمین کو الٹ دیا جائے گا۔

ہم اہلِ صفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے

اور یہ بھی پیشین گوئی کی کہ جلد ہی مظلوم جابر حکمرانوں سے آزاد ہوں گے

جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اٹھوائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

اس نظم پر قرآنی آیات کی چھاپ شدید ہے۔ کئی مصرعے قرآنی آیات کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں:

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی

اس نظم کے علاوہ فلسفۂ وحدانیت اسلامی کی جھلک بھی نمایاں ہے

اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

فیض اپنی تمام نظموں کو نتیجہ پر ختم کرتے ہیں۔ یہ نتیجہ بعض اوقات جلی اور عیاں ہوتا ہے اور بعض مقامات پر خفی اور نہاں ہوتا ہے۔ یہی فیض کا فلسفۂ حیات اور مقصدِ شاعری بھی ہے:

اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

حریت، مساوات، محنت کی عظمت فیض کا آدرش ہے۔

فیض کی شاعری کا حسن یہ بھی ہے کہ اس کی تعبیر اور تفسیر مختلف ذہن کے افراد مختلف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید ذکی اپنی کتاب فیض میں لکھتے ہیں: "یعنی کہ اس وقت تیسری دنیا کی طبقاتی جدوجہد کا نتیجہ کا اندازہ ہوتی ہے جس لیے فیض تیسری دنیا کا انقلابی شاعر و مفکر ہے جو پیداواری انقلاب کا داعی ہے۔ وہ اپنی نظم "و یبقیٰ وجہ ربک" میں پرولتاری انقلاب کا اجمالی اور مفصل نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ نظم اس کے تصورِ انقلاب کی اس طرح بھرپور وضاحت کرتی ہے کہ کوئی شخص اس کی تاویل نہیں کر سکتا۔

شیخ محمد ملک "فیض" میں انقلاب آفرینی کی مثالیں دیتے ہیں: "فیض اپنے دورِ آخر میں دینی روایت کو طبقاتی جدوجہد کے ساتھ اپنانے اور ذہن و فکر کو انقلابی معنویت سے آشنا کرنے میں نئی شان دکھاتے رہے ہیں۔ اس تخلیقی کاوش کا بہترین ثمر "و یبقیٰ وجہ ربک" ہے۔ فنی اور فکری ہر دو اعتبار سے یہ نظم خود فیض کی شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ نظم قرآن کی آیات کے انداز میں جبر و استبداد پر مظلوم انسانیت کی آخری فتح کی بشارت دیتی ہے۔ قرآن حکیم میں قیامت کے روز کا جو نقشہ ہے وہ ان الفاظ سے عبارت ہے جو لوحِ ازل پہ مرقوم ہے اور اس کے مطابق اس یوم احتساب کی نشاندہی ہے جب ظلم و ستم کے پہاڑ روئی کے مانند اڑ جائیں گے اور جب ارضِ خدا کے کعبے کو جبر و سلطان کے بتوں سے پاک کر کے سلطانیٔ جمہور کا علم لہرایا جائے گا"۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جدید شاعری میں فیض کی کسی دوسری نظم کا عنوان قرآن مجید کی آیت سے نہیں ہے۔ خود ہمارے فیض قرآن اور علومِ قرآن سے بہت واقفیت رکھتے تھے۔ بچپن میں کچھ قرآن کے پارے حفظ بھی کیا تھا، گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ انگریزی کے ساتھ عربی میں ایم اے کیا تھا۔ ادب کی تعلیم اور تربیت حاصل کی تھی۔ جیل میں قید کے دوران احادیث پر درس و تفسیر بھی کرتے تھے اور ان

نے بتایا کہ دستار بندی تو کسی نے ان کی نہیں کی لیکن چونکہ ان کا ایک مذہبی Inhibitions بھی کہتے تھے ... ایک بسم کا ... نے

مسجد میں امامت اور کسی نے آپ کے خاندان کے افراد سے تھوڑا بہت ... کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمارا یہ سب کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام مذہبی اقدار اور تہذیب کا مجموعہ لازم ہیں اور اسی کے زیر اثر شاعر کے کلام میں موجود ہیں اور اس طرح کی کوئی ... ہیں۔

ہم اپنی تحریر کو ختم کرتے ہیں ... نے اپنے مضمون "فیض اور رمضان" میں لکھا ہے: "فیض کی ترتیب ... میرے ذہن میں ... کی دیواروں ... سے وابستہ ہیں۔ مثلاً اپنے والد سے عدالت میں جانے کے لیے ... فیض ... لیتے تھے ... سفید رنگ ... عطر اور خوشبو کا استعمال بھی بے دریغ کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے ان کی اس عادت پر تبصرہ کیا تو فیض صاحب نے ... یہ تو سنت ہے۔ اس شخص نے حیرت سے کہا حضرت! آپ کو بھلا ان عقائد، روایات اور اعتقادات سے کیا تعلق؟! فیض صاحب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں، میں یقیناً اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک حصہ ہوں۔"

☆

جو میرا تمھارا رشتہ ہے

(فیض کے خطوط سرفراز کے نام ..... "دامنِ یوسف" کا تاثراتی تجزیہ)

مرزا غالب کے خطوط نے اردو ادب میں نئی جان پھونکی اور اردو ادب کو خطوط نویسی کا نیا سلیقہ عطا کیا لیکن یہ پہلی اور آخری غالب تھی کیونکہ بیسویں صدی اردو ادب میں مکاتیب کی اہم صدی یادگار رہے گی۔ خطوط نویسی جو تیزی سے ترقی کا تھی جتنی اہم ضرورت مانی گئی تھی آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت موبائل، انٹرنیٹ، ای میل (E-mail) وغیرہ کی بدولت غیر ضروری ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ادبِ لطیف کا وہ حصہ جو جذبات، محسوسات اور خصوصی ذاتی کیفیات کی تحریری تصویر ہوا کرتا تھا ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں علامہ اقبال کے تقریباً ایک ہزار خطوط اقبال شناسی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آخر میں ایما ویگے ناسٹ کے نام وہ تحریر کیے 27 خطوط جو علامہ اقبال نے جرمن اور انگریزی میں لکھے تھے ان کے درمیان میں ہونے والے تعلق کی لطیف جذباتی اور عشقیہ واردات سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ فیض بھی ان کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ فیض کے قید و اسیری کے 125 خطوط کا اردو ترجمہ مرزا ظفر الحسن نے "صلیبیں مرے دریچے میں" کے عنوان سے 1971ء میں کراچی سے شائع کیا۔ یہ کتاب 716 صفحات پر مشتمل ہے اور جسے فیض کی دونوں بچیوں کے علاوہ ایلس فیض کی اور بیٹیوں سے انتساب کیا گیا ہے۔ یہ خطوط جو فیض کی زندگی میں شائع ہوئے ان کا تفصیلی ذکر ہم نے دوسرے مقام پر کیا ہے۔ اس موقع پر ہم ان خطوط کا ذکر کرتے ہیں جو فیض نے سرفراز اقبال کو لکھے۔ ان خطوط کو فیض کے انتقال کے بعد 1988ء میں بیگم سرفراز اقبال نے ضروری تشریحات اور تبصروں کے ساتھ "دامنِ یوسف" کے نام سے لاہور سے شائع کیا۔ "دامنِ یوسف" میں بیگم سرفراز اقبال کا مختصر پیش لفظ اور تمہید مکمل ہے بغیر اقتباسات کے خطوط کی شکل میں تحریر کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اصل موضوع فیض کے تقریباً 55 سے زیادہ خطوط ہیں جن میں فیض کی شخصیت، ذاتی کیفیات، الجھنیں، ادبی، سماجی، قومی، ملی، بین الاقوامی مسائل کے علاوہ کچھ ایسے نازک مسائل بھی سامنے آتے ہیں جن سے پتہ محبت اور خلوص اور عشق کا ترانہ ملتا ہے۔ یہ مطالب خطوط کے مطالعے سے زیادہ ان اقتباسات سے ظاہر ہوتے ہیں جن سے پڑھنے والا واقف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیشتر خطوں پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن کتاب کے حوالے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خطوط 1970ء سے 1984ء تک چودہ برس کے لمبے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان خطوں کے مجموعہ "دامنِ یوسف" میں فیض کا پہلا حسن کے اور جواب اقتباسات بھی شامل کیے گئے ہیں جن کے بارے میں خود سرفراز لکھتی ہیں۔ "میرے نزدیک یہ ضروری تھا کہ ان باتوں کی وضاحت ہو جائے جو نثری صورت میں شاعر صاحب نے تحریر کیں ورنہ شاید مکمل نہ ہوتا"۔ محمد علی صدیقی کو اس کتاب کے تقسیم پر اظہارِ خیال کا موقع ملا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سرفراز اقبال نے نہایت ایمانداری سے اظہار میں فیض کے لیے اپنی عقیدت و احترام کی جانی پیش کی ہے۔ یہ ایک بہت خوب صورت شاعر کے ایک خوب صورت پرستار کی خوب صورت داستان ہے۔" محمد علی صدیقی نے داستان کا لفظ

بات سچ لکھتا ہوں کہ سرفراز اقبال نے اپنی صحافت اور ادبیت سے ان مکاتیب کو بڑے سلیقے کے ساتھ شائع کر کے حق ادا کیا ہے۔ میں تو یہاں کہ دوں۔ مشفق خواجہ کہتے ہیں کہ اس کتاب کا نام "دامنِ یوسف" کے بجائے "دامنِ تار تار" ہونا چاہیے تھا۔ راقم کو خواجہ صاحب کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں۔ دامنِ یوسف کی وسعت اس کی کیفیت، اس کی صداقت، اس کی عظمت، اس کی نفاست کے مطابق ہے۔ یہ آپ اپنی ادبی صحافت کی تاریخ میں ہے۔ اس دامن کا ہر حرف ایک زندہ سبب ہے۔

اس مجموعہ میں فیض نے اپنے اشعار سے وہ حوالے دیے ہیں جو خطوط کی تحریر سے ملتے تھے

جانا جانا یہاں سے جانے والے

فیض فرہاد و جم کی بات کرے

فیض کے خطوط کا یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ اس مجموعہ میں سرفراز اقبال کا کوئی خط نہیں جس کا فیض نے جواب لکھا ہے البتہ خود جوابی خطوط میں سرفراز کے خطوں کے متن اور مطالب کا اشارہ ملتا ہے۔ کچھ خط تو نجی اور عام سماجی نوعیت کے ہیں جن میں فیض نے سرفراز اقبال کے سوالات پر اپنے اشعار و اپنی غزل کا حوالہ دے کر جواب دیئے ہیں۔ ان خطوں میں تحریری نوعیت کا ہے۔ اطمینان کی سرفراز سے فرمائش پوری کرنے میں فیض پر جو گزری ہے جو بعد میں پیاری سرفراز سے فرمائش ہو کر پیار بھرا خط فیض پر قائم ہوا۔ اس موقع پر ہم مخاطب کے گلے بھی وصول کرتے ہیں کیوں کہ یہ سب سلسلہ اردو ادب میں اپنا اور اپنی تحریر کی ضرورت تھی۔

پیاری سرفراز.... تمہارا کہنا بالکل غلط ہے کہ تمہیں ملاقات کی تمنا سے زیادہ ضرورت ہے تمہارے پاس تو ہم جیسی ہر طرح کی ملاقات کا بوسیدہ سامان موجود ہے۔ یہ بات تو یہ ہے کہ تمہارے سوا کچھ نہیں ہے۔ بالکل Hans Andersen کی سی کیفیت ہے۔ اس وجہ سے ہم آئے تو تھوڑا کچھ اداس ہو گئے تھے کہ یہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے 104 نمبر والے مکان میں تھی کہ گھر کا گوشہ گوشہ ملتا ہے۔ ..... سایہ دار..... فیض

(سرفراز اقبال کی پہلی رہائش گاہ کا نمبر 104 تھا جو بعد میں نئے بنگلے میں منتقل ہوئیں)

پیاری سرفراز..... دو تین دن پہلے تمہارا خط ملا۔ وقت تمہارا ایسا ہی ہے جیسے تھا۔ اس بار تمہارا پیغام ہے ہم تو تمہاری گفتگو سے تمہارے پاس ہیں۔ ہم بھی سرفراز کو سمجھانے کے لیے بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن ان کی اپنی طبیعت سے دل کی بات کہہ چکی ہے۔ تمہاری بدقسمتی ہوئی سو تو ہمارے سامنے رہتی ہے لیکن کیا کروں؟ تمہیں بالکل suit نہیں کرتا۔ میرے لئے تو یہ سب پہلے پوری ہو گئی تھی۔ اب تو اس سے "خط آنے سے ملاقات" کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم کہیں نہ جاؤ کہ یہ چارہ گری پہلے بھی ہو سکتی ہے..... تمہارا دوست اور یہ سایہ دار۔ فیض

جو میرا تمہارا رشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال

اس عشق کا حاصل، ہر ایک سے چھپائے ہوئے
”سمندر کیا ہے زندہ گئے اٹھائے ہوئے“

... .

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا، عہدِ وفا آخرِ شب
گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

پیاری سرفراز...... تم نے چاہے جو ناول کو پڑھ لیا ہے لوٹ آئی ہو اور انشاء تمھیں خوش رکھے تمھیں ہر کسی سے تو وہ ناول کیسی لگ سکتے نہ مل سکتا ہے جو حسن اخلاق سے وہاں میسر آتا تھا اور حسن کی طلب میں جس طرح ہوتی ہے۔ تم نے لکھا تو کہ تم بھی باتیں کرتی ہو اور شاید دل کی تہہ سے ابھی تک نہیں ہے جو ابھی شروع ہوگئی ہو لیکن ان سے باتیں کرنے کے علاوہ اور چھوٹی موٹی کوئی خوشی ہے اور میرا صاحب (میر جی احمد علی پیر) آج کل یہی لوگ دکھاتے ہیں وہ دکھاتے ہو، دل کی تہہ سے تمھاری تہہ سے۔ بہرحال زندہ تو شاید ابھی رہنا ہے لیکن شاید پچھلے سال کی طرح قریب ہونے کا بھی کوئی موقع بن جائے۔

پیاری سرفراز...... آج نے تمھاری ڈائری کا لکھا ہے جو کل میرے سے پردیس میں شب و روز زندگی اچھی ہے تمھیں بچوں کے ساتھ اب ہم نے لکھا تھا کہ ”یہ چار دن کی جدائی کوئی بات نہیں“ تمھیں رونا ہے جو تمھیں خوف نہیں تھی۔ یہ چاہو کہ پردیس کے چھ دن تک ادھر ادھر ان کے دفتر دیکھ کر تے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب یہاں بہار کا موسم ہے اور دوست احباب سے ملنے کے علاوہ کوئی مصروفیت نہیں لیکن پھر بھی صبح آنکھ کھلتی ہے تو روشنی ابھی نہیں تھی۔ ابھی کام تھا کہ لیے دن تک جاناں کیسے ہو گئے۔ خیر یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

پیاری سرفراز... کراچی سے روانگی سے پہلے تمھاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمھارا خط بھی آیا تھا۔ ہم بھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں لیکن یہ خط ہم نے رکھ دیا ہے جا کر کہ۔ ہے اور تم جانتے ہو کہ حسن خیالی کا تو قصہ ہے لیکن صحت شریف ہے کہ کم ہی جا کر رہے ہو کہ محبت میں خلاف ہوتا ہے۔ ہمارا کام کچھ زیادہ ہو چکا ہے لیکن ”پچھلے روز اور میری جان“ انتظار جنوری ایک روز۔ کل شب رات کو سیف خوش نے ہمارا آخر Tour کی صورت میں جو تو سفر دن کی بھی جو افکار میں کچھ غلط ہیں ہے۔ ... ہے جس اور کی غلطی کی گئی ہو اس سے ذہن لو:

اب تو یہ ہے، کہیں، کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا، نہ سویرا
آنکھوں کے دریچے میں کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
شاید وہ کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اب بیر نہ الفت، نہ کوئی ربط، نہ رشتہ
اپنا کوئی تیرا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل، یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

پیاری سرفراز..... وہاں کے ایک انگریزی میگزین میں جو تمہاری تصویر نظر آئی (غلام رسول کی فرنشنگ کا فیچر ہے) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "دو وقت روزگار کی پرسش" تم نے اپنی دوستیوں اور رجحانات کا تذکرہ کیا ہے۔ اب یہ تو ہمیں کیا اعتراض ہو گا جس کام کسی کے دوست بننے میں جو تمہیں مہارت حاصل ہے اس کا کچھ نتیجہ ضرور ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر تم قصد کرنے تک تو ٹھیک ہے لیکن اگر مشکلات کا اعتراف کیا جائے کہ ... اپنے والوں کی زبان میں کسی کے بس میں ... تو اب ہم کس کی ... حافظہ۔ اس کے جواب میں تم جو کچھ بھی کہو ہم کیا کریں ہماری صورت ہی ایسی ہے۔ خیر بات کچھ ٹھیک ہے۔ ... آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں اور ... بھی عطا ہوئی ہے، مبارک ہو۔ میرے خیال سے اب تم اپنے لیے ایک Grand Mother کا ... سامنے لا کر ... لیکن ... البتہ ہم اب واقعی ... ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا، وہ شعر بھی سن لو اور وعدہ پورا کرو۔

اپنے انعام حسن کے بدلے
ہم تہی داماں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

پیاری سرفراز..... تم نے تو ہمیں TV پر دیکھا ہو گا لیکن ہم کیسے دیکھتے۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر سی کھنچی جاتی ہے "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"۔ اس سے زیادہ آرام دہ صورت یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ دی جائے لیکن وہ تو تصویر ہوئی اس سے بات کیسے کی جائے یا اس کی آواز کیسے سنی جائے۔ اگر ہم تمہیں TV پر نظر آئے ... تو عجیب سی بات ہے۔ سگریٹ چھوڑ دیا تو کسی ... البتہ کچھ وزن کم کرنے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں تا کہ بڑھاپے میں کچھ ... تو برقرار

رہے ورنہ بار بار کہیں یہ انگلیاں ہی نہ ختم ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے تمھارا بھی اس کا روز نہیں کرتیں اور اس کے ہوتے ہوئے بھی وقت یاد نہیں ہوتی ہے کہ کوئی تو یاد کرتا ہے۔ سلام یہ تمھیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو یہ قول تمھارا کہ تمھیں اپنے والدین کو واپس آنا ہے بڑی حد تک ہی رہی صورت رہی تو شاید ان کی یادوں کو بھی۔ البتہ تمھیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا ہے کہ ہم عمر میں زیادہ والدین سے مختلف ہوئے اور افسوس کرتے ہیں کہ تم جیسے لوگ بیکار کے ایسی کتنی باتیں ہیں۔

پیاری سرفراز..... میں اس لحاظ سے تو بہت خوش ہوا ہے کہ وہاں پہلے آخری مرتبہ خط آیا تھا۔ آج چند برس پہلے لکھا تھا:

جس قدر ہو گا یہاں عمر دو روزہ کا ہجوم
ہم تری یاد سے جس روز اتر جائیں گے

اور تمھاری طویل خاموشی سے مجھے ہونے لگا تھا کہ شاید یہ ہو بھی چکا ہے۔

ان خطوط میں سرفراز اقبال کے خطوط کی پرچھائیاں تو نظر آتی ہیں لیکن ان خطوط کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں: میں نے یہ خط آپ کے سامنے لا کر رکھ دیے ہیں اور ان کے ساتھ جو ماحول بھی بیان کرنا تھا، مگر مجھے شدت سے احساس ہے کہ میں اس شخص سے محبت اور عقیدت کا کوئی کنارہ بھی اس کوشش کے دوران ظاہر نہیں کر سکی جو مجھے ان خطوط کی صورت میں ملا جیسے دعوت و صالِ سخن۔

بعض اوقات مجھے سوچنا ہوتا ہے کہ یہ دوستی، محبت، عشق، چاہت یہ سب کیا ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آ سکی۔ ممکن ہے یہ بات سے دوست یار لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے یا فیض ان خطوں کی معلومات کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور لکھنا اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ، کاش کبھی مجسم ہو کر مجھ سے ملنے آ سکیں۔ میں انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں، خود بھی ان کی باتیں سنوں، سنتی جاؤں، سنتی ہی چلی جاؤں۔ کچھ کہنے سنانے کے لیے کچھ باقی نہ رہے۔ آوازیں ختم ہو جائیں لیکن تاثر رہ جائے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے یہ خطوط نکالے اور پڑھنا شروع کر دیے۔ وقت گزرتا رہا، آوازیں مدھم ہوتی گئیں اور کاغذ پر سوئی ہوئی عبارتوں کے بدلے جسم ہو کر میرے سامنے آن بیٹھے۔ ان لفظوں میں سے کوئی فیض صاحب کی طرح سگریٹ پیتا، کوئی ان کی طرح مسکراتا، کوئی ان کے انداز میں سر ہلاتا، کوئی خوب ہنستا، کوئی ان جیسی نگاہوں میں گفتگو کرتا، کوئی انگلیاں انھی کی طرح دھوئیں کو خوب صورت بناتا..... میں فیض صاحب کی ان پرچھائیوں میں یوں گم ہو جاتی جیسے گھنے جنگل میں کوئی کھو جائے۔

میں جب فیض صاحب کے ان خطوں، ان کی باتوں، ان کے لفظوں اور ان کے ہر منظر میں سانس لیتے ہوئے لمحوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں...... مجھے لگتا ہے جیسے ہر کی محبت میں کتنی محبت اور عمر ہو گئی ..... اور کبھی کبھی تو میرے گمان اور خیال کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب میری روح مکان سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہو گی تو حدِ نظر پر کسی اجنبی سمت سے اچانک کوئی خوشبو وصل رنگ لیے مجھ سے سرگوشی کرے گی: ارے تم! میرے خط کہاں ہیں؟ کہاں چھوڑ آئی ہو؟ کیا اپنا ہی بنا لیا ہے؟ کاش تم ایسے ہوتیں....

سید شاہ ان اپنے خط مورخہ یکم جنوری 1981ء میں سرفراز اقبال کو لکھتے ہیں: "میری عزیز دوست! سلامت رہیے..... اللہ کی بہت ہی کا شکر و فضل ہے۔ وہ فیض صاحب کا نام جیسے سادہ والی کو پسند نہیں کرتیں، کل نے بتایا ہے کہ جب یہ فیض ہیں۔ یہ ان کا احساس کتنا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔"

بقول ... یہ تجربہ ہے کہ ہر شخص فاتح کے علاوہ ہو ... انسان ... کا ذکر کرتا ہے جو محبت ... کرنے والے

ہیں۔ نظموں اور اقتباسوں سے عام طور پر بیماری اور علاج کے موضوع پر عملی گفتگو نہیں ہوتی۔ فیض نے سرفراز اقبال اور الطاف عارف کے بعض خطوں میں اپنے علاج اور صحت کے مختلف مسائل پر کھل کر بات چیت کی ہے جس سے آخری عمر میں اُن کی بیماریاں اور متعدد ہسپتالوں میں داخلے کا پتا چلتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ کچھ خطوط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

پیاری سرفراز...... جب سے پاکستان سے ہوکر ایک بیماری کے بعد زندگی کا اپنا تماشا لگا ہے کہ بچنے کی اُمید کم ہی ہے۔ ہسپتال میں بھی اسی نے مدد کی ہے اُس کو سامنا کر لیں لیکن بیماری نے پیچھا نہیں چھوڑا اور مجھے پابند کیے رکھا...... پھر ہوا یہ کہ جب ذرا ٹھیک ہوا تو اس سے آگے ہفتے یہاں پہنچے...... سامان کو ہمیں جاتے ہوئے ہی کے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جس سے ذرا پہلے میں تو عام ڈاکٹری میں تھا کہ شہر کے ایک بڑے ہسپتال میں چھوڑ گئے یہاں سے تیرہ دن بعد ڈاکٹر نے کہا کہ ایک ماہ کے بعد دوبارہ ٹیسٹ ہوں گے پہلے میں اتفاق کر کے اندر ہی رہتا تھا کا ہر روز بھی ڈالا جاتا تھا۔ پہلے ہفتے میں آیا تو آپریشن کی ضرورت پڑے گی مگر ابھی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک ہفتے کے بعد تشخیص ہوئی تو جان میں جان آئی لیکن بخار کے اعلان اور بھی تھے۔ سب ہم اس ہسپتال کے Polyclinic میں داخل ہونے کے لیے گئے تو دن کی خوشی ختم ہو گئی۔ جب سب کچھ ٹھیک ہو گیا تو پتا چلا کہ آنکھوں کا ٹیسٹ کیے بغیر نہیں ہے۔ مجھے یہ دن کا علم ہے کہ کل خون کا معائنہ ہو گا اس کے بعد خون کا ٹیسٹ ہوگا۔ کہنے گئے یہ تو نیند ہے مگر ابھی قیامت ہو رہی۔ معلوم ہوا ہے یہاں یہ ہال کو ایک یا دو سے تو ابھی کام ہو سکتا ہے۔ لوگ یہ تو بتا نہیں سکے کہ اس کو خالی کرنے کا حکم ہوا اور ہمیں اس ہسپتال کے Quarantine میں نظر بند کر دیا گیا۔ ہفتے بھر کے بعد ملنے والوں کی اجازت نہیں ہے اور مگر اس ہسپتال میں آنے کی اجازت ملی۔ یہاں ٹھیک نہ ہو سکا ہے بات کرنے کو کافی لوگ ہیں۔ غرض نہ آرام ہے۔

عزیزی سرفراز اقبال...... ہم پرسوں رات یہاں پہنچے تھے۔ آج ڈاکٹروں نے ٹیسٹ کیے ہیں اب کل دوسرے دن ڈاکٹر ملیں گے۔ جا کر دیکھیں گے۔

پیاری سرفراز اقبال...... ہم کوئی دو ہفتے سے ہسپتال میں ہیں۔ آج تک ٹھیک نہیں ہو پائے کی بیماری معلوم (Caesarian) کیا اور سے یہاں آپریشن کی ضرورت پڑی ہے۔

پیاری سرفراز اقبال...... ایک دن اپنے سر کے ساتھ ساری دنیا گھومنے لگی جسے Vertigo کہتے ہیں۔ دو ہفتے ہسپتال میں گزرے ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ کوئی مرض نہیں ہے محض تھکن ہے دماغ کو آرام اور خوش طبعی کی ضرورت ہے اور یہاں ان دنوں اجتناب کیا ہے۔

فیض نے بعض خطوں میں سرفراز اقبال کے بیٹے عدیم اور ان کی بیٹی ماہ رخ کے لیے محبت کا اظہار کیا اور اُن کی طبیعت کے بارے میں سوالات کیے۔ ایک موقع پر فیض لکھتے ہیں: "پیاری سرفراز یہ عجیب سی بات ہے کہ تمہیں بتاؤں تم جواب دو گی (عدیم) کی طرف سے آتا ہے۔" ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "عزیز بیٹی ہو...... آج دل اداس ہوا تو تمہیں بہت یاد کیا۔ سب تمہاری باتیں یاد آتی ہیں۔ ہر طرف بہت ہی ہونے ہیں مگر شہر بھلا لگتا ہے۔ سب کو بہت پیار کرنا اور اُس سے کہنا وفا کبھی نہ بھولنا ہے۔"

ان خطوط میں کچھ فلسطینیوں کے حالات، ورود کی جنگ کے علاوہ فیض کا حسب کے مختلف ممالک کے دورے اور یہ قیام کیا ہے اور ان کی عزیز بچوں سے محبت کا اظہار بھی ہے جو سرفراز اقبال سے ذاتی تعلق کا اندازہ ہو سکتے ہیں۔

پیاری سرفراز اقبال...... تمہیں اس سے پہلے عجیب اس وقت سے تمہیں لکھا کہ اب کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ دن ماسکو اور بیروت کی تلاش و تحقیق میں لگے پھر یہاں بیروت اور بچوں کی جگہ تلاش کرنے میں کچھ وقت گزرا۔ اب یہ ٹھکانہ ملا ہے۔ مجھے کچھ دن ہمارے دل

ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم زندگی سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ سمندر کے کنارے رہائش ملی ہے۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے اتنی دور بیروت میں گھر اور
بچے۔ لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔ کم از کم ہوٹل اور ہوائی جہازوں سے نجات ملی۔ اور پھر کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہے۔ البتہ سب ساحل پر
جا بجا ہوٹل اور ریستوران تھے سب تباہ ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ فوجی چوکیاں اور کیمپ خیمے بن گئے ہیں۔ ان میں ایک فائدہ
ہے کہ ضرورت کی ہر چیز قدم قدم پر موجود ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آتی جاتی ہر رنگ کے احباب ہم کلام ہو لیتے ہیں۔

پیارے سرفراز ... یہاں کچھ دنوں سے سرد لہروں نے پھر یورش کر رکھی ہے۔ تو ظاہر ہے لندن میں تو بادلوں کی کیا صورت ہوتی ہے لیکن
یہاں بھی ہم سمندر کے ساتھ قریب قریب ہر رات ان کی جنگ چھڑتی دیکھتے ہیں۔ بحر روم سے آنے والے طوفان شروع ہوتے ہیں جو ہمارے
اوپر سے گزرتے ہیں۔ بالکل آتش بازی کا سا سماں دیکھنے میں آتا ہے۔ دو گھنٹے اودھم کے بعد یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں تو شکر کرنا
چاہیے کیا ہے کہ یہ کوئی بڑی آفت نہیں ہوئی۔ واقعی آدمی سے تو بچنا ناممکن لیکن اس طرح کی مصیبت سے اللہ بچائے۔

دل کی اداسی کا علاج بھی ہے کہ زندگی سے لگاؤ رکھیں " آج کا دن ہے کل کا کیا خطرہ تھا " کبھی کبھی بچے اچانک مہربان
ہو جاتے ہیں تو ملاقات ہو گئی ورنہ کوئی دوسرا ہے، جیسے تم سے ملنا تھا۔ سال میں ایک آدھ، یہی دوستی میں تو ابھی کافی دن
باقی ہیں۔ کیا خبر کسی جگہ کوئی صورت نکل آئے۔

انہی خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ فیض اکتوبر 1972ء میں ایک ثقافتی وفد کے ہمراہ ایران گئے۔ وہ شیراز سے سرفراز کو
روانہ ہوتے ہیں۔ فیض ایران کی ساحلی قدیم اول ساحلی ماڈلوں کے ساتھ خاص سے ہو گئے ہیں۔ ہاتھ کا خط شیرازی نوکری کا پہلو کی
حیات کی۔ فیض کے خطوط میں وطن کی محبت اور محرومی عوام کی الفت بھری پڑی ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے "دامنِ یوسف" کی ہم عصر
شاعر لکھتے ہیں "شاید وہ لوگ جو فیض پر وطن دشمنی کا الزام لگاتے ہیں وطن کی تڑپ ان خطوط میں محسوس کریں کہ وطن تو سب کی
عزت ہوتا ہے.... "دامنِ یوسف" سے اگر کچھ واقعات میں وطن دوستی اور خلوص کی چمک کا فرق واضح ہو جائے تو یہ میری عمر بھر کی کمائی اور
فیض کے چاہنے والوں کی جیت ہے"۔

سرفراز اقبال ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں "فیض کے دل سے تعلق اور وطن کی تڑپ اور محبت کا اندازہ ان کے خطوط
سے بہی آخری جملے سے لگایا جا سکتا ہے اور یہ بات ان لوگوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے جنھوں نے اس وطن کے محب اور وطن
دوست شخص کے جذبۂ ایمان کو مشکوک کیوں کر شک کی نگاہوں سے دیکھا" فیض سرفراز کو لکھتے ہیں:

پیاری سرفراز ... تم سے ملاقات ہوئی تھی کچھ عرصہ کو اداسی سی۔ آہستہ آہستہ لوگ ملنے آ رہے ہیں۔ اب تم نے لندن کا چکر کرنا سیکھ
لیا ہے۔ ایک بچے اور زرا (یعنی عمر) تو ہی بہانے سے ہم بھی ملیں گے انشاءاللہ سب کیسے ہیں۔ فیض "دامنِ یوسف" کی آخری خوبصورت داستان کو فیض ہی کے دو شعر پر ختم کرتے ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

....

جوشِ دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

☆

جدول تصانیف

فیض

تعداد	تصانیف	نمبر شمار
1 ''سارے سخن ہمارے'' بڑا مجموعہ ہے''	کل کلیات	1
7	کل مجموعہ کلام	2
82	کل غزلیں	3
478	کل اشعار غزل	4
180	کل نظمیں	5
41	کل قطعات	6
83	کل اشعار قطعات	7
3	کل فردیات	8
8	کل نعت	9
10	کل فلمی گیت	10
6	کل پنجابی نظمیں	11
3	کل پنجابی گیت	12
29	کل تحریرات	13
21	کل منظوم تراجم	14
8	کل نظمیں (تضمینات)	15
38	کل فیض پر دوسروں کا کلام	16
11	کل نثری تصانیف	17

تصانیف

منظوم

نمبر شمار	تصانیف	سالِ اشاعت
1	نقشِ فریادی	1940ء
2	دستِ صبا	1952ء
3	زنداں نامہ	1956ء
4	دستِ تہِ سنگ	1965ء
5	سرِ وادیِ سینا	1971ء
6	شامِ شہرِ یاراں	1978ء
7	مرے دل مرے مسافر	1980ء
8	غبارِ ایام (فیض صاحب کے آخری زمانے کی شاعری کا مجموعہ، جو ان کی رحلت کے بعد مرتب ہوا اور نسخہ ہائے وفا میں شامل ہے)	
9	سارے سخن ہمارے (کلیات) (ڈاکٹر راشد حمید ''فیض بہ نام افتخار عارف'' میں لکھتے ہیں، یہ فیض صاحب کا کلیات ہے اور ان کے کسی چاہنے والے نے بڑے اہتمام کے ساتھ برطانیہ سے شائع کیا اور اپنا نام بھی ظاہر نہیں کیا۔ ایسی مجلد کتابیں کم کم چھپتی ہیں، خیال ہے کہ یہ کلیات محمد آصف خان نے فیض صاحب سے اپنے تعلق اور محبت کے اظہار کے طور پر چھپوایا)	1982ء
10	نسخہ ہائے وفا (کلیات)	1984ء

منثور

نمبر شمار	تصانیف	سالِ اشاعت
1	میزان (تنقیدی مضامین)	1962ء
2	صلیبیں مرے دریچے میں (خطوط)	1971ء

3	متاعِ لوح و قلم (مقالے اور متفرق تحریریں)	1973ء
4	سفرنامہ کیوبا	1974ء
5	ہماری قومی ثقافت	1976ء
6	مہ و سالِ آشنائی (سفرنامہ، یادیں، تاثرات)	1980ء
7	پاکستان ٹائمز کے اداریے	1980ء
8	قرضِ دوستاں (مقدمے، دیباچے، فلیپ)	1984ء
9	انتخاب پیامِ مشرق (منظوم اردو ترجمہ)	1977ء
10	مقالاتِ فیض	1990ء
11	فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت (تحریریں، تقریریں)	2006ء

غزلیں

نمبر شمار	شعری مجموعہ	غزلیات	اشعار
1	نقشِ فریادی	14	79
2	دستِ صبا	17	114
3	زنداں نامہ	15	85
4	دستِ تہِ سنگ	11	60
5	سرِ وادیٔ سینا	7	40
6	شامِ شہرِ یاراں	8	44
7	مرے دل مرے مسافر	3	17
8	غبارِ ایام	7	39
	کل تعداد:	82	478

نظمیں

نمبر شمار	شعری مجموعہ	کل نظمیں
1	نقشِ فریادی	31
2	دستِ صبا	21
3	زنداں نامہ	11
4	دستِ تہِ سنگ	15
5	سرِ وادیٔ سینا	30

6	شامِ شہرِ یاراں	30
7	مرے دل مرے مسافر	27
8	غبارِ ایام	15
	کُل تعداد:	180

قطعات

نمبر شمار	شعری مجموعہ	قطعات	اشعار
1	نقشِ فریادی	4	8
2	دستِ صبا	8	16
3	زنداں نامہ	7	14
4	دستِ تہِ سنگ	7	14
5	سرِ وادیٔ سینا	6	12
6	شامِ شہرِ یاراں	4	9
7	مرے دل مرے مسافر	2	4
8	غبارِ ایام	3	6
	کُل تعداد:	**41**	**83**

فردیات

نمبر شمار	تصنیف	فردیات
1	نقشِ فریادی	1 عدد

زمانے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے

2	سرِ وادیٔ سینا	2 عدد

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

[illegible]
[illegible]

(یہ دونوں شعر [illegible] کے اشعار سے [illegible] ہیں)

5	کل تعداد نغمات	8 عدد

گیت

نمبر شمار	گیت	مجموعہ کلام
1	چلو پھر سے مسکرائیں	شام شہر یاراں
2	مرے ہمدم مرے دلبر	شام شہر یاراں
3	اب کیا دیکھیں راہ تمہاری	شام شہر یاراں
4	ہم تیرے پاس آئے	شام شہر یاراں
5	کدھر ہے تیرے شہیدوں کے نشاں	شام شہر یاراں
6	چلے آؤ یادوں کی ہنچی	مرے دل مرے مسافر
7	رحلتے خورشید کے پیمان	سہ ماہی کتاب 1976ء
8	بچوں کی پھلواڑی کی ہر پھول کی خوشبو سے	افکار فیض نمبر

فلمی گیت

نمبر شمار				
1	اے وطن تیری للکار پر	تیرے حکم پہ اے وطن اے وطن	جاگو ہوا سویرا	سہ ماہی کتاب اپریل تا جون 1976ء
2	بہت ملا ہے ملاحت	اب کہاں دیکھیں راہ تمہاری من	جاگو ہوا سویرا	شام شہر یاراں
3	پہم سہا شانتی	بل دکھ ہو تن جنگ مرا سب آس گئی سب شانتی	دور ہے سکھ کا گاؤں	سہ ماہی کتاب اپریل تا جون 1976ء
4	جو مرا کوئی دل کا	پیچھے ہے عمر تو جنگ کے جھکے آ رہے	دور ہے سکھ کا گاؤں	سہ ماہی کتاب اپریل تا جون 1976ء
5	آئیے ہوائی	بے کار ہے بھگتن	دور ہے سکھ کا گاؤں	سہ ماہی کتاب اپریل تا جون 1976ء
6	سکھی ری تیری بات	سکھی رے ہے تیری بات پنہ سکھی رے تیری بات	دور ہے سکھ کا گاؤں	افکار فیض نمبر
7	شام ڈھلی	شام ڈھلی شام ڈھلی شام ڈھلی	جاگو ہوا سویرا	سہ ماہی کتاب اپریل تا جون 1976ء
8	شوق پہ طاری مرا دل	مرا دل مرا دل	قسم اس وقت کی	شام شہر یاراں

9	کوئی شعلہ کا بیعہ ہاتھ	کوئی شعلہ کا بیعہ ہاتھ اشعہ گری کی راہ دور ہے منزل کا آغاز ہاتھ	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء فیض نمبر
10	تعمیرابن	پچھلی رات جارے بیگمی ماہ حقیقیل دور ہے منزل کا آغاز	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء

پنجابی کلام

نمبر شمار			
1	اج رات اک رات دی قرنی دالی	نظم	شام شہر یاراں
2	کدھرے نہ پیندیاں دساں	گیت	شام شہر یاراں
3	میری ڈولی شوہ دریا	نظم	شام شہر یاراں
4	ربا سچیا	نظم	شام شہر یاراں
5	لکھ تاراں وی ہیرتہ	گیت	میرے دل میرے مسافر
6	ویلے دیاں تلخیاں ہتھ نہ آیار	گیت	میرے دل میرے مسافر
7	اج رات اک رات دی رات جی کے	نظم	مجلہ سہ ماہی غالب 1976ء
8	تُسیں ترکے ادہ زبان	نظم	مجلہ سہ ماہی غالب 1976ء
9	تہوڑ منڈے بچیں گلاب منگو	نظم	مجلہ سہ ماہی غالب 1976ء

متفرقات

نمبر شمار			
1	حمد	علم کی شمع زندگی میں جلا کر کس طرح سے ادا کیجیے	دستِ تہِ سنگ
2	نعت	اے تو کہ ہست ہر دلِ محزوں سرائے تو	غبارِ ایام
3	مرثیۂ امام	رات آئی ہے شبیر پہ یلغارِ بلا ہے	شام شہر یاراں
4	شامِ غربت	دشت میں سوختہ ساماں پہ رات آئی ہے	غبارِ ایام
5	نغمہ	آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی	سر وادیٔ سینا
6	مدحِ حسین شہید سہروردی	کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر	شام شہر یاراں
7	شخصی مرثیہ	سجاد ظہیر کا انتخاب وفات سے محبت کو سب	سر وادیٔ سینا
	مرثیہ		

8	تین مرثیے	دور جا کر قریب ہو کتنے	مرے دل مرے مسافر
		چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا	
		کب تک دل کی خیر منائیں	
9	سپاہ ظلمت کے نام	عجب سمے تھا جو ہم کلی نہ بن پائے	شام شہر یاراں
10	نوحہ	مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے	دست صبا
11	شہر اصحاب کی یاد	اقرا کی بات ہے ہم سے تو بچھائی تم نے	غبار ایام
12	علامہ اقبال	زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظار موت کرتا تھا	افکار فیض نمبر
13	نیمی کی سالگرہ	گلاب بنتے ہوئے ہونٹ سے نکال	افکار فیض نمبر
14	شادی کی خوشی میں	جانا ہم سے کہ دے کدہ تر دو	افکار فیض نمبر
15	منیزہ کی سالگرہ	آج منیزہ ہماری بچی ہے	افکار فیض نمبر
16	اعتراف	جو ہوا ہوں کہ تم سے مجھے محبت ہے	غالب جون 1976ء
17	انقلاب پرتگال	مرے ساتھی کے ساتھ شب تنہائی	غالب اپریل 1976ء
18	اے وطن اے وطن	تیرے پیغام ہوا دیتی وطن اے وطن	افکار فیض نمبر
19	پیغام	حرف صورت زمانہ آگیا ہے	مجلہ ... 1973ء
20	تب اور اب	زمیں و آسماں ...	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
21	تو اور میں	...	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
22	دل ہے جب	...	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
23	راز ہستی	...	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
24	سرآغاز	...	افکار فیض نمبر، سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
25	شام غم	...	افکار فیض نمبر
26	اداسی	...	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
27	چند اشعار	...	

28	نظم	ضربِ حرب، گل گل شوق تیغ ہا کاری دنیا	ماہنامہ ہلال، ملتان 1976ء
29	ماسکو سے	کچھ بے بسی کو آپ کے شکوے بہم تھے	زنداں نامہ

تراجم

نمبر شمار			
1	حسینۂ خیال سے	براؤننگ (انگلینڈ)	نقش فریادی
2	بڑھاپے سے پہلے	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
3	زنداں سے ایک خط	ناظم حکمت (ترکی)	شام شہر یاراں
4	دنیا کے نام	ناظم حکمت (ترکی)	شام شہر یاراں
5	نامہ ہے بخت	ناظم حکمت (ترکی)	شام شہر یاراں
6	صحرا کی رات	ایلچی مرسی سبتان (تاجکستان)	شام شہر یاراں
7	شہر لوٹ	تان تی (تھائی لینڈ)	مرے دل مرے مسافر
8	شوپین کا نغمہ بجتا ہے	تان تی (تھائی لینڈ)	مرے دل مرے مسافر
9	ناظم حکمت کے اشعار	ناظم حکمت (ترکی)	مرے دل مرے مسافر
10	ہم نے دیکھا ہے کہساروں کو	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
11	بھائی	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
12	داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
13	آرزو	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
14	پرانی شمشیر	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
15	سالگرہ	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
16	تیرا جاں سے اور بھلا ہے نور	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
17	نصیحت مرا	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
18	ادیبوں کے اندرونی لطف کے لیے سفارش	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا
19	ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد سنگ را بستند و سگاں را گشادند	سعدی	دست صبا
20	جوانی مری اسی چٹان پہ گئی جہاں سے بلبل نے رخصت کی تھی بعنوان ایک چٹان کے لیے کتبہ	رسول حمزہ (داغستان)	سر وادی سینا

21	میرے دامن پہ کے آنچل سے لگی ہوئی ہوا اور کبھی صحن کبھی اس سے بھی اگر ہوا	وصال نامہ (داستان)	سرِ وادیٔ سینا

تضمینات

نمبر شمار			
1	اقبال	آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر	نقشِ فریادی
2	اقبال	زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا	سارے سخن ہمارے 1976ء
3	نذرِ غالب	کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں	دستِ صبا
4	نذرِ خسرو	موری اکھین سے سجن دوست گئے	شامِ شہرِ یاراں
5	نذرِ حافظ	قند دہنی کچھ بس سے زیادہ	مرے دل مرے مسافر
6	نذرِ سودا	فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں	دستِ صبا
7	نذرِ مولانا حسرت موہانی	کس سے ناحق سوچتے رہو	سرِ وادیٔ سینا
8	ایک امریکی خاتون کے	کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں	زنداں نامہ

ترجمہ

ڈرامے

فیض نے سات ڈرامے لکھے جن کی تفصیل ذیل میں ہے۔

نمبر شمار		
1	راہِ اجنبی 1930ء میں ریڈیو سے نشر ہوا۔	(مطبوعہ اوراقِ قلم میں ہے)
2	قسمت 1935ء میں نشر ہوا۔	(مطبوعہ اوراقِ قلم میں ہے)
3	سانپ کی چھتری	(مطبوعہ اوراقِ قلم میں ہے)
4	ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے	(مطبوعہ اوراقِ قلم میں ہے)
5	[illegible]	(مطبوعہ اوراقِ قلم میں ہے)
6	[illegible] عدالت	
7	[illegible]	

بقول مرزا ظفر الحسن آخری دو ڈرامے کوشش کے باوجود حاصل نہ ہو سکے۔ فیض نے دو فلموں کے مکالمے بھی لکھے جو "جاگو ہوا سویرا" اور "دور ہے سکھ کا گاؤں" ہیں۔

کلیات فیض میں اساتذہ کے منقولہ اشعار

نمبر شمار	شعری مجموعہ		اشعار	شاعر
1	نسخہ ہائے وفا		تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا	غالب
2	نقش فریادی	1	بہ دامے ہمی امید تحقیق رکھت ایستی گر ما نسخہ غم ہائے قلاں ور پیش است	عرفی
		2	دلے بدرد و غم ہائے خویش	فغانی
3	دست صبا		عشق ہر دو جہاں تحفۂ قدرت خواہد شد عالم ہمہ از یار جدا خواہد شد	حافظ
4	زنداں نامہ	1	اسد سالکان نگر قفس! صبح کو صبا سنتی ہی ہوئے گی سوئے گلزار کہہ کر	سودا
		2	قلندر چہ گوید بہ ہر جا کہ نی بینی بگیر ہائے محبت کہ خالی از قلب است	حافظ
5	دست تہ سنگ	1	مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے	غالب
		2	کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد	غالب
		3	تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں	درد
6	سر وادیِ سینا		سو ہم آیا کوئی دار پہ میر سر منصور ہی کا بار آیا	میر
7	شام شہر یاراں		عرب بے جگر بیاباں دو کارِ جہاں چار پارۂ ناقوس در گل خاک است	اقبال
8	مرے دل مرے مسافر	1	بہ غم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق دراے خواجہ عاقل ہنرے بہتر ازیں	حافظ
		2	غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را	غنی کاشمیری

9	غبارِ ایام	1	ہر کجا رفتم غبارِ زندگی در پیش بود یا رب این خاک پریشاں از کجا برداشتم	بیدلؔ
		2	جلوہ دردی کزاں شیریں شمایل داشتم گفتم گذشتم از سرِ خود ہرچہ در دل داشتم گفتم	بیدلؔ

انتسابات تصانیف

نمبر شمار		
1	دستِ صبا	کلثوم کے نام (ایلس فیض کا اسلامی نام)
2	دستِ تہِ سنگ	وطن پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام
3	سرِ وادیٔ سینا	مریم (سالگانیک) کے نام
4	شامِ شہرِ یاراں	مجید بھائی اور آمنہ بہن کے نام
5	مرے دل مرے مسافر	یاسر عرفات مع الاحترامات
6	متاعِ لوح و قلم	استاذی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام
7	میزان	بطرس، تاثیر، حسرت، محمود اور رشید جہاں کی یاد میں
8	صلیبیں مرے دریچے میں	[illegible] اور میزو کے نام
9	ہماری قومی ثقافت	قومی یکجہتی کے نام

تصانیف پر خود نوشتہ مقدمے اور دیگر تحریریں

منظوم

نمبر شمار			
1	نقشِ فریادی	دیباچہ	فیض احمد فیض 1940ء
		مقدمہ	ن۔م۔راشد 1940ء
2	دستِ صبا	ابتدائیہ	فیض احمد فیض، ستمبر 1952ء
3	زنداں نامہ	سرِ آغاز	سید سجاد ظہیر، جنوری 1956ء
		روداد قفس	میجر محمد اسحاق 1956ء
4	دستِ تہِ سنگ	تقریب	فیض احمد فیض
		فیض	فیض احمد فیض

5	سروادیٔ سینا	فیض۔ ترجمہ: محمد انصاری	اکبر حیدری
		ایک عاصمہ صدیقی کا نام۔ ترجمہ: محمد انصاری	ایلزبتھ شریف
6	شامِ شہرِ یاراں	پیش گفتار	فیض احمد فیض
		عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک	مرزا ظفر الحسن
		فیض سے میری پہلی ملاقات	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
		ملاقی سوتی	اشفاق احمد
		فیض سے میری ملاقات	شیر محمد حمید
7	مرے دل مرے مسافر	ندارد	
8	غبارِ ایام	ندارد	

منثور

نمبر شمار			
1	میزان	دیباچہ	فیض احمد فیض
2	صلیبیں مرے دریچے میں	گزارشِ احوالِ واقعی	فیض احمد فیض
		کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی	مرزا ظفر الحسن
3	مہ و سالِ آشنائی	پیش لفظ	فیض احمد فیض
4	متاعِ لوح و قلم	احوالِ واقعی	فیض احمد فیض
		فیض کے بارے میں دو دوست	مرزا ظفر الحسن
5	ہماری قومی ثقافت	حرفِ اول	مرزا ظفر الحسن
6	انتخابِ پیامِ مشرق	پیش لفظ	فیض احمد فیض

اس کے علاوہ متاعِ لوح و قلم کے آغاز میں فیض کا مشہور شعر درج ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

ہماری ثقافت میں دو شعر لکھے ہوئے ہیں۔

اگر عزیز ہے تو عرض کے جو مقبول ہے تو مجھے
مرا طریق کی طلب تیرے مکتب سے ہے

....

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض کا غیر مدوّن کلام

(جو کسی مطبوعہ مجموعے میں نہیں)

نمبر شمار				
1	انتقال	وہ شخص تھا کہ جو [illegible] صورت گر رہا تھا		سہ ماہی غالب 1976ء
2	نادار	جہاں رنگ نہ وہ دیوان کی مستی ہے لذت ہے		سہ ماہی غالب 1976ء
3	[illegible]	[illegible]		سہ ماہی غالب 1976ء
4	پنجابی نظم	اج رات اک رات دی رات جی کے		سہ ماہی غالب 1976ء
5	پنجابی نظم	[illegible]		سہ ماہی غالب 1976ء
6	پنجابی نظم	[illegible] گلاب [illegible]		سہ ماہی غالب 1976ء
7	گیت	ڈھلتے سورج کے [illegible]		سہ ماہی غالب 1976ء
8	گیت	بجھ گیا چاند لٹ گیا گھر [illegible] گئی رے		ادب لطیف فیض نمبر
9	اے وطن [illegible]	تیرے [illegible] اے وطن	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
10	[illegible]	[illegible]	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
11	[illegible]	[illegible]	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
12	[illegible]	[illegible]	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
13	[illegible]	[illegible]	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
14	[illegible]	[illegible] رات [illegible]	[illegible]	[illegible] فیض نمبر

15	شام ڈھلی	شام ڈھلی، شام ڈھلی، شام ڈھلی / جاگ کے دیکھا سویرا	سہ ماہی تہذیب اپریل تا جون 1976ء
16	سپیرے کی سرگم	صبح پھوٹے ہوئے پھوٹے ہے بگل	افکار فیض نمبر
17	سویرا	[illegible]	افکار فیض نمبر
19	میری کی سالگرہ	آج جشن ہماری بیٹی ہے	افکار فیض نمبر
19	اعتراف	ہم انجان تم سے مجھے محبت ہے	سہ ماہی غالب جنوری تا مارچ 1976ء
20	انقلاب روس	[illegible]	سہ ماہی غالب جنوری تا مارچ 1976ء
21	اے وطن اے وطن	[illegible]	افکار فیض نمبر
22	پیغام	[illegible]	مجلہ گورنمنٹ کالج 1973ء
23	شب و صباح	زمین و آسمان [illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
24	شام اور شمع	[illegible] جب انجمن آئی	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
25	دل سے قریب	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
26	ساز زندگی	[illegible]	سہ ماہی غالب اپریل تا جون 1976ء
27	میرے آنسو	[illegible]	افکار فیض نمبر
28	شام غم	[illegible]	افکار فیض نمبر
29	غزل	[illegible]	سہ ماہی غالب 1976ء
30	غزل	[illegible]	سہ ماہی غالب 1976ء
31	غزل	[illegible]	سہ ماہی غالب 1976ء
32	غزل	[illegible]	سہ ماہی غالب 1976ء
33	غزل	[illegible]	سہ ماہی غالب 1976ء

34	نظم	مجھے معجزوں پر یقیں نہیں	مہ و سال آشنائی 1981ء
35	لیلۃ القدر	رات کا وقت	مہ و سال آشنائی 1981ء
36	مجنوں کی آنکھیں	[illegible]	مہ و سال آشنائی 1981ء
37	قاتل سے عار	میری جان اک ضرورت کی بات کہنی ہے ختم ہے	مہ و سال آشنائی 1981ء
38	او صاحب الجنی	او صاحب الجنی	مہ و سال آشنائی 1981ء
39	فرض کی بات	بچھی ہوا یار سے بچھی ہوا یا تھا نہ ملی	نقوش فیض نمبر
40	انگریزی نظم	Illusion	نقوش فیض نمبر
41	نوحہ	حد ہے ہے حد سخن اب مصرف ہے	نقوش فیض نمبر

ـ ختم ـ

تخلیقاتِ فیض پر ایک نظر

نمبر شمار		
1	شعری مجموعے	7 عدد
2	کلیات	2 عدد
3	منتخب شدہ کلام	ایک درجن سے زیادہ مختلف اداروں سے شائع ہو چکے ہیں۔
4	نثری تصنیفات	11 عدد
5	ڈرامے اور خطبے	5 عدد
6	غیر مدون مطبوعہ کلام	40 غزلوں اور نظموں سے زیادہ ہیں۔
7	مضامین، تقریظیں، تحریریں اور خطبے	87 عدد
8	تقاریر، ریڈیو، ٹی وی نشریات	15 عدد
9	خطوط	مطبوعہ خطوط کی تعداد 330 ہے
10	باقیات	فیض نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ انھوں نے کچھ کلام کو شائع نہیں کیا۔ اس کی مقدار کیا ہے؟ (واللہ اعلم) کاش یہ سارا کلام "باقیاتِ فیض" کے عنوان سے شائع ہو۔ (راقم باقیاتِ فیض مرتب کر رہا ہے)

شعری و نثری مجموعے

شعری مجموعے

نمبر شمار	شعری مجموعے	مصنف	مطبع
1	نقشِ فریادی	فیض احمد فیض	نیا ادارہ، لاہور
2	دستِ صبا	فیض احمد فیض	مکتبہ کارواں، لاہور
3	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	قومی دارالاشاعت، لاہور
4	دستِ تہِ سنگ	فیض احمد فیض	مکتبہ کارواں، لاہور

5	سرِ وادیٔ سینا	فیض احمد فیض	پاک پبلشرز لمیٹڈ، کراچی
6	شامِ شہرِ یاراں	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
7	مرے دل مرے مسافر	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
8	غبارِ ایام	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
9	سارے سخن ہمارے (کلیات)	فیض احمد فیض	حسین جلس، لندن
10	نسخہ ہائے وفا (کلیات)	فیض احمد فیض	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

نثری مجموعے

نمبر شمار	شعری مجموعے	مصنف	مطبع
1	میزان	فیض احمد فیض	جاوید پریس، کراچی
2	صلیبیں مرے دریچے میں	فیض احمد فیض	پاک پبلشرز لمیٹڈ، کراچی
3	متاعِ لوح و قلم	فیض احمد فیض	مکتبہ دانیال، کراچی
4	مہ و سالِ آشنائی	فیض احمد فیض	مکتبہ دانیال، کراچی
5	سفرنامہ کیوبا	فیض احمد فیض	نیشنل بک ہاؤس، لاہور
6	پاکستانی ثقافت	فیض احمد فیض	فیروز سنز، کراچی
7	ہماری قومی ثقافت	فیض احمد فیض	ادارہ یادگارِ غالب، کراچی
8	حکایاتِ خوں چکاں	فیض احمد فیض	نئے افق گورنمنٹ کالج، لاہور
9	انتخابِ پیامِ مشرق (منظوم خراجِ عقیدت)	فیض احمد فیض	این پرنٹنگ پریس، لاہور
10	قرضِ دوستاں (مقدمے دیباچے فلیپ)	فیض احمد فیض	1984ء، لاہور
11	پاکستان ٹائمز کے اداریے	فیض احمد فیض	1980ء، لاہور

مضامین، ڈرامے، تقریظیں، تحریریں، تقریریں اور خطوط

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	مطبع / ریفرنس
1	خامہ انگشت بدنداں	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
2	فن کار اور ترقی پسند معاشرہ	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
3	حدیثِ رفتگاں	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
4	پاکستان کہاں ہے؟	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
5	داغستان میں چند روز	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء

6	ایک یادگار تقریر	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
7	شعر میں اظہار و ترسیلِ معانی	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
8	آہنگ (فیض کا پہلا مقدمہ)	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
9	کچھ ڈراموں کے بارے	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
10	صہبا ٹورنٹو	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
11	کچھ راگ رنگ کے بارے میں	فیض احمد فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
12	فیض بنام ایلس	فیض احمد فیض	فیض صدی منتخب مضامین 2011ء
13	فیض بنام افتخار عارف	فیض احمد فیض	فیض صدی منتخب مضامین 2011ء
14	بین الاقوامی لینن امن ایوارڈ	فیض احمد فیض	فیض صدی منتخب مضامین 2011ء
15	پاکستانی ثقافت اور اس کے مسائل	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور
16	ثقافت.....ایک گفتگو	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور
17	پاکستانی تہذیب کا مسئلہ	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور
18	East & West: The confrontation	Faiz Ahmad Faiz	Illustrated Weekly of India 1983
19	Israeli Butchers will stand trial	Faiz Ahmad Faiz	New Age 17.7.1972
20	نقشِ فریادی (دیباچہ)	فیض احمد فیض	نقشِ فریادی
21	دستِ صبا (ابتدائیہ)	فیض احمد فیض	دستِ صبا
22	دستِ تہِ سنگ (فیض از فیض)	فیض احمد فیض	دستِ تہِ سنگ
23	میزان (دیباچہ)	فیض احمد فیض	میزان
24	صلیبیں مرے دریچے میں "گزارشِ احوالِ واقعی"	فیض احمد فیض	پاک پبلشرز لمیٹڈ
25	متاعِ لوح و قلم "احوالِ واقعی"	فیض احمد فیض	مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
26	سہ وسال آشنائی "پیشِ لفظ"	فیض احمد فیض	مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1980ء
27	خم کاکل (مقدمہ) سیف الدین سیف	فیض احمد فیض	عمر گزشتہ کی کتاب۔ مرزا ظفر الحسن
28	چند روز اور (تقریظ) خدیجہ مستور	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
29	وہ لوگ (تقریظ) ہاجرہ مسرور	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
30	سات ڈرامے (مقدمہ) آغا ناصر	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
31	مصر کی رقاصہ (مقدمہ) پطرس بخاری	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
32	مشرق و مغرب کے نغمے (مقدمہ) میراجی	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
33	راگ رنگ (مقدمہ) حمایت الٰہی	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد
34	مصور دیوانِ غالب (مقدمہ) صادقین	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد

35	ذکرِ یار چلے (مقدمہ) مرزا ظفر الحسن	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
36	باتیں کچھ تحریریں سے (مقدمہ) مختار زمن	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
37	[illegible] (مقدمہ) قتیل شفائی	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
38	سبو (تقریظ) عمر انصاری	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
39	نگ آفتاب (قلیپ) مرزا پاور بیگ	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
40	ندیم کی شاعری (کاروانِ زندگی کے اضافہ شدہ اندازہ) احمد ندیم قاسمی	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
41	برگ ریز (تقریظ) عرفانہ عزیز	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
42	شجرِ نو (مقدمہ) اسد جعفری	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد
43	سخنِ دیوار (مقدمہ) اوپندر ناتھ [illegible]	فیض احمد فیض	حسامی بک ڈپو حیدرآباد۔1944ء
44	آوارہ سجدے (پیش لفظ) کیفی اعظمی	فیض احمد فیض	آوارہ سجدے۔ کیفی اعظمی
45	مہرِ دو نیم (پیش لفظ) افتخار عارف	فیض احمد فیض	مہرِ دو نیم۔ افتخار عارف
46	تعلیم الکتاب (مقدمہ) محمد ادریس	فیض احمد فیض	تعلیم الکتاب۔ سید محمد ادریس
47	روح القدس کا ذوقِ جمال (تقریظ) عصمت [illegible]	فیض احمد فیض	روح القدس کا ذوقِ جمال۔ [illegible]
48	گردِ راہ (قلیپ) ڈاکٹر اختر حسین	فیض احمد فیض	افکار۔ فیض نمبر۔ کراچی
49	مصطفیٰ زیدی کا ایک [illegible] (۱۹۶۹) صہبا لکھنوی	فیض احمد فیض	افکار۔ صہبا لکھنوی۔ کراچی
50	عشق ایک [illegible] (مقدمہ) جلیل [illegible] رضوی	فیض احمد فیض	عمرِ گذشتہ کی کتاب، ظفر الحسن، حیدرآباد
51	سیاہ (تقریب) عبدالعزیز خالد [illegible]	فیض احمد فیض	عمرِ گذشتہ کی کتاب، ظفر الحسن، حیدرآباد
52	[illegible] (تقریب [illegible]) [illegible]	فیض احمد فیض	عمرِ گذشتہ کی کتاب، ظفر الحسن، حیدرآباد
53	ادب کا ترقی پسند نظریہ	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
54	شاعری کی قدریں	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
55	ادب اور جمہور	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
56	ہماری تنقیدی اصطلاحات	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
57	فنی تخلیق اور تخیل	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
58	خیالات کی شاعری	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
59	موضوع اور طرزِ ادا	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
60	پاکستانی تہذیب کا مسئلہ	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
61	[illegible]	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء
62	اردو شاعری کی انسانی روایتیں اور نئے تجربات	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پبلشرز کراچی۔ 1965ء

63	جدید فکر و خیال کے تقاضے اور غزل	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
64	جدید اردو شاعری میں اشاریت	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
65	ادب اور ثقافت	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
66	فلم اور ثقافت	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
67	نظیر اور حالی	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
68	ہوسٹل کی ایک شام	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
69	مولوی محمد شفیع	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
70	راجا صاحب کا ادبی دربار	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
71	ہنسانے کو صرف شوکت تھانوی	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
72	ادبیات عرب و عجم	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
73	تحریک اور تنظیم	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
74	غالب	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
75	جہد و کاوش کی دو صورتیں	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
76	ادب اور ادیب	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
77	غالب اور زندگی کا فلسفہ	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
78	اردو ناول	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
79	رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
80	شرر	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
81	پریم چند	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
82	اقبال اپنی نظر میں	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
83	جذبات اقبال کی بنیادی کیفیت	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
84	جوش شاعر انقلاب کی حیثیت سے	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
85	کہ گوہر مقصود گفتگو است	فیض احمد فیض	میزان۔ جاوید پریس کراچی۔ 1965ء
86	وکی احباب (طنزیہ)	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1977ء
87	شکست (طنزیہ)	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1977ء
88	ہوتا ہے شب و روز	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1977ء
89	سانپ کی چھتری	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1977ء
90	پرائیویٹ سیکرٹری	فیض احمد فیض	متاع لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1977ء

91	تاشقند کی افریقی ایشیائی ادبی کانفرنس 1958ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
92	بنائے محبت ..... کہ خالی از خلل است 1962ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
93	ادبی رسائل ..... ہمارے اور بیرونی ممالک کے 1966ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
94	دوستوں کی عنایات بے بہا 1971ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
95	غالب لائبریری کا افتتاح 1971ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
96	نقشِ فریادی کی تخلیق کے دوران 1972ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
97	سوویت معاشرے کی تاریخ کا دوسرا سنگِ میل 1972ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
98	نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا 1973ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
99	ہوچی منہ اور اُن کی نظموں کا ترجمہ 1973ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
100	مدت ہوئی یار کو مہماں کیے ہوئے 1973ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
101	غالب لائبریری کی دوسری سالگرہ 1973ء (تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
102	اُردو کے صوفیانہ اشعار۔ (ریڈیو تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
103	میرا پیغام محبت ہے۔ (ریڈیو تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
104	قلم۔ (ٹی وی تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
105	آزادی سے انتخاب تک۔ (ٹی وی تقریر)	فیض احمد فیض	متاعِ لوح و قلم، مکتبہ دانیال، کراچی۔ 1973ء
106	آرٹ اور ثقافت (مضمون)	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز، لاہور۔ 1988ء
107	قومی تشخص کی تلاش (مضمون)	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ 1988ء
108	ہم اور آپ (مضمون)	فیض احمد فیض	پاکستانی کلچر۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ 1988ء

(جدول فیض کے مطبوعہ خطوط)

کتابیات	تعداد	بنام	نمبر شمار
صلیبیں مرے دریچے میں، 1971ء	135	ایلس فیض	1
صلیبیں مرے دریچے میں، 1971ء	8	سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی	2
فیض کے مغربی حوالے، 1992ء	2	سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی	3
فیض بنام افتخار عارف، 2011ء	38	افتخار عارف	4
داماں یوسف، 1978ء	55	سرفراز اقبال	5
داماں یوسف، 1978ء	8	مینا، بانو اور مدیحہ	6
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	ابراہیم جلیس	7
متاع لوح و قلم، 1978ء	3	احمد ندیم قاسمی	8
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	اختر انصاری اکبر آبادی	9
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	اطہر قادری	10
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	چراغ حسن حسرت	11
متاع لوح و قلم، 1978ء	2	حزیں لدھیانوی	12
متاع لوح و قلم، 1978ء	2	حمید اختر	13
متاع لوح و قلم، 1978ء	17	خدیجہ بیگم	14
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	خدیجہ مستور	15
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	سحر انصاری	16
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	سلام مچھلی شہری	17
متاع لوح و قلم، 1978ء	3	سید سبط حسن	18
متاع لوح و قلم، 1978ء	2	صہبا لکھنوی	19
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	عبادت بریلوی	20
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	عبدالرحمن چغتائی	21
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	غلام رسول مہر	22
متاع لوح و قلم، 1978ء	4	مرزا ظفر الحسن	23
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	محمد اجمل	24
متاع لوح و قلم، 1978ء	1	ایوب الیاس	25
متاع لوح و قلم، 1978ء	2	محمد طفیل	26

27	نسیم سید	1	مثالی لوح و قلم، 1978ء
28	اشفاق حسین	2	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
29	حسن نواز گردیزی	1	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
30	کرنل انور احمد	3	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
31	سردار جعفری	1	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
32	محمد حسن	1	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
33	عبدالرحیم انجان	7	خوش نوا فقیر۔ فیض احمد فیض، 2009ء
34	منیزہ ہاشمی	14	لاؤ تو قتل نامہ مرا، 1985ء
35	سلیمہ ہاشمی	3	لاؤ تو قتل نامہ مرا، 1985ء
36	عبداللہ ملک	4	لاؤ تو قتل نامہ مرا، 1985ء

کُل تعداد مطبوعہ خطوط کی 330 ہے۔

ہم جانتے ہیں درجنوں خطوط ابھی غیر مطبوعہ ہیں، ڈاکٹر مجید بیدار صدر شعبہ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی مشاہیر کے خطوط بنام سکندر علی وجد مرتب کر رہے ہیں۔ جن میں پانچ خط فیض کے بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر ضیاءالدین شکیب کی تحقیق کے مطابق ابھی درجنوں خطوط لوگوں کے پاس محفوظ ہیں، شاید ایک بڑی تعداد خطوط کی ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کے خاندانی افراد کے پاس ہو، جن کو طباعت سے عرشِ ہو کر گلشن اُردو ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔

-☆-

فیض پر مرتبہ کتب و رسائل

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مؤلف	مطبع
1	ہم جیتے جی مصروف رہے	آغا ناصر	سنگ میل، لاہور۔2009ء
2	فیض کے مغربی حوالے	اشفاق حسین	جنگ پبلشرز۔1992ء
3	نقد فیض	[illegible] عباسی	تاج پریس، دہلی۔1978ء
4	فیض احمد فیض۔ شخص اور شاعری	مظہر امام	پرنٹ آفسٹ پریس، دہلی 1991ء
5	مرگ سوز محبت	مرزا ظفر الحسن	حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔1978ء
6	خون دل کی کشید	مرزا ظفر الحسن	مکتبہ اسلوب، کراچی۔1983ء
7	نقش فیض	ابو سعید قریشی	مکتبہ اسلوب، کراچی۔1986ء
8	Old city of Lights	خالد حسن اور داؤد کمال	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2006ء
9	Poems by Faiz	وکٹر کیرنن	خالد اقبال پبلشرز، لاہور۔1971ء
10	فیض عہد ساز شخصیت	اشفاق حسین	جمہوری پبلی کیشنز، لاہور۔2008ء
11	اشاریہ کلام فیض	ڈاکٹر معین الدین عقیل	ادارہ یادگار غالب، کراچی۔1977ء
12	فیض احمد فیض۔ شخصیت اور فن	اشفاق حسین	اکادمی ادبیات پاکستان۔2006ء
13	فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ	خلیق انجم	سرا آفسٹ پریس، دہلی۔1985ء
14	فیض احمد فیض، ہمارے عہد کی شاعری	شکیل الرحمٰن	عالمی بک، دہلی۔ 1985ء
15	سخن در سخن	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی۔1987ء
16	فیض کی شاعری	ڈاکٹر نصرت چوہدری	نگارشات، لاہور۔1987ء
17	ہم کہ ٹھہرے اجنبی	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک، لاہور 1977ء
18	فیض شاعری اور سیاست	پروفیسر فتح محمد ملک	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1991ء
19	Requiem for an ailing messiah	فیض احمد فیض (کلام)	DAWN
20	فیض اور مکتب فیض	حبیب الرحمٰن چغتائی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

21	مقالاتِ فیض	ضیا مجید	فیروز سنز لاہور 1990ء
22	فیض: ایک جائزہ	اشفاق حسین	ادارہ یادگار غالب کراچی 1977ء
23	فیض نمبر افکار	صہبا لکھنوی	مکتبہ افکار کراچی 1965ء
24	افکار، فیض	صہبا لکھنوی	مکتبہ افکار کراچی 1985ء
25	فیض احمد فیض۔ فن اور شخصیت	[illegible]	[illegible] 1981ء
26	ماہ نو، فیض لاہور	ادارہ مطبوعات پاکستان	[illegible] لاہور 2002ء
27	ماہنامہ نیا دور فیض نمبر	محمد شعیب عادل	[illegible] 2011ء
28	ادب لطیف، فیض نمبر	صدیقہ بیگم	[illegible] لاہور 1985ء
29	The True Subject	Naomi Lazard	Lahore Pakistan, 1988
30	An Introduction to the Poetry of Faiz Ahmad Faiz	Imdad Husain	Lahore Pakistan, 1989
31	Faiz Ahmad Faiz	Estelle Dryland	Lahore Pakistanm 1992
32	Faiz	Vaisip	Lahore Pakistan, 1987
33	Faiz Ahmad Faiz	Riz Rahim	USA, 2008
34	فیض: پیام اور فکر و فن	ماجد حمید	[illegible] لاہور 2011ء
35	فیض محبت اور انقلاب کا شاعر	[illegible]	[illegible] لاہور 1996ء
36	فیض احمد فیض: شاعر اور شخص	ڈاکٹر آفتاب احمد	مکتبہ دانیال، کراچی
37	فیض احمد فیض: شخص اور شاعر	[illegible]	[illegible] دہلی 2011ء
38	[illegible] فیض احمد فیض	[illegible]	[illegible] 2009ء
39	فیض احمد فیض	ضیا ساجد	[illegible] لاہور 1985ء
40	[illegible]	عبداللہ ملک	[illegible] لاہور 1982ء
41	[illegible]	[illegible]	لاہور 1985ء
42	فیض احمد فیض: فیض صدی انتخاب مضامین	پروفیسر یوسف حسن	مقتدرہ قومی زبان پاکستان 2011ء
43	Dear Heart	ایلس فیض	فیروز سنز لاہور
44	Over My Shoulder	ایلس فیض	فرنٹیئر پوسٹ پبلی کیشنز
45	[illegible]	[illegible]	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی
46	[illegible]	ڈاکٹر آفتاب احمد	مکتبہ دانیال، کراچی
47	[illegible] (فیض نمبر) کراچی	[illegible]	[illegible] کراچی 1965ء

48	Elusive Dawn	Muhboob Haq	اسلام آباد، پاکستان
49	The Unicom and the Dancing Girl	Daud Kamal	ایلیڈ پبلی کیشن، دہلی
50	فیض کی شاعری کا نیا دور	عبدالرؤف ملک	پیپلز پبلشنگ ہاؤس، لاہور
51	Faiz Ahmad Faiz	K.K.Khullar	ادارہ فکر جدید، دہلی۔ 1985ء
52	فیض احمد فیض (پہلا تنقیدی و تحقیقی مقالہ)(غیر مطبوعہ)(1967ء)	حنیف اختر/ تعارف سید معین الرحمن	غالب سہ ماہی فیض نمبر، ص79 عمر گذشتہ کی کتاب، مرزا ظفر الحسن، ص145
53	فیض احمد فیض (غیر مطبوعہ) جامعہ کراچی (مقالہ بغرض ضروری تکمیل امتحان ایم اے)(1972ء)	محمد قمر قاضی/ نگران ڈاکٹر انجمن خورشید۔ جامعہ کراچی	1972ء۔ ٹائپ شدہ، بڑا سائز، ایک سو صفحات پر مشتمل ہے، جامعہ کراچی
54	سہ ماہی غالب کراچی "فیض نمبر" (1976ء)	ادارہ یادگار غالب، کراچی	ادارہ غالب ناظم آباد کراچی
55	تجزیات، اتر پردیش اُردو اکادمی	غلام حسین زیدی	نامی پریس، لکھنؤ۔ 1978ء
56	نذر فیض، مغربی بنگال اُردو اکیڈمی	محمد فخر الدین	نوا شین پرنٹرس، کلکتہ۔ 1980ء

☆

فیض پر مرتبہ مضامین کا ذخیرہ

نمبر شمار	کتاب	مضمون نگار	ریفرنس
1	فیض ایک تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر جمیل جالبی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
2	وقت، نقش فریادی، ہم اور میں	سید ابوالخیر کشفی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
3	فیض کی غزل	ڈاکٹر سلام سندیلوی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
4	فیض کی داخلیت پسندی	انجم اعظمی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
5	فیض میری نظر میں	میجر اسحاق محمد	افکار، فیض نمبر، 1965ء
6	فیض ایک صحافی	احمد علی خان	افکار، فیض نمبر، 1965ء
7	فیض کا اسلوبِ شاعری	فیصل جعفری	افکار، فیض نمبر، 1965ء
8	مرکزِ داستاں ہے فیض	بریگیڈیئر گلزار احمد	افکار، فیض نمبر، 1965ء
9	فیض کی شاعری، چند فنی پہلو	انیس فرید	افکار، فیض نمبر، 1965ء
10	فیض ایک نثر نگار	عمر انصاری	افکار، فیض نمبر، 1965ء
11	فیض کے دو عشق	اختر جمال	افکار، فیض نمبر، 1965ء
12	فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور	کشمیری لال ذاکر	افکار، فیض نمبر، 1965ء
13	فیض کی شاعری اور زبان و بیان	ماہر القادری	افکار، فیض نمبر، 1965ء
14	فیض کی شاعری، پس منظر و پیش منظر	ڈاکٹر محمد حسنین	افکار، فیض نمبر، 1965ء
15	فیض غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک	اظہر قادری	افکار، فیض نمبر، 1965ء
16	گندم کے کھیت، بچوں کے ہاتھ اور شاعر	احفاظ الرحمن	افکار، فیض نمبر، 1965ء
17	فیض فکر و فن کے آئینے میں	امجد کندیالی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
18	فیض احمد فیض اور ان کی شاعری	ساحر الہ آبادی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
19	فیض کی شخصیت شاعری کے پس منظر میں	نجمہ تقی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
20	لندن میں ایک ملاقات	فیض + عبادت بریلوی	افکار، فیض نمبر، 1965ء
21	بک سیلر فیض	ابراہیم جلیس	افکار، فیض نمبر، 1965ء

22	فیض صاحب: دو تصویریں	ابن انشا	افکار فیض نمبر 1965ء
23	مرے عہد کے محسن	نذیر احمد چوہدری	افکار فیض نمبر 1965ء
24	[illegible] کی کلیسا چہ	یونس [illegible]	افکار فیض نمبر 1965ء
25	سارے عقیدے نے [illegible] کی آبرو ہیں	شفیع احمد	افکار فیض نمبر 1965ء
26	فیض کو کیسے پڑھیں	پروفیسر گوپی چند نارنگ	فیض کے قدر دان 1992ء
27	فیض احمد فیض: متفرق حالات	صہبا لکھنوی	افکار فیض نمبر 1965ء
28	پردیس کے ساتھی	ایلس فیض	افکار فیض نمبر 1965ء
29	فیض اور میں	سجاد ظہیر	افکار فیض نمبر 1965ء
30	فیض صاحب	شاہد احمد دہلوی	افکار فیض نمبر 1965ء
31	فیض ایک پیاری عظیم شخصیت	ڈاکٹر ملک راج آنند	افکار فیض نمبر 1965ء
32	چند روز: چند تاثرات	ڈاکٹر عبادت بریلوی	افکار فیض نمبر 1965ء
33	لکھنؤ کی ایک بات	سردار جعفری	افکار فیض نمبر 1965ء
34	فیض شخصیت کی چند جھلکیاں	حمید اختر	افکار فیض نمبر 1965ء
35	فیض آئینہ خانے میں	شیر محمد حمید	افکار فیض نمبر 1965ء
36	فیض ایک دوست ایک دانشور	فقیر سید وحید الدین	افکار فیض نمبر 1965ء
37	کچھ فیض صاحب کے بارے میں	حمید نسیم	افکار فیض نمبر 1965ء
38	پیام آشنا کو سلام	آغا آفتاب قزلباش	افکار فیض نمبر 1965ء
39	لاہور کی ایک بات	انور عظیم	افکار فیض نمبر 1965ء
40	چین میں فیض کی مقبولیت	شمیم حنفی	افکار فیض نمبر 1965ء
41	شاعر محشر	سید [illegible]	افکار فیض نمبر 1965ء
42	فیض الہ آباد میں	محبوب اللہ مجیب	افکار فیض نمبر 1965ء
43	فیض کی انفرادیت	پروفیسر احتشام حسین	افکار فیض نمبر 1965ء
44	فیض نقش فریادی سے [illegible]	پروفیسر آل احمد سرور	افکار فیض نمبر 1965ء
45	[illegible]	ممتاز حسین	افکار فیض نمبر 1965ء
46	فیض کی ملی شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	افکار فیض نمبر 1965ء
47	کچھ فیض کے بارے میں [illegible] کہے جیسے بارے میں	مجتبیٰ حسین	افکار فیض نمبر 1965ء
48	شاعر محبت شاعر انسانیت	پروفیسر سلامت اللہ خان	افکار فیض نمبر 1965ء
49	شاعر حیات و کائنات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	افکار فیض نمبر 1965ء

50	شاعر پاکستان	علی عباس حسینی	افکار فیض نمبر 1965ء
51	زنداں نامہ پر ایک نظر	شاہد دہلوی	افکار فیض نمبر 1965ء
52	تازہ شعری دور تک	ڈاکٹر مسعود حسین خان	افکار فیض نمبر 1965ء
53	تعارف فیض	مرزا ظفر الحسن	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
54	فیض کے شعری و ادبی رجحانات	اخلاق سلیم مرزا	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
55	فیض میرے دوست اور ...	یاسر عرفات	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
56	کیا دن تھے ہم جوان تھے کیا دن جب یاد ... گزرے تھا	لدمیلا واسی لیوا	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
57	ایشیا کی فیض سے باتیں	امرتا پریتم	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
58	فیض صاحب سے بات چیت	ڈاکٹر جمیل احمد انجم	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
59	وہ ایک جس کا فیض کو ساری عمر پچھتاوا رہا	احمد فراز، افتخار عارف	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
60	فیض صاحب کا انٹرویو	ڈاکٹر حسن رضوی	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
61	بر سر تربت ہے پیام فیض	یاسر عرفات	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
62	نظم بے حرف	ضیا ساجد	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
63	فیض صاحب	اے حمید	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
64	فیض سے ملاقات	کرشن چندر	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
65	سرور شبانہ	قرۃ العین حیدر	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
66	میرے دل میرے مسافر	ڈاکٹر محمد حسن	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
67	فیض احمد فیض کی شاعری	ڈاکٹر شمیم حنفی	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
68	فیض کی شاعری کے چند پہلو	رشید حسن خان	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
69	فیض کے دو عشق	ڈاکٹر قمر رئیس	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
70	فیض کا جمالیاتی احساس اور معنیاتی نظام	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
71	فیض اور کلاسیکی غزل	شمس الرحمٰن فاروقی	فیض صدی منتخب مضامین، 2011ء
72	فیض کا آخری انٹرویو	آئی۔اے رحمٰن	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
73	امروز لاہور میں فیض سے ایک ملاقات	ڈاکٹر وزیر آغا	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
74	بیاد فیض	اندر کمار گجرال	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
75	بھائی جان کی کہانی، بہن کی زبانی	اختر جمال	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
76	فیض اور دست صبا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
77	میزان پر ایک نظر	ڈاکٹر سید عبداللہ	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء

78	فیض احمد فیض	شاد امرتسری	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
79	یوسف حسن: بہت سایہ دار درخت	ابراہیم جلیس	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
80	فیض ہمارے شہر میں	اقبال مسعود	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
81	ہمارے فیض۔ ماسکو ریڈیو کا لیکچر	لدمیلا واسی لیوا	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
82	شمشیر وستان اوّل	یوری کورلی نوف	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
83	صلیبیں مرے دریچے میں۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
84	مرگِ فیض۔ ایک تاثر	رفعت سروش	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
85	افتادگانِ خاک کا شاعر	قاضی جاوید	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
86	فیض۔ شاعرِ انسانیت	ڈاکٹر تاراچرن رستوگی	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
87	نقشِ فریادی کی غزلیں	مجتبیٰ حسین	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
88	زنداں نامہ کی غزلیں	عتیق احمد	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
89	سرِ وادیِ سینا کی غزلیں	شان الحق حقی	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
90	فیض کا کلام موسیقی کے روپ میں	امین الرحمٰن	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
91	زنداں نامہ کا سرسری جائزہ	جعفر علی خان اثر	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
92	فیض کی نظم "ملاقات"	سجاد ظہیر	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
93	مرے دل مرے مسافر	محمد حسن	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
94	فیض اور فلسطین	سحر انصاری	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
95	فیض کے دیباچے	مرزا ظفر الحسن	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
96	بوڑھے شاعر کا المیہ	انیس ناگی	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
97	فیض اور برہم نوجوان کا المیہ	پروفیسر فتح محمد ملک	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
98	Faiz Ahmad Faiz: Poet of Peace	F. Ahmad	Africasia 1985
99	Curious Case of the Rawalpindi Conspirators	Editorial	DAWN Magazine
100	Faiz Shows Fine Verse Despite Being Seventy	Shamim Faezee	DAWN Magazine
101	فیض کی شاعری میں صبا کی علامت	ڈاکٹر انیس اشفاق	فیض، شخص اور شاعری، 1991ء
102	فیض کا تنقیدی رویہ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	فیض، شخص اور شاعری، 1991ء
103	فیض کا ذاتی سفر	نصرت چودھری	فیض، شخص اور شاعری، 1991ء
104	فیض کی نظموں پر صادقین کا عمل	شاہد ماہلی	فیض، عکس اور جہتیں، 2011ء

105	فیض احمد فیض، ایک نظر میں	ساجد محمود	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
106	فیض: شعر، درد، دار	محمد علی صدیقی	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
107	فیض کی جمالیات	خلیل الرحمٰن	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
108	فیض کی شاعری	ظفر اقبال	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
109	فیض اور غالب	آغا سہیل	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
110	فراق اور فیض	ضمیر جعفری	فیض: عکس اور جہتیں، 2011ء
111	فیض کا فیض	خواجہ احمد عباس	ماہنامہ [illegible] 2011ء
112	پہلی ملاقات	[illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
113	یہ فیض کون ہے	[illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
114	بچوں سے محبت تھی	[illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
115	فیض کے دو دن	ارشد محمود	ماہنامہ [illegible] 2011ء
116	ایک آدمی شاعر	[illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
117	فیض کے محسنات	[illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
118	فیض اور ظلم	زاہد [illegible]	ماہنامہ [illegible] 2011ء
119	فیض کو نذرانۂ عقیدت	[illegible]	اقبال نمبر، [illegible] 1985ء
120	[illegible]	جعفر [illegible]	اقبال نمبر، [illegible] 1985ء
121	[illegible]	مشتاق احمد [illegible]	اوراق فیض نمبر، 2002ء
122	فیض صاحب [illegible]	آئی اے رحمٰن	اوراق فیض نمبر، 2002ء
123	[illegible]	شمیم [illegible]	اوراق فیض نمبر، 2002ء
124	خواب کا [illegible]	[illegible]	اوراق فیض نمبر، 2002ء
125	فیض کی یادیں	[illegible]	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
126	فیض کی شاعری کا [illegible]	[illegible]	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
127	فیض کی [illegible]	[illegible]	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
128	فیض، [illegible]	[illegible] حسین	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
129	فیض کی [illegible]	[illegible]	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
130	پیارے فیض	قدرت اللہ شہاب	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
131	[illegible]	[illegible] اختر	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
132	فیض صاحب	[illegible]	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء
133	فیض صاحب اور [illegible]	آئی اے رحمٰن	فیض احمد فیض [illegible] 1986ء

134	فیض نے کہا	شیخ القاسمی	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
135	سب کے ہمدل	ڈاکٹر جمیل احمد	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
136	فیض پیارا کرو	فاروق اعظم، خورشید ملک، خواجہ مسعود	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
137	عظیم شاعر، عظیم انسان	پروفیسر کرار حسین	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
138	میں نے فیض صاحب کو قریب سے دیکھا ہے	اسرار اللہ خان	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1996ء
139	دلِ فیض	قمر ساجد	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
140	فیض رومانی انقلاب کا پیامبر	ز۔ بابا	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
141	محبت کا پیامبر پر ایک تاثراتی نظر	جلال الدین احمد	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
142	فیض کی شاعری میں رومانی عناصر	عرش صدیقی	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
143	مقدمہ نقشِ فریادی	ن۔ م۔ راشد	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
144	فیض صاحب کا انٹرویو	حسن رضوی	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
145	فیض	مالک رام	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
146	فیض جی	خلیق انجم	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
147	یادِ یاراں	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	فیض احمد فیض: فن، فکر، شخصیت، 1986ء
148	فیض کی موت پر ایک خط	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1986ء
149	فیض کی باتیں، فیض کی شاعری	فارغ بخاری	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
150	فیض احمد فیض کا شعری سفر	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ، 1985ء
151	میں نے کہا کہ بنا چاہا تھا	مجتبیٰ حسین	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
152	خوش مزاج ایک	اشفاق احمد	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
153	فیض صاحب کی باتیں اور یادیں	تجمل حسین	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
154	ہر نظر میں پھول مہکے	کنہیا لال کپور	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
155	اپنے عہد کی آواز	مشتاق احمد یوسفی	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
156	فیض کا مقامِ غزل	غالب احمد	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
157	فیض صاحب کی نظم	محمد طاہر	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
158	میرے دل میرے مسافر	خالد حسن	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
159	فیض کی شخصیت اور شاعری	دام جلیل	ادبِ لطیف، فیض نمبر، 1985ء
160	عظیم روح کا عظیم نمائندہ	علی سردار جعفری	فیض احمد فیض، شخص اور شاعری، 1991ء
161	فیض احمد فیض اور مرزا غالب کا زمانہ	عبداللہ جان مستوفی	فیض احمد فیض، شخص اور شاعری، 1991ء

162	فیض ایک سیاسی شاعر	قیصر ہاشمی	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
163	فیض کی شاعری: تصورات، تجربات یا حقیقت	[illegible]	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
164	سوچنے دو	ڈاکٹر [illegible] شاہین	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
165	فیض اور جدید شاعری میں بے گھری کا موضوع	ڈاکٹر [illegible]	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
166	ساٹھ کے بعد [illegible] میں فیض کی شاعری کا [illegible] مطالعہ اور تجزیہ	[illegible]	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
167	فیض: شاعر، [illegible]	شفیق احمد (پاکستان)	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
168	کلام فیض کا ایک تجزیہ	ڈاکٹر شاہ [illegible] بخاری	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
169	فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو	ڈاکٹر سید محمود الحسن	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
170	فیض کی غنائی شاعری	ڈاکٹر [illegible] ہاشمی	فیض احمد فیض: شخص اور شاعری، 1991ء
171	فیض کے بارے میں	[illegible] ملک	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
172	[illegible] اور فیض	[illegible]	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
173	فیض اور [illegible]	یوسف [illegible]	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
174	فیض کا فلسفہ [illegible] کی روشنی میں	عبداللہ ملک	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
175	لب پہ حرفِ غزل	آفتاب احمد	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
176	فیض [illegible] عصر	خواجہ مسعود	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
177	دیکھے ہیں ہم نے [illegible]	آغا بابر	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
178	زنداں اور شب [illegible]	[illegible] نعمانی	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
179	ہمارے انقلابی [illegible] پر فیض کا اثر	حامد محمود خان	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
180	فیض کی [illegible]	شاہین مفتی	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
181	[illegible]	[illegible] قریشی	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
182	[illegible]	[illegible] (7 مضامین)	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
183	فیض ایک [illegible] شاعر	[illegible]	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
184	انسان فیض [illegible] موضوع	[illegible]	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
185	فیض [illegible]	محمد [illegible]	ماہِ نو فیض نمبر، 2002ء
186	فیض کا [illegible]	پروفیسر [illegible] کاشمیری	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
187	فیض کی شاعری ایک جائزہ	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
188	فیض [illegible]	ڈاکٹر [illegible]	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء
189	فیض: حیات و کارنامے	ڈاکٹر [illegible]	فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، 1981ء

190	فیض ایک نثر نگار	سحر انصاری	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
191	[illegible]	ڈاکٹر راہی معصوم رضا	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
192	[illegible]	خدیجہ بیگم	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
193	[illegible]	کشمیری لال ذاکر	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
194	فیض کا دکھ	فکر تونسوی	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
195	حسن کا شاعر	پرکاش پنڈت	فیض احمد فیض فن اور شخصیت، 1981ء
196	[illegible]	سجاد ظہیر	افکار فیض نمبر، 1985ء
197	[illegible]	ذکاء الرحمن	افکار فیض نمبر، 1985ء
198	[illegible]	رفعت	افکار فیض نمبر، 1985ء
199	فیض کی شاعری	پروفیسر احتشام حسین	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
200	فیض کا نظریہ فن	محمد صفدر میر	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
201	فیض کا آدرش	سید سبط حسن	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
202	کچھ دست صبا کے بارے میں	سید سجاد ظہیر	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
203	[illegible]	مجتبیٰ حسین	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
204	لیلائے وطن	پروفیسر فتح محمد ملک	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
205	فیض	کلیم الدین احمد	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
206	نئے شاعر فیض احمد فیض	ڈاکٹر جمیل جالبی	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
207	مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ	سلیم احمد	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
208	کچھ فیض کی شاعری کے بارے میں	ڈاکٹر آفتاب احمد	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
209	فیض احمد فیض کی [illegible]	ڈاکٹر عالم خوندمیری	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
210	مقدمہ نقش فریادی	ن۔م۔راشد	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
211	فیض کی شاعری کا طلسم	احمد ندیم قاسمی	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
212	فیض کا شعری تجربہ	عزیز حامد مدنی	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
213	ہمارا فیض	جیلانی کامران	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
214	فیض قرب و دوری کا کرشمہ	انتظار حسین	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
215	[illegible]	مشتاق احمد یوسفی	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
216	ہمارے فیض صاحب	افتخار عارف	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
217	مابعد جدیدیات [illegible]	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء
218	ہم کہ ٹھہرے اجنبی !	ڈاکٹر ایوب مرزا	فیض صدی، منتخب مضامین، 2011ء

219	فیض کی شاعری: چند تاثرات	امین مغل	فیض صدی: منتخب مضامین، 2011ء
220	فیض اور ایران	ظفر بشیر پراچی	فیض صدی: منتخب مضامین، 2011ء
221	Art, Life and Myth	Athar Murtaza	S.Asian Literature Vol.2.1974
222	A Faiz Interview	Rizvi, Rameez, Shafai, Kamran, Sayyed, Naqi	Akhbar Faiz
223	Faiz on the Afro-Asian Literary Scene		Viewpoint-1982
224	مرا گئے تو کس پہ ثانی ہوگا	حمید اختر	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
225	شاعرِ منصور فیض	ڈاکٹر سید جعفر	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
226	ایک شاعر پاکستان کے سینے سے	ڈاکٹر شہید شوکت	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
227	شاعرِ شفق رنگ فیض	نظیر صدیقی	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
228	دلِ ہر قطرہ ہے ساز انا البحر	ممتاز حسین	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
229	فیض ایک تجزیہ	باقر مہدی	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
230	انسان کی آواز فیض	ظفر بشیر پراچی	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
231	فیض سے فیض تک	پروفیسر آل احمد سرور	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
232	ترقی پسند تحریک کا بانی فیض	ظفر ادیب	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
233	دستِ صبا کی غزلیں	ریاض صدیقی	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
234	زنداں نامہ کی غزلیں	شفیق احمد	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
235	فیض کی شاعری (ایک جائزہ)	پروفیسر رفیع سلطان	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
236	فیض کی شاعری میں نئی فکر	ڈاکٹر احمد سجاد	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
237	فیض کے کلام میں ابدیت	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
238	جدید اردو شاعری میں فیض کا مقام	پروفیسر عبدالحق	فیض احمد فیض، فن اور شخصیت، 1981ء
239	ماضی پر سے نقش ہیں سائے کی طرح	مرزا ظفر الحسن	خوباں کی کہکشاں، مکتبہ اسلوب 1983ء
240	فیض اور سرمایہ	نصراللہ خان	خوباں کی کہکشاں، مکتبہ اسلوب 1983ء
241	فیض جیل میں	ڈاکٹر محمد شاہد	خوباں کی کہکشاں، مکتبہ اسلوب 1983ء
242	فیض لندن میں	سلیمہ ہاشمی	خوباں کی کہکشاں، مکتبہ اسلوب 1983ء
243	فیض کی شخصیت کا خاکہ	مرزا ظفر الحسن	خوباں کی کہکشاں، مکتبہ اسلوب 1983ء

244	[illegible]	مرزا ظفر الحسن	عمر گزشتہ کی کتاب، مکتبہ اسلوب 1983ء
245	مجروح، فیض اور میں	مرزا ظفر الحسن	عمر گزشتہ کی کتاب، مکتبہ اسلوب 1983ء
246	فیض، ن۔ م۔ راشد	مرزا ظفر الحسن	عمر گزشتہ کی کتاب، مکتبہ اسلوب 1983ء
247	فیض کا کلام موسیقی کے روپ میں	امین الرحمٰن	عمر گزشتہ کی کتاب، مکتبہ اسلوب 1983ء
248	[illegible]	مرزا ظفر الحسن	عمر گزشتہ کی کتاب، مکتبہ اسلوب 1983ء
249	کچھ تذکرہ، کچھ تبصرہ	ڈاکٹر ظ۔ انصاری	فن اور شخصیت: 1981ء
250	[illegible] کا شاعر	ڈاکٹر مسعود حسین	فن اور شخصیت، 1981ء
251	انقلاب اور تنہائی کا شاعر	پروفیسر [illegible] احمد خان	فن اور شخصیت، 1981ء
252	فیض احمد فیض	کوثر مظہری	جدید نظم حالی سے میراجی تک، دہلی
253	نظم گوئی میں فیض کے امکانات	ابوالکلام قاسمی	جدید نظم حالی سے میراجی تک، دہلی
254	فیض اور ان کے غیر ملکی معاصرین	وہاب اشرفی	شب خون، الہ آباد، 2001ء
255	فیض احمد فیض کی شاعری	ظفر اقبال	شب خون، الہ آباد، 2011ء
256	ایک عہد آفریں شخصیت	[illegible]	[illegible]
257	فیض احمد فیض	عارف نقوی	یادوں کے چراغ
258	سفینۂ غزل اور فیض	[illegible]	افکار، کراچی 1965ء
259	فیض	ڈاکٹر انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں
260	فیض صاحب کا نظریۂ شاعری اور اس کی [illegible]	ڈاکٹر سید محمد عقیل	[illegible]
261	فیض احمد فیض	پروفیسر سیدہ جعفر	تاریخ اردو ادب
262	فیض کی تحریریں	مظہر امام	[illegible]
263	حضرت فیض احمد فیض	ڈاکٹر عالیہ امام	[illegible]
264	نظریات فیض	رؤف خیر	[illegible]
265	فیض احمد فیض	پروفیسر عبدالقوی [illegible]	[illegible]
266	فیض کا شعری مرتبہ	[illegible]	تنقید کا نیا محاورہ
267	فیض احمد فیض	ڈاکٹر حنیف کیفی	غزل اور مسائل
268	[illegible]	محمد علی صدیقی	افکار، فیض نمبر، کراچی، 1985ء
269	[illegible]	پروفیسر [illegible] شاہین	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
270	[illegible]	سید خورشید عالم	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء
271	فیض، [illegible] آزادی کا مسافر	خالد سہیل	فیض کے مغربی حوالے، 1992ء

272	فیض کی شاعری	حمیدہ اختر قریشی	فیض کے مغربی حوالے 1992ء
273	فیض ایک سورج	بانو قدسیہ	فیض کے مغربی حوالے 1992ء
274	فیض اور آراگاں	ڈاکٹر محمد حسن	فیض کے مغربی حوالے 1992ء
275	فیض کا ایک نامکمل مرثیہ اور ایک نظم سوز	ڈاکٹر ہلال نقوی	مرثیہ بیسویں صدی میں 1992ء
276	فیض احمد فیض	ضمیر اختر نقوی	اردو مرثیہ پاکستان میں 1992ء
277	نسبِ فیض	محمد رضا کاظمی	جدید اردو مرثیہ، کراچی، 1991ء
278	جمالِ رنگِ فیض	ہلال نقوی	ادب سیاست اور جمہوریت
279	مہاجن	پروفیسر فتح محمد ملک	اخبار اردو، دسمبر 2009ء
280	مرد صوفی	اشفاق احمد	صبح ہونے تک، کراچی
281	قصہ ایشیا	سید عاشور کاظمی	فیض کے مغربی حوالے 1992ء
282	فیض نظریات کا شاعر	احمد ندیم قاسمی	افکار، کراچی 1965ء
283	یہ کہاں سے جدا مرا تخمیں کہاں تھے	مشتاق احمد یوسفی	ماہنامہ لاہور، ص60، 2003ء
284	فیض بحیثیت ایڈیٹر	آئی اے رحمن	ماہ نو لاہور، ص74، 2002ء
285	غالب اور فیض	وزیر آغا	ماہ نو لاہور، ص139، 2002ء
286	فیض کی جمالیات کا تجزیہ	ناصر عباس	ماہ نو لاہور، ص210، 2002ء
287	فیض احمد فیض کی شاعری کا صوتیاتی پہلو	نصرت چوہدری	فیض ایک مطالعہ 1987ء
288	فیض کی نظموں پر صادقین کا کام	شاہد ماکلی	فیض عکس اور جہتیں 2011ء
289	Do You Write Poetry?	سلیمہ ہاشمی	پاکستان بک 2010ء
290	فیض محبت، دوستی اور جنگ بیروت کے پس منظر رہتے تھے	یاسر عرفات	افکار فیض نمبر 1965ء
291	فیض کے انٹرویوز (28 انٹرویو، 450 سوالات)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
292	فیض کا مرثیہ امام	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
293	فیض سے انٹرویو	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
294	اے ہما آرزو کے تاک کے علم	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
295	فیض کی شخصیت اور ہم عصروں کی نظر کی روشنی میں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
296	فیض نے کن کتابوں کا مطالعہ کیا	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
297	فیض اور مصطفیٰ زیدی	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء
298	فیض کا تذکرہ نامہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور 2011ء

299	شامِ غربت	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
300	فیض کا منظوم ترجمہ "پیامِ مشرق" تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
301	فیض کی نعت	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
302	جو میرا تمھارا رشتہ ہے	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
303	بادِ بہاراں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
304	نذرانۂ عقیدت	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
305	فیض مشاہیر شعر و ادب کی نظر میں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
306	فیض کا ادبی مناظرہ بعنوان "پہ چند"	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
307	فیض کی تقریظیں ـ تحقیقی و تنقیدی ابعاد	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
308	فیض کے بہتر (72) ادبی نشتر	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
309	کون جیتا؟ جوش یا فیض (ادبی محاسبہ و موازنی مطالعہ)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
310	فیض اور ترکی پوئٹ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
311	فیض اور پابلو نرودا	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
312	کلامِ فیض ـ عربی فارسی الفاظ اور تراکیب کا گلدستہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
313	فیض اور ایرانی انقلاب	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
314	تفصیلِ سازش اخبار کی ان سرخیوں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
315	کلامِ فیض پر فیض کا ریویو	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
316	فیض اور احمد شیرازی کی تحریر تقریریں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
317	فیض کی دولتِ تنہائی کا جائزہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
318	فیض صدی تقریب تعدیاتِ حسن	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
319	فیض کا غیر مدون کلام	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
320	فیض کی غزل کا مقام	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
321	فیض کی چھوٹی تصانیف	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
322	فیض کا عقیدہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
323	فیض کے لطیفے	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء
324	فیض پر مرتبہ کتب و رسائل	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور، 2011ء

325	فیض کے مطبوعہ مضامین کا اشاریہ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء
326	تعلیقاتِ فیض پر ایک نظر	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء
327	فیض کی شاعری (تشریح، تجزیہ، تبصرہ)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء
328	فیض کی نظم کی ہیئتیں	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء
329	فیض کے کلام میں غلطیاں اور اسقام (منصفانہ تجزیہ)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء
330	فیض پر دشنام انگار عاملین۔ مجید جعفر اور مسعود جاوید	ڈاکٹر سید تقی عابدی	فیض فہمی، لاہور۔ 2011ء

☆

فیضؔ کا غیر مدوّن کلام

فیضؔ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ انھوں نے اپنا ابتدائی کلام کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔ اگرچہ فیضؔ نے ہائی اسکول میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی، لیکن کالج کے ابتدائی دنوں میں مشاعروں میں شرکت کرتے اور رسالوں میں بالخصوص کالج میگزین "راوی" میں چھپتے بھی تھے۔ ان رسائل اور محفلوں سے فیضؔ کا غیر مطبوعہ کلام جمع کیا جائے تو فیضؔ کی باقیات ترتیب دی جا سکتی ہے جو آئندہ نسلوں کے نقادوں اور محققوں کے لیے ان کے فن کے ارتقا کی راہ متعین کر سکتی ہے۔ ہم نے فیضؔ کی تصانیف کی جلدوں میں تقریباً چوالیس (44) غزلوں، نظموں، قطعوں اور گیتوں کے حوالے دیے ہیں جو فیضؔ کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں، لیکن مطبوعہ شکل میں مختلف رسالوں اور کتابوں میں موجود ہیں۔ یہ رسالے اب نایاب ہیں۔ ہماری کوشش کے باوجود صرف سولہ سترہ غزلیں، نظمیں، قطعے اور گیت حاصل ہوئے ہیں جنھیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ مزید معلوم کی نشاندہی جلدوں میں کی گئی ہے۔ اس غیر مدوّن کلام میں پنجابی، انگریزی کلام کے علاوہ چند تراجم بھی شامل ہیں۔ اس کلام میں فیضؔ کا ایک سہرا بھی شامل ہے شاید فیضؔ نے بھتیجے کے لیے سہرا لکھا ہوگا: ع "ایسے کہتے ہیں سخن ور سہرا"۔

منیزہ کی سالگرہ

(فیضؔ کی چھوٹی بیٹی 1950ء)

ایک چھوٹی ہماری بچی ہے
جو بہت ہی نڈر کی بچی ہے
ہم ہی کب اس کو پیار کرتے ہیں
سب کے سب اس کو پیار کرتے ہیں
جیسے سب کو خود آئے پیار اس پر
ہے ضدی تو ہماری اکثر
پر نہ سے جو کسی کی مانے گا
وہ ضرور اس سے مار کھائے گا
مجھ پہ یہ بات تو اٹکی سی ہے
دیکھ تو کتنی اچھی ہے

پھول کی طرح اس کی رنگت ہے
چاند کی طرح اس کی صورت ہے
جب وہ خوش ہو کے مسکراتی ہے
چاندنی جگ میں پھیل جاتی ہے
پڑھنے لکھنے میں خوب قابل ہے
کھیلنے کودنے میں کامل ہے
عمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے
عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے
پھر وہ گانا بھی اچھا گاتی ہے
گرچہ مجھ کو نہیں سناتی ہے
بات کرتی ہے اس قدر میٹھی
جیسے ڈالی پہ کوک بلبل کی
ہاں کوئی اس کو جب ستاتا ہے
تب ذرا غصہ آ ہی جاتا ہے
پر وہ جلدی سے من بھی جاتی ہے
کب کسی کو بھلا ستاتی ہے
ہے شگفتہ بہت مزاج اس کا
سارا عمدہ ہے کام کاج اس کا

ہے منیزہ کی آج سالگرہ
ہر طرف شور ہے مبارک کا
چاند تارے دعائیں دیتے ہیں
پھول اس کی بلائیں لیتے ہیں
باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل
تم سلامت رہو منیزہ گل
امی ابا بھی اور باجی بھی !
آنٹیاں اور بہن بھائی بھی
آج سب اس کو پیار کرتے ہیں
مل کے سب بار بار کہتے ہیں

پھر یونہی شور ہو نہ رک کا
آئے سب اور تیری سالگرہ
سو تو کیا سو ہزار بار آئے
یوں کہو بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی
اور پھر سب کہا کریں یونہی
یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے
یہ منیزہ تو پیاری بٹیا ہے

تتمہ

تین گیت

نظم: دور ہے سکھ کا گاؤں (1969ء)

(1) گیت

پنچھی راجا رے پنچھی راہ دکھلائیں
جوت جگی ہر من میں
متوا کو سجے ڈالی جھومے
بستی بڑی بن میں......
جوت جگی ہر من میں

ندیا والی رے
ندیا رانی جھالا لے
ہمجولی
گھاٹ گلی دوار
بات گئی سکھ جائے
ڈگیا ہاتھ چھوٹ پر کا
گھاٹ گئی پرواہ
ندیا والی ہمجولی

نندر گوری رے
نندر گوری چھما اڑن
جیسے سندر روپ جوانی
بات کرے تو پھول کھلیں
انکھیاں ایک کہانی
جیسے دور سے تارا چمکے
چمکے روپ جوانی
جیسے سندر روپ جوانی
جیسے کلی برہن کی
پنچھی راجا جائے ماہولی
مہارانی ..... نندر گوری

٭

(2) گیت

ٹھنڈی رہے تیری رات ، پیا ٹھنڈی رہے تیری رات
دور ہے ساجن کی نگری چندا دور ہے شہر کا جانو
جانے کیسے راہ کٹے گی ، ہارے تھک تھک پاؤں
رات میں بیٹھے بیری پیا ، تھام لے میرا ہاتھ
ٹھنڈی رہے تیری رات......

تیری ادا سے دیپ جلا ہے اب پلکوں کے دوارے
چاہت کیسے جاگ اٹھے ہیں نین کھلے ہیں سارے
من کا پنچھی ، نئی رت آئے ، پیا چھوٹ نہ جائے ساتھ
ٹھنڈی رہے تیری رات

٭

(3) گیت

ٹھمک پیچھا لے سیا مورا بالی بچھڑ گئی رے
دئی نا دولو کر
موری بالی بچھڑ گئی رے کوئی دیپ جلا ؤ

رونے سے کب رات کٹے گی، ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ
کالی رات سے جوتی لاؤ
اپنے دکھ کا دیپ بناؤ
ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ

☆

اقبال

(سنہ 1931ء)

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا، عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا، صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ ویراں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا، خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیزہ انگیز ہنگامے، شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر، ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
بنے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے، خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا، فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے، یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے

نمود و بود کے سب راز تُو نے پھر سے بتلائے، ہر اک فطرت کو تُو نے اُس کے امکانات جتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تُو نے، ہر اک ذرّے کو ہم دوشِ ثریا کر دیا تُو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں، زجاجِ زندگی کو آتشیں روشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کُن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے، کہ تُو نے صد ہزار افسونوں کو مُردہ کر ڈالا

☆

نوحہ

(صحافی محمد اختر کے انتقال پر، 1959ء)

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے، نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

☆

سہرا

(بہ مناسبت خانہ آبادی نعیم طاہر اور یاسمین امتیاز، 1962ء)

سجاؤ بزم، درِ مے کدہ کشادہ کرو
اُٹھاؤ سازِ طرب، اہتمامِ بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے، چراغ کافی نہیں
سجاؤ بزم کہ رنج و الم کے دن ٹلے
بساطِ لطف و محبت پہ آج یار ملے
دعا کو ہاتھ اُٹھاؤ کہ وقتِ نیک آیا
رُخِ عزیز پہ سہرے کے آج پھول کھلے
اُٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مدام رہے
شبِ نشاط و بساطِ طرب دوام رہے
تمھارا صحن معطر ہو مثلِ صحنِ چمن
اور اِس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

☆

شامِ غم

ہر گھڑی عکسِ رُخِ یار لیے پھرتی ہے
کتنے مہتاب شبِ تار لیے پھرتی ہے

سُن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دل
شامِ غم سیکڑوں اقرار لیے پھرتی ہے

ہے وہی حلقۂ موہوم مگر موجِ نسیم
ذرۂ تیشہ میں خم دار لیے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے

۔٭٭٭۔

لیلۃ القدر

(ترجمہ: عمر علی سلیمان)

رات کا وقت
گرسنہ
بزرگ آدمی
جائے نماز پہ سرگوشیاں کر رہے ہیں
ایک ابرو اٹھا کر
آنکھیں چار کر حیرت سے تکتا ہوا
اور شہر کے دریا کے پار سے
آبشاروں سے
جہاں تک بھیگتے دن رات
جیسے وضو کر رہی ہیں
کبھی لوگ اپنے خدا کے حضور
اپنا جائزہ آنکھیں بند کر کے لے رہے تھے
دعا کر رہے ہیں
کہ یہ رات عرش اور مناجات کی رات ہے
آرزوؤں کے پورے ہونے کی رات ہے
مسلماں دعا کر رہا ہے
کہ خدا کی رحمتوں سے محروم نہ ہوں:
رات تاروں بھری کہکشاں جگمگی
اور پھر ہوا
روشنی ہوا کی صورت

اُتری ہوئی ہے
ہلکی بہار صبح کی خاموشی ہے

اب کا نوچیدہ چندر
گزار رہا ایک غم زدہ

سر پہ سنبھالے ہوئے
ننگے پیروں سامنے سے گزرتے ہوئے

پیچھے گزرے ہوئے ماہ و سال
سبزہ زاروں میں کہیں کھوئی آب جو
مچلتی ہوئی
جیسے شمع کی دستار کے سارے بل کھل گئے ہوں
سیب کے پیڑ
پانی کے نیلے بادلوں میں اپنی جڑیں دھو رہے ہیں
پیار کا گیت گانے کی رات ہے
اور میں بھی لڑکیوں کے ساتھ
سرِ آب کے کنارے
کہ جو ستاروں پہ پہنچے ہوئے
زیرِ لب پھر دعا کر رہا ہوں

اور پیارے تیرا نام ہے
کاش میری دعا آج مقبول ہو

☆

او میرے وطن

(ترجمہ: ناظم حکمت)

او میرے وطن
او میرے وطن
او میرے وطن
مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ جوتے بھی نہیں

واقف تھے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کرتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
یا جھریاں میرے ماتھے پر
وا میرے وطن
وا میرے وطن
وا میرے وطن

☆

بھوکوں کی آنکھیں

(ترجمہ: ناظم حکمت)

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو
نہ ایک ہزار
قحط کے مارے پورے تین کروڑ
ایسے ہیں یا بچے لیے
ان کے لیے ہم ایسے ہیں
جیسے لہریں
ساگر کے لیے
یا ساگر
لہروں کے لیے

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو،
نہ ایک ہزار
قحط کے مارے تین کروڑ
صف در صف،
ان میں کوئی مرد نہیں

عورت بھی نہیں
لڑکا بھی نہیں
لڑکی بھی نہیں
سب چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں
جو مر گئیں
عورت بھی کہیں
لڑکا بھی کہیں
لڑکی بھی کہیں
سب بچے بکھرے ٹوٹے پڑے ہیں
دھرتی کے سینے پہ پڑی ہے
ان میں سے کوئی
اپنے گھر کو جاتا ہے
گھر جاتا ہے
گھر جاتا ہے
یہاں ابھی بھی کوئی
بچا ہے
سب ٹوٹ گیا ہے، آنکھوں میں
خوابوں کا دھواں
بجھ چکا ہے
اور مر گیا ہے
پہاڑ کی طرح
آنسو کی بوندوں کی طرح
یہ حالات ہیں، یہ جو عالم ہے،
پھر بھی ہم
جدوجہد سے جڑے رہیں گے
ہم نے اپنا مقصد طے کیے ہیں
اور بچے تو زندہ
ان بچوں کی زندگی کی خاطر
جن کی کالی آنکھیں

اپنا غم ہے اپنا ناتا ہے
اور تجھے یاد ہوا
تجھے بھی
کہ ہاں کی بات کبھی تھی نے
کہ مجھ کو بجلی سمجھے ہو
اور دل کی طرح
تم بھی سمجھتے ہو
ایسا سوچتے ہو
کہ کب چاہا ہے
اپنی میں سے کوئی
بس ایک چہرے کا تکیہ ہے
آنسو کی بات
جو آنکھوں میں رہتی ہے
جیون کے پل
جیسے ہیں ذکر جو روز میں
اور ہاں کو لو
نکھرے چہرے والی آنکھوں والی
ذرا دیکھو
میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو
آنکھیں ایک درد کے مارے کی
جو درد کے موسموں پاگل ہے
اداس ہے تو اپنا تماشا ہی آپ درد کے سامنے
کیوں بیٹھ ہے گئے ترے در کے سامنے
جیسا ہے تیرا درد تو بنا لیے ہوئے
بازیچہ سامنے کھلا ہے کسی گھر کے سامنے
ہر بات پر ہے اس سے تو کیا کہیں
دل کے سامنے کسی آئینے کے سامنے

اکتوبر انقلابِ روس کی سالگرہ

مرغِ بسمل کے مانند شب تلملائی
اُفق تا اُفق
صبحِ محشر کی پہلی کرن جگمگائی
تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹائے گئے
دل جلائے گئے

طبق در طبق
آسمانوں کے در
یوں کھلے، ہفت افلاک آئینہ سا ہو گئے
شرق تا غرب سب قید خانوں کے در
آج وا ہو گئے
قصرِ جمہور کی طرحِ نو کے لیے آج نقشِ کہن
سب مٹائے گئے
سینۂ وقت سے سارے خونیں کفن
آج کے دن سلامت اٹھائے گئے
آج پائے غلاماں میں زنجیر
ایسے چھنکی کہ بانگِ درا بن گئی
دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی
ایسے چمکی کہ تیغِ قضا بن گئی

-☆-

جیل سے ایک خط

(ترجمہ: ناظم حکمت)

مری جان، اِک ضروری بات کہنی ہے مجھے تم سے
بدل جاتا ہے خود انساں جو اُس کا گھر بدلتا ہے
میں اِس زنداں میں اب مرنے لگا ہوں اپنے خوابوں پر
جو نیند آتی ہے
اپنے دستِ شفقت سے

مری زنجیر توڑا کرنے
توڑے جاتی ہیں دیواریں
پرانی بات ہے پھر بھی
میں کھو جاتا ہوں ایسے اپنے خوابوں میں
کہ جیسے پُرسکوں پانی میں
سورج کی کرن اُترے
بہت دلکش ہیں میرے خواب، میری جاں
وسیع، شاداب دُنیا میں
بہت خوش اور آزادانہ پھرتا ہوں
مرے خوابوں میں کوئی بیستی کا دُکھ نہیں ہوتا
نہ کوئی پل کسی زنداں میں گذرا ہے
''تو پھر اس خواب سے اُٹھنا، تمھیں کتنا گراں ہوگا''

شاید کہو گی تم،
نہیں، جاں، یوں نہیں ہے،
مجھ میں اب بھی اتنی ہمت ہے
کہ اپنی نیند کو اوقات سے اُتنا ہی حصہ دوں
جو میں چاہوں
آج بیر کا دن ہے
اور آج پہلی بار
وہ مجھے باہر کھلی ہوا میں لے کر گئے
آج زندگی میں پہلی بار
میں نے بہت حیرت سے دیکھا
کہ آسماں کتنا نیلا ہے
اور کتنا دور
میں دھوپ میں ساکت کھڑا رہا
اور پھر ادب سے سر جھکا کر
پتھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر
بیٹھ گیا۔

اور پھر یکبارگی سب کچھ کھول گیا
خواہیں بھی
آزادی بھی
اور تم بھی مری جاں
بس اک سورج، دھرتی اور میں
اُف کتنا شکوہ ہے، کتنا شکوہ ہے

-☆-

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں

(ترجمہ: رسول حمزہ توف)

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں
مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آ سکوں
ترے در پہ آ کے صدا کروں
تجھے غم گسار کی ہو طلب
تو ترے حضور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم
میں دوبارہ پھر سے روانہ ہوں

-☆-

فیض کی انگریزی نظم

Illusion

(Verse Libre)

To a desolate heart, sick with
longing, there came a dream
--- the most beautiful of dreams
But it was faithless as all dreams
be ---
The dream of becoming a
Hostel ... perfect.
It went the way it came, but
the poor man's world was
changed.
The staircase created demoniac
laughter.
And the talking tubes were
red.
The infernal tower clock
clanging its eternal hours
How wearisome and garish
Singh's hostel ...
How absurd!

(1930)

خوابِ پریشاں

[illegible]
[illegible]
تھی مرے سب خوابوں کی طرح
یہ خواب بھی بے معنی تھا
[illegible] ...
... [illegible]
جیسے کہ آیا تھا، مگر
[illegible]
[illegible]
زینوں کی صدا آسیب زدہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
یہ خواب بھی کیا [illegible] تھا

([illegible])

اے وطن اے وطن

تیرے پیغام پر اے وطن ! اے وطن !
آ گئے ہم فدا ہوں ترے نام پر
تیرے پیغام پر اے وطن ! اے وطن !
نذر کیا دیں کہ ہم مال والے نہیں
آن والے ہیں ، اقبال والے نہیں
ہاں یہ جاں ہے کہ شکوہ جس نے دیکھا نہیں
یا یہ تن جس پہ کپڑے کا ٹکڑا نہیں
اپنی دولت بھی ، اپنا وطن ہے یہی
اپنا جو کچھ بھی ہے ، اے وطن ہے یہی
وار دیں گے یہ سب کچھ ترے نام پر
تیری للکار پر ، تیرے پیغام پر
تیرے پیغام پر اے وطن ! اے وطن !
ہم لٹا دیں گے جانیں ترے نام پر
تیرے غدار غیرت سے منہ موڑ کر
آج وہ پھر ایروں غیروں سے سر جوڑ کر
تیری عزت کا بھاؤ لگانے چلے
تیری عصمت کا سودا چکانے چلے
دم میں دم ہے تو یہ کرنے دیں گے نہ ہم
چال اُن کی کوئی چلنے دیں گے نہ ہم
تجھ کو بکنے نہ دیں گے کسی دام پر
ہم لٹا دیں گے جانیں ترے نام پر
سر کٹا دیں گے ہم تیرے پیغام پر
تیرے پیغام پر اے وطن ! اے وطن!

☆

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف/مؤلف	مطبع/ناشر
1	تنقیدی اشارے	پروفیسر آل احمد سرور	اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ 1942ء
2	ایک ادبی ڈائری	پروفیسر اختر انصاری دہلوی	ایم ثناء اللہ خاں لاہور۔ 1944ء
3	نئے پرانے چراغ	پروفیسر آل احمد سرور	اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ 1946ء
4	روایت اور بغاوت	پروفیسر احتشام حسین	ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔ 1947ء
5	نیا ادب	کشن پرشاد کول	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ 1949ء
6	تنقید اور عملی تنقید	پروفیسر احتشام حسین	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ 1952ء
7	مختصر تاریخ زبان اردو	غلام حسین ایم اے	خواجہ اجمیری کراچی۔ 1952ء
8	مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین خان ظہیر لدھیانوی	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔ 1953ء
9	جدید غزل	پروفیسر رشید احمد صدیقی	صدر شعبہ مطبوعات اشاعت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ 1955ء
10	روایت کی اہمیت	ڈاکٹر عبادت بریلوی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ 1956ء
11	مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ 1956ء
12	میزان شعر	آغا جمیل کاشمیری	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور۔ 1956ء
13	جدید شعرائے اردو	ڈاکٹر عبدالوحید	فیروز سنز لاہور۔ 1958ء
14	تنقیدی تجربے	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو دنیا کراچی۔ 1959ء
15	تہذیب اور تحریر	مجتبیٰ حسین	مکتبہ افکار کراچی۔ 1959ء
16	اردو ادب آزادی کے بعد	ڈاکٹر اعجاز حسین	کاروان پبلشرز الہ آباد۔ 1960ء
17	شعر اور غزل	پروفیسر مجنوں گورکھپوری	ادبی اکیڈمی کراچی۔ 1961ء
18	جدید اردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر سروری	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ 1962ء
19	ادب اور شعور	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ 1962ء
20	تاثرات و تعصبات	نظیر صدیقی	پاک کتاب گھر ڈھاکہ۔ 1962ء

21	اُردو	خلیل الرحمٰن اعظمی	آزاد کتاب گھر، دہلی۔1962ء
22	غزل کا سروپ	عبدالمجید ارشد	ادارہ ادب ... پٹنہ۔1962ء
23	عملی تنقید	پروفیسر کلیم الدین احمد	کتاب منزل، پٹنہ۔1963ء
24	جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے	سید ...	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔1963ء
25	نظم جدید کی کروٹیں	ڈاکٹر وزیر آغا	اردو دنیا، لاہور۔1963ء
26	شاعر اپنے ... پر	ادارہ	ادارہ ادبیات مشرق، ماسکو۔1963ء
27	ادبی شذرے	ڈاکٹر سلام سندیلوی	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور۔1964ء
28	تاریخ ادب اردو	سیدہ جعفر	... حیدرآباد۔2002ء
29	تنقیدی مباحث	پروفیسر شارب ردولوی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔1995ء
30	نئی تنقید اور ادب	...	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔1977ء
31	...	پروفیسر عبدالقوی ...	بزم تخلیق ادب، پاکستان۔1997ء
32	ادیب اور ادب	ڈاکٹر رفیع اللہ	... 2002ء
33	نقوش (شخصیات نمبر)	محمد طفیل	ادارہ فروغ اردو، لاہور
34	شاعری کی تنقید	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔2001ء
35	جدید نظم (حالی سے میراجی تک)	کوثر مظہری	... پبلی کیشنز، دہلی۔2005ء
36	الف (سہ ماہی) شمارہ 35	... خان	ادارہ الف، حیدرآباد
37	... (تنقیدی مضامین)	رؤف خیر	... حیدرآباد۔1997ء
38	جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	... حیدرآباد۔2006ء
39	...	ڈاکٹر ...	مکتبہ ... کراچی۔1991ء
40	... اور ادب	...	... 1986ء
41	ادب اور شعور	... حسین	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔1961ء
42	زبان، اسلوب اور اسلوبیات	مرزا خلیل بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔1983ء
43	میزان تنقید	... ہاشمی	کراچی بک سینٹر ... 1990ء
44	غزل اور مسائل	ڈاکٹر حفیظ قتیل	اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد۔1959ء
45	تنقید و تجزیہ	...	کاروان ادب، ملتان۔1987ء
46	تنقید کا نیا محاورہ	... اللہ	... دہلی۔1984ء
47	...	...	... آفسٹ پرنٹرس، دہلی۔1997ء
48	تنقید شعر	ڈاکٹر ...	نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد۔1971ء
49	جدید اردو مرثیہ	محمد رضا کاظمی	مکتبہ ادب، کراچی۔1981ء

50	ہم جیتے جی مصروف رہے	آغا ناصر	سنگ میل۔ لاہور۔ 2009ء
51	فیض کے مغربی حوالے	اشفاق حسین	جنگ پبلشرز۔ 1992ء
52	نقشِ فیض	نسیم عباسی	جامع پبلی کیشنز، دہلی۔ 1978ء
53	فیض احمد فیض: شخصیت اور شاعری	[illegible]	پرنس آفسٹ پرنٹرز، دہلی۔ 1991ء
54	عمرِ گزشتہ کی کتاب	مرزا ظفر الحسن	حسن بک ایجنسی، حیدرآباد۔ 1978ء
55	پوئمز بائی فیض (انگریزی)	مترجم: وکٹر کیرنن	خالد عمران پبلشرز، لاہور۔ 1971ء
56	او سٹی آف لائٹس (انگریزی)	خالد حسن اور داؤد کمال	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ 2006ء
57	خونِ دل کی کشید	مرزا ظفر الحسن	مکتبۂ اسلوب، کراچی۔ 1983ء
58	این انتھولوجی آف ماڈرن اردو پوئٹس (انگریزی)	[illegible]	انٹرنیشنل پبلشنگ، دہلی۔ 1984ء
59	فیضانِ فیض	ابوسعید قریشی	مکتبۂ اسلوب، کراچی۔ 1986ء
60	اشاریہ کلام فیض	ڈاکٹر محی الدین شکیل	ادارۂ یادگار غالب، کراچی۔ 1977ء
61	فیض احمد فیض	ضیا ساجد، فرحت ظفر	علمی پبلشرز، لاہور۔
62	فیض احمد فیض: شخصیت اور فن	اشفاق حسین	اکادمی ادبیات پاکستان۔
63	فیض احمد فیض: تنقیدی جائزہ	خلیق انجم	سیمانت پرکاشن، دہلی۔ 1985ء
64	فیض احمد فیض اور ان کی شاعری	شکیل الرحمن	[illegible]
65	Requiem for an unsung messiah	فیض احمد فیض	DAWN The Great Interpreters
66	سخن در سخن	سبط حسن	مکتبۂ دانیال، کراچی۔ 1987ء
67	فیض کی شاعری	ڈاکٹر نصرت چوہدری	نگارشات، لاہور۔ 1987ء
68	ہم کہ ٹھہرے اجنبی	ڈاکٹر ایوب مرزا	الکتاب پبلشرز، اسلام آباد۔
69	فیض نامہ	ڈاکٹر ایوب مرزا	کلاسیک، لاہور۔
70	فیض شاعری اور سیاست	پروفیسر فتح محمد ملک	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
71	روشنائی	سید سجاد ظہیر	مکتبۂ دانیال، کراچی۔
72	تجربے اور روایت	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	تنویر پریس، لکھنؤ۔
73	مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔
74	اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری	الٰہ آباد۔ 1945ء
75	ترقی پسند ادب	عزیز احمد	چمن بک ڈپو، دہلی۔
76	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

77	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔
78	اسلوب	سید عابد علی عابد	مجلس ترقی ادب لاہور۔
79	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	فیروز سنز لاہور۔
80	روایت کی اہمیت	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی۔
81	معنی سے تجربے تک	نقی علی تقوی	سندھی مجلس ماہرین حیدرآباد۔
82	ادب اور شعور	ممتاز حسین	کراچی۔1961ء
83	اردو غزل	یوسف حسین خان	مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔
84	فیض محبت اور انقلاب کا شاعر	ثاقب رزمی	آئینہ ادب چوک مینار لاہور۔1986ء
85	شخصیات (غالب) کراچی	رضا نقوی	ادارہ یادگار غالب کراچی۔
86	فیض احمد فیض شخص اور شاعر	ڈاکٹر آفتاب احمد	مکتبہ دانیال کراچی۔
87	فیض احمد فیض عکس اور جہتیں	شاہد ماہلی	معیار پبلی کیشنز دہلی۔
88	فیض نامہ فیض احمد فیض	عبدالمجید انجم	شاہین کتاب گھر کوئٹہ۔
89	فیض احمد فیض	ضیا ساجد	مکتبہ جاوید پبلشرز لاہور
90	اردو تنقید کا سفر	عبداللہ ملک	مکتبہ پبلشرز لاہور
91	[illegible]	فیض فکر و فن	لاہور۔
92	فیض احمد فیض شخص، شاعر، صحافی مرتب مظفر علی	پروفیسر یوسف حسن	مقتدرہ قومی زبان پاکستان۔
93	شام انتظار کا تنہا شاعر (صبا)	عبدالصمد	صبا حیدر آباد دکن۔ نومبر 1963ء
94	جدید نظم ہیئت کے تجربے	اویس احمد دوراں	شاعر بمبئی ستمبر 1963ء
95	فیض کی شاعری کے بعض پہلو	عرش صدیقی	ادبی دنیا لاہور۔ شمارہ نمبر 11، 1963ء
96	نئی شاعری اور جدید شاعری	شیخ محمد ملک	نقوش لاہور۔ شمارہ نمبر 1، 1963ء
97	فیض احمد فیض کی شاعری	انور جمیل	ماہنامہ اردو ادب ۔ جنوری 1964ء
98	فیض اور ناصر (تقابلی مطالعہ)	قمر اعظم ہاشمی	سب رس ۔ فروری 1964ء
99	فیض سے معذرت	اشفاق حسین قریشی	اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اپریل 1964ء
100	اردو شاعری کے جدید رجحانات	جمیل الرحمن زخمی	شاعر بمبئی۔ اپریل، مئی 1964ء
101	فیض کا سنہرا خواب	محمود صدیقی	نگار رسالہ کراچی۔ مئی، جون 1964ء
102	فیض اور جدید شاعری	عرش صدیقی	خیابان مجلہ پشاور یونیورسٹی۔ خاص نمبر 1964ء
103	[illegible]	ڈاکٹر محمد علی نقوی	باب العلم حیدر آباد۔ 1996ء

104	اردو غزل، تجزیاتی مطالعہ	کے۔ اے۔ حمیدی	بی۔ آر پبلی کیشنز، دہلی۔ 1987ء
105	کلاسیکی ادب اور فیض کے درمیان	صدیق الرحمن قدوائی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ 2006ء
106	ترتیب فیض	ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی	مرکزی پبلی کیشنز، جیوتی نگر، دہلی۔ 2015ء
107	تنقیدی نظریات	پروفیسر سید احتشام حسین	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ 1966ء
108	ادبی تجزیے	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	قومی آفسیٹ پریس، بھوپال۔ 1966ء
109	فیض صاحب تحریر و صحبت	اشفاق حسین	جادہ پبلی کیشنز، لاہور۔ 2008ء
110	فن کے تجربات	سید عاشور کاظمی	مکتبہ کتب نما، دہلی۔ 1990ء
111	معنویت کی تلاش	ڈاکٹر عنوان چشتی	رنگ محل پبلی کیشنز، غفار منزل۔ 1983ء
112	ادبی تحقیق و تنقید	ڈاکٹر ابو محمد سحر	ایجوکیشنل پبلشرز، پرنٹرز بھوپال۔ 2002ء
113	اردو غزل	ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکادمی، دہلی۔ 1987ء
114	آگہی و بے باکی	باقر مہدی	ہلال پبلی کیشنز، بمبئی۔ 1965ء
115	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اشرف بک ایجنسی، لاہور۔ 1961ء
116	صبا	سید مظہر حسن نقوی	اردو مجلس، حسامی نگر، ... 2009ء
117	تنقیدی تحریریں	رحمت النساء بیگم	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ 1985ء
118	اردو مرثیہ پاکستان میں	ضمیر اختر نقوی	سید اینڈ سید، کراچی۔ 1982ء
119	فیض کے ذہنی ارتقا کے چند پہلو	اے۔ حمید ناز	امروز، لاہور، استقلال نمبر 1952ء
120	فیض کا شعور	ابوالفضل سید محمود قادری	نظام ادب، حیدرآباد دکن۔ 1955ء
121	فیض ایک عظیم فن کار	اقبال مہدی	سٹی کالج میگزین، حیدرآباد دکن۔ فروری 1956ء
122	زنداں نامہ پر ایک نظر	صابر علی سید	صادق، لاہور۔ اپریل 1956ء
123	کچھ فیض کے بارے میں	محمود جمال	شاعر، بمبئی۔ جنوری 1957ء
124	فیض سے ایک انٹرویو	شمس نوید	لیل و نہار، بمبئی۔ فروری 1957ء
125	زنداں نامہ کا سرسری جائزہ	اثر صحرائی	علی گڑھ اردو ... 1957ء
126	حسن غزل اور فیض	شمیم کرہانی	صبا، حیدرآباد دکن۔ شمارہ 8-9، 1957ء
127	فیض کی ایک نظم	انجم اعظمی	افکار، کراچی۔ دسمبر 1957ء
128	زنداں نامہ ایک مطالعہ	قاضی افضل رزمی	شاعر، بمبئی۔ جنوری 1958ء
129	فیض زنداں ناموں کی کہانی	شہاب جعفری	نئی عمران، اشاعت خاص نمبر 2۔ 1958ء
130	فیض کی شاعری پر ایک نظر	رشید حسن خاں	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ اگست 1958ء
131	فیض اور دست صبا	وحید قریشی	تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ دسمبر 1958ء

132	فیض احمد فیض	حمید اختر	نئی زندگی، لاہور ۔ 1959ء
133	فیض احمد فیض	صہبا لکھنوی	افکار کراچی ۔ نومبر، دسمبر 1959ء
134	نیا دستِ صبا	اثر لکھنوی	نئی دنیا، دہلی ۔ مئی، جون 1959ء
135	فیض کے کلام میں تصوّر	سہیل بخاری	کاروان، بہاولپور ۔ اگست، ستمبر 1960ء
136	فیض کی شاعری	رشید حسن خاں	آج کل، دہلی ۔ ستمبر 1960ء
137	فیض اور ندیم	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	ادبِ لطیف، لاہور ۔ اپریل 1961ء
138	انتخابِ کلامِ فیض	الطاف حسین قریشی	اردو ڈائجسٹ، لاہور ۔ جولائی 1961ء
139	فیض، شاعر انسان	ممتاز حسین	ماہ نو، کراچی ۔ جولائی 1963ء
140	فیض کی شاعری	ظ۔ انصاری	ہماری زبان، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو کا اخبار 1962ء
141	فیض کی غزلیں	مظفر علی سید	نصرت، لاہور ۔ اگست 1962ء
142	میزان پر تنقیدی تبصرہ	سجاد باقر رضوی	نگار پاکستان، کراچی ۔ دسمبر 1962ء
143	دستِ تہِ سنگ پر ایک خط	قاری	تحریک، دہلی ۔ فروری 1963ء
144	فیض کی شاعری کا ایک تجزیہ	صدیق کلیم	لیل و نہار، لاہور ۔ 14 اپریل 1963ء
145	اردو شاعری کے چند مسئلے	سجاد ظہیر	شاہراہ، دہلی ۔ اپریل 1963ء
146	فیض کی شاعری	جمیل ملک	ساقی، کراچی ۔ مئی 1963ء
147	فیض کی نظریاتی شاعری	ظہیر صدیقی	شاعر، بمبئی ۔ جولائی 1963ء
148	پیرویں	محتسب	تحریک، دہلی ۔ ستمبر 1963ء

☆

عمل: صادقین

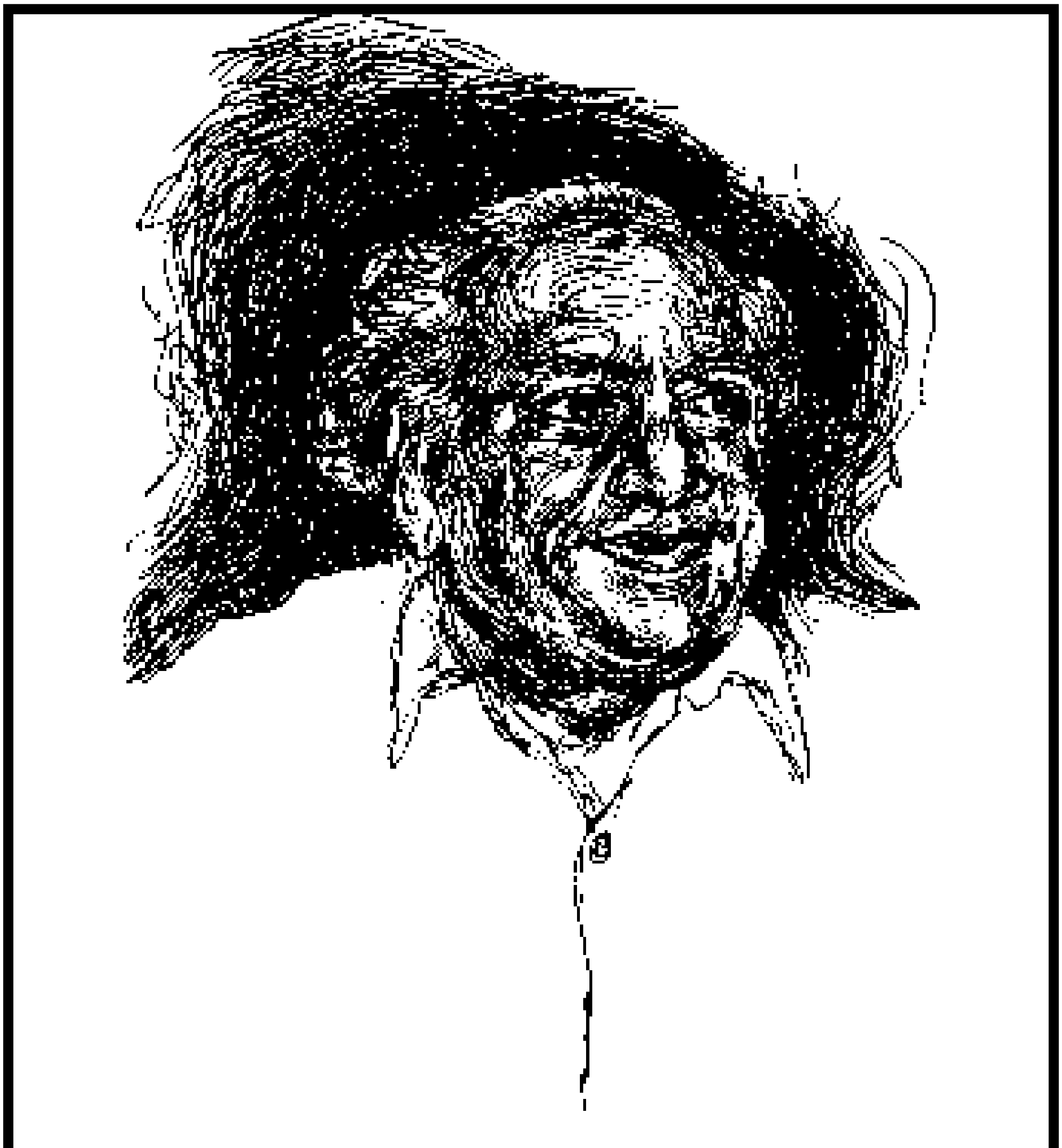

عمل: صادقین

عمل: صادقین